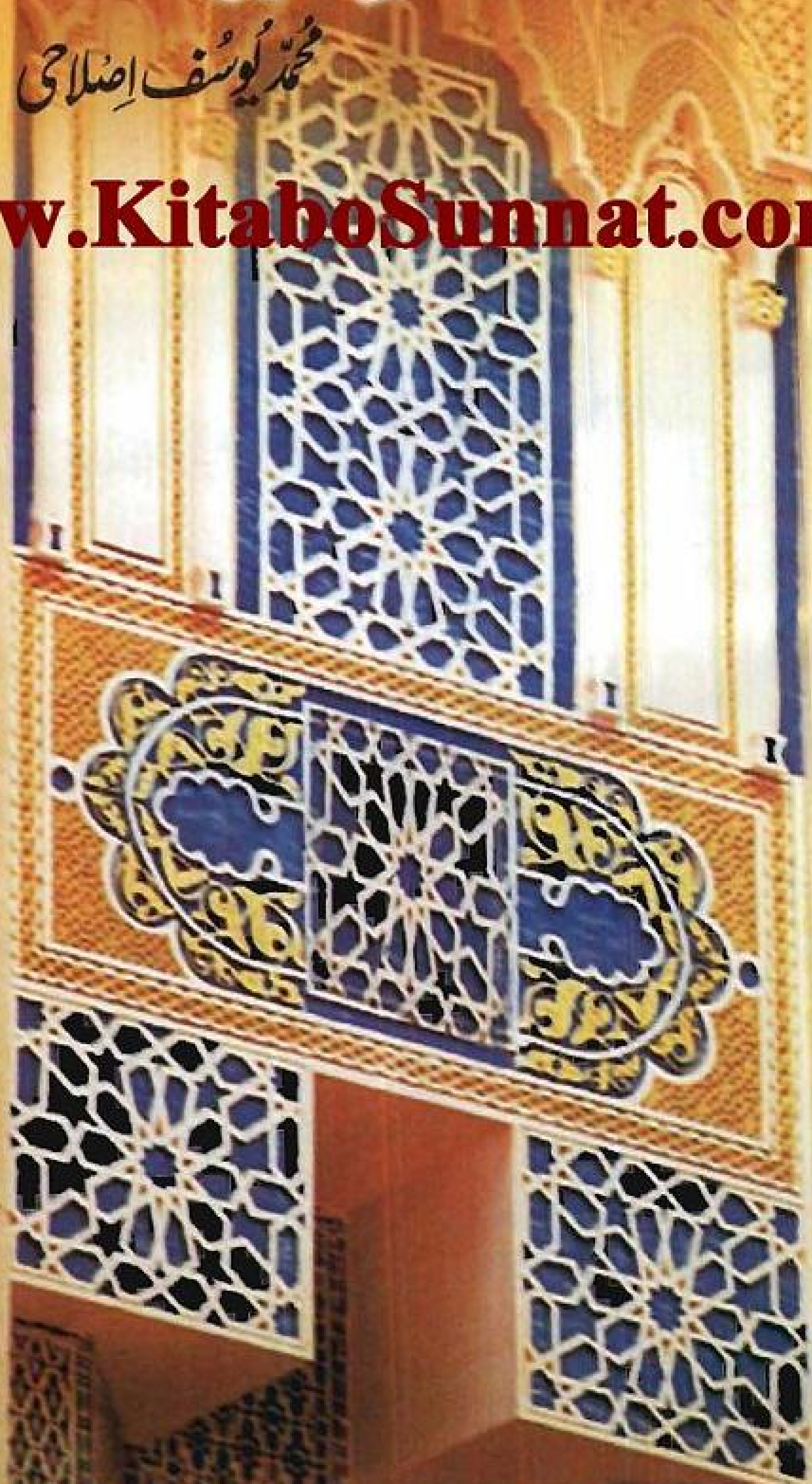
# شعورِ حیات

محمد یوسف اصلاحی









شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

**IN THE NAME OF ALLAH,**
**THE BENEFICIENT, THE MERCIFUL**

# شعورِ حیات

محمد یوسف اصلاحی






البدر پبلی کیشنز

23 راحت مارکیٹ اُردو بازار لاہور

Ph:042-37225030 Cell: 0300-8485030

☆ نام کتاب شعورِ حیات

☆ مصنف محمد یوسف اصلاحی

☆ ناشر عبدالحفیظ احمد

☆ اشاعت نہم جون 2010ء

☆ مطبع علی اعجاز پرنٹرز' لاہور

☆ ہدیہ -/550 روپے

# فہرست مضامین

# تعارف

الحمدللہ! شعورِ حیات آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ ماہنامہ ''ذکریٰ'' کے ابتدائی سالوں کے چند اداریئے ہیں۔ ''ذکریٰ'' کے یہ اداریئے ضرورت، حالات اور مختلف محرکات کے تحت لکھے جاتے رہے ہیں۔ جیسا کہ گوناگوں عنوانات اور مضامین کے تنوع سے آپ اندازہ کر رہے ہیں...... ان مضامین میں گو کوئی تصنیفی ترتیب نہیں ہے اور نہ ہو سکتی تھی لیکن ایک معنوی ربط اور مطلوب قدر مشترک یہ ضرور ہے کہ یہ سب شخصی تربیت وتزکیہ اور اجتماعی اصلاح وانقلاب کے لیے فکرمند اور مضطرب کرنے والے ہیں۔ دراصل یہ داعی کے دل میں موجود یا مطلوب آگ ہے جس کی آنچ سے داعی اپنے اردگرد کے ماحول کو گرم کرنا اور گرم رکھنا چاہتا ہے۔

شخصی تربیت وتزکیہ ہو یا اجتماعی اصلاح وانقلاب کی دعوت، اس سلسلے میں دو باتیں اصولی اور بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ تربیت واصلاح کا نقطۂ آغاز فرد کی اپنی ذات ہے اور اوّل وآخر تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں اور کاوشوں کا مطلوب یہی ہے کہ فرد کی شخصیت کی تکمیل ہو سکے اور وہ آخرت میں فلاح ونجات کا مستحق بن سکے۔ قرآن وسنت کا خطاب اصلاً فرد سے ہے اور فرد کی نجات وفلاح ہی اصل موضوع ہے۔ ایک صالح اجتماعیت اور ہمہ گیر اسلامی انقلاب کا مقصود بھی یہی ہے کہ فرد کا صحیح ارتقا ہو سکے اور سازگار فضا میں کسی روک ٹوک کے بغیر وہ خود کو آخرت کی فلاح ونجات کے لائق بنا سکے۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ فرد اور جماعت کی تمام کوششوں کا محور ومرکز اور منتہائے مقصود صرف اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح ہو۔ اس کے سوا کوئی اور مقصود ذہن وقلب کے کسی گوشے میں ہرگز نہ ہو۔

ان دو حقیقتوں پر پختہ یقین اور شرح صدر سے جو نکھری ہوئی اسلامی فکر پیدا ہوتی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح کو یکسوئی، اخلاص اور صحیح فہم کے ساتھ مقصود بنا کر جو زندگی گزاری جائے وہی کامیاب اور مطلوب زندگی ہے۔ خواہ وہ آرام وآسائش اور خوشحالی میں گزرے یا مصائب وآلام اور غربت وافلاس میں، محکومی اور مظلومی میں گزرے یا اقتدار وآزادی میں، آزمائش وتعذیب میں گزرے یا دنیا کے وسائل وذرائع پر

قابض ومتصرف ہوکر۔ دیکھنا یہ نہیں ہے کہ زندگی کس طرح گزری، دیکھنا یہ ہے کہ کس چیز کو مقصود بنا کر گزری اور یہ حقیقت بھی ذہن میں سورج کی طرح روشن رہنی چاہیے کہ آخرت کی زندگی کو تابناک وکامیاب بنانے کے لیے ہمارے پاس صرف ایک ہی موقع اور ایک ہی پونجی ہے اور وہ یہی دنیا کی حیات مستعار ہے جو صرف ایک ہی بار ملتی ہے۔ یہ حیات مستعار واحد مہلت عمل اور واحد پونجی ہے جو اگر ضائع ہوگئی تو پھر کبھی دوبارہ نہ ملے گی---اس پہلو سے سوچیے تو کتنی غیر معمولی اہمیت ہے۔ اس ''فانی زندگی'' کی!---اس فانی زندگی کو صحیح رخ پر لگا کر اور فلاح آخرت کے مقصد میں کھپا کر ہی تو ہم اس زندگی کو کامیاب بنا سکتے ہیں جو جاوداں ہے اور کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس نے اس فانی زندگی کو ضائع کر دیا اس نے اپنا سب کچھ ضائع کر دیا۔ اب اس کے پاس کچھ نہیں رہا جس کے بل پر وہ فلاحِ آخرت کے بارے میں کچھ سوچ سکے یا کر سکے۔ اب حسرت ویاس کے ساتھ ہاتھ ملنے کے سوا اس کے لیے کچھ نہیں ہے۔

کامیابی کا یہ معیار نگاہ میں ہو تو ہم یقین کی پوری قوت سے کہہ سکتے ہیں کہ جس نے دنیا کی زندگی کامیاب گزاری اس کی آخرت کی زندگی بھی کامیاب ہے۔ اور جس نے دنیا کی زندگی ناکام گزاری وہ ایک ایسا دیوالیہ تاجر ہے جس نے اپنی ساری پونجی کھو دی اور اب ابدی ناکامی اور نامرادی ہی اس کا نصیب ہے۔

یہ روشن فکر مذکورہ دو حقیقتوں پر ایمان واذعان کا لازمی ثمرہ ہے اور یہ فکر آدمی کو آمادہ ہی نہیں بے تاب رکھے گی کہ وہ تربیت ودعوت کی تمام کوششوں اور کاوشوں کا اولین نشانہ اپنی ذات کو بنائے اور فلاح آخرت کو اپنا قطعی ذاتی مسئلہ سمجھ کر سنجیدگی اور اخلاص کے ساتھ اس کے لیے کوشاں ہو مگر ملک وملت اور سماج سے آنکھیں موند کر نہیں بلکہ اپنی نجات وفلاح کے لیے:

''سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے''

کو ناگزیر بنا کر اور یہی اضطراب اور بے تابی آپ کو ان مضامین کے زور اور جوش میں کارفرما نظر آئے گی۔ یہی ان کا معنوی ربط ہے اور یہی بے تابی ان کی قدر وقیمت متعین کرنے والا جوہر ہے۔

اللہ بزرگ وبرتر سے دعا ہے کہ وہ اس مجموعے کو شرفِ قبول بخشے۔ قارئین کے لیے نفع بخش بنائے اور امت کے بیش از بیش افراد کے حق میں اس کو اچھی تبدیلیوں کا ذریعہ بنا کر مرتب کے لیے وسیلہ مغفرت ونجات قرار دے۔

محمد یوسف اصلاحی

۱۵/ذی قعدہ ۱۴۰۵ھ (2 اگست 1985ء)

# زندگی

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم رواں، ہردم جواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سِرِّ آدم ہے ضمیر کُن فکاں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہ کَن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے ایک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب!
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

(اقبالؒ)

# کتابِ زندگی



کتابِ زندگی کے ورق برابر الٹ رہے ہیں' ہر آنے والی صبح ایک نیا ورق اُلٹ دیتی ہے۔ یہ الٹے ہوئے ورق برابر بڑھ رہے ہیں اور باقی ماندہ ورق برابر کم ہو رہے ہیں—— اور ایک دن وہ ہوگا جب آپ اپنی زندگی کا آخری ورق الٹ رہے ہوں گے—— جونہی آپ کی آنکھیں بند ہوں گی، یہ کتاب بھی بند ہو جائے گی اور آپ کی یہ تصنیف محفوظ کر دی جائے گی۔

کبھی آپ نے غور کیا، اس کتاب زندگی میں آپ کیا درج کر رہے ہیں؟ روزانہ کیا کچھ اس میں لکھ کر آپ اس کا ورق الٹ دیتے ہیں۔ آپ کو شعور ہو یا نہ ہو، آپ کی یہ تصنیف تیار ہو رہی ہے اور آپ اس کی ترتیب و تکمیل میں اپنی ساری قوتوں کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ اس میں آپ وہ سب کچھ لکھ رہے ہیں جو آپ سوچتے ہیں' دیکھتے ہیں، سنتے ہیں، چاہتے ہیں، کرتے ہیں اور کراتے ہیں۔ اس میں صرف وہی کچھ نوٹ ہو رہا ہے جو آپ نوٹ کر رہے ہیں۔ کسی دوسرے کو ہرگز کوئی اختیار نہیں جو ایک شوشہ بھی اس میں بڑھا یا گھٹا سکے۔ اس کتاب کے مصنف تنہا آپ ہیں اور صرف آپ ہی اپنی کوشش اور کاوش سے اسے ترتیب دے رہے ہیں۔ ذرا آنکھیں بند کیجئے اور سوچیے ''کل'' یہی کتاب آپ کے ہاتھ میں ہوگی اور شہنشاہِ واحد وقہار آپ سے کہے گا:

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ط كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ○ (الاسراء:۱۷:۱۴)

''پڑھ اپنی کتاب آج اپنے نامۂ اعمال کا جائزہ لینے کے لیے تو خود ہی کافی ہے۔''

پھر سوچیے ان خوش نصیبوں کی خوشی کا کیا ٹھکانا ہوگا جن کا دفترِ عمل ان کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اور ان مجرموں پر کیا بیتے گی جن کی کتاب زندگی ان کے بائیں ہاتھ میں پکڑائی جائے گی! آیئے کچھ دیر کے لیے تصور کی آنکھوں سے قرآن کے آئینے میں اس کو جھنجھوڑنے والے منظر کو دیکھیں۔

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ○ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ○ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ○ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ○ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ○ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ○ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓئًا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ○ (الحاقۃ ۶۹:۱۸-۲۴)

''وہ بھی کیسا دن ہوگا جب تم لوگ پیش کیے جاؤ گے، تمہارا کوئی راز چھپا نہ رہ جائے گا۔ اس وقت جس کا نامۂ اعمال سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا لو دیکھو، پڑھو میرا نامہ اعمال۔ میں سمجھتا تھا کہ مجھے ضرور اپنا حساب ملنے والا ہے۔ پس وہ دل پسند عیش میں ہوگا' عالی مقام جنت میں' جس کے پھلوں کے گچھے جھکے پڑ رہے ہوں گے۔ (ان سے کہا جائے گا) مزے سے کھاؤ پیو۔ اپنے ان نیک اعمال کے صلے میں جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں کیے ہیں۔''

وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتَابَهٗ بِشِمَالِهٖ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ کِتَابِیَهْ ○ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِیَهْ ○ یٰلَیْتَهَا کَانَتِ الْقَاضِیَةَ ○ مَاۤ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ ○ هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ ○ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ○ ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ ○ ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ○ اِنَّهٗ كَانَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِیْمِ ○ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ ○ فَلَیْسَ لَهُ الْیَوْمَ هٰهُنَا حَمِیْمٌ ○ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ ○ لَا یَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ ○ (الحاقۃ ۶۹: ۲۵-۳۷)

''اور جس کا نامۂ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا' کاش میرا نامۂ اعمال مجھے نہ دیا گیا ہوتا اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے۔ کاش میری وہی موت (جو دنیا میں آئی تھی) فیصلہ کن ہوتی۔ آج میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا۔ میرا سارا اقتدار ختم ہوگیا۔ (حکم ہوگا) پکڑ واسے اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو اور پھر اسے جہنم میں جھونک دو۔ پھر اس کو ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو۔ یہ نہ اللہ بزرگ و برتر پر ایمان لاتا تھا اور نہ مسکین کو کھلانے کے لیے ابھارتا تھا۔ لہٰذا آج نہ یہاں اس کا کوئی یارِ غم خوار ہے اور نہ زخموں کے دھوون کے سوا اس کے لیے کوئی کھانا' جسے خطا کاروں کے سوا کوئی نہیں کھاتا۔ (کیونکہ ان خطا کاروں نے زندگی بھر اسی کے کھانے کی عادت ڈالی تھی)''

کبھی آپ نے غور کیا کہ آپ اپنی کتابِ زندگی کس ہاتھ میں لینے کی تیاری کر رہے ہیں، دائیں ہاتھ میں یا بائیں ہاتھ میں؟ —— دائیں ہاتھ میں وہی کتاب دی جائے گی جو اللہ کی نظر میں دائیں ہاتھ کے لائق ہوگی اور بائیں ہاتھ میں وہی کتاب دی جائے گی جو اللہ کی نظر میں بائیں ہاتھ کے لائق ہوگی۔ سنجیدگی سے سوچنے کی بات ہے کہ آپ شب و روز کی دوڑ دھوپ سے جو کتاب مرتب کر رہے ہیں وہ کس آرزو کے ساتھ کر رہے ہیں اور اس آرزو میں آپ کس حد تک مخلص ہیں!



# فرض آپ کو پکار رہا ہے!



بے شک آپ پابندی سے نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، زکوٰۃ کا بھی اہتمام کرتے ہیں، استطاعت ہو تو حج کو بھی جاتے ہیں، آپ اسلامی وضع قطع کے بھی پابند ہیں، حلال و حرام کی تمیز میں بھی نہایت حساس ہیں، آپ تقویٰ و طہارت کے لوازم کا بھی التزام کرتے ہیں اور نوافل و اذکار، صدقہ و خیرات کا بھی زیادہ سے زیادہ خیال رکھتے ہیں، اس لیے کہ آپ کو اپنے مسلمان ہونے کا احساس ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ اس احساس میں آپ تنہا بھی نہیں ہیں۔ آپ کی طرح شریعت کے احکام و آداب کی اتباع اور پیروی کرنے والے امت میں ہزاروں نہیں لاکھوں ہیں۔ اور اگر میں یہ دعویٰ کروں تو اس کی تردید نہیں کی جا سکتی کہ اپنی عبرت ناک پستی کے باوجود آج بھی مسلمان مذہب کی پیروی اور عبادات سے شغف میں ہر مذہب کے پیروؤں سے آگے ہیں۔ اُمتِ مسلمہ میں لاکھوں افراد اب بھی موجود ہیں جن کی زندگیاں قابلِ رشک حد تک خدا ترسی اور فرض شناسی کا نمونہ ہیں۔ جن کی سیرت اور کردار آئینے کی طرح صاف ہے، جن کا تقویٰ ہر شبہ سے بالا ہے اور جن پر سوسائٹی اعتماد کرتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی مذہبی گروہ ان کی ٹکر کے انسان پیش کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلمان تعداد کے اعتبار سے بھی دنیا میں دوسری عظیم اکثریت ہیں۔ ان کے پاس ہر طرح کے وسائل و ذرائع بھی ہیں۔ ان کے پاس کوئلہ بھی ہے، پٹرول بھی ہے، لوہا بھی ہے، سونا بھی ہے، یہ دولت مند بھی ہیں اور دنیا کے کتنے ہی حصوں میں ان کی اپنی حکومتیں بھی ہیں۔

مگر تلخ سہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اس مذہبی تقدس اور دولت و حکومت کے باوجود سب سے زیادہ ذلیل و خوار اور بے وزن یہی مسلمان قوم ہے، نہ ان کی اپنی کوئی رائے ہے، نہ کوئی منصوبہ، نہ ان کا کوئی وقار ہے اور نہ کوئی اعتبار، انفرادی حیثیت سے ان میں یقیناً لاکھوں ایسے ہیں جن پر انسانیت فخر کر سکتی ہے لیکن اجتماعی حیثیت سے دنیا میں ان کا کوئی مقام نہیں ہے۔

آپ اسی امت کے ایک فرد ہیں۔ آپ کا مستقبل امت کے مستقبل سے وابستہ ہے۔ کیا آپ کو یہ احساس

پریشان کرتا ہے کہ امت کو اس ذلت سے نکالا جائے اور اس کو عظمت رفتہ حاصل کرنے کے لیے پھر بے تاب کر دیا جائے۔

کبھی آپ نے غور کیا کہ اس بے قدری اور ذلت کی وجہ کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ امت نے اپنا وہ فرض بھلا دیا ہے جس کے لیے اللہ نے اس کو پیدا کیا تھا۔ اُمتِ مسلمہ عام امتوں کی طرح کوئی خودرو امت نہیں ہے۔ اس کو اللہ نے ایک خاص منصوبے کے تحت ایک عظیم مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ اللہ نے اس کی زندگی کا وہی مشن قرار دیا ہے جو اپنے اپنے دور میں اللہ کے پیغمبروں کا مشن رہا ہے۔ نبوت کا سلسلہ نبی اُمیؐ پر ختم ہو گیا۔ آپ ﷺ کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا ـــــ اللہ کے بندوں تک اللہ کا دین پہنچانے کا کام اب رہتی زندگی تک اسی امت کو انجام دینا ہے۔ یہی اس کی زندگی کا مقصد ہے، اسی کی خاطر اللہ نے اسے ایک امت بن کر رہنے کی تاکید کی ہے اور اسی فرض کی ادائیگی سے اس کی تقدیر وابستہ ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ (آل عمران۳:۱۰۴)

تم کو ایک ایسی امت بن کر رہنا چاہیے جو خیر کی طرف لوگوں کو دعوت دے۔

خیر سے مراد ہر وہ نیکی اور بھلائی ہے جس کو نوع انسانی نے ہمیشہ نیکی اور بھلائی سمجھا ہے اور اللہ کی وحی نے بھی اس کو نیکی اور بھلائی قرار دیا ہے۔ الخیر سے مراد وہ ساری نیکیاں ہیں جن کے مجموعے کا نام دین ہے اور جو ہمیشہ اللہ کے پیغمبر اللہ کے بندوں تک پہنچاتے رہے ہیں۔ امت کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کو کسی امتیاز کے بغیر اس دین کی دعوت دے اور اسی سوز اور تڑپ کے ساتھ دعوت کا کام کرے جس طرح اللہ کے پیغمبروں نے کیا ہے۔ اس لیے کہ وہی مشن اللہ نے اس امت کے سپرد کیا ہے۔

امت کی زندگی میں دعوتِ دین کے کام کی وہی حیثیت ہے جو انسانی جسم میں دل کی حیثیت ہے۔ انسانی جسم اسی وقت تک کارآمد ہے جب تک اس کے اندر دھڑکنے والا دل موجود ہو، اگر یہ دل دھڑکنا بند کر دے تو پھر انسانی جسم، انسانی جسم نہیں ہے، مٹی کا ڈھیر ہے۔ اس لیے کہ جسم کو صالح خون پہنچانے والا اور اس کو زندہ رکھنے والا دل ہے۔

ٹھیک یہی حیثیت دعوتِ دین کی بھی ہے۔ اگر امت یہ کام سرگرمی سے انجام دے رہی ہے' اللہ کے منصوبے اور منشا کے مطابق امت میں صالح عناصر کا اضافہ ہو رہا ہے اور غیر صالح عنصر چھٹ رہا ہے، نیکیاں پنپ رہی ہیں اور برائیاں دم توڑ رہی ہیں تو امت زندہ ہے اور عظمت و عزت اور وقار و سربلندی اس کی تقدیر ہے لیکن امت اگر اس فرض سے غافل ہو جائے' دینِ حق کے کام کا اسے احساس ہی نہ رہے تو وہ زندگی سے محروم ہے ـــــ اور مردہ ملت بھلا عزت و عظمت کا مقام کیسے پا سکتی ہے۔

اللہ کے نزدیک بھی امت کی تمام تر اہمیت اسی وقت ہے جب وہ اس منصب کے تقاضے پورے کرے جس پر اللہ نے اسے سرفراز فرمایا ہے۔ اگر وہ اس منصب ہی کو فراموش کر دے اور اسے احساس ہی نہ رہے کہ اللہ نے مجھے کس کام کے لیے پیدا کیا ہے تو پھر اللہ کو اس کی کیا پروا کہ کون اسے پیروں میں روند رہا ہے اور کون اس کی عزت سے کھیل رہا ہے۔

•••-----•••-----•••-----•••

آپ کے ہاتھ میں بندھی ہوئی یہ قیمتی گھڑی یقیناً آپ کی نظر میں ایک نعمت ہے۔ آپ نے اس کو اس لیے اپنے ہاتھ پر جگہ دی ہے کہ یہ آپ کو صحیح وقت بتائے اور آپ اپنے اوقات کو منظّم کر کے ٹھیک وقت پر اپنے سارے کام انجام دے سکیں۔ اگر یہ گھڑی اپنا کام ٹھیک ٹھیک انجام دے تو آپ اسے اپنے ہاتھ کی زینت بنائے رکھتے ہیں، اہتمام کے ساتھ اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ آپ کو گوارا نہیں ہوتا کہ اس پر پانی کی ایک بوند پڑے، اس کے نازک شیشے کو ذرا سی ٹھیس لگے یا کسی چیز سے یہ ٹکرائے۔ لیکن گھڑی کی یہ ساری قدر و منزلت اور اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کا یہ اہتمام اسی وقت تک ہے جب تک وہ صحیح وقت بتاتی ہے۔ اگر وہ بار بار بند ہونے لگے، کبھی آدھا گھنٹہ تیز ہو جائے اور کبھی ایک گھنٹہ سست چلنے لگے، آپ بار بار اس سے دھوکہ کھائیں، آپ کے پروگرام اس سے متاثر ہونے لگیں —— اور وہ مقصد اس سے پورا نہ ہو جس کی خاطر آپ نے اسے اپنے ہاتھ پر جگہ دی تھی تو کیا آپ یہ برداشت کریں گے کہ پھر بھی وہ آپ کے ہاتھ کی زینت بنی رہے اور آپ اسی طرح اس کی حفاظت کرتے رہیں؟ یقیناً آپ کا فیصلہ یہ ہوگا کہ یہ گھڑی نہیں چند پرزوں کا مجموعہ ہے اور پیتل کے چند ٹکڑے ہیں، اس کی مناسب جگہ انسان کا قابلِ احترام ہاتھ نہیں بلکہ کباڑیے کی دکان ہے اور پھر آپ کو اس کی کیا پروا کہ کباڑی اس کو کہاں ڈالتا ہے اور اس کو بے دردی کے ساتھ کوٹتا اور توڑتا ہے یا کوئی اس کو بھٹی میں گلاتا ہے۔ آپ کے نزدیک اس کی جو کچھ قدر و منزلت تھی وہ اسی بنا پر تھی کہ وہ صحیح وقت بتائے۔ اس لیے کہ بنانے والے نے اسے اسی لیے بنایا تھا اور آپ نے ایک بڑی رقم دے کر اسی لیے خریدا تھا۔

اللہ نے اُمتِ مسلمہ کو اسی لیے پیدا کیا تھا کہ وہ دوسروں تک اللہ کا دین پہنچائے۔ سوسائٹی میں نیکیوں کا پرچار کرے اور برائیوں کو مٹائے۔ جب تک وہ اپنے اس فرض کو انجام دیتی رہے گی اللہ کی نصرت و حمایت بھی اسے حاصل رہے گی۔ وہ اس کا محافظ اور نگہبان بھی ہوگا اور اسے عظمت و وقار کی بلندیوں سے سرفراز بھی فرمائے گا لیکن امت اگر اس فرض سے غافل ہو جائے تو پھر نہ اس کی کثرتِ تعداد اسے کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ دولت و حکومت اس کے کام آسکتی ہے نہ تسبیح و تہلیل اور نوافل و اذکار کی کثرت سے وہ عظمتِ رفتہ کو پا سکتی ہے اور نہ یہ انفرادی دین داری اس کو اللہ کے غضب سے بچا سکتی ہے۔ اگر ہر طرف بگاڑ ہو اور اللہ کے بندے اللہ کو بھول کر اپنی من مانی کر

رہے ہوں اور آپ ان سے بے فکر صرف اپنی فکر میں لگے ہوئے ہوں تو سمجھ لیجیے کہ اللہ کا (عذاب) بہت قریب ہے اور پھر اس کی پکڑ سے کوئی بچ نہ سکے گا — حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اوحی اللّٰہ عزوجل الی جبریل علیه السلام ان اقلب مدینة کذا و کذا فقال یا ربّ ان فیھم عبدك فلانا لم یعصك طرفه عین قال فقال اقلبھا علیه و علیھم فان وجھه لم یتمعر فی ساعته قط (مشکوٰۃ، باب الامر بالمعروف، عن جابر رضی اللہ عنہ)

''خدائے بلند و برتر نے جبریل علیہ السلام کو حکم دیا کہ ایسی ایسی بستی کو الٹ دو، جبریل علیہ السلام نے کہا پروردگار ان میں تو تیرا ایک ایسا نیک بندہ ہے جس نے پلک جھپکانے کی حد تک بھی کبھی تیری نافرمانی نہیں کی ہے۔ پروردگار نے کہا، ہاں جبریل بستی کو اس پر بھی الٹ دو اور دوسروں پر بھی۔ اس لیے کہ (ان بستیوں میں علی الاعلان میری نافرمانی ہوتی رہی اور) اس کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی۔''

یہ حدیث اگر آپ کے اندر کوئی بے تابی پیدا کرے تو اس کی قدر کیجیے اور اللہ سے دعا کیجیے کہ وہ اس بے تابی میں اور اضافہ کرے۔ آپ کا فرض آپ کو پکار رہا ہے اور یہی بے تابی آپ کو اپنا فرض ادا کرنے پر آمادہ کر سکتی ہے۔

سکوں مجھ کو نہیں درکار آقا<br>
بڑھا دیجیے میری بے تابیٔ دل



# نبی ﷺ کی دعا اور آپ

کس مؤمن کے دل میں یہ آرزو نہ ہوگی کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی مقبول دعا کا مستحق بنے اور نبی ﷺ کی یہ دعا کہ ''اے اللہ! تو اس بندے کو خوش و خرم اور شاداب رکھ!'' اس کے حق میں بھی اللہ کے یہاں شرفِ قبولیت پائے۔ کیسا خوش نصیب ہے وہ بندہ جس کے لیے اللہ کے رسول ﷺ دعا فرمائیں۔ اس بات میں کیسے تردّد ہو سکتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی زبانِ مبارک سے نکلی ہوئی دعا شرفِ قبول پائے گی اور اللہ اپنے حبیب کی فرمائش ہرگز ردّ نہ فرمائے گا۔

نبی ﷺ کی دعا کا مستحق دنیا میں بھی خوش و خرم اور شاداب رہے گا، لیکن اصل خوشی اور شادابی تو اس کو اس دن حاصل ہوگی جب وہ حشر کے میدان میں اللہ کے حضور پہنچے گا۔ ذرا تصور تو کیجیے اس بندے کی خوش نصیبی کا جو حشر کے میدان میں اس طرح آئے کہ اس کا چہرہ مسرت و کامرانی سے چمک رہا ہو اور اس کی نگاہیں دیدارِ الٰہی میں محو ہوں۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ○ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ○ (القیامہ ۷۵:۲۲-۲۳)

''اس دن بہت سے (خوش نصیبوں کے) چہرے تر و تازہ اور بارونق ہوں گے اور اپنے ربّ کے دیدار میں محو ہوں گے۔''

جب کہ اسی دن بہت سے بدنصیب وہ بھی ہوں گے جن کے چہرے شرم و ندامت اور گناہوں کی تپش سے جھلسے ہوئے ہیبت ناک حد تک سیاہ اور اداس ہوں گے۔

وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ○ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ○ (القیامۃ ۷۵:۲۴-۲۵)

''اور بہت سے (بدنصیبوں کے) چہرے اداس اور بے رونق ہوں گے۔ اس آفت کے اندیشے سے جوان پر آنے والی ہے۔''

ذرا اپنے دل کو ٹٹولیے۔ کیا آپ کے دل میں یہ تڑپ نہیں ہے کہ آپ بھی اپنے رسول ﷺ کی اس دعا کے مستحق بنیں کہ ''اے اللہ! تو اس بندے کو خوش و خرم اور شاداب رکھ!'' اور آپ بھی چمکتے چہرے کے ساتھ اللہ کے

حضور پہنچیں اور اس کے دیدار سے اپنی آنکھیں روشن کریں!

•••-------•••-------•••-------•••

رسول اکرم ﷺ نے کن لوگوں کے لیے یہ دعا فرمائی ہے اور کون لوگ اس کے مستحق ہیں۔ یقیناً آپ جاننا چاہتے ہوں گے اور بڑی بے تابی کے ساتھ! ـــــ رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا ان لوگوں کے حق میں فرمائی ہے جو رسول ﷺ کا پیغام رسول ﷺ سے سن کر اللہ کے بندوں تک پہنچائیں اور دعوت و تبلیغ کا کام کریں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ''اللہ اس بندے کو شاداب و مسرور رکھے جس نے مجھ سے میرا پیغام سنا اور اسے ٹھیک ٹھیک دوسروں تک پہنچایا۔''

•••-------•••-------•••-------•••

بلاشبہ آپ نبی ﷺ کا پیغام نبی ﷺ کی زبان سے نہیں سن سکتے لیکن یہ موقع بہرحال آپ کو حاصل ہے کہ آپ نبی ﷺ کا پیغام دوسروں تک ٹھیک ٹھیک پہنچائیں اور قلب کی لگن کے ساتھ دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیں اور نبی ﷺ کی دعا کے مستحق بنیں۔

نبی ﷺ کی یہ دعا یقیناً آپ کے حق میں بھی ہے اگر آپ دعوت و تبلیغ کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور حسن و خوبی کے ساتھ یہ عمل کر رہے ہیں، یہی آپ کی زندگی کا مشن ہے اور یہی شب و روز کی سرگرمی۔

پھر دعوت و تبلیغ کے اجر و انعام کی کوئی حد اور انتہا نہیں، بالکل ممکن ہے کہ آپ جن لوگوں تک اللہ کے رسول کا پیغام پہنچائیں، وہ آپ کے مقابلے میں اس پیغام کی زیادہ حفاظت کریں۔ آپ سے زیادہ اس کے تقاضوں کو سمجھیں، آپ سے زیادہ اس کا حق ادا کریں اور آپ سے زیادہ شوق و محنت کے ساتھ دوسروں تک اسے منتقل کریں، لیکن اللہ کا فضل و احسان تو دیکھیے چونکہ ان تک دین کا پیغام پہنچنے کا واسطہ آپ بنے ہیں۔ اس لیے اب رہتی زندگی تک اس واسطے سے جن جن لوگوں کو بھی یہ پیغام پہنچے گا ان سب کے اجر و انعام کے برابر آپ کو اجر و انعام ملتا رہے گا۔ آپ کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ یہ بے پایاں فضل و کرم فرمائے گا اور ان لوگوں کے اجر و انعام میں بھی کوئی کمی نہ کرے گا۔

•••-------•••-------•••-------•••

البتہ دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتے وقت یہ بنیادی بات ضرور پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ نبی ﷺ کی دعا کے مستحق صرف وہی لوگ ہوں گے جو ٹھیک ٹھیک آپ ﷺ کی دعوت کو منتقل کریں۔ آپ ﷺ سے سننے والوں نے جس طرح آپ ﷺ سے سنا، جس طرح سمجھا اور جس طرح اپنے بعد کی امت کو پہنچایا، ٹھیک اسی طرح آپ بھی دوسروں تک وہ دعوت پہنچائیں، اس میں آپ کو نہ کسی کمی کی اجازت ہے اور نہ کسی اضافے کا اختیار، اگر آپ

اسی آرزو کے ساتھ دعوتِ دین کا کام کر رہے ہیں کہ نبی ﷺ کی دعا کے مستحق بنیں۔ اللہ کا دیدار آپ کو نصیب ہو اور قیامت کے دن آپ کامیاب اور شادماں اللہ کے حضور پہنچیں تو آپ نہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا کریں، نہ کسی لالچ سے مرعوب ہوں، نہ کسی قوت سے خوف کھائیں اور نہ کسی آزمائش سے ہراساں ہوں۔ ہر آنے والی آفت کا مردانہ وار مقابلہ کریں اور اللہ کا دین بے کم و کاست ٹھیک ٹھیک اللہ کے بندوں تک پہنچائیں اور اس تمنا کے ساتھ یہ سب کچھ کریں کہ نبی ﷺ کی دعا آپ کے حق میں قبول ہو، دنیا میں بھی آپ کامیاب و شادماں ہوں اور کل قیامت کے روز بھی آپ کا چہرہ مسرت و کامرانی سے دمک رہا ہو، نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا فَبَلَّغَهُ كَمَا سَمِعَهُ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰى لَهَا مِنْ سَامِعٍ

(الترمذی، کتاب العلم باب ۷ فی الحث علی تبلیغ السماع)

اللہ اس بندے کو مسرور و شاداب رکھے جس نے مجھ سے کچھ سنا اور پھر اس کو ٹھیک اسی طرح اس نے دوسروں تک پہنچایا جس طرح مجھ سے سنا تھا بہت سے وہ لوگ جن تک واسطوں سے بات پہنچی ہے وہ ان سے زیادہ اس پیغام کی حفاظت کرتے ہیں جو براہ راست سننے والے ہوتے ہیں۔



# آپ اسلام کے نمائندے ہیں!

آپ کی زندگی میں ہزار کوتاہیاں سہی لیکن اسلام بہرحال آپ کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے اور آپ کو بجا طور پر فخر ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ بے شک آپ کے لیے فخر کی بات یہ نہیں ہے کہ آپ عالی شان کوٹھی میں رہتے ہیں، لاکھوں اور کروڑوں کا کاروبار کرتے ہیں، کاروں میں گھومتے ہیں، آپ اونچے عہدے پر فائز ہیں اور ہزاروں انسانوں پر آپ حکومت کرتے ہیں، فخر کی بات یہ بھی نہیں ہے کہ آپ عالمی شہرت کے مالک ہیں اور ہر جگہ آپ کی رسائی ہے۔ فخر کی بات اگر ہے تو صرف یہ کہ اللہ نے آپ کو اسلام کی دولت سے نوازا ہے اور آپ مسلمان ہیں۔

•••-----•••-----•••

کیا آپ نے کبھی یہ بھی سوچا کہ جب آپ مسلمان ہونے کا اقرار کرتے ہیں تو دراصل آپ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ میں اسلام کا نمائندہ ہوں اور میری زندگی اسلام کی ترجمان ہے۔ آپ کو اپنی اس حیثیت کا احساس ہو یا نہ ہو بہرحال یہ حقیقت ہے کہ ہر مسلمان چاہے وہ سرمایہ دار ہو یا مزدور، عرب کا رہنے والا ہو یا عجم کا، صاحبِ علم ہو یا اَن پڑھ، کالا ہو یا گورا، عربی زبان بولتا ہو یا دنیا کی کوئی دوسری زبان، جب وہ مسلمان ہے' تو اسلام کا نمائندہ ہے۔
آپ اسلام کے نمائندے ہیں، آپ کی زندگی صحیح یا غلط اسلام کی ترجمانی کر رہی ہے اور آپ اللہ کی راہ میں بیٹھ کر اللہ کے بندوں کو یا تو اللہ کی طرف بلا رہے ہیں یا اللہ کی راہ سے روک رہے ہیں۔ آپ کو دیکھنے والا، آپ کو سننے والا، آپ کو برتنے والا اور آپ سے معاملہ کرنے والا صرف آپ کے بارے ہی میں رائے قائم نہیں کرتا، بلکہ اس دین کے بارے میں بھی رائے قائم کرتا ہے جس سے آپ کا تعلق ہے۔ آپ کی گفتگو، آپ کا طرزِ عمل، آپ کا سلوک، آپ کا لین دین، آپ کا طرزِ رہائش، آپ کا کھانا پینا، غرض آپ کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات ایسی نہیں ہے جس کو دیکھ کر لوگ اسلام کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کرتے ہوں۔
چھوڑیئے اس بحث کو کہ پچھلی صدیوں کے مسلمانوں نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا اور اپنی اس حیثیت کا کہاں تک پاس ولحاظ رکھا، اسے بھی چھوڑیئے کہ خود آپ کے ملک میں سات سو سال عزت وعظمت کی زندگی گزارنے والوں نے اسلام کی نمائندگی کس طرح کی، اسے بھی جانے دیجیے کہ خود آپ کے باپ دادا کی زندگیاں کس طرح اسلام

کی نمائندگی کرتی رہی ہیں — اللہ ان کی کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔ آپ ان کے حساب کتاب کی ذمہ داری اپنے سر نہ لیں۔ وہ اپنے ربّ کے پاس پہنچ چکے، ان کا حساب چکانے کے لیے ان کا ربّ کافی ہے نہ وہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے، آپ تو اپنی فکر کیجیے کہ آپ کس طرح اسلام کی نمائندگی کر رہے ہیں اور آپ کی زندگی سے اسلام کی کیا ترجمانی ہو رہی ہے۔

•••-------•••-------•••

اگر آپ نے اب تک اس طرح نہیں سوچا تھا اور لا ابالی کی زندگی ہی گزارتے رہے تو ذرا غم نہ کیجیے اور مایوسی کو قریب نہ پھٹکنے دیجیے۔ آپ کا معاملہ جس عظیم اللہ سے ہے وہ کبھی اپنے پیارے بندوں کو مایوس نہیں کرتا۔ آپ کا اللہ کبھی آپ کو اپنی رحمت سے مایوس نہ کرے گا۔ وہ آپ کو اپنی رحمت کے سائے میں لینے اور زندگی بھر کی کوتاہیوں کو معاف کرنے کے لیے خود آپ کو آواز دے رہا ہے۔ بشرطیکہ آپ سننا چاہیں۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (الزمر ۳۹:۵۳)

''(اے رسول!) کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ وہ نہایت بخشنے والا اور انتہائی رحم کرنے والا ہے۔''

اگر آپ کو — یقین ہے کہ یہ اللہ ہی کی آواز ہے اور اللہ آپ ہی کو پکار رہا ہے تو مایوسی کا کیا سوال؟ مایوس تو وہ ہوں جن کو اللہ پر یقین نہ ہو، اس کتاب پر یقین نہ ہو اور کتاب لانے والے پر یقین نہ ہو، جنہیں یقین کی یہ دولت حاصل ہے ان کے پاس مایوسی کا کیا گزر!

اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (یوسف ۱۲:۸۷)

''اللہ کی رحمت سے تو وہی مایوس ہوتے ہیں جو اس پر یقین نہیں رکھتے۔''

جو کچھ ہو چکا، ہو چکا۔ زندگی کے جو دن بُرے یا بھلے بیت گئے، بیت گئے۔ ماضی کے جنازے پر بیٹھ کر آنسو بہانے اور بین کرنے سے کیا حاصل؟ ہوش کی آنکھیں کھولیے زندگی کے جو لمحات باقی ہیں ان کی فکر کیجیے۔ مستقبل پر نظریں جما کر اسے تابناک بنانے میں لگ جائیے۔ جو کچھ ہو چکا اس پر آپ کا کوئی قابو نہیں لیکن جو کچھ آگے ہونے والا ہے وہ آپ کے اختیار میں ہے۔ آپ نیکی کا جو قدم بھی اٹھائیں گے اللہ آپ کو ہرگز مایوس نہ کرے گا۔

•••-------•••-------•••

آپ مسلم ہیں اور اس عظیم رہنما کی دعاؤں کا نتیجہ ہیں جس کو اللہ نے امامِ انسانیت کے خطاب سے نوازا ہے اور جس نے اپنے ربّ سے یہ عہد کیا تھا کہ میں نے اپنی زندگی تیرے حوالے کر دی ہے اور میں تیرا مسلم اور فرمانبردار ہوں۔

قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○ (البقرہ۲:۱۳۱)

''ابراہیم علیہ السلام نے کہا میں ربّ العالمین کا مسلم اور فرمانبردار ہوں۔''

آپ ملتِ ابراہیم علیہ السلام کے پیرو ہیں۔ آپ نے اسلام قبول کر کے اپنا سب کچھ اللہ کے حوالے کر دیا ہے اور اس سے یہ عہد کیا ہے کہ زندگی کے ہر معاملے میں صرف اسی کی بندگی کریں گے۔ اس عہد کا کھلا ہوا تقاضا ہے کہ آپ کی زندگی کا ہر گوشہ اسلام کی ترجمانی اور نمائندگی کرے اور آپ کی کوئی بات اور کوئی عمل ایسا نہ ہو جس سے اسلام کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم ہو۔

آپ کو احساس ہو یا نہ ہو آپ کی ہر بات اور ہر عمل اپنا اثر کر رہا ہے۔ آپ کا کوئی غلط طرزِ عمل ہزاروں انسانوں کو اللہ کی ہدایت سے دور کرنے کا سبب بھی بن سکتا ہے اور کوئی ایک نیک عمل ہزاروں زندگیوں میں خوش گوار انقلاب پیدا کر کے آپ کی رشک انگیز کامرانی کا سبب بھی بن سکتا ہے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی کے آخری ایام میں اپنے ایک عزیز کو قبول اسلام کے واقعات جمع کرنے اور کتاب ترتیب دینے کا مشورہ دیا اور پھر خود ہی دو نہایت مؤثر واقعات بھی سنائے۔

''بمبئی میں کسی خوش حال مسلمان نے اپنے حلقہ تعارف کے کچھ اونچے لوگوں کو کھانے پر مدعو کیا۔ ان میں ایک عیسائی انگریز بھی تھا۔ دستر خوان پر طرح طرح کے کھانے چنے ہوئے تھے اور قاب میں پلاؤ بھی تھا، عیسائی انگریز نے پلاؤ نہایت شوق سے کھایا، کھانے سے جب سب فارغ ہو گئے اور گفتگو چھڑی تو انگریز عیسائی نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ صاحبِ خانہ سے درخواست کی کہ مجھے کلمۂ توحید پڑھا کر دائرہ اسلام میں شامل کر لیجئے۔

صاحبِ خانہ حیران تھے کہ اس عام قسم کی دعوت میں کس چیز نے اس انگریز کے دل کی دنیا بدل دی اور اس نے حیرت و مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ سوال کیا، آپ کو کس چیز نے اس وقت متاثر کیا؟

''پلاؤ نے ــــ پلاؤ کھاتے وقت میرے ذہن نے یہ سوچا کہ جس قوم کا ذوق کھانے کے معاملے میں اتنا اچھا اور اونچا ہے، دین کے معاملے میں اس کا ذوق کتنا حسین اور بلند ہو گا اور میرے دل نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا'' ــــ انگریز نے جواب دیا۔

حاضرین کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور سبحان اللہ کی صدائیں بلند ہوئیں۔ صاحبِ خانہ نے خوشی میں کہا ــــ پلاؤ زندہ باد!

انگریز نے جواب دیا، ''نہیں اسلام زندہ باد!''

اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے ''جس نے سچے دل سے کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھا وہ جنت میں جائے گا'' اور یہ بھی آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ بھلائی کی طرف متوجہ کرنے والے کو ان تمام انسانوں کے برابر اجرو انعام ملے گا جو قیامت تک اس بھلائی کو اختیار کرتے رہیں گے۔ کلمہ پڑھنے والا اگر جنت کا مستحق ہے تو اللہ کے فضل وکرم سے یہی توقع ہے کہ کلمہ پڑھنے کا سبب بننے والا بھی جنت کا مستحق قرار پائے۔

•••-------•••-------•••

دراصل آپ کی زندگی کی ایک ایک چیز دوسروں پر اچھا یا برا اثر ڈال رہی ہے۔ آپ کی گفتگو، آپ کا سلوک، آپ کا لین دین، آپ کے معاملات، آپ کی نشست و برخاست، آپ کا رہن سہن، حد یہ کہ آپ کا دسترخوان بھی اچھا یا برا اثر ڈال رہا ہے۔ کتنے خوش نصیب ہیں اللہ کے وہ بندے جن کو اس حقیقت کا شعور بھی ہے اور جو اپنی زندگی کی ایک ایک حرکت پر اس پہلو سے نگاہ رکھتے ہیں کہ اللہ کے بندے اس سے کیا اثر قبول کر رہے ہیں؟ اور اسلام کے بارے میں ان کی رائے کیا بن رہی ہے؟ اسلام کا اعلان کر کے دراصل آپ نے سوسائٹی کے سامنے اپنے آپ کو اس حیثیت سے پیش کر دیا ہے کہ آپ کی پوری زندگی سے لوگ اسلام کو سمجھیں اور آپ کو دیکھ کر آپ کے بارے ہی میں رائے قائم نہ کریں بلکہ اسلام کے بارے میں بھی رائے قائم کریں۔

•••-------•••-------•••

اسلام انہی لوگوں کا دین نہیں ہے جو عالم، فاضل، لیڈر، پیشوا اور پیر و مرشد ہیں، نہ یہ صرف ان لوگوں کا دین ہے جو جماعت بن کر دعوت و تبلیغ کا کام کرتے ہیں۔ اسلام ہر مسلمان کا دین ہے چاہے وہ کسی مل کا مالک ہو یا مل میں مزدور ہو، چاہے وہ زمیندار ہو یا ہل جوتنے والا کاشتکار، وہ کسی کوٹھی میں رہنے والا سرمایہ دار ہو یا معمولی مزدوری کرنے والا غریب اور نادار، کار میں گھومنے والا ہو یا رکشہ کھینچنے والا، عدالت کی کرسی پر عزت سے بیٹھنے والا جج ہو یا دفتر کا معمولی قاصد، پڑھا لکھا ہو یا اَن پڑھ، کوئی بھی ہو جب وہ مسلمان ہے تو اسلام اس کا دین ہے اور وہ اسلام کا نمائندہ اور ترجمان ہے۔ اس کی زندگی سے لازماً لوگ اسلام کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور اسلام سے یا تو قریب ہوں گے یا دور بھاگیں گے۔ اگر اس کی زندگی اسلام کی نمائندگی میں کامیاب ہے تو لوگ محض اس لیے ہرگز اسلام قبول کرنے سے نہیں ہچکچائیں گے کہ اسلام ان کے قاصد کا بھی دین ہے یا ان کے میلے کپڑے دھونے والی غریب دھوبن کا بھی۔

•••-------•••-------•••

علامہ اقبالؒ نے اپنے عزیز کو اسی سلسلے کا دوسرا واقعہ سناتے ہوئے کہا:

''ایک غیر مسلم کسی اونچے عہدے پر فائز تھے، گھر میں عیش وعشرت اور آرام و آسائش کا ہر سامان موجود تھا،

اونچی سوسائٹی میں عزت حاصل تھی۔ایک دن یہی افسر گھر آئے تو ان کی بیوی نے کہا، میں نے تو اسلام کا کلمہ پڑھ لیا، آپ بھی پڑھ لیجئے اور اپنے اللہ سے ہی کی بندگی کا عہد کیجئے۔

آفیسر دیر تک بیوی کا منہ تکتے رہے، پھر بولے آخر کیوں؟ اس انقلاب کی وجہ؟ بیوی نے کہا:

''ہمیں دنیا کی ہر نعمت حاصل ہے، نہ زیور کی کمی ہے، نہ زرق برق لباس کی، پھر جن لوگوں سے ہمارا ربط ہے، وہ بھی خوش حال اور دولت مند ہیں، میں جس تقریب میں بھی گئی بے فکری کے قہقہے سنے، زرق برق لباس دیکھے، سونے کے زیور دیکھے، عیش کے نغمے سنے، لیکن یہ عجیب وغریب بات ہے کہ پھٹے کپڑوں اور ٹوٹی چپلوں میں آنے والی غریب دھوبن کی زندگی میں جو اطمینان، جو سکون اور خوشی میں نے دیکھی وہ مجھے کہیں دیکھنے کو نہیں ملی۔ میں اس سے اس کی پریشان حالی کی بات کرتی ہوں اور وہ نہایت اطمینان کے ساتھ مسکرا کر جواب دیتی ہے ''اللہ مالک ہے اس کا بڑا شکر ہے، وہ بڑا مہربان ہے، اس کے شکر کا حق ادا نہیں ہوتا، بی بی کوئی فکر کی بات نہیں، سب کا اللہ مالک ہے۔'' اور میں سوچنے لگتی ہوں کہ جو خوشی اور اطمینان اس غریب اور خستہ حال دھوبن کو حاصل ہے دنیا کی ہر چیز ہوتے ہوئے بھی مجھے وہ حاصل نہیں ہے۔ضرور یہ اس کے دین کی برکت ہے اور اس کا دین واقعی اللہ کا سچا دین ہے— اسی لیے میں نے اپنے اللہ کا کلمہ پڑھا اور اس پر ایمان لائی۔ آپ بھی اپنے اللہ کا کلمہ پڑھیں اور اس پر ایمان لائیں۔''

•••------•••------•••

آپ نے دیکھا، پھٹے پرانے کپڑے پہننے والی ایک غریب دھوبن بھی کوٹھیوں میں رہنے والیوں کو اسلام کی دولت سے مالا مال کر سکتی ہے۔ اسلام اللہ کا دین ہے، اس میں بڑی کشش ہے، بے پناہ تاثیر ہے اور جذب کرنے کی غیر معمولی قوت ہے— سوچیے کہ آپ کس طرح اسلام کی نمائندگی کا حق ادا کر رہے ہیں اور آپ کی زندگی سے اسلام کی کیا ترجمانی ہو رہی ہے؟



# اسلام، سُنتِ رسول ﷺ کی پیروی

آپ کی سیرت نبی ﷺ کی سیرت سے جس قدر مشابہ اور قریب ہے اسی قدر آپ اپنے ایمان و اسلام میں سچے اور مخلص ہیں۔ اسلام اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ آپ کی پوری زندگی زیادہ سے زیادہ سیرتِ رسول ﷺ کے مطابق ہو اور آپ ہر معاملے میں سنت رسول کی کامل اتباع کریں۔ نبی ﷺ پر نبوت ختم ہوگئی اور اب رہتی زندگی تک کے لیے اللہ کے بندوں کی فلاح و کامرانی صرف آپ ﷺ کی اتباع اور پیروی میں ہے۔ رسول ﷺ سے تعلق توڑ کر اور آپ ﷺ کی سنت سے منہ موڑ کر اگر کوئی اللہ کی رضا حاصل کرنے کو ممکن سمجھتا ہے تو وہ زبردست قسم کی جہالت اور فریب میں مبتلا ہے۔ اللہ کی نظر میں آپ کا کوئی بھی عمل قبول نہیں ہے، اگر وہ سنتِ رسول ﷺ کے مطابق نہیں۔



آپ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن آپ کا یہ ایمان اور دعوائے محبت ہرگز معتبر نہیں ہے اگر آپ نبی ﷺ کی اتباع میں سرگرم نہیں ہیں۔ آپ کا دعوائے محبت اسی وقت قابلِ اعتبار ہو گا جب آپ نبی ﷺ کی اتباع کریں، آپ کی محبت کے جواب میں اللہ آپ سے لازماً محبت کرے گا۔ وہ آپ کے گناہوں کی مغفرت بھی فرما دے گا۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کر کے اپنی محبت کا ثبوت دیں۔ اللہ کا ارشاد ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (آل عمران ۳:۳۱)

"اے رسول! لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔ وہ بہت ہی معاف کرنے والا اور بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے۔"

اللہ کی نظر میں اس تعلق باللہ کی کوئی قیمت نہیں جو آپ نے سنت رسول ﷺ سے بے نیاز ہو کر اپنے من مانے طریقے پر اللہ سے قائم کر رکھا ہے۔ رسول ﷺ سے بے نیازی رسول ﷺ ہی کی توہین نہیں، شہنشاہِ کائنات کی توہین ہے۔ رسول ﷺ اللہ کے نمائندے اور اللہ کے ترجمان ہیں۔ وہ بھیجے ہی اس لیے جاتے ہیں کہ اللہ کے اذن

سے ان کی اطاعت کی جائے اور برضا و رغبت کی جائے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ (النساء ۴:۶۴)

''ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔''

رسول ﷺ کی اطاعت کے بغیر رسول ﷺ پر ایمان بالکل بے معنی ہے۔ جو لوگ رسول ﷺ کی اطاعت سے آزاد ہو کر رسول ﷺ پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں وہ خود بھی فریب میں مبتلا ہیں اور دوسروں کو بھی فریب دینا چاہتے ہیں۔ اللہ کے احکام بجا لانے اور اس کی اطاعت کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ رسول ﷺ کی اطاعت کی جائے — رسول ﷺ کی اطاعت ہی دراصل اللہ کی اطاعت ہے اور رسول ﷺ کی نافرمانی دراصل اللہ کی نافرمانی ہے۔ رسول ﷺ کی عظمت کے منکر در حقیقت اللہ کی عظمت کے منکر ہیں اور رسول ﷺ کے حکم اور سنت سے سرتابی کرنے والے دراصل اللہ سے باغی ہیں۔ اس لیے کہ رسول ﷺ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے، صرف اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (النجم ۵۳: ۳-۴)

''وہ اپنی خواہش نفس سے کچھ نہیں بولتے یہ تو (آسمانی) وحی ہے جو ان پر نازل کی جاتی ہے۔''

رسول ﷺ کی تعلیمات کی پیروی اور رسول ﷺ کی اطاعت ہی ایک ذریعہ ہے اللہ کی اطاعت کا۔ اس کے سوا اللہ کی مرضی پر چلنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ (النساء ۴:۸۰)

''جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی اس نے یقیناً اللہ ہی کی اطاعت کی۔''

اور جس نے رسول ﷺ کو اپنے تمام معاملات میں حکم تسلیم نہ کیا وہ ایمان سے محروم ہے اور اللہ نے اپنی باعظمت ذات کی قسم کھا کر کہا ہے کہ ایسے لوگ ہرگز مؤمن نہیں ہیں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝

(النسا ۴:۶۵)

''اے رسول! آپ کے ربّ کی قسم یہ ہرگز مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے باہمی اختلافات میں یہ آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر آپ جو کچھ فیصلہ کریں اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ آپ کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر دیں۔''

ظاہر ہے اللہ کا یہ فرمان صرف رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ قیامت تک کے لیے ہے۔ رہتی دنیا تک آدمی کے مؤمن ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ اسی پر ہے کہ رسول ﷺ کی تعلیمات اور آپ ﷺ کی

سنت کو آدمی زندگی کے ہر معاملے میں سند مانتا ہے یا نہیں۔ اللہ کے نزدیک اپنے دعوائے ایمان میں صرف وہی لوگ سچے اور مخلص ہیں جو دل و جان سے رسول ﷺ کے فیصلے کو تسلیم کریں اور دل کی پوری آمادگی سے اس کی اتباع کریں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے، اگر اب موسیٰ بھی نمودار ہو جائیں اور تم ان کی اتباع اور پیروی کرنے لگو اور میری پیروی چھوڑ دو تو تم یقیناً سیدھی راہ سے بھٹک جاؤ گے۔ اگر موسیٰ زندہ ہوتے اور میرا زمانۂ نبوت پاتے تو میری ہی پیروی کرتے۔''

ایک اور روایت میں ہے کہ: ''میری اتباع کے سوا ان کے لیے اور کوئی چارہ کار ہی نہ ہوتا۔''

(مسند احمد، دارمی، مشکوۃ باب الاعتصام)

یہ حدیث دوٹوک انداز میں بتاتی ہے کہ اب رہتی دنیا تک اتباع اور پیروی کے لائق صرف خاتم النبیین ﷺ کی سنت ہے، آج اگر موسیٰ جیسے صاحبِ شریعت پیغمبر بھی نمودار ہوں تو کسی کے لیے یہ گنجائش نہیں کہ وہ محمد ﷺ کو چھوڑ کر ان کی پیروی کرے اور خود ان کے لیے بھی اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا کہ وہ حضرت محمد ﷺ ہی کی اتباع کریں۔

یہ انتہائی خطرناک قسم کی گمراہی ہے کہ آدمی شریعت کی پابندیوں سے آزاد ہو کر یا رسول ﷺ پر ایمان لائے بغیر بھی اسلام پر عمل کر سکتا ہے اور مسلم و مؤمن ہو سکتا ہے۔ مؤمن اور مسلم ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ آدمی رسول ﷺ پر ایمان لائے اور آپ ﷺ کی اطاعت کرے۔ اسلام کی اصطلاح میں مسلم وہی شخص ہے جو اللہ کی اطاعت' سنت رسول ﷺ کے مطابق کرے۔

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے پہلے کے رسولوں پر ایمان لانے والے اور ان کی شریعت کے مطابق اللہ کی اطاعت کرنے والے سارے لوگ مسلم تھے۔ لیکن حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے بعد اب اللہ کی اطاعت کرنے اور مسلم ہونے کی صرف ایک ہی شکل ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع کی جائے اور آپ ﷺ کی سنت کے مطابق زندگی گزاری جائے۔ اس شخص کا دعوائے اسلام بالکل باطل ہے جو آپ ﷺ پر ایمان لانے اور آپ ﷺ کی اطاعت کرنے کا قائل نہیں ہے اور اسی طرح اس شخص کا ایمان و اسلام بھی معتبر نہیں ہے جو رسول ﷺ کو صرف رسول سمجھ لینا ہی کافی سمجھتا ہے اور آپ ﷺ کی اطاعت و اتباع کی ضرورت نہیں سمجھتا —— نبی ﷺ کا ارشاد ہے۔

''تم میں سے کوئی مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہش اس شریعت کے تابع نہ ہو جائے جو میں

لے کر آیا ہوں۔''

اسلام کی شاہراہ پر چلنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے دل میں نبی ﷺ کے لیے بے مثال محبت وعقیدت ہو، ایسی محبت جو دنیا کی ہر محبت پر غالب ہو اور عمل کی زندگی میں اس محبت کی علامت یہ ہے کہ آپ کو سنت رسول ﷺ سے محبت ہو اور آپ کے دل میں رسول ﷺ کی عزت وعظمت اور وفاداری و جاں نثاری کا زبردست جذبہ ہو۔ رسول ﷺ کی سیرت کے مطابق اپنی سیرت کو ڈھالنا اور دل و جان سے آپ ﷺ کے نقش قدم پر چلنا ہی دراصل ایمان واسلام ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست



# اللہ تعالیٰ سے محبت کی کسوٹی

اللہ کی توفیق اور عنایت سے آپ کو ایمان کی بے بہا دولت حاصل ہے۔ آپ انتہائی خوش نصیب ہیں کہ ایمان کی روشنی میں زندگی گزار رہے ہیں اور آپ کی انتہائی آرزو یہ ہے کہ ایمان ہی پر آپ کا خاتمہ ہو، اللہ آپ کو استقامت بخشے اور آپ کی پاکیزہ آرزو پوری کرے۔ آمین

قرآن پاک کی نظر میں ایمان والے وہ لوگ ہیں جو اللہ سے شدید محبت رکھتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ؕ (البقرہ۲:۱۶۵)

''اور ایمان والے اللہ سے شدید محبت رکھتے ہیں۔''

ایمان ایک معنوی چیز ہے جسے دیکھا نہیں جا سکتا۔ پھر آپ کو کیسے اطمینان ہو کہ آپ واقعی اللہ سے شدید محبت رکھتے ہیں یا یہ محض ایک خیال اور مفروضہ ہے۔

•••-----•••-----•••

اللہ نے اس معاملے میں بھی آپ کی دستگیری فرمائی ہے اور آپ کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا ہے۔ اللہ نے آپ کو ایک ایسی کسوٹی بتا دی ہے جس کی مدد سے آپ نہایت آسانی کے ساتھ معلوم کر سکتے ہیں کہ آپ اللہ کی محبت میں کس حد تک صادق ہیں۔ اللہ سے محبت کی کسوٹی اتباعِ رسول ﷺ ہے۔ اللہ سے محبت کا دعویٰ یقیناً سچا ہے اگر آپ کی زندگی رسول ﷺ کی اتباع میں گزر رہی ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ (آل عمران۳:۳۱)

''اے رسول ﷺ! لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو۔''

اس ارشاد کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ سے محبت کے دعوے میں وہی لوگ سچے ہیں جو رسول ﷺ کی پیروی میں زندگی گزار رہے ہیں اور جن کی زندگیاں اتباعِ رسول ﷺ سے محروم ہیں وہ اپنے دعوائے محبت کو اپنے عمل سے جھٹلا رہے ہیں۔

محبت کے جواب میں محبت ہی ملتی ہے، آپ اللہ سے محبت کریں گے تو وہ بھی آپ سے محبت کرے گا اور آپ

کے گناہوں پر مغفرت کا پردہ ڈال دے گا۔ شرط یہ ہے کہ آپ کی محبت سچی ہو اور آپ زندگی کے ہر میدان میں رسول ﷺ کی کامل پیروی کر کے اپنی محبت کا ثبوت فراہم کر دیں۔

مؤمن کی اس سے بڑی سعادت اور کیا ہوگی کہ اللہ اس سے محبت کرنے لگے اور اس کو گناہ کی آلائشوں سے پاک کر کے اس کی مغفرت فرما دے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ط (آل عمران ۳:۳۱)

''تو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہوں کی مغفرت فرما دے گا۔''

•••------•••------•••

بے شک سنت رسول ﷺ کی پیروی بندے کو اللہ کا محبوب بنا دیتی ہے اور اللہ ایسے بندے کو گناہوں سے پاک صاف کر دیتا ہے مگر رسول ﷺ کی پیروی وہی شخص کر سکتا ہے جو رسول اللہ ﷺ سے والہانہ محبت رکھتا ہو۔ رسول ﷺ کی سچی محبت کے بغیر آپ ﷺ کی سنت پر چلنا محال ہے۔ اسی لیے اللہ کی کتاب نے بھی محبتِ رسول ﷺ کو ایمان کی بنیاد قرار دیا ہے۔

قرآن کا ارشاد ہے:

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (الاحزاب ۳۳:۶)

''ایمان والوں کے لیے اللہ کے رسول ﷺ ان کی اپنی جانوں سے بھی مقدم ہیں۔''

اللہ کے رسول ﷺ نے بھی اس حقیقت کی تصریح کی ہے، ایک مجلس میں نبی ﷺ یہی حقیقت ذہن نشین کرا رہے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ

(البخاری' کتاب الایمان' باب ۸' حب الرسول من الایمان' ص ۳)

''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے لیے اس کے باپ سے، اس کی اولاد سے اور سارے ہی لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔''

اس مجلس میں خلیفہ ثانی فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے صحابی بھی موجود تھے۔ کہنے لگے یا رسول اللہ! آپ ﷺ مجھے والدین سے بھی زیادہ عزیز ہیں، اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہیں، مگر اپنی جان سے زیادہ عزیز نہیں ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''عمر! ابھی تمہارے ایمان کی تکمیل نہیں ہوئی'' اور پھر اس محبت میں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کیا مقام حاصل کیا، اس کی ایک جھلک آپ اس ایمان افروز واقعہ میں دیکھئے۔ اللہ کے رسول ﷺ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ فاروق اعظم محبتِ رسول میں مدہوش، ننگی تلوار لیے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں ''جو شخص یہ کہے گا کہ رسول ﷺ کا انتقال ہو

گیا ہے، میں اس کا سر قلم کر دوں گا۔ حضور ﷺ اپنے ربّ سے ملنے گئے ہیں اور پھر واپس تشریف لائیں گے۔''

•••------•••------•••

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اکرم ﷺ سے کس قدر والہانہ محبت رکھتے تھے، اس کی ہلکی سی جھلک آپ اس واقعہ میں دیکھیے جو رسول اللہ ﷺ کے ایک جواں سال صحابی حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے۔

''صحرا کے خیمے میں رہنے والے ایک اعرابی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا ''یارسول اللہ! قیامت کب آئے گی؟'' اتنی دیر میں نماز کے لیے اقامت ہوگئی اور آپ ﷺ نماز پڑھانے کھڑے ہو گئے۔ نماز کے بعد اعرابی کو بلایا اور پوچھا ''کہو تم نے قیامت کے لیے کیا تیاری کر رکھی ہے؟'' اعرابی نے سادگی سے کہا ''یا رسول اللہ! میں نے نمازوں میں کوئی غیر معمولی سرگرمی تو نہیں دکھائی ہے۔ البتہ مجھے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت ہے'' اس کے جواب میں حضور ﷺ نے فرمایا،

اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (البخاری' کتاب الادب' باب ۹۶ صفحہ ۵۲۰)

''آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اسے محبت ہے۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے ''یہ خوش خبری سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس قدر خوش ہوئے کہ اسلام لانے کے بعد میں نے ان کو اس قدر خوش کبھی نہیں دیکھا تھا۔''

رسول ﷺ کی والہانہ محبت ہی آدمی کو اتباع شریعت کے لیے آمادہ کرتی ہے، وہ شخص اتباعِ رسول ﷺ میں دو قدم بھی نہیں چل سکتا جس کا دل محبتِ رسول ﷺ سے خالی ہے — اور یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اسلام میں محبتِ رسول ﷺ کے کسی ایسے تصور کی قطعاً گنجائش نہیں ہے جو سنت سے بے نیازی یا بے زاری کے ساتھ ہو، سنت رسول ﷺ سے انحراف کے ساتھ عشقِ رسول کا دعویٰ گمراہ کن فریب ہے۔ اتباع سنت پر آمادہ کرنے والی چیز رسول ﷺ کی محبت ہے اور سنت سے محبت ہی دراصل رسول ﷺ سے محبت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خود فرمایا، میری سنت کو چاہنے والے ہی دراصل میرے چاہنے والے ہیں۔

مَنْ اَحَبَّ سُنَّتِیْ فَقَدْ اَحَبَّنِیْ

''جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی۔''

غفلت، لاپروائی، سہل انگاری اور جذباتِ نفس سے مغلوب ہو کر کبھی آدمی کوتاہی کرتا ہے اور کر سکتا ہے — اور یہ کوتاہی محبتِ رسول ﷺ سے محرومی کی دلیل نہیں ہے، لیکن یہ تصور و اطمینان کہ سنت سے مسلسل انحراف اور بیزاری کرتے ہوئے بھی آدمی عاشق رسول ﷺ ہے، بدترین خود فریبی ہے۔

•••------•••------•••

رسول اللہ ﷺ سے آپ کی محبت کا کیا حال ہے، اس کا جائزہ ضرور لیجیے لیکن خواہ مخواہ اپنے سے بدگمانی اور مایوسی بھی صحیح نہیں ہے اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ آپ اپنی سستی اور کوتاہ کاری پر دھیان ہی نہ دیں اور اطمینان کی سانس لیتے رہیں۔

آپ نے کبھی غور کیا کہ شب و روز میں کتنی بار آپ کو رسول ﷺ کی یاد تڑپاتی ہے اور کتنی بار بے اختیار آپ کی زبان پر درود و سلام کے کلمات آجاتے ہیں، نماز میں بے شک آپ درود پڑھتے ہیں اور دن رات کی نمازوں میں کئی بار پڑھتے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ کبھی حضور اکرم ﷺ کے بے پایاں احسانات کو یاد کر کے جذباتِ عقیدت و محبت سے بے تاب ہو کر بھی درود و سلام کے نذرانے آپ نے پیش کیے؟ کبھی یہ سوچ کر بھی آپ کی آنکھیں بھیگ گئی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کی خاطر جو لرزہ خیز دکھ اٹھائے ہیں آپ اس کا کوئی بدل نہیں دے سکتے؟ کبھی آپ نے جاں نثاری اور فدا کاری کے جذبات سے سرشار ہو کر اللہ سے یہ التجائیں کی ہیں کہ پروردگار! تیرے حبیب ﷺ نے ہماری خاطر جس اضطراب اور غم میں اپنی راتیں گزاری ہیں اور جن ہولناک مصائب میں اپنے دن بتائے ہیں اس کا کوئی بدلہ ہم نہیں دے سکتے۔ پروردگار! تو ہی ان پر اپنی خاص رحمتیں نازل فرما اور انہیں اپنے تقرب کے وہ بلند درجات عطا فرما جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

•••-----•••------•••

آپ کے دل میں کبھی یہ خواہش اُبھری ہے کہ آپ کو رسول اللہ ﷺ کا دیدار ہو اور آپ ان کی زیارت سے اپنی آنکھیں روشن کریں۔ کیا آپ کبھی ان کو دیکھنے کے لیے تڑپے ہیں۔ کیا کبھی آپ اس تصور کے ساتھ سوئے ہیں کہ خواب میں آپ کو رسول اکرم ﷺ کی زیارت نصیب ہو، زیارت رسول اللہ ﷺ کے لیے آپ نے کبھی کسی سے کوئی تدبیر پوچھی ہے، کیا کبھی اس کی خاطر آپ نے درود و سلام کی کثرت کا اہتمام کیا ہے؟

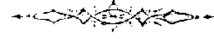
ایک بار حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت فضل رحمٰن گنج مراد آبادی سے سوال کیا کہ ''کوئی خاص درود شریف بتائیے جس سے رسول اللہ ﷺ کی زیارت نصیب ہو۔ فرمایا ''کوئی خاص درود تو نہیں ہے بس خلوص پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔'' پھر کچھ تامل کے بعد فرمایا ''حضرت سید حسین رضی اللہ عنہ کو اس درود کا عمل کارگر ہوا۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى عِتْرَتِهٖ بِعَدَدِ كُلِّ مَعْلُوْمٍ لَّكَ

''اے اللہ! رحمت نازل فرما محمد ﷺ پر اور ان کی اولاد پر ان تمام چیزوں کی تعداد کے بقدر جو تیرے علم میں ہیں۔''

کبھی آپ کو اس غم نے بھی تڑپایا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کا لایا ہوا دین آج مغلوب و مظلوم ہے، آپ ﷺ کی شریعت زندگی کے ہر میدان سے بے دخل ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے خون سے جس باغ کو سینچا تھا، آج

وہ اجڑ رہا ہے۔ جس دین کو قائم کرنے کے لیے آپ ﷺ نے مکے کی گلیوں، طائف کے بازاروں اور بدر و احد کے میدانوں میں طرح طرح کی اذیتیں برداشت کی تھیں، آج وہ دین مٹایا جا رہا ہے — کیا یہ سوچ کر واقعی آپ کی بے چینی بڑھ جاتی ہے اور آپ اس عزم کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں کہ اپنا سب کچھ آپ اس راہ میں قربان کر کے ہی اللہ کے حضور پہنچیں گے۔ رسول کریم ﷺ سے گہرے تعلق کے بغیر آپ ﷺ کی اتباع ناممکن ہے اور نہ ایسی اتباع مطلوب ہے — اللہ کی محبت کے لیے جس اتباعِ رسول ﷺ کو کسوٹی بتایا گیا ہے وہ وہی اتباع ہے جو دلی عقیدت و محبت کے ساتھ کی جائے۔



# آپ کا سب سے بڑا سرمایہ

ہندوستان کے مایہ ناز محدث حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ کے ایک لائق شاگرد تھے مولانا علی احمد رحمہ اللہ ——مولانا علی احمد رحمہ اللہ بھی حدیث پر اچھی نظر رکھتے تھے، آپ نہایت ہی معمولی اور کمزور جثّے کے مالک تھے۔ چھوٹا سا قد، سیاہی مائل رنگ، معمولی ناک نقشہ، کمزور و ناتواں، بظاہر ان کی شخصیت میں کوئی کشش نہ تھی۔

ایک دن دورانِ درس بڑے تاثر کے ساتھ مزے لے لے کر اپنا ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ واقعہ اس قدر سبق آموز تھا کہ آج تک اس کا اثر دل پر باقی ہے۔ مولانا نے بیان فرمایا:

''میں اعظم گڑھ میں مقیم تھا، عصر کی نماز پابندی سے شہر کی جامع مسجد میں پڑھتا تھا۔ نماز پڑھ کر جب مسجد سے نکلتا تو مسجد کی سیڑھیوں پر ایک نوجوان کھڑا ملتا، میں بے اختیار چند لمحے اس کو دیکھنے کے لیے رک جاتا اور انتہائی رشک کے ساتھ اسے دیکھتا رہتا۔ نوجوان واقعی قدرت کا عجیب وغریب شاہ کار تھا، بلند و بالا قد، متناسب اعضاء، سرخ وسفید کھلتا ہوا رنگ، دلکش ناک نقشہ، بہترین صحت۔

میں اسے دیکھتا تو اپنا وجود نہایت ہی حقیر معلوم ہونے لگتا اور احساسِ کمتری میں مبتلا، افسردہ اور مضمحل بوجھل قدموں کے ساتھ گھر کی راہ لیتا۔ راستے میں عجیب عجیب باتیں سوچتا۔ مجھے ایسا لگتا کہ جیسے میرا دل حقیر اور معمولی جثّے پر اللہ سے شکایت کر رہا ہو۔ میں کوشش کر کے ان خیالات کو جھٹک دیتا مگر دوسرے روز یہ احساسات پھر کچھ اور زیادہ قوت کے ساتھ تازہ ہو جاتے۔

یہ سلسلہ ایک عرصے تک چلتا رہا—— میں مسجد سے باہر آتا، نوجوان کھڑا ملتا اور میں اشتیاق سے اس پر نظریں جما دیتا——نوجوان کی شخصیت بڑی ہی دلآویز تھی——مگر اس دوران کبھی اس نوجوان نے مجھے نظر بھر کر نہ دیکھا، نہ میری طرف متوجہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی خاص فکر میں ہے۔ کبھی وہ فضا میں تاکتا جیسے کسی کو تلاش کر رہا ہو، کبھی زمین پر نظریں گاڑے کھڑا ہوتا جیسے اسے گہرے غم نے گھیر رکھا ہو، کبھی کسی سمت ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ وہ آنے جانے والوں سے بالکل ہی بے نیاز اپنی فکر میں مگن ہے۔

کافی دنوں کے بعد ایک روز میں حسبِ معمول مسجد سے باہر آ رہا تھا کہ یکا یک وہ میری طرف لپکا۔ میں ٹھٹک

کر کھڑا ہو گیا۔ میرے دل کی دھڑکن کس قدر تیز ہو گئی —— اور جب وہ میرے قریب آیا، تو مجھے اپنا بھدا اور کمزور وجود کچھ اور زیادہ حقیر معلوم ہونے لگا۔ نوجوان نے کسی تمہید کے بغیر بڑی عاجزی اور لجاجت سے کہا ''مولانا صاحب! آپ کی بڑی مہربانی ہو گی، مجھے کوئی دعا بتا دیجئے یا کوئی تعویذ دے دیجئے۔ شاید اللہ مجھ پر کرم فرمائے۔''

میں حیرت سے اس کے یہ خلافِ توقع جملے سنتا رہا اور پھر میرے دل نے نہایت چابک دستی کے ساتھ فیصلہ کیا کہ نوجوان ضرور دل کے ہاتھوں مجبور ہے۔ مجھے دلچسپی ہوئی اور میں نے اس کے حسین چہرے کی طرف سر اٹھاتے ہوئے اس سے پوچھا —— ''بھائی! آپ کس کام کے لیے دعا اور تعویذ مانگ رہے ہیں؟''

''مولانا صاحب! میرے جسم کے ایک ایک جوڑ میں درد ہے، نہ میں بیٹھ سکتا ہوں نہ کوئی کام کر سکتا ہوں —— برسوں سے علاج کرا رہا ہوں، سینکڑوں ڈاکٹروں اور حکیموں کو دکھا چکا ہوں مگر کوئی افاقہ نہیں —— روز بروز حالت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ گھر میں طبیعت گھبراتی ہے تو یہاں آ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ مولانا صاحب کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ زندگی سے بیزار ہوں، مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ میری زندگی میں کوئی سکھ اور کوئی لذت نہیں ہے۔'' اور نوجوان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک پڑے، آواز بھرا گئی اور کچھ دیر کے لیے وہ خاموش ہو گیا۔

میں حیران و ششدر یہ سب سن رہا تھا، کچھ دیر تو میں بت بنا خاموش کھڑا رہا اور پھر اس کو کوئی جواب دیئے بغیر اس طرح وہاں سے بھاگا جیسے میں نے کوئی بڑا جرم کیا ہو، میں نہایت تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا اور بے اختیار میری زبان پر شکر کے کلمات جاری تھے، آج مجھے اپنا مختصر سا وجود بڑا قیمتی محسوس ہو رہا تھا، آج میری آنکھیں کھل گئی تھیں اور آج اللہ کے شکر میں وہ لذت تھی جو اس سے پہلے مجھے کبھی میسر نہیں آئی تھی۔

•••-------•••-------•••

اس عجیب و غریب واقعہ میں نصیحت کا بڑا سامان ہے۔ بہت سی الجھنوں اور پریشانیوں کا تسکین بخش جواب ہے۔ بے شک اللہ نے آپ کو سب کچھ نہیں دے رکھا ہے لیکن جو کچھ دیا ہے اس کی قدر پہچاننے کی کوشش کیجئے اور شکر بجالانے کی عادت ڈالیے۔ ہو سکتا ہے کہ اپنی کسی کمزوری، نقص اور پریشانی پر آپ کے اندر بھی اللہ سے شکایت و فریاد کے جذبات اُبھرتے ہوں اور دوسروں کو اپنے سے برتر دیکھ کر آپ بھی کچھ کڑھن محسوس کرتے ہوں، ایسے تمام مواقع پر قوی اندیشہ ہوتا ہے کہ آدمی صبر و شکر کا دامن چھوڑ بیٹھے اور ذہن و فکر کی کسی ایسی کجی میں مبتلا ہو جائے جو مؤمن کی شان کے خلاف ہے۔

•••-------•••-------•••

دنیا میں اللہ نے اپنے وسیع علم اور زبردست حکمت کے تحت اپنی نعمتوں کی تقسیم کی ہے، کسی کو جسمانی توانائی سے نوازا مگر وہ فکر و فہم میں کمزور ہے۔ کسی کو مال و دولت عطا فرمایا لیکن وہ علم و دانش سے محروم ہے۔ کسی کو کسی جسمانی نقص میں مبتلا کیا ہے لیکن اسے اعلیٰ ذہنی و فکری صلاحیت حاصل ہے۔ کسی کو زندگی کی ہر سہولت اور عیش و آرام کا

سامان دیا ہے لیکن وہ اہل و عیال کی طرف سے دکھی ہے، کوئی انتہائی تنگ دست اور فقیر ہے لیکن اسے وہ ذہنی سکون اور قلبی اطمینان حاصل ہے جو بڑے بڑے دولت مندوں کو نصیب نہیں ہے، کوئی علم و دانش اور فہم و بصیرت کے نہایت اعلیٰ مرتبے پر فائز ہے لیکن وہ نان شبینہ کا محتاج ہے، کسی کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں لیکن اس پر مال و دولت کی بارش ہو رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں بڑی حکمتیں ہیں اور اللہ ہی کو ان حکمتوں کا صحیح علم ہے۔

•••-------•••-------•••

خدانخواستہ آپ آنکھوں سے محروم ہیں، بے شک آپ بہت بڑی نعمت سے محروم ہیں — مگر یہ اللہ کی آپ پر خصوصی مہربانی بھی تو ہے کہ اس نے بطور خود ان بہت سے گناہوں سے محفوظ کر دیا ہے جن کا ارتکاب صرف آنکھوں والے ہی کرتے ہیں، پھر آنکھیں نہ ہونے کے باوجود آپ کو وہ عزت و احترام حاصل ہے جو بہت سے آنکھوں والوں کو حاصل نہیں ہے اور اگر اللہ نے اپنی توفیق سے آپ کے سینے میں اپنی کتاب بھی محفوظ کر دی ہے اور فہم و بصیرت سے بھی نوازا ہے تو سوچیے کتنی بڑی دولت آپ کو حاصل ہے۔ آپ کو بینائی حاصل نہیں ہے لیکن بہت سی ایسی نعمتیں حاصل ہیں جن سے بہت سے بینا لوگ محروم ہیں۔

خدانخواستہ آپ پیروں سے معذور ہیں، پیدائشی مفلوج یا کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہیں تو واقعی یہ دکھ کی بات ہے۔ لوگوں کو آزادی سے چلتے پھرتے اور دوڑ بھاگ کرتے دیکھ کر آپ بڑی کڑھن محسوس کرتے ہوں گے لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اللہ نے آپ کو بڑی فراوانی کے ساتھ مال و دولت سے نوازا ہے اور نہ جانے کتنے تندرست و توانا آپ کے دست نگر ہیں، کتنے ہیں جن کی روزی کا ذریعہ اللہ نے آپ کو بنا دیا ہے اور کتنے ہیں جو اپنی گزر بسر کے لیے آپ کی مدد کے محتاج ہیں — بے شک آپ مفلوج ہیں لیکن آپ کو اللہ نے علم و فہم کی اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا ہے اور نہ صرف یہ کہ آپ اپنی روزی خود کماتے ہیں بلکہ بہت سے تندرست و توانا لوگوں کی آپ کفالت کر رہے ہیں — اور بہت سے قوی ہیکل آپ کے سامنے اس طرح عاجزی اور عقیدت سے بیٹھے ہوتے ہیں کہ آپ کے کمزور جثے میں انہیں کسی غیر معمولی قوت کا احساس ہوتا ہے۔

•••-------•••-------•••

آپ انتہائی تنگ دست اور نادار ہیں لیکن اللہ نے آپ کو دین کا علم عطا فرمایا ہے۔ فہم و بصیرت کی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ سینکڑوں ہیں جو آپ سے دلی محبت رکھتے ہیں۔ ہزاروں سینوں میں آپ کے لیے عقیدت و احترام کے جذبات ہیں، کتنے ہیں جو آپ کی سربراہی کو اپنے لیے سعادت سمجھتے ہیں، اہل و عیال کی ضرورتیں آپ کشادگی سے پوری نہیں کر پاتے اور پریشان رہتے ہیں لیکن اللہ کا کرم ہے کہ آپ کی رفیقہ حیات انتہائی وفادار، اطاعت شعار، پاک دامن اور قناعت پسند ہے۔ آپ کی اولاد آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور آپ کا گھر جنت کا نمونہ

ہے۔ ایسے افلاس پر ہزاروں خوش حالیاں قربان کی جا سکتی ہیں اور آپ کی خوش نصیبی پر رشک کرنا بھی سعادت ہے۔

•••-------•••-------•••

آپ اعلیٰ تعلیم سے محروم ہیں، اونچے عہدے سے محروم ہیں۔ سماج میں آپ کو کوئی امتیازی مقام بھی حاصل نہیں ہے۔ نہ آپ کے پیغام کی کوئی قیمت ہے نہ آپ کی سفارش کی کوئی حیثیت۔ لیکن اللہ نے آپ کو اپنی عبادت اور بندگی کی توفیق دی ہے۔ لوگوں کے حقوق ادا کرنے کا احساس دیا ہے، حرام سے بچنے کا جذبہ بخشا ہے، اللہ کی نافرمانی کے تصور سے آپ لرز اٹھتے ہیں تو یقین مانیے اللہ کی نظر میں آپ ان کروڑوں انسانوں سے بہتر ہیں جن کی سفارش کی زبردست اہمیت ہے، جن کا پیغام لوگ دل و جان سے قبول کرتے ہیں اور جن کو سماج میں اونچا مقام حاصل ہے مگر نہ وہ اللہ کا حق ادا کرتے ہیں نہ بندوں کا ـــــ آپ ہرگز یہ نہ سوچیں کہ آپ معاشرے کے گرے پڑے انسان ہیں، اللہ کا آپ پر بڑا کرم ہے اور آپ کو دونوں جہان کی دولت حاصل ہے۔

•••-------•••-------•••

یہ دنیا عبرت اور آزمائش کی جگہ ہے۔ یہاں اللہ نے ایک کو ایک پر فضیلت دی ہے اور ایک کو ایک کا محتاج بنایا ہے۔ بے شک آپ بہت سی نعمتوں سے محروم ہیں، بہت سی چیزوں میں آپ دوسروں سے فروتر ہیں --- لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جن کو وہ کچھ بھی حاصل نہیں ہے جو آپ کو حاصل ہے، بہت سے ایسے بندے بھی ہیں جو بہت سے پہلوؤں سے آپ کے مقابلے میں کہیں زیادہ فروتر ہیں۔ آپ کے لیے سوچنے کا صحیح انداز وہی ہے جو آپ کے رسول ﷺ نے آپ کو بتایا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

> ''تم میں سے جو لوگ دنیوی اعتبار سے کچھ چیزوں میں بالاتر ہیں انہیں نہ دیکھو ان کو دیکھو جو بہت سے پہلوؤں سے تم سے فروتر ہیں ـــــ اسی طرح تم میں یہ صلاحیت پیدا ہوگی کہ اللہ نے تمہیں جو نعمتیں دے رکھی ہیں تم انہیں حقیر نہ سمجھو گے۔'' (البخاری' کتاب الرقاق باب ۳۰' ینظر من ھو اسفل صفحہ ۵۴۴)

اور صحیح مسلم کی روایت ہے:

> ''جب تم میں سے کسی کی نظر کسی ایسے آدمی کی طرف اٹھے جو مال و دولت اور جسمانی قوت میں اس سے بڑھا ہوا ہے تو وہ اس شخص کو دیکھے جو جسمانی قوت و وجاہت اور مال و دولت میں اس سے فروتر ہے۔'' (مسلم' کتاب الزہد' حدیث ۸' صفحہ ۱۱۹۱)

شکر کے جذبات پروان چڑھانے اور تسلیم و رضا کی عادت ڈالنے کے لیے نبی ﷺ کی بتائی ہوئی یہ تدبیر انتہائی مؤثر اور بے خطا ہے۔ مصائب اور محرومیوں پر صبر اور نعمتوں پر شکر مومن کے دو ایسے امتیازی اوصاف ہیں

جن کی بدولت مؤمن کا ہر معاملہ اس کے لیے خیر ہی خیر ہے — اور یہ سعادت صرف مؤمن ہی کو حاصل ہوتی ہے جو اللہ کی صفات پر پختہ یقین رکھتا ہے جس کا ایمان ہے کہ کوئی چیز اللہ کے علم سے باہر نہیں ہے اور اللہ کا کوئی عمل حکمت سے خالی نہیں ہے۔ یہ یقین و ایمان ہی مؤمن کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ ایمان ہی سے صبر و شکر کی صفات پیدا ہوتی ہیں اور صبر و شکر ہی کے ذریعے مؤمن بلند سے بلند درجات پاتا ہے۔



# آپ کا بدترین دشمن

آپ ذرا لاپروائی برتیں تو دیمک آپ کی قیمتی کتابوں کو برباد کر ڈالتی ہے۔ ذرا احتیاط نہ کریں تو گھن آپ کے غلے کے ذخیروں کو تباہ کر دیتا ہے، ذرا غفلت کریں تو بیماری آپ کی صحت خراب کر دیتی ہے۔ بے شک دیمک گھن اور بیماری آپ کی دشمن ہیں اور آپ ہر ممکن احتیاط کرتے ہیں کہ آپ کی قیمتی کتابیں، آپ کا محنت سے حاصل کیا ہوا غلے کا ذخیرہ اور آپ کی اچھی صحت ان دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رہیں۔ آپ کو ان دشمنوں کی دشمنی کا اندازہ ہے اور ان کے دشمنانہ حملوں کے عبرت ناک نتائج آپ نے سر کی آنکھوں سے دیکھے ہیں — آپ کی دانائی اور دور اندیشی کا یہی تقاضا ہے کہ آپ ان دشمنوں سے ہوشیار رہیں اور کوئی ایسی کوتاہی نہ کریں کہ کل آپ کو پچھتانا پڑے۔

•••-----•••-----•••

مگر آپ کا بدترین دشمن تو وہ گھن ہے جس کا حملہ آپ کے دل پر ہوتا ہے اور وہ آپ کے خرمنِ ایمان کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ حیرت ہے کہ اس گھن سے بچنے کی آپ کو نہ اتنی فکر ہے اور نہ آپ اس کی زد سے اپنی حفاظت میں اس قدر چاق و چوبند ہیں۔ اس کا حملہ نہایت خاموش اور غیر محسوس ہے اور جس گراں قدر چیز کو یہ دشمن اپنا نشانہ بناتا ہے اس کی قدر و عظمت کا آپ کو بھی احساس ہے، بلکہ آپ کا یقین ہے کہ آپ کے پاس اس سے زیادہ قیمتی کوئی دولت نہیں ہے لیکن اس کی حفاظت میں آپ سے غفلت اور کوتاہی اس لیے ہوتی ہے یا ہو رہی ہے کہ یہ دولت آپ کے سر کی آنکھوں سے نظر نہیں آتی اور آپ محسوس نہیں کر پاتے کہ آپ کی سب سے زیادہ قیمتی دولت کو گھن لگ رہا ہے۔

اس گھن کا حملہ ہر دل پر ہوتا ہے، آپ کے دل پر بھی ہوتا ہے، ہوتا رہتا ہے۔ تلخ نوائی معاف! کوئی دل ایسا نہیں ہے جس کی تاک میں یہ ہمہ وقت لگا نہ رہتا ہو، اس دشمن کی زد سے وہی بچ سکتا ہے جو اس سے بچنے کی فکر سے کسی وقت بھی غافل نہ ہو اور جس پر اللہ اپنا خصوصی کرم فرمائے۔

آپ کا یہ بدترین دشمن جو گھن کی طرح آپ کے ایمان کو لگ جاتا ہے اور اندر ہی اندر اسے کھوکھلا کرتا رہتا ہے

''نفاق'' ہے ــــ ناراض نہ ہوں، خاکم بدہن میں ہرگز آپ کو منافق کہنے کی گستاخی نہیں کر رہا ہوں، اللہ آپ کے ایمان کو سلامت رکھے، میں خیر خواہی اور نصیحت کا حق ادا کرتے ہوئے دراصل آپ کو اس بدترین دشمن سے آگاہ کر رہا ہوں جو آپ کی ذراسی غفلت اور اپنے احتساب میں ذراسی بے توجہی سے آپ کے روشن دل میں پرورش پانے لگتا ہے۔ اگر جھرجھری لے کر آپ اس کو کھرچ پھینکنے میں مؤمنانہ چابکدستی سے کام نہ لیں تو یہ پنپنے لگتا ہے۔ روحِ ایمان کو مزے لے لے کر چاٹنے لگتا ہے۔ اس کے شدید اور ایمان لیوا حملے سے اللہ کے وہی بندے محفوظ رہتے ہیں جنہیں یہ اندیشہ ہر وقت بے چین کیے رہتا ہے کہ ہم اس بدترین دشمن کی زد میں ہیں ــــ اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اس اندیشہ سے بے چین رکھے ــــ وہ غافل یقیناً اس کی زد میں ہیں جو سر جھٹک کر اس طرح کی بات سننے سے کترا جاتے ہیں اور اس زعم میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ہمارے مضبوط ایمان کو بھلا نفاق کیوں کر آنکھ دکھا سکتا ہے ــــ

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

''مؤمن اپنے گناہوں کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ گویا وہ ایک پہاڑی کے نیچے بیٹھا ہے اور برابر ڈر رہا ہے کہ کہیں یہ پہاڑی اس پر گر نہ جائے، اس کے برخلاف بدکار اپنے گناہوں کو ایسا محسوس کرتا ہے گویا اس کی ناک پر مکھی بیٹھ گئی، اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ اڑ گئی۔''

•••--------•••--------•••

میں اپنی بات کے لیے دو عظیم ترین صحابیوں کے عبرت آموز واقعہ سے مدد لیتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ان واقعات سے آپ تشفی اور اطمینان کی بڑی سکون انگیز ٹھنڈک محسوس کریں گے اور یہ باور کرنے میں آپ کو ذرا شک نہ رہ جائے گا کہ میں کتنی جچی تلی بات کہہ رہا ہوں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس واقعہ سے میں مدد لے رہا ہوں کہ ایمان و اسلام کا راستہ ہم انہی بزرگوں کی پاک زندگی کی روشنی اور پیروی میں طے کر سکتے ہیں ــــ ان سے بے نیاز ہو کر اس راستہ پر چلنے کا خواب دیکھنا، سرتاسر محرومی ہے اور بدترین قسم کی محرومی۔

•••--------•••--------•••

ایک دن حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ اپنا ایک بڑا ہی سبق آموز واقعہ سنانے لگے۔ فرمایا ''ہم لوگ ایک دن حضور ﷺ کی مجلس میں حاضر تھے۔ آپ ﷺ نے وعظ فرمایا اور ایسا وعظ کہ ہمارے دل پگھل گئے، آنکھیں برسنے لگیں اور ہمیں اندازہ ہوا کہ ہماری حقیقت کیا ہے ــــ پھر میں آپ ﷺ کی مجلس سے اٹھ کر گھر چلا آیا۔ یہاں آ کر گھر کے دھندوں اور بیوی بچوں میں مشغول ہو گیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ میں نے اپنی حالت میں تبدیلی محسوس کی اور وہ حالت نہیں رہی جو حضور ﷺ کی مجلس میں تھی، مجھے اندیشہ ہوا کہ میں تو منافق ہو گیا۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ حضور ﷺ کی مجلس میں تو وہ حالت تھی اور چند گھڑیاں نہیں گزریں کہ میری حالت بدل گئی۔ میں اسی رنج و غم میں

گھر سے باہر نکلا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لا رہے ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہو حنظلہ کیا حال ہے؟ میں نے کہا: ''نافق حنظلة'' حنظلہ تو منافق ہو گیا۔ انہوں نے فکر مند ہو کر کہا ''سبحان اللہ! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے اپنے حال دل کی روداد سناتے ہوئے کہا ہم لوگ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ہوتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے جنت اور دوزخ کا حال سنتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت اور دوزخ ہمارے سامنے ہے لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے اٹھ کر گھر آتے ہیں اور بیوی بچوں کے مسائل اور کھیتی باڑی کے دھندوں میں لگ جاتے ہیں تو سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ سنا تو بولے یہ کیفیت تو مجھے بھی پیش آتی ہے اور ہم دونوں فکر مند ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے ―― میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں تو منافق ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا بات ہوئی؟ میں نے کہا جب ہم آپ کی مجلس میں ہوتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنت اور دوزخ کا تذکرہ فرماتے ہیں تو ہماری یہ حالت ہوتی ہے کہ گویا جنت اور دوزخ ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں لیکن جب یہاں سے اٹھ کر ہم بیوی بچوں میں جاتے ہیں اور گھر اور جائیداد کے کام دھندوں میں مشغول ہوتے ہیں تو سب کچھ بھول جاتے ہیں''۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میری بات سن کر ارشاد فرمایا ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر تمہارا حال ہمیشہ وہی رہنے لگے جو میری مجلس میں رہتا ہے تو فرشتے تمہارے بستروں اور راستوں میں تم سے مصافحہ کرنے لگیں، حنظلہ یہ کیفیت تو کبھی کبھی ہوتی ہے۔'' (ابن ماجۃ کتاب الزہد باب ۲۸ المداومۃ علی العمل صفحہ ۴۲۷۳)

ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہ ہے کہ دل کی کیفیت ہمیشہ یکساں نہیں رہتی، یہ جو کیفیت میری مجلس میں تمہیں حاصل ہوتی ہے اگر یہ ہمہ وقت باقی رہے تو پھر آزمائش ہی کیا ہوگی، حالانکہ یہ دنیا تو آزمائش کی جگہ ہے، دل کی روشنی گاہ بگاہ حاصل ہو تو یہ بہت کافی ہے۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایمان میں وہی شک کر سکتا ہے جسے اپنی عاقبت عزیز نہ ہو، کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ ان کے ایمان پر کبھی منافقت کا سایہ بھی پڑ سکتا ہے لیکن وہ بے قرار ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فریاد کرتے ہیں اور پریشان ہوتے ہیں کہ نفاق میں مبتلا ہو گئے ―― دراصل یہی دلیل ہے اس بات کی کہ ان کا ایمان مثالی ایمان تھا اور وہ معمولی سی کوتاہی کو بھی بہت بڑی بات سمجھ کر لرز جاتے تھے اور انہیں یہ اندیشہ بے قرار کر دیتا تھا کہ ہائے ہم منافق ہو گئے۔

ایمان آدمی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اس حقیقت کا زندہ احساس ہو تو آدمی کی یہی کیفیت ہوتی ہے ―― چند ہزار کی رقم آپ کے پاس موجود ہو اور آپ سفر میں ہوں تو پوری رات آپ آنکھوں میں کاٹ دیتے ہیں، نیند

آپ پر بار بار حملہ کرتی ہے، شدید سے شدید حملہ کرتی ہے لیکن آپ برابر اس کا مقابلہ کرتے ہیں اور بیدار رہنے کی مسلسل کوشش کرتے ہیں جبکہ اس مادی دولت کو لوٹنے والا آنکھوں سے نظر بھی آتا ہے اور اس سے بچاؤ کے لیے بہت سے لوگوں کا تعاون بھی حاصل رہتا ہے۔

اس کے برخلاف ایمان کی دولت پر حملہ کرنے والا نفاق اندر ہی اندر دل کی دنیا میں جنم لیتا ہے۔ اس کا حملہ بھی نہایت خاموش اور اکثر اوقات غیر محسوس ہوتا ہے اور کوئی وقت ایسا نہیں ہوتا جب کہ یہ دشمن آپ کی فکر سے غافل ہو، پھر بھی اگر آپ اس کی طرف سے بے فکر ہیں تو یہ نہایت تشویشناک نادانی ہے۔ آپ ایمان کی قدر و قیمت کے احساس سے بھی بے بہرہ ہیں اور اس سب سے بڑے دشمن کی عیاری سے بھی ناواقف ہیں۔

•••-----•••-----•••

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کا یہ ایمان افروز واقعہ آپ کو جھنجھوڑنے کے لیے ہے کہ آپ اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے بے چین کیوں نہیں ہیں، یہ دولت اگر آپ کو حاصل ہے تو آپ چوکنے کیوں نہیں ہیں اور آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ان واقعات سے سبق کیوں نہیں حاصل کرتے۔

قرآن پاک میں جن مقامات پر منافقین کے کردار و اعمال اور اخلاق و صفات کا ذکر کیا گیا ہے ان کو بار بار پڑھیے اور اس آئینے میں بار بار اپنے کردار و اخلاق کو دیکھنے اور جانچنے کی فکر کیجئے۔

قرآن پاک کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم بعض اوقات ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس سے وہ سبق حاصل نہیں کر پاتے جس کے لیے اس کی تلاوت اور تدبر کی تاکید کی گئی ہے۔

قرآن کی بعض آیات میں مشرکین کا ذکر ہے، بعض میں اہلِ کتاب کا ذکر ہے، بعض میں منافقین کا ذکر ہے، مطالعہ کرتے ہوئے نفس ہمیں یہ فریب دے کر آگے بڑھا دیتا ہے کہ یہ تو منافقین کے کردار اور اوصاف کا بیان ہے۔ اللہ کا شکر ہے تم تو مؤمن ہو ــــ حالانکہ منافقین کے وہ اوصاف ہماری ہی عبرت اور نصیحت کے لیے بیان ہو رہے ہوتے ہیں۔ ایمانِ خالص حاصل ہونے کے باوجود آدمی بہت سے وہ اعمال کر بیٹھتا ہے جو منافقت کے اعمال ہوتے ہیں اور مؤمن ہونے کے باوجود وہ عملی نفاق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اگر وہ بار بار اپنے کو بیدار رکھنے کی کوشش نہ کرے اور بار بار توبہ کر کے اپنے دل کی صفائی اور جلا کا اہتمام نہ کرے تو اس اندیشہ سے وہ ہرگز محفوظ نہیں ہے کہ اس کا ایمان بھی نفاق سے متاثر ہو جائے۔

•••-----•••-----•••

حدیث میں نفاق کے بعض اعمال اور علامات کا ذکر آتا ہے۔ ان حدیثوں کا بار بار مطالعہ کیجئے اگر کوئی ایسا عمل یا علامت آپ کی زندگی میں نظر آئے تو بے چین ہو کر اسے دور کرنے کی فکر میں لگ جایئے۔ ان سے غفلت اور لا

پروائی دراصل اپنی عاقبت سے لاپروائی ہے ــــ نفاق کے یہ اعمال اور علامات ایمان کے لیے گھن کی طرح ہیں۔ اگر ان سے بچاؤ کی فکر آپ نے نہ کی تو یہ اندر ہی اندر آپ کے ایمان کو کھوکھلا کر دیں گے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

''چار باتیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں وہ چاروں موجود ہوں تو وہ خالص منافق ہے اور جس شخص میں ان چاروں میں سے کوئی ایک خصلت ہو تو اس میں نفاق کی ایک خصلت موجود ہے اور وہ اسی نفاق کی حالت میں ہے۔ جب تک وہ اس عادت کو ترک نہ کر دے وہ چاروں خصلتیں یہ ہیں جب اسے کوئی امانت دی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے اور جب گفتگو کرے تو جھوٹ بولے اور جب کسی سے کوئی عہد و پیمان کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے اور جب کسی سے کوئی جھگڑا ہو تو بدزبانی کرنے لگے۔'' (بخاری' کتاب الایمان' باب ۲۴' علامۃ المنافق صفحہ ۵)

حدیث کے اس آئینے میں اپنے کردار کا چہرہ دیکھئے اور اپنے ساتھ خیر خواہی کیجیے۔ آپ کو جہاں کوئی دھبا اور داغ نظر آئے تو اسے کھرچنے اور صاف کرنے کی جرأتمندانہ جدوجہد کیجیے اور نفس کے فریب سے بچنے میں ذرا سستی نہ کیجیے۔

لوگ آپ کے پاس اپنی امانتیں بھی رکھتے ہوں گے۔ قرآن وسنت سے معلوم کیجیے کہ امانت داری کے تقاضے کیا ہیں اور امانت میں خیانت کی کیا کیا شکلیں ہیں۔ آپ گفتگو کے دوران واقعی اہتمام کرتے ہیں کہ کبھی کوئی غلط بات آپ کی زبان سے نہ نکلے؟ تفریح اور ظرافت کے طور پر بھی آپ کبھی جھوٹ نہ بولیں۔

آپ لوگوں سے عہد و پیمان بھی کرتے ہیں، کاروباری معاہدے بھی کرتے ہیں، کیا آپ مطمئن ہیں کہ آپ اپنے معاہدوں کی پابندی کرتے ہیں، قرآن وسنت کی روشنی میں اپنا بے لاگ جائزہ لیجیے۔ لوگوں سے آپ کا جھگڑا بھی ہوتا ہوگا۔ بہت سے مسائل میں اختلاف بھی ہوتا ہوگا۔ جھگڑے کے موقع پر آپ کی زبان آپ کے قابو میں رہتی ہے؟ ناشائستہ کلمات تو آپ کی زبان سے نہیں نکلتے۔ غصہ سے بے قابو ہو کر آپ کی زبان بے لگام تو نہیں ہو جاتی؟ اور وہ کچھ تو نہیں بکنے لگتے جو مؤمن کی شایانِ شان نہیں ہے۔

•••-------•••-------•••

ایک اور حدیث میں نبی ﷺ نے نماز پڑھنے والوں کو تنبیہ کرتے ہوئے اس نماز سے بچنے کی تلقین کی ہے جو مؤمن کی نہیں بلکہ منافق کی نماز ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

''یہ تو منافق کی نماز ہے کہ آدمی بے پروائی سے بیٹھا سورج کو دیکھتا رہے ــــ جب وہ زرد ہو جائے اور غروب ہونے لگے تو وہ نماز کے لیے اٹھے اور پرندوں کی طرح چار چونچیں مارلے اور اس نماز میں وہ کم ہی اللہ کو یاد کرے۔''

اسی کردار کی تصویر کشی قرآن پاک میں اس طرح کی گئی ہے:

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

(النساء ۴:۱۴۲)

''اور جب یہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔''

•••-----•••-----•••

اس باب میں سب سے زیادہ فکر مند کر دینے والی حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جس کو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے:

''جو آدمی اس حال میں دنیا سے رخصت ہوا کہ نہ تو اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور نہ اس کے دل میں اس کی آرزو پیدا ہوئی، تو وہ نفاق کی ایک کیفیت میں دنیا سے رخصت ہوا۔''

•••-----•••-----•••

اللہ کے دین کو غالب اور سربلند کرنے کی کوششوں کا نام جہاد ہے اور جہاد کا اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ آدمی حق کی خاطر کفر سے جنگ کرے اور اس راہ میں اپنی جانِ عزیز کو بھی لگا دے۔

اللہ کے دین کو بلند کرنے کے لیے آپ کیا کر رہے ہیں۔ اس جہاد میں آپ کس حد تک حصہ لے رہے ہیں، آپ کی تمنائیں، آرزوئیں اور منصوبے کیا ہیں اگر آپ نے حصہ نہیں لیا ہے اور نہ آپ کے دل میں اس طرح کی کوئی آرزو اور تمنا ہے تو یہ آپ کے لیے فکر کی بات ہے — اللہ سے دعا ہے کہ آپ کا اور ہم سب کا خاتمہ ایمان پر ہو اور ہمارا ایمان نفاق کی یورشوں سے محفوظ رہے۔



# بدترین محروم

اس دنیا میں نہ محروم انسانوں کی گنتی ممکن ہے، نہ محرومیوں ہی کا شمار ہوسکتا ہے۔ ہزاروں حسرتیں پوری ہونے کے بعد بھی آدمی یہی کہتا ہے—"بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے" اور یہ حقیقت ہے کہ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی چیز سے محروم نہ ہو۔ کون ہوگا جسے اپنی محرومی پر افسوس نہ ہو اور وہ شب و روز کوشاں نہ ہو کہ اس کی محرومی کا خاتمہ ہو۔ کوئی گوارا نہیں کرتا کہ وہ محروم رہے اور محرومی کی زندگی گزارے۔

•••----•••----•••

مگر محرومیوں کی اس بھیڑ میں بدترین قسم کا محروم وہ ہے جو اپنے مخلص دوستوں اور ساتھیوں کی نصیحت وفہمائش اور تذکیر وتنقید سے محروم ہے، اس لیے نہیں کہ اسے ایسے ساتھی اور ایسے مخلص رفقائے سفر مہیا نہیں ہیں جو اس کو یاددہانی کراتے رہیں اور غلطیوں پر اسے ٹوک کر صحیح سمتِ سفر بتاتے رہیں بلکہ اس کی محرومی کی وجہ یہ غلط زعم ہے کہ وہ ان سب سے بلند ہے اور ان کی نصیحت وفہمائش اور تذکیر و یاددہانی سے بالاتر ہے۔ اس کے اچھے ساتھی اسے اس لیے نہیں ٹوکتے کہ وہ بگڑ جاتا ہے، وہ نصیحت سننے کے بجائے اسے اپنی تحقیر سمجھتا ہے اور الٹا نصیحت کرنے والے کے درپے آزار ہوجاتا ہے۔ اس کے ہمدرد اسے بار بار ٹھوکریں کھاتے دیکھتے ہیں، بھٹکتا ہوا محسوس کرتے ہیں، کڑھتے ہیں لیکن اس کی بدمزاجی، کبرِ نفس اور بُرے طرزِ عمل کی وجہ سے مفید نہیں سمجھتے کہ اسے توجہ دلائیں۔ خیر خواہی کا جذبہ انہیں بار بار اکساتا ہے لیکن وہ بار بار ہمت کرنے کے باوجود اس لیے رک جاتے ہیں کہ انہیں حق نصیحت وخیر خواہی ادا کرنے میں مزید نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کتنی عبرتناک ہے یہ بدمزاجی اور کیسا بدترین محروم ہے وہ شخص جس کے مخلص ساتھی اس کو بھلی بات بتانے اور صحیح بات کی طرف متوجہ کرنے سے بھی کترانے لگیں۔

کون نہیں چاہتا کہ اس کی محرومی دور ہو لیکن محرومی کو دور کرنے کی کوشش وہی شخص تو کرے گا جس کو اپنے محروم ہونے کا احساس ہو، جس شخص کو اپنی محرومی کا شعور ہی نہ ہو وہ محرومی سے بچنے کی فکر وکوشش کیسے کرسکتا ہے۔ دوستوں کی نصیحت اور فہمائش سے محروم انسان کی محرومی کا ایک دردناک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کو اپنے محروم ہونے کا شعور ہی نہیں ہوتا۔ آپ اگر اسے اس طرف متوجہ کریں تو اس یاددہانی کو بھی اپنی تحقیر تصور کرتا ہے اور اپنی روش پر غور کرنے

کے بجائے وہ دوسروں کا مذاق اڑاتا ہے، اس کو ہر ایک اپنے سے کم عقل اور کم مرتبہ نظر آتا ہے اور کسی کو بھی وہ اس لائق نہیں سمجھتا کہ وہ اس کے کسی عمل پر احتساب کرے۔

•••------•••------•••

انسان بہت کمزور ہے، وہ ہر وقت اپنے نفس، خواہشات اور شیطانی ذرّیت کے نرغے میں ہے۔ یہ شیطانی ذرّیت راہِ حق سے بھٹکانے کی وہ وہ زمین دوز اور خفیہ تدبیریں کرتی ہیں، جہاں اکثر اوقات انسان کی نگاہ نہیں پہنچ پاتی اور اسے احساس بھی نہیں ہو پاتا کہ میں اپنے مقام سے بہت نیچے گرا دیا گیا ہوں۔

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ (الاعراف ۷: ۲۷)

''اور شیطان کی ذرّیت تمہیں وہاں وہاں سے دیکھتی ہے جہاں تمہاری نگاہیں نہیں پہنچ پاتیں''۔

یہ زندگی امتحان کی مہلت ہے، اس مہلت میں کوئی مرحلہ اور کوئی مقام ایسا نہیں آتا جہاں پہنچ کر آدمی یہ اطمینان کر لے، کہ اب میں ہر پہلو سے محفوظ ہو گیا اور اب میرے بھٹکنے اور بہکنے کا کوئی امکان نہیں۔ کسی کو یہ حق نہیں جو مجھے میرے کسی قول و عمل پر ٹوکے اور کسی کا یہ مقام نہیں جو مجھے نصیحت و فہمائش کرے۔ میں اپنی بہترین ریاضت اور اعلیٰ تربیت کی بدولت ہدایت و اخلاق کے اس بلند مقام پر پہنچ گیا ہوں جہاں آدمی دوسروں کی تلقین و نصیحت اور تذکیر و تنقید سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

•••------•••------•••

خدانخواستہ اگر آپ اس طرح کی خام خیالیوں میں مبتلا ہیں تو کھرچ پھینکیے ان گمراہ کن خیالات کو، سچے دل سے اللہ کے حضور گڑگڑایئے اور شیطان کے اس جال سے جلد از جلد نکل آیئے۔ اگر آپ اپنے خیر خواہ ہیں تو جواب دینے کے مؤثر انداز نہ سوچیے، خاموشی اختیار کیجئے اور تنہائی میں اپنے رویے پر غور کیجئے۔ زندگی بھر کی بہترین تربیت اور ریاضت کی بدولت بھی اس مہلتِ عمل میں کوئی مرحلہ ایسا نہیں آتا کہ آدمی خود کو کامل و اکمل سمجھنے لگے اور وہ دوسروں کی یاد دہانی اور سمجھانے بجھانے سے بے نیاز ہو جائے۔ ایسا سوچنا صرف یہی نہیں کہ غلط ہے' بلکہ یہ خیالات علامت ہیں اس حقیقت کی کہ آدمی ہدایت و اخلاق کے بلند مرتبے سے بہت نیچے گر چکا ہے۔

•••------•••------•••

حضرت شہر بن حوشب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: ''ام المؤمنین! جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے پاس ہوتے ہیں تو وہ اکثر کون سی دعا مانگتے رہتے ہیں؟''

ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر یہ دعا مانگتے رہتے ہیں۔

يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ (جامع ترمذی' کتاب القدر' باب ۷)

اے دلوں کو پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر مضبوط جمادے۔

اللہ اکبر! سرورِ عالم ﷺ کی زبان پر تو اکثر یہ دعا ہو اور ہم یا آپ اس خام خیالی میں مبتلا ہوں کہ ہم دین کے ایسے اعلیٰ مقام پر ہیں جہاں ہمیں کسی کی تذکیر وتنقید کی ضرورت نہیں۔

•••-----•••-----•••

اگر آپ اپنی تندمزاجی اور ناروا طرزِ عمل کے باعث دوستوں کی نصیحت وتذکیر سے محروم ہیں، آپ ساتھیوں کی تنقیدوں پر بھڑک اٹھتے ہیں اپنی کوتاہیوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بجائے، غضب ناک ہو جاتے ہیں تو بے شک آپ کبرِ نفس میں مبتلا ہیں، اپنی ذات کے بدترین دشمن ہیں۔ دنیا میں مخلص ساتھیوں کی رفاقت اللہ کی عظیم نعمت ہے، اچھے ساتھیوں کی صحبت آدمی کی بہت بڑی سعادت ہے، غلطیوں پر ٹوکنے والے، کوتاہیوں پر متوجہ کرنے والے اور بھلائیوں کی تلقین کرنے والے ساتھی آپ کے محسن ہیں۔ ان کی خیر خواہی اور تذکیر و یاددہانی سے اگر آپ خود کو محروم کر رہے ہیں تو یہ بدترین قسم کی محرومی ہے۔ آپ اپنی ہلاکت کے لیے خود گڑھا کھود رہے ہیں اور اس عمل کے دوران اپنے دونوں کانوں میں آپ نے انگلیاں ٹھونس رکھی ہیں کہ کسی تنبیہ کرنے والے کی آواز آپ کے کان میں نہ پہنچ سکے۔

اپنی حالتِ زار پر رحم کھایئے، نفس کو پھلانے کے بجائے اسے روندنے کی کوشش کیجئے۔ اللہ سے توبہ کیجئے' تہجد کی نماز کے ذریعے اپنے بدترین دشمن پر قابو پایئے۔ اپنے مخلص ساتھیوں کی قدر کیجئے۔ یہ اگر آپ کو متوجہ کریں تو ان کا احسان مانئے، ان کے حوصلے بڑھایئے' ان کے مشوروں پر اخلاص کے ساتھ غور کیجئے' ان کو جھڑکنے اور الزامی جواب دینے کے بجائے ان کی باتیں خندہ پیشانی سے سنئے۔ ان کی نصیحتوں، مشوروں اور تنقیدوں کو اللہ کا انعام تصور کیجئے — آدمی کو اپنے عیوب، اپنی کوتاہیاں اور اپنی کمزوریاں نظر نہیں آتیں، اپنے چہرے کے داغ آدمی اپنی آنکھوں سے کیسے دیکھ سکتا ہے۔ آپ آئینے کا احسان کیوں نہیں مانتے کہ وہ آپ کے سامنے آپ کے داغ دھبوں کو رکھ دیتا ہے اور آپ کے لیے یہ موقع فراہم کر دیتا ہے کہ آپ اپنے ان داغ دھبوں کو صاف کر لیں۔

آپ کے دوست اور ساتھی دراصل آپ کا آئینہ ہیں، ان کے تعاون کے بغیر نہ آپ اپنے اخلاقی اور روحانی عیوب کو دور کر سکتے ہیں اور نہ اس راہ میں آگے بڑھ سکتے ہیں — اور اگر آپ کے ناروا طرزِ عمل سے متاثر ہو کر آپ کے یہ ساتھی، آپ کو ٹوکنے اور آپ کو توجہ دلانے سے کترانے لگیں تو یقین کیجئے کہ آپ اس دنیا کے بدترین محروم انسان ہیں۔



# فہمِ دین

دو ساتھی گاؤں کے ایک راستے پر چلے جا رہے تھے۔ شیخ نصیر ادھیڑ عمر کے آدمی تھے اور اذکار اور وظیفے کے پابند تھے۔ شہاب جواں سال تھے لیکن دینی امور میں ان کی بھی خاص توجہ تھی، دونوں کو قریب کی ایک بستی میں جانا تھا۔ شہاب خان کے لیے یہ راستہ اجنبی تھا، وہ پہلی بار اس راستہ پر آئے تھے۔ شیخ نصیر اکثر اس راستے سے گزرتے تھے، اور وہ راستے کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف تھے۔ شیخ صاحب اپنی عادت کے مطابق اپنا وظیفہ پڑھتے ہوئے جا رہے تھے۔ شہاب خاں کچھ آگے آگے چل رہے تھے۔

آگے ایک ندی تھی جسے پار کر کے ہی دونوں کو اپنی منزل مقصود پر پہنچنا تھا۔ ندی میں پانی اگرچہ تھوڑا ہی تھا لیکن پھر بھی پانی میں سوچ سمجھ کر ہی اترنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی جگہ گڑھا ہو اور آدمی کی جان پر بن آئے۔ شیخ صاحب کو تو خوب معلوم تھا کہ کہاں گڑھا ہے اور کس طرف راستہ ٹھیک ہے کیونکہ وہ اکثر و بیشتر اس ندی سے گزرتے تھے لیکن شہاب خاں پہلی بار ہی ادھر آئے تھے، اس لیے انہیں کیا خبر کہ کس طرف سے ندی پار کریں اور کس طرف خطرہ ہے۔

ندی میں پانی کچھ زیادہ نہ تھا۔ اس لیے ایک کنارے سے شہاب خاں ندی میں اتر پڑے مگر اترتے ہی ان کے پاؤں اٹھنے لگے اور لگے غوطے کھانے، وہ تو اللہ کا کرم یہ ہوا کہ جلد ہی ایک اجنبی آ پہنچا اور اس کی مدد سے شہاب خاں کی جان بچ گئی۔

شیخ صاحب چند گز کے فاصلے پر تھے، یہ سب منظر دیکھتے رہے۔ شہاب خاں جب باہر نکل آئے تو چند لمحے بعد شیخ صاحب بھی قریب پہنچے اور افسوس کرنے لگے۔ شہاب خاں کو تہمد دیا اور ان کے کپڑے اتروا کر دھوپ میں سوکھنے کے لیے ڈالے۔

آپ تو اکثر اس راستے سے آتے جاتے ہیں۔ آپ کو بھی نہیں معلوم تھا کہ یہاں کنارے پر ہی اتنا گہرا گڑھا ہے؟ شہاب خاں نے شیخ صاحب سے پوچھا۔

عزیز! مجھے خوب معلوم تھا، یہ گہرا گڑھا بڑا ہی خطرناک ہے، اللہ کا خصوصی فضل ہے کہ تم بچ گئے، اللہ کا شکر ادا

کرو اور شکرانے کے نوافل پڑھو۔

جب آپ کو معلوم تھا کہ یہاں اتنا خطرناک گڑھا ہے اور آپ مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر تھے تو آپ نے مجھے روکا کیوں نہیں۔ شہاب خاں نے حیرت اور شکایت کے ملے جلے انداز میں کہا۔

ہاں بھئی! میں دیکھ تو رہا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اب تمہارا بچنا محال ہے لیکن میں تمہیں آواز کیسے دیتا، میں وظیفہ پڑھ رہا تھا، وظیفہ پورا کیے بغیر دنیاداری کے کاموں میں کیسے ذہن لگاتا، جونہی میں نے وظیفہ پورا کیا فوراً تمہاری طرف دوڑا۔

یہ من گھڑت کہانی نہیں، سچا واقعہ ہے۔ شیخ صاحب نے یہ گوارا کیا کہ ان کا ایک جواں ساتھی ڈوب جائے لیکن یہ گوارا نہ کیا کہ اپنے وظیفے کی تکمیل کیے بغیر ان کی طرف متوجہ ہوں۔ یہ بات انہیں دین داری کے خلاف محسوس ہوئی کہ دعا اور وظیفے کی عبادت ادھوری چھوڑ کر آدمی کسی اور کام کی طرف توجہ کرے۔

شیخ صاحب نے یہ طرزِ عمل اس لیے اختیار کیا کہ ان کی نظر میں یہی اعلیٰ درجے کی دین داری تھی، آدمی اگر اللہ کے ساتھ مشغول ہے' اس کے ذکر و فکر میں لگا ہوا ہے تو یہ گستاخی ہے کہ ذرا سا کوئی ہنگامہ سامنے آئے اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس میں لگ جائے۔ کیا اس بات میں شک اور تردد کی کوئی گنجائش ہے کہ شیخ صاحب کا یہ طرزِ عمل سراسر غلط ہے، انہوں نے دین کا تقاضا پورا نہیں کیا بلکہ سخت جرم کیا لیکن اس جرم کی بنیاد بے دینی، خدا بیزاری، سرکشی، شرارت اور درندگی نہیں ہے' بلکہ دین کی سوجھ بوجھ اور دین کے فہم و بصیرت سے محرومی ہے، اگر شیخ صاحب کو دین کا صحیح فہم حاصل ہوتا تو وہ ہرگز یہ طرزِ عمل اختیار نہ کرتے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے، میں نماز پڑھانے کھڑا ہوتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ خوب طویل قرأت کروں، مگر پیچھے سے کسی بچے کے رونے کی آواز آتی ہے اور میں قرأت مختصر کر دیتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ طویل قرأت کی وجہ سے بچے کی ماں کے دل کو کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے جو جماعت میں شریک ہے۔ کیا نماز سے بھی افضل کوئی عبادت اور پھر خاتم النبیین ﷺ کی نماز و قرأت، کیا کوئی اس نماز و قرأت کی عظمت اور مقام و مرتبے کا اندازہ کر سکتا ہے لیکن اللہ کے رسول ﷺ جن کے قول و عمل اور فکر و بصیرت ہی کا نام دین ہے، وہ محض اس اندیشے سے اپنی قرأت کو مختصر کر دیتے ہیں کہ بچے کی ماں کے دل کو تکلیف نہ پہنچ جائے۔

شیخ عابد مسجد میں دل کھول کر چندہ دیتے ہیں، غریبوں کی بھی مدد کرتے ہیں۔ پچھلے دنوں مسجد کی دکانیں بن رہی تھیں تو اس میں بھی انہوں نے دل کھول کر حصّہ لیا۔ جاڑوں کے موسم میں انہوں نے دو محتاجوں کو لحاف بھی بنوا کر دیئے۔ مگر کتنے ہی لوگوں کا ان پر قرضہ ہے، بہت پرانا قرضہ۔ جب بھی ان سے تقاضا کیا جاتا ہے وہ حالات کا

رونا روتے ہیں، اور یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ذرا حالات ساز گار ہو جائیں تو میں یہ قرضہ ادا کروں اور یہ ٹال مٹول برسوں سے جاری ہے۔

بستی کے اکثر لوگ ان کو بڑا غریب پرور سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے مال میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اللہ کی خوشنودی کا سامان کر رہے ہیں اور اللہ کے مقرب بندوں میں شامل ہو رہے ہیں۔

اس طرزِ عمل کی بنیاد بھی دین سے بے تعلقی اور نافرمانی ہرگز نہیں ہے' بلکہ دین کے صحیح فہم سے محرومی ہے، اس میں کیا شک ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنی دولت لٹانا اور غریبوں، مسکینوں، بیواؤں، یتیموں اور معذوروں کی مدد کرنا، بہت بڑی نیکی ہے یقیناً یہ اللہ کے محبوب اور مقرب بندوں کا کام ہے، بے شک انفاق فی سبیل اللہ ایمان واخلاص کا لازمی تقاضا اور ایمان واخلاص کی علامت ہے لیکن قرض ادا کرنا اولین فرض ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے مقروض کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ ادائے قرض سے غفلت برت کر آپ خیر خیرات کر رہے ہیں تو آپ اپنے ساتھ بھی زیادتی کر رہے ہیں اور دین کے ساتھ بھی۔ فرض چھوڑ کر نوافل کا اہتمام وہی شخص کر سکتا ہے جو دین کی سمجھ سے بالکل ہی محروم ہو۔ آپ کا فرض یہ ہے کہ آپ ہر زحمت برداشت کر کے اپنا قرض ادا کریں، کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کس لمحے موت آ جائے۔ صدقہ وخیرات میں آپ ایک پیسہ خرچ نہ کریں اور ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر آپ قرض کا بوجھ اتارنے کی فکر کریں، یہی دین کا صحیح تقاضا ہے۔

جس شخص کی فرض نمازیں قضا ہوگئی ہیں اس کے لیے یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ وہ نوافل پڑھتا رہے۔ اس کے لیے صحیح روش یہ ہے کہ وہ پہلے فرض نمازوں کا اہتمام کرے۔ اللہ کو آپ کے صدقہ وخیرات اور نوافل کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب کچھ تو آپ کی شخصیت کی تعمیر اور آپ کے قلب وروح کے تزکیہ کے لیے ہے۔ آپ دوسروں کی رقم دبا کر صدقہ کریں، فرض کے تارک رہتے ہوئے نوافل کا اہتمام کریں تو سوچیے قلب وروح کا تزکیہ کیونکر ممکن ہے؟

حکیم صاحب تراویح کا انتہائی اہتمام کرتے ہیں، وقت سے پہلے مسجد پہنچ جاتے ہیں اور بڑی دل بستگی اور یکسوئی کے ساتھ تراویح پڑھتے اور قرآن سنتے ہیں، رمضان کے دوران کہیں سفر بھی نہیں کرتے تاکہ پورا قرآن پاک تراویح میں سن سکیں، سحری بھی نہایت اہتمام سے کھاتے ہیں اور بڑی پابندی سے روزہ رکھتے ہیں، گھر میں بھی روزے اور تراویح کا رمضان بھر چرچا رہتا ہے۔ دن بھر مطب میں مریضوں کے ساتھ مغز زنی کرتے ہیں، مریض بھی کافی آتے ہیں اس لیے حکیم صاحب دن بھر کام کر کے تھک جاتے ہیں لیکن کیا مجال کہ کسی ایک دن بھی تراویح میں ایک لمحے کی تاخیر سے پہنچیں۔

ہاں! سحری کھانے کے بعد سو جاتے ہیں، نہ سوئیں تو دن بھر کام ہی نہیں کر سکتے اور شب میں نشاط کے ساتھ تراویح بھی نہیں پڑھ سکتے۔ دن چڑھے اٹھ کر نماز فجر پڑھ لیتے ہیں اور ظہر کی نماز مریضوں کی ہماہمی میں مستقل طور پر قضا ہی پڑھتے ہیں لیکن انہیں اطمینان ہے کہ وہ دین داری کے تقاضے پورے کر رہے ہیں اور لوگ بھی ان کی دین داری سے مرعوب ہیں۔

تراویح کی اہمیت تسلیم، بے شک تراویح سنت مؤکدہ ہے اور حدیث میں تراویح کا اجر بہت بڑا بتایا گیا ہے لیکن ظاہر ہے فجر وظہر کی نماز فرض ہے، فرض نمازوں کا نہ پڑھنا، فرض نمازوں کی جماعت سے لاپرواہی برتنا اور تراویح کی جماعت کا اہتمام کرنا دین کی صحیح سوجھ بوجھ سے محرومی ہی کا نتیجہ ہے۔

حافظ صاحب ہر سال پابندی سے تراویح میں قرآن سناتے ہیں، قرآن بہت اچھا پڑھتے ہیں، دور دور سے لوگ ان کا قرآن سننے کے لیے آتے ہیں مگر بڑے کمزور ہیں، اکثر بیمار رہتے ہیں اور اس اندیشے سے روزے نہیں رکھتے کہ کہیں کمزوری نہ بڑھ جائے اور قرآن پاک سنانے میں خلل پڑے۔ وہ بھی قرآن پاک سنانے سے محروم رہیں اور سننے والے بھی محروم رہیں۔

یہ طرزِ فکر وعمل بھی اس حقیقت کا غماز ہے کہ دین کے صحیح فہم سے محرومی ہے اور دین کے اعمال کو اپنے ذوق کے مطابق اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دین کی راہ پر ٹھیک چلنے اور زمین پر اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے بنیادی چیز یہی ہے کہ آدمی کو دین کا صحیح فہم حاصل ہو۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اللہ کے بندے کے لیے اس سے بڑی فضیلت اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ اسے دین کا صحیح فہم اور سوجھ بوجھ حاصل ہو، دین کا صحیح فہم رکھنے والا ایک عالم ہزاروں عابدوں سے زیادہ شیطان پر بھاری ہے۔ ہر چیز کی کوئی نہ کوئی بنیاد ہوتی ہے۔ دین کی بنیاد صحیح سوجھ بوجھ ہے۔“

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”اللہ تعالیٰ جب کسی آدمی کے لیے بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے دین میں صحیح فہم وبصیرت عطا فرماتا ہے۔“ (بخاری، کتاب العلم باب ۱۰)

واقعہ یہ ہے کہ دین کی بصیرت اور فہم اگر آدمی کو حاصل نہ ہو تو وہ دین داری کا جذبہ رکھنے کے باوجود دین سے بے بہرہ رہے گا، خود بھی دین کی برکتوں سے محروم رہے گا اور دوسروں کے سامنے بھی دین کی برکتوں سے محروم رہے گا اور دوسروں کے سامنے بھی دین کی غلط نمائندگی کرے گا اور دین داری کی آرزو رکھنے کے باوجود اللہ کی نظر

میں دین دار نہیں ہوگا بلکہ اس کی غلط روش سے دین کو نقصان پہنچے گا اور اس کے نیک اعمال بھی اس کی شخصیت پر مطلوب اثر نہ ڈال سکیں گے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ایک شخص نماز بھی پڑھتا ہے، روزہ بھی رکھتا ہے، زکوٰۃ بھی دیتا ہے، حج اور عمرہ بھی ادا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام نیکیوں کا ذکر کیا مگر قیامت کے روز اس کی عقل وفہم کے مطابق ہی اس کا صلہ دیا جائے گا۔''



# زندگی ایک خاموش سبق

آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ آپ کی ذات سے دنیا میں کیا پھیل رہا ہے اور لوگ آپ سے کیا سیکھ رہے ہیں — برائی یا بھلائی؟ یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی خواہ کسی حیثیت کا ہو اور علم مرتبے کے لحاظ سے کسی بھی مقام پر ہو، اس کی ذات سے یا برائی پھیلتی ہے یا بھلائی۔ اس کو دیکھ کر یا تو لوگوں میں نیکی اور بھلائی کے جذبات اُمڈتے ہیں یا بُرے کاموں کی رغبت ہوتی ہے۔ ہر آدمی کے تعلقات اور اثرات کا ایک دائرہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اس کے رشتہ دار ہوتے ہیں، کچھ دوست، احباب ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا وہ ماتحت ہوتا ہے کچھ لوگ اس کے ماتحت ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ اس سے محبت کرتے ہیں، کچھ لوگ اس سے محبت نہیں کرتے۔ کچھ لوگ اس کو بڑا مانتے ہیں، کچھ لوگ اس کے بڑے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کے پڑوس میں بستے ہیں، کچھ شریک کار ہوتے ہیں اور یہ سب ہی لوگ اس کی زندگی سے اچھا یا برا کچھ نہ کچھ اثر ضرور لیتے ہیں۔ وہ چاہے یا نہ چاہے اس کی زندگی، اس کے شب و روز کا عمل اور اس کا روّیہ لوگوں پر اثر ڈالتا ہے اور لوگ اس سے اچھا یا برا اثر قبول کرتے ہیں۔

•••-----•••-----•••

سوچیے آپ بھی اس طرح کے بہت سے رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں، بہت سے لوگوں سے آپ کے بھی تعلقات ہیں اور فطری طور پر آپ کے اثرات کا بھی ایک دائرہ ہے—— آپ سے گوناگوں تعلق رکھنے والے یہ سب لوگ آپ سے کیا سیکھ رہے ہیں؟ اور آپ کی زندگی ان پر کیا اچھا یا برا اثر ڈال رہی ہے؟ آپ کی بات چیت، افکار و خیالات، مشغلے، دلچسپیاں، دوڑ دھوپ، حوصلے، ارادے، تمنائیں، آپ کا سلوک، آپ کا روّیہ، غرض بحیثیت مجموعی آپ کی زندگی لوگوں کو کچھ نہ کچھ دیتی ہے اور آپ کو محسوس ہو یا نہ ہو وہ لوگوں پر اثر انداز ہوتی ہے—— آپ کی زندگی ایک خاموش سبق ہے جو ہر وقت پڑھا جا رہا ہے، یاد کیا جا رہا ہے اور اپنے وقت پر دہرایا جائے گا۔

یہ حقیقت تو سورج سے زیادہ روشن ہے کہ اچھائی ہو یا برائی اس کا ایک لازمی انجام ہے جس طرح یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ گردن کٹ کر الگ گر جائے اور آدمی نہ مرے ٹھیک اسی طرح یہ نہیں سوچا جا سکتا کہ ایک برائی کی جائے اور اس کا برا انجام سامنے نہ آئے یا کوئی نیکی کی جائے اور اس کا نیک انجام نہ ہو—— زمین کے سینے پر جہاں

کہیں کوئی برائی یا بھلائی ہو رہی ہے، زمین و آسمان کی فضا اس کا انجام محفوظ کر رہی ہے اور آدمی چاہے یا نہ چاہے، یہ انجام لازماً اس کے سامنے آئے گا۔ نہ اس انجام سے بچ کر کوئی شخص زمین و آسمان کے دائرے سے کہیں بھاگ سکتا ہے اور نہ اس انجام کو سامنے آنے سے کوئی چیز روک سکتی ہے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (الزلزال ۹۹: ۷-۸)

''پھر جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا''۔

•••--------•••--------•••

پھر بات صرف اتنی نہیں ہے کہ آپ صرف اس نیکی یا بدی کا انجام دیکھیں گے جو آپ نے خود اپنے ہاتھوں کی ہوگی بلکہ آپ کی ذات سے جو برائی بھی پھیلی ہے اور آپ سے متاثر ہو کر جن جن لوگوں نے بھی کوئی برائی کی ہے اور کرتے رہیں گے، ان سب کی ذمہ داری میں بھی آپ شریک ہیں، اس برائی میں مبتلا ہونے والے تو اپنی برائی کی سزا پائیں گے ہی لیکن ان سب کے برابر سزا آپ کو بھی بھگتنا ہوگی کیونکہ آپ اس برائی کے محرک بنے اور آپ نے اپنے قول و عمل سے اسے جنم دے کر لوگوں تک منتقل کیا —— اسی طرح اگر آپ کی ذات سے کوئی بھلائی پھیلی ہے اور آپ سے متاثر ہو کر لوگوں نے اسے قبول کیا ہے اور دوسروں تک پہنچایا ہے تو یہ لوگ تو اپنی نیکی کا بدلہ پائیں گے ہی، آپ بھی ان سب کے برابر اجر و ثواب کے مستحق ہوں گے کیونکہ آپ کی ہی ذات سے وہ نیکی پھیلی ہے اور آپ ہی نے لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا ہے، اس اصولی حقیقت کو نبی ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

من دعا الی هدی کان له من الاجر مثل اجور من تبعه لا ینقص ذالك من اجورهم شیئًا و من دعا الی ضلالة کان علیه من الاثم مثل اثام من تبعه لا ینقص ذالك من اثامهم شیئا۔ (مسلم، کتاب العلم)

''جس کسی نے بھی لوگوں کو کسی نیکی کی طرف بلایا تو ایسے شخص کو ان تمام لوگوں کے برابر اجر و ثواب ملے گا جو اس نیکی پر عمل کریں گے اور اس سے نیکی پر عمل کرنے والوں کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہ ہوگی اور جس کسی نے لوگوں کو کسی برائی اور گمراہی کی طرف بلایا تو اس آدمی کو ان تمام لوگوں کے برابر سزا دی جائے گی جو اس برائی میں مبتلا ہوں گے اور اس سے برائی کرنے والوں کی سزا میں کوئی تخفیف نہ ہو گی''۔

حدیث میں ''ہدیٰ'' کا لفظ اسم عام ہے یعنی کوئی بھی چھوٹی یا بڑی اچھی بات یا نیک کام۔ اسی طرح ''من'' کا لفظ بھی عام ہے، کرنے والا خواہ کوئی ہو، کس حیثیت اور کسی مرتبے کا شخص ہو —— مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی کسی کو

کوئی نیکی کی بات بتادے یا اپنی حرکت وعمل سے کسی بھی نیک کام کی طرف متوجہ کردے تو رہتی دنیا تک جو جو لوگ بھی اس نیکی پر عمل کریں گے ان سب کے اجر وثواب کے برابر اس شخص کو اجر وثواب دیا جائے گا جس نے سب سے پہلے اس نیکی اور بھلائی کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور داعی اول کے اس زبردست اور بے پایاں اجر سے ان لوگوں کے اجر وثواب میں قطعاً کوئی کمی نہ ہوگی جو اپنے اپنے وقت میں اس نیکی پر عمل کریں گے۔ اسی طرح اگر کسی نے اپنے قول وعمل سے برائی کی طرف لوگوں کو رغبت دلائی ہے تو قیامت تک جو لوگ بھی اس برائی میں مبتلا ہوں گے ان سب کی سزا کے برابر اس شخص کی سزا ہوگی جس نے سب سے پہلے اس برائی کی طرف لوگوں کو بلایا اور اس داعی اول کی زبردست سزا سے ان لوگوں کی سزا میں ہرگز کمی نہ ہوگی جو اپنے اپنے وقت میں اس گناہ کا ارتکاب کریں گے اور اس گمراہی میں مبتلا ہوں گے۔

•••-------•••-------•••

یہ حدیث ایک مؤمن کو جھنجھوڑتی ہے کہ وہ ہر وقت چوکنا رہے اور غفلت کی زندگی نہ گزارے۔ اپنی بات چیت، اخلاق واعمال اور مشغولیتوں پر نگاہ رکھے اور ہر وقت یہ سوچتا اور جانچتا رہے کہ اس کے قول وعمل اور سرگرمیوں سے لوگ کیا سیکھ رہے ہیں۔ اس کی ذات سے کیا پھیل رہا ہے۔ اس کی کتابِ زندگی لوگوں کو کیا سبق دے رہی ہے اور اس کو دیکھ کر لوگ برائیوں اور گناہوں کی طرف لپک رہے ہیں یا بھلائیوں کی طرف۔ اگر کوئی ایک برائی بھی خدانخواستہ اس کی ذات سے پھیلتی ہے تو اس حدیث کی روشنی میں اس کی سزا بڑھتے بڑھتے اتنی ہوسکتی ہے کہ سارا اعمال نامہ سیاہ ہوجائے اور اسی طرح اگر اس کی ذات سے کوئی ایک نیکی پھیلتی ہے تو اس کا اجر وانعام بڑھتے بڑھتے اتنا ہوسکتا ہے کہ اس کا پورا اعمال نامہ روشن ہوجائے۔

ایک مؤمن کی انتہائی تمنا اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ اس کا اعمال نامہ روشن ہو، نیکی کے کاموں میں وہ سب کے لیے نمونہ ہو اور اس کی زندگی سے نیکی کی روشنی پھیلے۔ قرآن حکیم میں مؤمنین کی ایک دعا نقل کی گئی ہے:

وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا۝ (الفرقان ۲۵:۷۴)

''اور اے پروردگار ہمیں نیک لوگوں کا امام بنا''۔

زندگی کے جس معاملے میں جو شخص امام اور پیشوا بنتا ہے وہ اپنے پیچھے والوں کے لیے نمونہ ہوتا ہے، نماز میں جس شخص کو آپ اپنا امام بناتے ہیں جب تک نماز میں ہوتے ہیں، وہ آپ کے لیے نمونہ ہوتا ہے جو کچھ وہ کرتا ہے وہی آپ کرتے ہیں۔ جب وہ کھڑا ہوتا ہے آپ بھی کھڑے ہوجاتے ہیں، جب وہ جھکتا ہے آپ بھی جھک جاتے ہیں، جب وہ سجدے میں جاتا ہے آپ بھی سجدے میں گر پڑتے ہیں، غرض آپ ہر حرکت میں اسی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں اور کوئی حرکت اس کے خلاف نہیں کرتے۔ مؤمنین کی دعا کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ، ہمیں نیک

کاموں کی توفیق دے اور ایسا نیک بنادے کہ ہم نیک لوگوں کے لیے نمونہ ہوں، ہمیں دیکھ کر وہ نیکی اختیار کریں اور نیکی کی طرف لپکیں، ہم بدکاروں اور نافرمانوں کے لیے نمونہ نہ ہوں، زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی نیکی اور بھلائی کے لیے ہماری ذات مثال رہے، ہم نیک کاموں سے یاد کیے جائیں اور ہماری ذات سے ایسی نیکیاں پھیلیں کہ ہم نیک لوگوں کے لیے مثال اور نمونہ بنیں۔ مرنے کے بعد جب ہم رخصت ہوں تو نیک کاموں کے لیے ہماری مثال دی جائے، بُرے کاموں کے لیے ہماری مثال نہ دی جائے۔

•••--------•••--------•••

مؤمن کی یہ انتہائی تمنا اسی وقت پوری ہوسکتی ہے اور اس کی دعا میں اسی وقت اثر پیدا ہوسکتا ہے کہ جب اس کی زندگی اس کی تمنا کی سچی تصویر ہو اور اس کی زندگی سے یہ ثبوت ملے کہ واقعی دعا کے یہ الفاظ دل سے نکلی ہوئی آواز ہے، اور یہ تمنا واقعی اس کے دل کی گہرائیوں میں کروٹیں لے رہی ہے لیکن اگر معاملہ کچھ اور ہو، اس کی زندگی کا رخ اس تمنا کے خلاف ہو، اس کی دوڑ دھوپ اس دعا کی تردید کررہی ہو اور محض زبان سے وہ اس دعا اور تمنا کے الفاظ دہرا رہا ہو، تو ظاہر ہے اس کی دعا اسی کے خلاف شہادت ہوگی اور اس کی تمنا خود اسی کا مذاق اڑائے گی۔

•••--------•••--------•••

اگر آدمی واقعی یہ خواہش رکھتا ہے کہ اس سے لوگ نیکی سیکھیں، اچھے ناموں سے اس کو یاد کریں اور اس کی زندگی سے نیکی کی رغبت ہو تو اسے اپنی زندگی بھی ایسی ہی بنانی ہوگی اور اپنی زندگی سے اس نیک خواہش کا ثبوت دینا ہوگا اور اگر وہ بُرے کام کرکے یہ خواہش رکھتا ہے کہ لوگ اس سے نیکی کا سبق لیں اور اچھے الفاظ سے اسے یاد کریں تو وہ عقل و دماغ کی کسی سخت بیماری میں مبتلا ہے جس کا علاج صرف یہ ہے کہ وہ توبہ و استغفار کرے اور آئندہ اس روش پر پوری طرح پرہیز کرے۔

•••--------•••--------•••

ایک مشہور صحابی حضرت حرملہ رضی اللہ عنہ نے ایک بار اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، یا رسول اللہ! آپ مجھے کن کاموں کے کرنے کا حکم دیتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، ''نیک کام کرو اور بُرے کاموں سے بچو۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارے پیچھے لوگ تمہیں اچھے ناموں سے یاد کریں تو اپنے اندر ایسی ہی خوبیاں پیدا کرو اور جن برائیوں کے ساتھ تم اپنا ذکر پسند نہیں کرتے ان برائیوں سے دور رہو'' کون اس بات کو پسند کرے گا کہ اس کی زندگی سے لوگ برا اثر قبول کریں اور اس کی ذات لوگوں میں برائی پھیلنے کا ذریعہ بنے۔ ہر مؤمن اپنے سینے میں یہی پاکیزہ خواہش رکھتا ہے کہ لوگ اسے اچھے ناموں سے یاد کریں، اس کی زندگی سے اچھائی اور بھلائی سیکھیں اور اس کی شخصیت بھلائی پھیلانے کا ذریعہ بنے لیکن خواہش کتنی ہی پاکیزہ ہو، محض خواہش کا کوئی حاصل نہیں اگر اس

خواہش کو پورا کرنے کے لیے آپ عملی جدوجہد کا حق ادا نہ کریں۔ اگر آپ کی دوڑ دھوپ کا مرکز نیکی اور بھلائی نہیں ہے، آپ کی محفلوں میں نیکی اور بھلائی کے تذکرے نہیں ہیں، آپ کی مشغولیتوں میں ایمان کے تقاضوں کی جھلک نہیں ہے، آپ کے افکار وخیالات میں اسلامی رنگ نہیں ہے، آپ کے گھر دین داری کے ہمہ وقتی مدرسے نہیں ہیں، اگر آپ کے کاروبار اور کارخانوں میں اسلامی احکام وآداب کا پاس ولحاظ نہیں ہے اور آپ دینی اصول واحکام سے آزاد، خودسری اور خودرائی کی زندگی گزار رہے ہیں یا خدانخواستہ سرکشی اور نافرمانی کی روش پر گامزن ہیں تو آپ کی زندگی، آپ چاہیں یا نہ چاہیں، لوگوں کو برا سبق پڑھا رہی ہے اور آپ لوگوں کو بری راہ پر لگانے میں لگے ہوئے ہیں۔

آپ کی یہ پاکیزہ خواہش ہے کہ آپ کو لوگ نیکی کی مثال بنائیں۔ اسی وقت پوری ہوسکتی ہے جب آپ کو دیکھ کر بے اختیار لوگوں میں نیکی کی تڑپ پیدا ہو، بھلائی کا شوق اُبھرے اور آپ کی کتابِ زندگی شب وروز خاموش تبلیغ وتلقین میں برابر مصروف رہے۔



# اللہ تعالیٰ کی پکار پر لبیک کہنے والے

اللہ نے اپنے دین کی خدمت کے لیے آپ کو پکارا، آپ نے اس کی پکار پر لبیک کہا: اور دین کی دعوت و اشاعت کے کام میں لگ گئے۔ یہ محض اللہ کی توفیق اور احسان ہے کہ اس نے اپنے دین کی دعوت وتبلیغ کے لیے آپ کا انتخاب فرمایا جبکہ روئے زمین پر کروڑوں بندے ہیں جو مال و دولت، اثر و شہرت، علم وبصیرت اور قوت و اقتدار کے لحاظ سے آپ سے کہیں زیادہ آگے ہیں۔ اس کے باوجود اللہ کی نظر آپ پر پڑی اور اس نے اپنا پیغام بندوں تک پہنچانے کے لیے آپ کو منتخب فرمایا۔ اسی نے آپ کے سینے میں یہ عزم وحوصلہ پیدا فرمایا کہ آپ دینِ حق سے ناواقف اور غافل بندوں تک اللہ کا پیغام پہنچائیں اور انہیں اسلام کا سیدھا سچا راستہ بتائیں۔ یہ بہت بڑی سعادت ہے جو اللہ نے محض اپنے فضل وکرم سے آپ کو عطا فرمائی ہے۔

دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اللہ کا شکر ادا کیجیے کہ اس نے آپ کو اس عظیم منصب کے لیے چنا۔ یہ انتخاب اللہ کا بہت بڑا انعام بھی ہے اور بہت بڑی آزمائش بھی۔ دینِ حق کا علم وشعور اور دعوتِ دین کی ذمہ داری کا احساس دے کر اللہ نے آپ پر اپنا خصوصی فضل فرمایا ہے اور یقیناً اس نے آپ کو بہت بڑے انعام سے نوازا ہے---لیکن یہ شعور واحساس آپ کا امتحان اور آزمائش بھی ہے، اس عظیم منصب پر سرفراز فرما کر دراصل اللہ تعالیٰ آپ کو آزما رہا ہے کہ آپ اس کی وفاداری میں کس حد تک پورے اترتے ہیں، اللہ کے احسان وسلوک کا اپنے عمل وکردار سے کیا جواب دیتے ہیں اور اپنی ذمہ داری کا حق ادا کرنے میں کس قدر مخلص ہیں۔ نبی ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا:

وان اللہ مستخلفکم فیھا فینظر کیف تعملون (ترمذی، کتاب الفتن، باب ۲۶)

''اور یہ کہ اللہ نے تمہیں، ان لوگوں کا جانشین بنایا ہے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں تا کہ وہ یہ دیکھے کہ تم کیا روش اختیار کرتے ہو''۔

اللہ کی سونپی ہوئی اس ذمہ داری کا حق ادا کرنے کے لیے تین حقیقتوں کو ہمہ وقت پیشِ نظر رکھیے اور کسی وقت بھی ان کی طرف سے غفلت اور لاپروائی نہ اختیار کیجیے۔

☆ ---یہ کہ اللہ کی نظر میں بندے کے لیے اس سے بڑا کوئی مرتبہ نہیں ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کو اللہ کے دین کی

طرف دعوت دے۔

☆--- یہ کہ اللہ ہی نے اس کام کے لیے آپ کا انتخاب فرمایا ہے، وہ انتخاب نہ فرماتا تو آپ ہرگز اس کام میں نہیں لگ سکتے تھے۔

☆--- یہ کہ اللہ کی پکار پر لبیک کہنے والوں کے جذبات اور سرگرمیاں کیا ہوتی ہیں؟

یہ تینوں باتیں ہمہ وقت آپ کے دل و دماغ میں تازہ رہیں۔صرف ایک بار انہیں پڑھ لینا یا سمجھ لینا کافی نہیں ہے، بار باران باتوں کو دہرایئے بار بار انہیں اپنے ذہن میں تازہ کیجئے، آدمی بار بار بھولتا ہے اور ضرورت ہوتی ہے کہ اسے بار بار یاددہانی کرائی جائے۔

اللہ کے بندوں میں سب سے اونچا مرتبہ رسولوں اور پیغمبروں کا ہے، جو اللہ کے بندوں کو دین کی طرف بلاتے ہیں اور اپنے قول و عمل سے لوگوں کو دین کا سیدھا اور سچا راستہ بتاتے ہیں، اللہ کے یہ رسول ہر دور میں آئے، ہر قوم میں آئے، ہر ملک میں آئے اور اپنے اپنے زمانے میں انہوں نے اپنی قوم کو اسلام کی تعلیم سے روشناس کرایا۔سب سے آخر میں حضرت محمد ﷺ کو اللہ نے اس کام کے لیے اپنا رسول بنا کر بھیجا اور آپ ﷺ نے نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد پورے ۲۳ سال تک اللہ کے بھٹکے ہوئے بندوں کو اللہ کی راہ پر لگایا اور دین کی روشن تعلیمات سے ان کی انفرادی، سماجی اور سیاسی زندگی کو آراستہ کیا۔آپ ﷺ خاتم النبیین ہیں یعنی آپ ﷺ پر نبوت ختم ہوگئی، اب رہتی زندگی تک کوئی اور نبی یا رسول نہیں آئے گا۔

نبوت کا سلسلہ تو ختم ہو گیا لیکن وہ کام ختم نہیں ہوا جس کے لیے نبی آتے تھے، یعنی اللہ کے ناواقف اور غافل بندوں کو اللہ کے دین کی تعلیمات پہنچانا اور دین کی طرف دعوتِ دینا، اب یہ کام رہتی دنیا تک رسول ﷺ کی امت یعنی ''اُمتِ مسلمہ'' انجام دے گی، بیت اللہ کی تعمیر کرتے ہوئے اللہ کے برگزیدہ پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (البقرہ ۲:۱۲۸)

''اے ہمارے رب! ہمیں اپنا مسلم اور فرمانبردار بنا اور ہماری اولاد سے ایک ایسی امت کو اٹھا جو تیری مسلم اور فرمانبردار ہو''۔

اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کی دعا کو شرفِ قبول بخشا اور نبی ﷺ کی قیادت میں اُمتِ مسلمہ کو اٹھایا جو اس وقت تک دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیتی رہے گی، جب تک یہ دنیا آباد ہے۔یہ امت' رسول ﷺ کی جانشین ہے اور اس کو وہی کام انجام دینا ہے جو رسول کریم ﷺ انجام دیتے رہے۔

اللہ کا ارشاد ہے:

''اللہ نے تمہارا انتخاب فرمالیا ہے اور دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔پیروی کرو اس

دین کی جو تمہارے اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے، اس نے پہلے ہی سے تمہیں مسلم کے نام سے نوازا تھا اور اسی سلسلہ میں کہ رسول ﷺ تمہارے لیے دینِ حق کی شہادت دیں اور تم دنیا کے سارے انسانوں کے سامنے دینِ حق کی شہادت دو"۔ (سورۃ الحج ۲۲:۷۸)

دین میں اس سے بڑی سعادت اور کوئی نہیں ہے کہ آپ وہ خدمت انجام دیں جس کے لیے ہمیشہ انبیاء مبعوث ہوتے رہے ہیں اور جس کے لیے اللہ نے آخری رسول حضرت محمد ﷺ کو بھیجا۔ اللہ کے بندوں کو اللہ کے دین کی دعوت دے کر آپ رسول اللہ ﷺ کی جانشینی کا حق ادا کرتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ دین و دنیا میں انسان کے لیے اس سے زیادہ شرف اور عظمت کا کوئی دوسرا کام نہیں ہو سکتا۔ اپنے منصب کی قدر و عظمت کا یہ شعور آپ کو ہمیشہ سرگرم رکھے گا، آپ کو عزم، حوصلہ، ولولہ اور لگن بخشے گا اور کسی وقت بھی آپ کے داعیانہ جذبات کو مضمحل نہ ہونے دے گا۔

دوسری حقیقت جو کسی وقت بھی آپ کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ آپ اشاعت دین کی کوششوں میں اسی لیے شریک ہیں کہ اللہ نے اپنی حکمت کے تحت اس کام کے لیے آپ کو منتخب فرما لیا ہے۔ اس کی توفیق نہ ہوتی تو آپ اس عظیم کام کا حوصلہ ہرگز نہ کر سکتے تھے، اس کی توفیق کے بغیر آپ نیکی کے لیے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے، یقیناً اللہ ہی نے اپنے دین کی خدمت کے لیے آپ کا انتخاب فرمایا ہے۔ اور اس کا ہر کام علم و حکمت کی بنیاد پر ہی ہوتا ہے۔ اس یقین و شعور کا زبردست فائدہ یہ ہے کہ آپ دو بہت بڑی نفسیاتی اور اخلاقی کمزوریوں سے محفوظ رہیں گے۔

☆ ---احساس پستی اور کمتری

☆ ---احساس برتری اور غرور

یہ وہ بدترین کمزوریاں ہیں جن کے ہوتے نہ آپ دعوتِ اسلامی کے لیے کسی طور مفید ہو سکتے ہیں اور نہ آپ کو دعوتِ اسلامی سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

احساسِ کمتری اور پستی کا شکار آدمی دنیا میں کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ دعوتِ اسلامی کے لیے بھی وہ لوگ ہرگز مفید نہیں ہو سکتے جو احساس پستی میں مبتلا ہوں۔ اس کے لیے ایسے ہی کارکن درکار ہیں جو ہر محفل میں ہر طبقہ میں اور ہر مقام پر کسی خوف و خطر کے بغیر یقین کی پوری قوت اور جرأت کے ساتھ اپنی بات پیش کر سکیں اور اپنے پیغام کی قدر و عظمت پر یقین رکھتے ہوئے پیش کر سکیں۔ ایرانی سپہ سالار رستم کے دربار میں جہاں عام آدمی پر داخل ہوتے ہوئے لرزہ طاری ہوتا تھا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے جس جرأت، بے باکی اور شانِ عظمت کے ساتھ اسلام کی دعوت پیش کی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے جس شان کے ساتھ نجاشی کے دربار

میں اسلام کی ترجمانی کی، اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے جس جرأت اور بے خوفی کے ساتھ مکے کے خونخوار نادانوں کے سامنے اعلانِ حق کیا، وہ تاریخ دعوت کے ایسے روشن باب ہیں جن سے داعیانِ حق کے قافلے رہتی دنیا تک روشنی حاصل کرتے رہیں گے۔

نبوت کے ابتدائی دور میں نبی ﷺ نے قریش کے سرداروں کو اپنے دسترخوان پر مدعو کیا اور ان کے سامنے یہ بات رکھی کہ جو پیغام میں لے کر آیا ہوں، اس میں تمہارے لیے دونوں جہان کی سعادت وفلاح ہے۔ بتاؤ تم میں سے کون میرا ساتھ دے گا؟ سب خاموش تھے، ایک نوعمر لڑکا اٹھا اور اس نے کہا:

''اے چچا کے بیٹے، اگرچہ میری آنکھوں میں آشوب ہے، میری ٹانگیں پتلی ہیں اور میں نوعمر ہوں لیکن میں آپ کا ساتھ دوں گا۔''

مکے کا ابتدائی دور، قریش کے تنومند سرداروں کی غضب ناک نگاہیں اور ایک نوعمر، ناتواں اور بظاہر بے مایہ لڑکے کا یہ جرأت مندانہ اعلان کہ میں آپ کا ساتھ دوں گا، دراصل اس یقین وشعور کا اظہار ہے کہ اس عظیم کام کے لیے اللہ ہی میرا انتخاب فرمارہا ہے، اور جب قوت وطاقت اور اثر ورسوخ رکھنے والے ان تندرست وتوانا سرداروں کو چھوڑ کر اللہ کی نظرِ انتخاب مجھ ناتواں اور نوعمر پر پڑی ہے تو میں ظاہر کی ہر بے بسی اور ناتوانی سے بے نیاز ہوکر اعلان کرتا ہوں کہ میں آپ کا ساتھ دوں گا جس ہستی نے آپ ﷺ کی رفاقت ومعیت کے لیے میرا انتخاب کیا ہے وہ قوتوں کا سرچشمہ ہے، کائنات اس کی چٹکی میں ہے، وہی میری پشت پناہی کرے گا۔ جب اس نے میرا انتخاب کیا ہے تو میری پتلی ٹانگوں میں وہی استقلال کی قوت بھرے گا۔ میری دکھتی آنکھوں میں وہی روشنی پیدا کرے گا جس سے میں دور تک دیکھ سکوں اور پیغام حق ملک کے دور دراز گوشوں تک پہنچا سکوں۔ یہ اندازِ فکر رکھنے والا داعیِ حق کبھی احساس پستی اور کمتری کا شکار نہیں ہوسکتا اور تاریخ شاہد ہے کہ اس تاریخ ساز بچے نے وہ کارنامے انجام دیئے جس کے تصور سے بڑے بڑوں کے زہرے آب ہوتے ہیں۔

آپ بھی علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے نقشِ قدم پر چلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور بجا طور پر آپ کو اپنے اس حوصلے پر فخر ہے۔ بے شک آپ معذور بھی ہوسکتے ہیں۔ کمزور وناتواں بھی ہوسکتے ہیں، آپ کو کوئی اثر ورسوخ اور شہرت و اقتدار بھی حاصل نہیں ہے اور دنیوی اعتبار سے آپ کسی اونچے مقام کے مالک بھی نہیں ہیں لیکن اللہ نے آپ کو اسلام کے شعور سے نوازا ہے اور آپ دعوت وتبلیغ کے کام میں لگے ہوئے ہیں، تو یقین کیجئے کہ اللہ نے آپ کا انتخاب فرمایا ہے، ہر احساس پستی اور کہتری کو دل سے کھرچ پھینکیے اور وہی الفاظ دہرا کر کہ ''اگرچہ میری ٹانگیں پتلی ہیں، میری آنکھوں میں آشوب ہے لیکن میں آپ کا ساتھ دوں گا'' تن من دھن سے اس کام میں لگ جائیے جس نے آپ کا انتخاب کیا ہے، وہ خود آپ کی ناتوانی کو توانائی سے بدل دے گا اور آپ کو وہ حوصلہ اور جرأت بخشے گا

کہ اس دور کے بڑے سے بڑے جید اور بڑے سے بڑے علم وفکر رکھنے والوں کے سامنے آپ کامل یقین اور مثالی جرأت کے ساتھ اسلام کا پیغام رکھ سکیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ اس تاریخ ساز لڑکے کے الفاظ میں آپ کے لیے ایک اور سبق بھی ہے، وہ یہ کہ تبلیغ دین کا یہ عظیم فریضہ انجام دیتے ہوئے آپ پر غرور وکبر اور احساس برتری کا سایہ بھی کبھی نہ پڑنے پائے۔ یہ وہ بدترین برائی ہے جس کے ہوتے آپ کا سارا کیا کرایا اکارت جائے گا اور آپ کے ہاتھ کچھ نہ آئے گا۔ آپ کی کوششوں سے دعوتِ اسلامی کو کچھ فائدہ پہنچ بھی جائے تو بھی آپ کا دامن خالی ہی رہے گا اور دعوتِ اسلامی سے نسبت وتعلق رکھنے کے باوجود آپ کو اپنی عبرت ناک محرومی پر رونا پڑے گا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی ناتوانی، معذوری، بے مائیگی اور نوعمری کی تصویر کشی کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا ہے وہ ان کی ذہنی عظمت کا اظہار ہے۔ وہ یوں سوچتے ہیں ''میں اپنی شخصیت کے لحاظ سے کسی پہلو سے بھی اس قابل نہیں ہوں کہ اس عظیم کام کی ذمہ داری اپنے سر لوں، یہ محض اللہ کی توفیق اور کرم ہے کہ اس نے مجھے اس عظیم خدمت کے لیے منتخب فرمایا، میں صرف اسی ذات کے بھروسے پر ان سنگین حالات میں رسول ﷺ کا ساتھ دینے کی ہمت کررہا ہوں جس نے میرے دل میں یہ بات ڈالی اور مجھے اس عزم وارادے کی توفیق بخشی۔''

آپ اسی عظیم شخصیت کے جانشین اور پیرو ہیں۔ اپنے دل کے ایک ایک گوشے میں جھانک کر دیکھئے، دعوتِ دین کا عظیم کام انجام دیتے ہوئے کہیں آپ اپنی عظمت کے دھوکے میں تو مبتلا نہیں ہورہے ہیں، نفس آپ کو فریب دینے میں تو کامیاب نہیں ہورہا ہے، یقین کیجئے کہ اگر اس میدان میں آپ نفس سے دھوکہ کھا گئے تو پھر دعوتِ اسلامی میں آپ کا کوئی مقام نہیں ہے۔ سمجھ لیجئے آپ نے اپنی شخصیت کو تباہ کردیا اور آپ کی عاقبت خراب ہوگئی۔ کبر وغرور کے مریضوں کا دین میں کوئی حصہ نہیں۔ وہ لوگ ہرگز اللہ کی بندگی نہیں کرسکتے جو اپنے نفس کی بندگی میں مگن ہوں اور نہ ان کا ان کوششوں کے اجر وانعام میں کوئی حصہ ہے جو اللہ کی بندگی کا نظام قائم کرنے کے لیے کی گئی ہوں۔ خواہ ان میں وہ خود بھی شریک رہے ہوں۔ 

تیسری حقیقت یہ علم وشعور ہے کہ اللہ کی پکار پر لبیک کہنے والوں کے جذبات کیا ہوتے ہیں۔ وہ کس طرح سوچتے ہیں اور ان کی زندگیاں کن اوصاف سے آراستہ ہوتی ہیں۔ مگر یاد رکھیے، اس باب میں صرف علم وشعور ہی کافی نہیں ہے' بلکہ عملی طور پر ان جذبات اور اوصاف سے اپنی زندگیوں کو آراستہ کرنے کی مسلسل جدوجہد کے بغیر آپ اپنے داعیانہ منصب کا حق ادا نہیں کرسکتے۔ آپ کے لیے بہترین نمونہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیاں ہیں جو رسول ﷺ کی دعوت قبول کرکے آخر دم تک ہر طرح کے حالات میں آپ ﷺ کا ساتھ دیتے رہے، اللہ کے دین کو قبول کرنے کے بعد انہوں نے کوئی چیز اپنے لیے بچا کر نہیں

رکھی بلکہ سب کچھ اس دین پر نثار کر دیا، مال و دولت، اثر و اقتدار، قوت و صلاحیت، وطن و اولاد، محبت و دشمنی حتیٰ کہ اپنی جان عزیز بھی اس راہ میں قربان کر دی اور پھر بھی یہ احساس انہیں بے چین کیے رہا کہ ''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔''

آیئے! حوارینِ عیسیٰ کی زندگیوں کی ایک جھلک دیکھیں۔ یہ بھی اللہ کے انصار تھے اور دینِ حق کے داعی اور نقیب۔ داعیانِ اسلام کے لیے ان کی زندگی میں بڑی کشش بھی ہے اور سبق بھی۔ قرآن کا ارشاد ہے:

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْھُمُ الْکُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ ۚ وَاشْھَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاکْتُبْنَا مَعَ الشّٰھِدِیْنَ ۝ (آل عمران ۳:۵۲-۵۳)

''پس جب عیسیٰ نے ان کی طرف سے مسلسل انکار کو بھانپ لیا تو انہوں نے پکارا، کون میرا مددگار بنتا ہے، اللہ کی راہ میں؟ حواریوں نے جواب دیا ہم ہیں اللہ کے انصار، ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ آپ گواہ رہیے کہ ہم مسلم اور فرمانبردار ہیں۔ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے اس چیز پر جو تو نے نازل کی اور ہم نے اس رسول کی پیروی کی سو تو ہمیں گواہی دینے والوں میں لکھ۔''

رسول کی پکار کے جواب میں انصار اللہ ہونے کا عزم و اظہار، اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کا حوصلہ اور حق کی شہادت دینے والوں میں شامل ہونے کی تمنا' یہ حوارینِ عیسیٰ کی ایسی ایمان افروز داستان ہے جسے بار بار دہرایئے اور دل کی دنیا کو، ان جذبات اور تمناؤں سے آباد کرنے کی فکر کیجیے۔

حواری کے معنی ہیں، خیر خواہ، مددگار، حامی و ناصر۔ جس طرح انصار کا لفظ مدینے کے ان جاں نثاروں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے اور انہوں نے ہر طرح کے حالات میں رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دیا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ کے حواری وہ جاں نثار کہلائے جو اخلاص کے ساتھ آپ ﷺ کی دعوت پر ایمان لائے اور ہر طرح کے نرم گرم حالات میں انہوں نے آپ علیہ السلام کا ساتھ دیا۔ حضرت عیسیٰ نے نہایت شفقت، دل سوزی اور لگن کے ساتھ اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت فرمائی اور پھر آپ کے داعی، نقیب اور پیغامبر بن کر بنی اسرائیل کی ایک ایک بستی تک پہنچے۔

دنیوی اعتبار سے یہ کسی بڑے مرتبے کے لوگ نہ تھے لیکن اس اعتبار سے یہ سب پر بازی لے گئے کہ جب حضرت عیسیٰ نے جوشِ دعوت میں ان کے سامنے یہ حقیقت رکھی کہ مجھے تو ہر حال میں اللہ کی راہ پر چلنا ہے، اب کون یہ حوصلہ کرتا ہے کہ میرا ساتھ دے، تو حوارین نے ہر لالچ اور خوف سے بے نیاز ہو کر کہا: ''نحن انصار اللہ'' اور ان نازک حالات میں یہ اعلان کیا کہ جب قوم کے علماء اور سردار اور مقتدر لوگ

محروم رہ گئے اور اللہ نے ان بے اثر لوگوں کو اپنے کام کے لیے منتخب فرما کر اپنے رسول کی رفاقت اور نصرت کی توفیق بخشی۔

''انصار اللہ'' ہونے کا اعلان کرتے ہوئے وہ خوب سمجھ رہے تھے کہ اس اعلان کا کیا مطلب ہے، انصار اللہ ہونے کے کیا تقاضے ہیں اور یہ اعلان کر کے ہم کن ذمہ داریوں اور وفاداریوں کا اقرار کر رہے ہیں--- چنانچہ ''نحن انصار اللّٰہ'' کہنے کے بعد انہوں نے خود ہی ان تقاضوں کو واضح کیا اور اللہ سے اپنی وفاداری کا عہد استوار کیا۔

☆--- ہم سچے دل سے اللہ پر ایمان لائے۔ اب ہماری زندگی ایمان کی روشنی میں گزرے گی۔

☆--- آپ گواہ رہیے کہ ہم مسلم اور فرمانبردار ہیں، ہم اقرار کرتے ہیں اور آپ کو گواہ بنا کر اقرار کرتے ہیں، آپ دیکھیں گے کہ ہم اللہ کے وفادار بندے ہیں، وفاداری اور جاں نثاری ہی ہمارا شیوہ ہے۔

☆--- ہم اللہ کی بھیجی ہوئی وحی پر ایمان لائے۔ ہم بے چون و چرا اس کی اطاعت کرتے ہیں۔

☆--- ہم رسول کی پیروی میں زندگی گزارتے ہیں اور کسی مرحلے میں بھی ان کی قیادت سے سرتابی نہیں کرتے۔

☆--- اور ہم اپنے قول وعمل سے اس حق کی شہادت دیتے ہیں، جس کا تو نے ہمیں امین بنایا ہے۔

پروردگار! ہماری دعا یہ ہے کہ حشر کے میدان میں ہمارا شمار حق کی شہادت دینے والوں میں ہو، حق کو چھپانے والوں میں نہ ہو۔ تو نے جب ہمیں اپنے دین کا شعور دیا ہے اپنے دین کی دعوت قبول کرنے کی توفیق دی ہے اور ہمیں دین کی خدمت کے لیے قبول کر لیا ہے تو ہم ہر حال میں حق کی شہادت دیں گے۔ دل سے، زبان سے، عمل سے اور اگر ضرورت ہوگی تو جان دے کر یہ شہادت دیں گے کہ یہی اصل شہادت ہے۔ لہٰذا اے ہمارے رب! ہمارا نام حق کی شہادت دینے والوں میں لکھ اور ان لوگوں میں ہرگز نہ لکھ جو حق واضح ہونے کے بعد اپنے قول وعمل سے حق کی شہادت دینے کے بجائے حق کو چھپانے کا سنگین جرم کرتے ہیں۔

آپ نے بھی اللہ کی دعوت پر لبیک کہا ہے، دعوتِ اسلامی کو قبول کیا ہے اور انصار اللہ ہونے کا اقرار کیا ہے۔ اپنے جذبات، احساسات، تمناؤں اور آرزوؤں کا جائزہ لیجیے۔ اپنے حوصلوں، ارادوں اور ولولوں پر نگاہ ڈالیے، اپنے قول وعمل پر نظر کیجیے، اپنی شب و روز کی سرگرمیوں کا تجزیہ کیجیے اور اپنے ربّ سے آپ نے جو عہد کیا ہے اسی کو گواہ بنا کر انصاف کے ساتھ اپنا احتساب کیجیے کہ آپ کے ذہن و فکر، علم وفن، مال و دولت اور جسم و جان کی قوتیں کہاں صرف ہو رہی ہیں اور اللہ نے اس دور میں اپنے کروڑوں بندوں میں سے اپنے دین کی خدمت کے لیے آپ ہی کو منتخب فرمایا ہے تو اللہ کے اس انتخاب کے ساتھ آپ کا سلوک کیا ہے۔

# آپ اور آپ کے اہل وعیال

آپ وطن سے دور کسی خوش حال ملک میں قیام پذیر ہیں، زندگی بڑے عیش سے گزار رہے ہیں، خوشنما کوٹھی، حسین کار، عزت، شہرت، دولت اور راحت وسکون کا ہر سامان مہیا ہے، آپ اپنے دوستوں، عقیدت مندوں، ساتھیوں اور بہی خواہوں کے ساتھ اپنی کوٹھی میں جشن منا رہے ہیں، ہر طرف چہل پہل ہے، انواع واقسام کے کھانے تیار ہو رہے ہیں، احباب آ رہے ہیں، آپ مسکراتے چہرے سے ان کا استقبال کر رہے ہیں، ان سے بغل گیر ہو رہے ہیں، خوشی کے قہقہے بلند ہو رہے ہیں اور ہر طرف مسرت کی لہریں ہیں، لوگ بھی آپ کو رشک سے دیکھ رہے ہیں، آپ کی خوش بختی کے چرچے کر رہے ہیں اور آپ بھی اپنی سعادت پر نازاں ہیں اور بجا طور پر نازاں ہیں۔

مگر یکا یک آپ کچھ سوچتے ہیں اور آپ کی حسین آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو بے اختیار ٹپک پڑتے ہیں۔ آپ کے بچے، آپ کی وفا شعار بیوی، آپ کے شفیق ماں باپ آپ سے دور وطن میں ہیں۔ نہ معلوم وہ کس حال میں ہیں جس قدر آپ سوچتے جاتے ہیں، آپ کے غم میں برابر اضافہ ہوتا جاتا ہے، آپ اپنے عیش وسکون میں ایک زبردست خلا سا محسوس کرنے لگتے ہیں، قدرتی طور پر آپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کاش میرے ماں باپ میرے ساتھ ہوتے، کاش میری وفا شعار بیوی میرے پاس ہوتی، کاش میرے پیارے بچے میری آنکھوں کے سامنے ہوتے اور میں ان سب کے ساتھ مل کر جشن مناتا۔ کاش میری خوشیوں میں یہ سب شریک ہوتے، یہ سب میرے ساتھ ہوتے تو میں کتنا خوش نصیب ہوتا، میرے ماں باپ کس قدر خوش ہوتے، میری بیوی کی مسرت کا کیا حال ہوتا، میرے بچے کس قدر مسرور ہوتے اور خود میں کس قدر خرم اور شاد ہوتا۔

ذرا آنکھیں بند کر لیجئے اور تصور کی قوتوں کو یکجا کر کے تصور کی آنکھوں سے دیکھئے، جنت کا بے مثال باغ، یاقوت وزمرد کا مثالی محل ہے، حوروں کے نقرئی قہقہے ہیں، غلمان کی چہل پہل ہے، چاروں طرف سے سلام وتحیات کی دلنواز صدائیں ہیں، عزت ہے، اقتدار ہے، عیش وعشرت ہے، سکون واطمینان ہے، بھرپور جوانی ہے، ہمیشہ قائم رہنے والی صحت ہے، نیک اور صالح بندوں کا پڑوس ہے، نہ شور نہ ہنگامہ، نہ بے ہودہ گفتگو ہے، نہ کسی گناہ کا چرچا،

ہر طرف سلامتی اور تحیات کی صدائیں، ہر طرف خوشی کی چاندنی بکھری ہوئی ہے، اللہ نے آپ کو ہر نعمت سے نواز رکھا ہے اور پھر جنت کی اس پر رونق زندگی میں ایک دن ایسا بھی آتا ہے کہ آپ کو اپنے ربّ کا دیدار حاصل ہوتا ہے۔ آپ کی خوش بختی کا کیا ٹھکانا کہ آپ کا ربّ آپ سے کہتا ہے، میرے بندے میں تجھ سے راضی ہوں، اب کبھی میں تجھ سے ناراض نہ ہوں گا۔ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ

کیا آپ گوارا کریں گے کہ اس جنت میں آپ کی بیوی آپ کے ساتھ نہ ہو، آپ کے بچے آپ کے پاس نہ ہوں، آپ کے ماں باپ آپ کے ہمراہ نہ ہوں، کیا آپ برداشت کر سکتے ہیں کہ آپ کے بیوی بچے اور آپ کے ماں باپ ان نعمتوں سے محروم ہوں اور آپ تنہا ان نعمتوں سے فیض یاب ہوں۔ کیا ان کے بغیر آپ کو اپنا عیش و آرام ادھورا نہ معلوم ہوگا۔ کیا یہ سوچ کر آپ کا دل نہیں بیٹھنے لگتا کہ آپ کی اولاد، آپ کے والدین اور آپ کی پیاری بیوی جنت کی ان نعمتوں سے محروم رہیں۔

بجا طور پر آپ کی یہی تمنا ہے کہ جنت کی ان سدا بہار نعمتوں میں آپ اپنے بچوں کے ساتھ رہیں، آپ کی رفیقہ حیات آپ کے ساتھ عیش کرے، آپ کے ماں باپ آپ کے ساتھ سکون، آرام کی زندگی گزاریں اور سب مل کر جنت کی بے نظیر نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں، آپ کی آرزو ایک فطری آرزو ہے —— کتنی بڑی خوش نصیبی ہوگی کہ آپ کی یہ آرزو پوری ہو اور آپ اپنے عزیزوں کے ساتھ فردوس بریں میں اللہ کا قرب حاصل کریں۔

اللہ کی کتاب گواہ ہے کہ آپ کی محبوب بیوی، آپ کے پیارے بچے، آپ کے شفیق ماں باپ کل جنت کی نعمتوں میں آپ کے ساتھ ہوں گے اور آپ ان کی معیت اور رفاقت میں جنت کی ابدی قیام گاہ میں عیش واطمینان کی زندگی گزاریں گے مگر ایک شرط ہے —— اور اس شرط کو پورا کرنے کے لیے اللہ نے آپ کو پورا پورا موقع دیا ہے، بلکہ آپ سے مطالبہ بھی ہے کہ آپ اپنے اور اپنے اہل وعیال کی خاطر اس شرط کو پورا کرنے کی سنجیدہ اور مسلسل کوشش کریں۔ نہایت دل سوزی اور حکمت کے ساتھ جدوجہد جاری رکھیں —— شرط صرف یہ ہے کہ آپ کے اہل و عیال اور ماں باپ اللہ کے فرمانبردار اور صالح ہوں۔

آپ اپنی آرزو میں سچے ہیں، آپ کی آرزو فطری آرزو ہے۔ اللہ نے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ آپ کی آرزو پوری ہوگی مگر آپ کے وہی عزیز جنت میں عیش جاوداں حاصل کرسکیں گے جن کی زندگی اللہ کی فرمانبرداری میں گزری ہوگی۔ قرآن کا ارشاد ہے:

أُولَٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ (الرعد ۱۳: ۲۲-۲۴)

”عاقبت کا گھر انہی لوگوں کے لیے ہے یعنی ایسے باغ جوان کی ابدی قیام گاہ ہوں گے، وہ خود بھی ان

میں داخل ہوں گے اور ان کے آباؤ اجداد اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے جو صالح ہوں وہ بھی ان کے ساتھ وہاں جائیں گے۔ فرشتے ہر طرف سے ان کے استقبال کے لیے آئیں گے اور ان سے کہیں گے، تم پر سلامتی ہو، تمہارے صبر کے صلے میں''۔

یہاں پروردگار نے اہلِ جنت کی کچھ بنیادی خوبیاں بیان کی ہیں جن کے صلے میں اللہ ان کو جنت سے نوازے گا اور پھر فرمایا گیا کہ عیش جاوداں کا یہ گھر ان کے لیے بھی ہے اور ان کے خاندان والوں کے لیے بھی، مگر خاندان کے وہی افراد اہلِ جنت کے ساتھ ہوں گے جو نیک اور صالح ہوں۔

خاندان کے نیک وصالح افراد ہی کل آپ کے ساتھ جنت میں داخل ہوں گے۔ قرآن کی یہ وضاحت آپ کی معلومات میں اضافہ کے لیے ہی نہیں ہے، بلکہ ایک انتہائی لطیف پیرائے میں اللہ نے آپ کو آپ کی ذمہ داری یاد دلائی ہے اور نہایت فطری اور نفسیاتی انداز میں آپ کو متوجہ کیا ہے کہ اگر آپ واقعی اپنی تمنا میں سچے ہیں تو سنجیدگی سے غور کیجئے کہ آپ اپنے اہلِ خاندان کو نیک وصالح بنانے کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں، آپ کا طرزِ عمل اور آپ کی سعی وفکر ہی بتائے گی کہ آپ کس حد تک اپنی تمنا اور آرزو میں سچے اور سنجیدہ ہیں۔

قرآن کا منشا یہ ہے کہ اگر آپ کی دلی خواہش واقعی یہ ہے کہ کل جنت کی ابدی نعمتوں میں آپ کی پیاری اور محبوب بیوی، آپ کے شفیق ماں باپ آپ کے ساتھ ہوں تو آپ کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ آپ ان کو جنت کی راہ پر چلانے کے لیے اپنی ساری کوششیں لگا دیں۔ اپنی زندگی کو بنانے اور سنوارنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی آپ ہی کی ذمہ داری ہے کہ ان کی زندگی بنانے اور سنوارنے کی بھی آپ فکر کریں اور اس فکر سے کسی وقت غافل نہ ہوں۔

کل اگر آپ اپنے قریبی عزیزوں کو اپنے ساتھ اللہ کی رحمتوں میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں تو آج اس خواہش کی تکمیل اور اس آرزو کو پورا ہونے کے لیے آپ کو موقع حاصل ہے۔ اگر آپ اس موقع سے فائدہ اٹھا رہے ہیں تو آپ اپنی خواہش اور آرزو میں سچے ہیں، ورنہ یہ محض ایک خیال ہے اور آپ نے سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور نہیں کیا ہے۔

اہلِ خاندان کی دینی تعلیم وتربیت اور اصلاح سے غفلت دراصل اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ تمنا آپ کے دل کی گہرائی میں نہیں ہے، یا جنت کو ابھی اپنی منزل بنانے میں آپ کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ اگر فی الواقع جنت ہی آپ کی منزل ہے اور آپ کو اپنے اہل وعیال اور ماں باپ سے واقعی دلی محبت ہے تو آپ ان کو دین کی سیدھی سچی راہ پر چلانے کی فکر سے کسی لمحے بھی غفلت نہ برتیں، ان کی اصلاح وتربیت کی کوشش مسلسل کرتے رہیں اور نہایت دل سوزی اور لگن کے ساتھ کرتے رہیں۔ اس جدوجہد میں کوتاہی کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ آپ خود ہی اپنی تمنا پوری کرنے میں کوتاہی کر رہے ہیں اور آپ دانستہ یا نادانستہ خود ہی نہیں چاہتے کہ آپ کی اپنی آرزو

پوری ہو۔

اسلام ایک فطری دین ہے۔اس کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے آپ کی اسی فطری تمنا کو آپ کا دینی فریضہ قرار دیا ہے۔آپ اس فرض کو انجام دیں گے تو اپنی ہی تمنا پوری کریں گے لیکن اللہ کی نوازش کا حال دیکھئے کہ وہ آپ کو اس ذمہ داری کی انجام دہی پر مزید اجر وانعام سے نوازے گا اور اپنے اہل وعیال اور اہلِ خاندان کی تربیت واصلاح کی کوششوں کا آپ کو صلہ بھی عطا فرمائے گا۔آپ کی یہ ذمہ داری قرآن نے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم ۶۶:۶)

''اے ایمان والو! اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ''۔

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

''باپ اپنی اولاد کو جو کچھ دیتا ہے اس میں سب سے بہتر عطیہ یہ ہے کہ وہ اس کی تربیت واصلاح کرے''۔(ترمذی، کتاب البر)

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

''جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے عمل کا موقع ختم ہو جاتا ہے مگر تین قسم کے اعمال ایسے ہیں کہ ان کا ثواب مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے۔ایک یہ کہ وہ صدقہ جاریہ کر جائے، دوسرے یہ کہ وہ ایسا علم چھوڑ جائے جس سے لوگ اس کے بعد فائدہ اٹھائیں، تیسرے یہ کہ وہ نیک اولاد چھوڑ جائے جو اس کے بعد اس کے لیے دعائے خیر کرتی رہے''۔(مسلم، کتاب الوصیہ)



# آپ کا فیصلہ اور آپ

دین کی پکار پر لبیک کہتے وقت آپ اس عزم کے ساتھ آگے بڑھے تھے کہ اب پیچھے ہٹنے کا نام نہ لیں گے۔ واپسی کی کشتیاں جلا کر آپ نے اس راہ میں قدم رکھا تھا اور اپنے اللہ سے یہ عہد کیا تھا کہ پروردگار! یہ جان بھی تیری ہے، یہ مال بھی تیرا ہے اور یہ سب کچھ میں نے تیرے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ میرا اپنا اب کچھ نہیں ہے، سب کچھ تیرا ہے اور تیری ہی راہ میں صرف ہوگا۔ پروردگار! مجھے معاف فرما، مجھے شعور نہیں تھا، میں غفلت میں تھا، تیرا کرم ہے کہ تو نے مجھے غفلت سے بیدار کیا اور اپنے دین کی خدمت کی سعادت بخشی۔ پروردگار! کس زبان سے تیرا شکر ادا کروں تو نے مجھے وہ سعادت بخشی جو تو صرف اپنے منتخب بندوں کو ہی بخشتا ہے۔

آپ نے اپنے اللہ کے دین کو سب سے بڑی دولت سمجھ کر اپنایا تھا، بڑی عقیدت کے ساتھ اپنایا تھا اور اس یقین کے ساتھ دین کی خدمت کا بیڑا اٹھایا تھا کہ اللہ نے وہ عظیم خدمت آپ کے سپرد کی ہے جس سے زیادہ عزت وعظمت کا اور کوئی کام دنیا میں نہیں ہے۔ آپ کو اپنی اس سعادت پر فخر تھا اور بجا فخر تھا۔ آپ نے اپنے ربّ سے عہد کیا تھا۔

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مجاہد میں اسی لیے نمازی

آپ نے مبارک فیصلہ کیا تھا کہ میں مرتے دم تک اسی دین کی خدمت میں لگا رہوں گا، کوئی ساتھ دے نہ دے، میں آگے بڑھتا رہوں گا لوگ ساتھ چلنے سے انکار کر دیں تو میں تنہا چلوں گا۔ اس لیے کہ مجھے صرف اپنے ربّ کی رضا مطلوب ہے۔

•••-----•••-----•••

کیسا مبارک تھا آپ کا فیصلہ، کیسے پاکیزہ تھے آپ کے جذبات اور کیسی ایمان افروز تھیں آپ کی سرگرمیاں۔ آپ خفا نہ ہوں، میری نظر میں یہ ماضی کی یادیں ہیں، ولولہ انگیز یادیں، آپ کو اصرار ہے کہ آپ کا فیصلہ اب بھی یہی ہے، آپ کے جذبات اب بھی یہی ہیں، آپ کی سرگرمیاں اب بھی یہی ہیں، نہ آپ کا عہد بودا تھا' نہ آپ کا

فیصلہ کمزور تھا' نہ آپ کے جذبات سرد پڑے ہیں نہ آپ کی سرگرمیاں کسی جمود کا شکار ہوئی ہیں —— اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ لیکن کیا کروں اپنی ان آنکھوں کا، کہاں لے جاؤں اپنے ان کانوں کو، کیا کروں اپنے احساس کا۔

کبھی جب میں آپ کو دیکھتا تو اپنی زندگی پر شرم آتی اور بے اختیار لب پر دعا بن کر یہ تمنا آتی ہے کہ پروردگار میری عمر کا کچھ حصّہ ان کو عطا فرمادے۔ میں جب آپ کو سرگرم دیکھتا تو ایک حیرت انگیز ولولہ محسوس کرتا، راہِ حق میں بڑھنے کی بے پناہ قوت کا احساس ہوتا، آپ کو بڑے رشک سے دیکھتا، اپنے لیے مثال بناتا اور بہت کچھ کرنے کے بعد بھی یہ محسوس کرتا کہ آپ کی منزل مجھ سے بہت آگے ہے، بہت کچھ کرنے کے بعد بھی شاید میں آپ کو نہ پاسکوں اور پھر عقیدت و محبت کے ساتھ میری نگاہیں آپ کے نورانی چہرے پر جم جاتیں، مگر اب —— اب مجھے نہ وہ عزائم نظر آتے ہیں، نہ ولولے، نہ وہ خاراشکن جذبات ہیں نہ حوصلے، وہ سرگرمیاں ہیں نہ وہ ہمت و ارادے۔

•••-----•••-----•••

آپ کا کہنا بجا کہ آپ کے ساتھیوں نے حوصلے چھوڑ دیئے۔ آپ کے ساتھی اپنے عہد میں بودے ثابت ہوئے۔ آپ کا یہ کہنا بھی صحیح کہ آپ سے بہت آگے چلنے والے بہت سے ساتھی آپ سے بھی پیچھے رہ گئے۔ یہ کہنا بھی بجا کہ بہت سے سو گئے اور ایسے سوئے کہ اب بیدار ہونے کا نام نہیں لیتے، یہ کہنا بھی حق کہ اگر آپ کے ساتھی برابر ساتھ دیتے رہتے تو آپ بہت آگے ہوتے مگر راہِ حق کے ساتھی! آپ ہی ذرا گردن جھکا کر سوچیے کیا آپ کی یہ تاویلیں صحیح ہیں؟ کیا آپ اپنے اللہ سے اسی وقت وفاداری کریں گے جب دوسرے بھی کریں، کیا آپ نے اپنے اللہ سے اس شرط کے ساتھ عہد کیا تھا کہ دوسرے تیرے دین کو سربلند کریں گے تو میں بھی مدد کروں گا ورنہ پیچھے ہٹ جاؤں گا۔ کیا آپ ان تاویلوں اور بہانوں پر مطمئن ہیں؟ آپ ہی بتایئے اس قافلے کا ہر راہی اگر یہی عذر اور یہی تاویل کرنے لگے تو قافلے کا کیا حشر ہوگا اور اللہ کے اس دین پر کیا بیتے گی جو آپ کو جان سے زیادہ عزیز ہے۔

دین کی پکار پر لبیک کہنا سب سے بڑی سعادت ہے اور اس راہ میں برابر آگے بڑھتے رہنا اس سعادت کی علامت ہے، مگر آپ آگے نہیں بڑھ رہے ہیں بلکہ پیچھے ہٹ رہے ہیں، اس سعادت سے محروم ہو رہے ہیں اور حیرت ہے کہ آپ کو اپنی اس محرومی کا احساس بھی نہیں، آپ کو ذرا پریشانی نہیں کہ آپ اپنے اللہ کی نظر سے گر رہے ہیں، اس کی عنایت سے محروم ہو رہے ہیں، آپ کا سینہ خدمت دین کے ان ولولوں اور حوصلوں سے خالی ہوتا جارہا ہے جو آپ کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ کبھی آپ کو دیکھ کر لوگ زندگی کی تڑپ محسوس کرتے تھے، اب وہ آپ کو یاددہانی کرا رہے ہیں۔ بے شک دنیا کو آپ نے اپنا مقصد نہیں بنایا ہے لیکن آپ کو احساس نہیں، اس مکار بڑھیا نے نہایت چالاکی سے آپ کو اپنے جال میں پھانس لیا ہے۔ آپ سوچ رہے ہیں کہ دین کا دامن بھی آپ کے

ہاتھ میں ہے اور دنیا بھی آپ کے قدموں میں ہے لیکن آپ دھوکے میں ہیں، آپ دین کی راہ میں بہت آگے بڑھ کر بہت پیچھے ہٹ آئے ہیں اور اگر آپ اس احساس سے بھی محروم ہیں تو یہ بہت بڑا سانحہ ہے، ایسا سانحہ جو آپ کی موت سے زیادہ تکلیف دہ ہے اور اس پر اگر خون کے آنسو بہائے جائیں تب بھی غم ہلکا نہ ہوگا۔

...------...------...

نفس کو ڈھیل نہ دیجیے، یہ آپ کا سب سے بڑا دشمن ہے، اس سے کڑا محاسبہ کیجیے، انصاف اور سنجیدگی کے ساتھ اپنے جذبات کا جائزہ لیجیے۔ اپنے عزائم اور حوصلوں پر نگاہ ڈالیے، اپنے ارادوں کا جائزہ لیجیے، اپنی تمناؤں اور آرزوؤں پر احتساب کی نظر ڈالیے، اپنی تنہائی کی دعاؤں کو سننے کی کوشش کیجیے، آپ اپنے اللہ سے کیا چاہتے تھے اور اب کیا چاہ رہے ہیں، آپ کی تمنائیں کیا تھیں اور اب کیا ہیں، آپ کی شب و روز کی دوڑ دھوپ کن کاموں کے لیے تھی اور اب کن مقاصد کے لیے ہے، آپ کن آرزوؤں میں مگن تھے اور اب کیا خواب دیکھ رہے ہیں۔

مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ اپنا پورا سبق بھولتے جا رہے ہیں کل تک جن قدروں کے لیے آپ سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھے، آج وہ آپ کی نظر میں بے وزن ہوتی جا رہی ہیں، کل تک جن برائیوں کو دیکھ کر آپ کی پیشانی پر غضب کی شکنیں نمودار ہو جاتی تھیں آج آپ انہی برائیوں سے سمجھوتہ کر رہے ہیں۔ کل تک جن منکرات کو آپ مٹانے کے لیے سینہ سپر تھے آج وہی منکرات دانستہ یا نادانستہ آپ کے وجود سے قائم ہو رہے ہیں اور آپ نہایت سادہ لوحی کے ساتھ حالات کی رو میں بے اختیار بہتے چلے جا رہے ہیں۔

...------...------...

کل آپ کو اللہ کے حضور کھڑا ہونا ہے، اس اللہ کے حضور جس سے آپ نے عہد کیا تھا اور اس یقین کے ساتھ عہد کیا تھا کہ وہ اپنے مزدوروں کا اجر ہرگز ضائع نہیں کرتا، وہ اپنے وفادار غلاموں کی کارگزاریوں سے کسی لمحے غافل نہیں ہوتا، نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند، وہ اپنے بندوں کی محنت و جانفشانی کی قدر کرتا ہے اور کبھی کسی مستحق کو محروم نہیں کرتا۔ اس اللہ کے حضور کل آپ کھڑے ہوں گے اور وہ آپ سے کہہ رہا ہوگا، میرے بندے! میں نے تجھے دینِ حق کا شعور دیا تھا تیرا ہاتھ پکڑ کر خدمت دین کی راہ پر لگا دیا تھا، تجھے توفیق دی تھی کہ میرے نیک بندوں کے ساتھ میرے دین کو سربلند کرنے میں لگ جائے، پھر تجھے کیا ہوا تو اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر کہاں بھاگ گیا۔

کیا آپ اللہ کو جواب دیں گے کہ پروردگار! میں اپنے دوسرے ساتھیوں کو مضمحل دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا، میں نے اس لیے تیرے دین کی خدمت سے ہاتھ کھینچ لیا کہ دوسروں کو بھی میں نے یہی کرتے دیکھا، میں نے اس لیے وفاداری کا ثبوت نہیں دیا کہ دوسرے بے وفا ثابت ہو رہے تھے، میرے جذبات اور ولولے اس لیے سرد پڑ گئے کہ دوسروں کو میں نے ٹھنڈا دیکھا، میں سب کچھ جاننے کے بعد اس لیے پیچھے پلٹ گیا کہ مجھ سے زیادہ جاننے والے

پیچھے پلٹتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

اس سے پہلے کہ آپ کی آنکھیں بند ہوں، خدارا آنکھیں کھولیے اور اپنے رویے پر غور کیجئے، اپنے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو تازہ کیجئے۔ کوئی عہد پورا کرے یا نہ کرے آپ اپنا عہد پورا کرنے کا عزم کیجئے۔ کوئی اس راہ میں بڑھتا نظر آئے یا نہ آئے آپ آگے بڑھئے۔ آپ نے معاملہ اللہ سے کیا ہے، کسی بندے سے نہیں کیا ہے اور جب دین کے کچھ خادم مضمحل ہوتے نظر آئیں تو آپ اپنے حوصلے اور بلند کر دیجئے۔ جب کچھ لوگ جی چھوڑتے محسوس ہوں تو اپنا جوش و ولولہ اور بڑھا دیجئے اور جب سب بھاگتے نظر آئیں تو آپ اپنے قدم اور جما دیجئے۔ دوسروں سے آپ جو کچھ توقعات رکھتے ہیں وہ خود پوری کر دکھائیے۔ دوسروں کا شکوہ نہ کیجئے، اپنے عمل سے انہیں شرم دلائیے۔ اور کوئی ساتھ نہ دے تو اپنے اللہ سے بے پایاں اجر لینے کے لیے اپنی رفتار کو اور تیز کر دیجئے۔

نوا را تلخ تر می زن چوں ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چوں محمل راگراں بینی



# آپ اور آپ کا نصب العین

آپ ایک انقلابی انسان ہیں، آپ حالات کو بدل ڈالنے کا عزم لے کر اٹھے ہیں۔ آپ اپنے پسندیدہ اصول ونظریات کے مطابق ایک ایسا خوش گوار انقلاب لانا چاہتے ہیں کہ انسان کی انفرادی زندگی بھی بدل جائے اور اجتماعی زندگی بھی۔ آپ اسلام سے عقیدت رکھتے ہیں اور آج کی دکھی انسانیت کے تمام مسائل کا حل اسلام کو سمجھتے ہیں، آپ اسلام کے داعی ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کو غالب اور نافذ کرنے کے لیے کوشاں ہیں، آپ کی یہ تمنا ہے کہ اللہ کے بندے صرف اللہ کی بندگی کریں اور اس دین کامل کے مطابق زندگی گزاریں جو اللہ نے ان کے لیے پسند کیا ہے۔ آپ کی پاکیزہ آرزو یہ ہے کہ دنیا اسلام کے رنگ میں رنگ جائے اور اسلام کی بے بہا برکتوں سے مالا مال ہو جائے۔ کتنا بلند ہے آپ کا یہ نصب العین اور کتنی مبارک ہے آپ کی یہ تمنا۔

•••------•••------•••

آپ کی پرسوز اور دلنواز گفتگوئیں بھی میں نے سنی ہیں۔ آپ کے منصوبوں سے بھی میں واقف ہوں، اصلاح وتربیت کے لیے آپ کی کوششیں بھی میرے سامنے ہیں، آپ کی مرتب اور مدلل تقریریں بھی میں نے سنی ہیں، دل کی گہرائی میں ان کا اثر بھی محسوس کیا ہے اور ذہن ودماغ کو اطمینان بھی ہوا ہے۔ اللہ شاہد ہے کہ دل سے بے اختیار دعا نکلی ہے —— "اللہ محفوظ رکھے ہر بلا سے" بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ میں نے تنہائی میں آپ کے لیے پروردگار سے دعائیں کی ہیں۔ آپ کی کامیابی اور آپ کی درازی عمر کے لیے التجائیں کی ہیں اور اکثر میں نے اپنی آنکھوں کو بھیگا ہوا پایا ہے۔

•••------•••------•••

مگر محترم! تلخ نوائی معاف فرمائیں "آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے" میری زندگی میں کچھ تلخ لمحات بھی آئے ہیں، انتہائی تلخ —— کوشش کے باوجود ان کی تلخی کسی طرح کم نہیں ہو پاتی۔ جب بھی یہ لمحات یاد آتے ہیں میں حیران اور پریشان ہو جاتا ہوں —— اور اپنے رب سے دعائیں کرتا ہوں کہ پروردگار! یہ لمحے مجھے پھر کبھی نہ دکھانا۔

محترم! ان تلخ لمحات کا تعلق بھی آپ سے ہے — کاش ان کا تعلق آپ سے نہ ہوتا — یہ لمحات وہ ہیں جب میں نے آپ کی دلنواز گفتگو اور آپ کے طرزِ عمل میں فاصلہ محسوس کیا ہے، ایسا عظیم فاصلہ جس کو کسی حسین تاویل اور کسی حسن ظن سے میں طے کرنے میں کامیاب نہیں ہوا اور ہر بار اپنے کو سنبھالنے کی آخری کوشش کے باوجود مجھ پر مایوسی، پریشانی، حیرانی اور حوصلہ شکنی کی وہ کیفیت طاری ہوئی جس کے بیان سے بھی میرا دل دکھتا ہے۔ اللہ سے گڑگڑا کر دعا کرتا ہوں کہ الٰہی تو اپنے کرم سے اس فاصلے کو کم کر دے۔ نہیں بلکہ ختم کر دے اور جب کبھی یہ سوچتا ہوں کہ قول و عمل کا یہ فاصلہ کچھ سادہ لوح بندوں کے لیے اللہ کے دین سے بیزاری کا باعث بھی بنتا ہوگا تو عقل و فہم کی قوتیں جواب دینے لگتی ہیں اور میں بے چین ہو کر اللہ کے دامن عفو و کرم میں پناہ ڈھونڈنے لگتا ہوں۔

آپ کا عذر بجا ہے کہ حالات انتہائی سنگین ہیں۔ دولت کی ریل پیل نے انسان سے فکر و انجام کی سنجیدگی چھین لی ہے۔ آپ یہ کہنے میں بھی حق بجانب ہیں کہ کسی کے دل پر آپ کا زور نہیں۔ آپ صحیح کہتے ہیں کہ معاشرے کو اپنی پسندیدہ راہ پر رواں دواں کر دینا آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ بے شک آپ بزور حالات کی کلائی نہیں موڑ سکتے، آپ کا ارشاد بجا ہے کہ آپ صرف اپنی بات بتا سکتے ہیں، سمجھا سکتے ہیں لیکن کسی کے دل میں بات اتار دینا اور اسے بدل ڈالنا ہرگز آپ کے بس میں نہیں۔ آپ کا یہ شکوہ بھی بجا ہے کہ لوگ آپ کی بات پر دھیان نہیں دیتے، حق کا وزن نہیں محسوس کرتے اور کسی ذمہ داری کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ بات کو طول نہ دیجیے، مجھے آپ کی بے بسی کا احساس ہے اور میں خوب جانتا ہوں کہ حالات بدل ڈالنے کا آپ کو کوئی اختیار نہیں، آپ معذور ہیں، اللہ کی نظر میں بھی اور بندوں کی نظر میں بھی۔

•••-----•••-----•••

مگر میرے محترم! جن تلخ لمحات کا اور جن فاصلوں کا ذکر میں آپ سے کرنا چاہتا ہوں، ان میں کوشش کے باوجود میں آپ کی معذوری سمجھنے سے قاصر ہوں۔ میری کڑھن یہ ہے کہ آپ اپنی گفتگوؤں، اپنی تقریروں، اپنی تحریروں اور دعوؤں میں جو کچھ دوسروں کے لیے چاہتے ہیں مجھے ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ اپنے لیے وہ نہیں چاہتے! آپ سماج کو اسلامی سماج بنانا چاہتے اور اس کی خیر و برکت کو بڑے مدلل انداز میں دل نشین کراتے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ آپ کا اپنا گھر اس کی برکتوں سے محروم ہے۔ آپ کے اپنے کارخانے، اپنی فیکٹریاں، اپنے دفاتر اور اپنے ادارے ان برکتوں سے خالی ہیں۔ آپ اپنے زور بیان سے پھر مجھے ادھر متوجہ کر رہے ہیں کہ گھر میں رہنے والوں، دفتروں اور اداروں میں کام کرنے والوں پر ہمارا کیا اختیار؟ — مگر محترم میں اس پر گفتگو نہیں کر رہا ہوں۔ میری گفتگو کا محور آپ کا برتاؤ، آپ کا طرزِ فکر، آپ کا اندازِ عمل اور آپ کا رویّہ ہے! آپ کے گھر والے آپ کے رویے سے کیوں غیر مطمئن ہیں۔ آپ کے برتاؤ سے کیوں شاکی ہیں، وہ کیوں آپ کو ایک اچھا انسان

تصور نہیں کرتے۔ آپ کے طرزِعمل کو اپنے لیے مثال بنانے کے بجائے، اس سے بیزار کیوں ہیں؟

آپ کے دفتروں، آپ کے کارخانوں اور اداروں میں کام کرنے والے اور آپ سے کاروباری تعلق رکھنے والے آپ کے سلوک سے کیوں نالاں ہیں۔ ان کے دلوں میں یقین کی یہ ٹھنڈک کیوں نہیں پیدا ہوتی کہ آپ کے دعوے کے مطابق اسلامی نظام جب آئے گا تو بہت بڑے پیمانے پر وہ اجتماعی عدل، وہ معاشی عدل، وہ سماجی عدل قائم ہوگا جس کی جھلک چھوٹے پیمانے پر وہ آپ کے ادارے اور آپ کے کارخانے میں دیکھتے ہیں، مجھے تو خطرہ یہ ہے کہ اگر آپ نے اپنے واسطے سے اسلامی انقلاب کے لیے ووٹ لینا چاہا تو آپ کی سرپرستی میں کام کرنے والوں کا ووٹ بھی آپ کو نہ مل سکے گا۔ درآنحالیکہ یہ لوگ اسلام کے حق میں مخلص ہوں گے۔

•••-----•••-----•••

آپ جس بستی میں رہتے ہیں جس معاشرے اور جس خاندان سے آپ کا تعلق ہے وہاں آپ کا تعارف ایک ''بہترین انسان'' کی حیثیت سے کیوں نہیں ہے۔ کیا آپ واقعی اپنی بستی والوں کے دردمند ہیں۔ کیا آپ ان کے دکھ درد کے شریک ہیں۔ کیا آپ ان کی پریشانیاں معلوم کرتے اور ان کو دور کرنے کے لیے فکرمند رہتے ہیں۔ کیا آپ اپنی سوسائٹی کے لوگوں کے جذبات واحساسات کا احترام کرتے ہیں۔ کیا آپ کا سلوک ان کے ساتھ فیاضی، فراخ دلی اور فضل واحسان کا سلوک ہے۔ کیا آپ کے معاملات سے وہ مطمئن ہیں۔ کیا انہیں یہ یقین ہے کہ آپ معاملے میں کبھی ناانصافی نہیں کریں گے اور ان کا حق پورا پورا دیں گے بلکہ فضل واحسان اور ایثار سے کام لیں گے۔ آپ سے تعلق رکھنے والے واقعی آپ کے خیر خواہ اور مخلص ہیں، سوچیے کیا ان کی وفاداریاں آپ کے ساتھ ہیں؟ کیا آپ کو یہ فکر بے چین کیے رہتی ہے کہ ان کی ضرورتیں پوری کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔ کیا کبھی یہ سوچ کر بھی آپ کی نیند اچاٹ ہوئی ہے کہ آپ کی نگرانی میں کام کرنے والوں کی دینی اور اخلاقی زندگی کے بارے میں بھی کل آپ سے پوچھا جائے گا۔

•••-----•••-----•••

میرا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ آپ ان پر اثر انداز کیوں نہیں ہیں۔ آپ کے ساتھ شب و روز رہنے کے باوجود اس خوش گوار انقلاب کے اثرات ان کی زندگیوں میں کیوں نہیں ہیں، جس کے آپ داعی ہیں حالانکہ یہ حقیقت بھی آپ کے لیے یقیناً قابلِ غور ہے کہ جس گھر میں آپ بستے ہیں جس معاشرے میں آپ زندگی گزارتے ہیں جس خاندان سے آپ کا تعلق ہے جو دفتر، جو کارخانہ اور جو ادارہ آپ کے نظم میں چل رہا ہے اس میں لازماً آپ کی اچھائیوں کا اثر پڑنا چاہیے۔ نہ پڑ رہا ہو تو آپ کو فکرمند ہونا چاہیے—غلط زندگیوں کے ساتھ برسہا برس تک نباہ پر اطمینان کیسا؟ انسان کی فطرت خیر پسند ہے، خیر کا اثر انسان بالعموم قبول کرتا ہے—لیکن چھوڑیئے ان کے اثر لینے

یا نہ لینے کو، آپ اپنے بارے میں سوچیے کہ آپ ان کے حقوق واقعی ادا کر رہے ہیں؟ آپ کے معاملے سے وہ مطمئن ہیں؟ آپ کا رویّہ انہیں اسلام سے قریب کر رہا ہے؟ آپ کے برتاؤ سے ان کے دل اسلام کے لیے کھل رہے ہیں، یا وہ آپ کے بارے میں اس سے مختلف رائے رکھتے ہیں۔ آپ سے قریب رہنے والوں کی آپ کے بارے میں رائے ہرگز نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ یہ ایک آئینہ ہے، اس میں آپ اپنی تصویر دیکھ سکتے ہیں، آپ کے پڑوس میں رہنے والوں کی رائے آپ کے بارے میں ہرگز بے وزن قرار نہیں دی جاسکتی۔

محترم! میرا احساس تو یہ ہے کہ آپ اپنے وجود پر بھی اس اسلام کو غالب نہیں کر سکتے ہیں جسے دنیا میں غالب کرنا آپ کا نصب العین ہے۔ آپ کا وجود اور اس کی صلاحیتیں تو بڑی حد تک آپ کے اختیار میں ہیں۔

آپ کے سینے میں دھڑکنے والا دل آپ کا دل ہے، اس میں پیدا ہونے والے جذبات آپ کے جذبات ہیں، ان جذبات پر بھی آپ قابو نہیں رکھتے، آخر آپ کے دل میں دوسروں کے خلاف غصہ اور نفرت کیوں ہے؟ اللہ کے دشمنوں کے خلاف نہیں بلکہ ان لوگوں کے خلاف جو اللہ کی فرمانبرداری کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی زبان سے آپ کے ساتھیوں کے دل زخمی کیوں ہیں، وہ کیوں شاکی ہیں کہ آپ نے ان کی تحقیر کی ہے۔ بارہا آپ نے اپنی ناروا باتوں سے ان کے دل چھیلے ہیں۔ ان کا یہ احساس کیوں ہے کہ آپ ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ انہیں یہ شکایت کیوں ہے کہ انہیں آپ نے گرانے کی کوشش کی ہے اور ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ زندگی کا بڑا حصّہ آپ کے ساتھ گزارنے کے باوجود وہ آپ کی زیادتی کا رونا کیوں روتے ہیں۔ نافرض شناسی اور غیر ذمہ داری کا الزام آپ پر کیوں ہے، آپ اپنی ذات میں اس انقلاب کا ادنیٰ نمونہ کیوں نہیں ہیں جس انقلاب کے آپ داعی ہیں؟ کیا ایسے لوگ بھی کوئی انقلاب لاسکتے ہیں جو اپنی زندگی میں بھی انقلاب لانے کی ہمت نہ رکھتے ہوں۔

آپ کے جذبات، آپ کے اخلاق، آپ کا برتاؤ، آپ کے معاملات، آپ کا سلوک، آپ کی عادات اور آپ کے طور طریق، ان میں کوئی چیز بھی اگر ان لوگوں کو اسلام کی طرف متوجہ نہیں کر رہی ہے تو بتائیے کس منہ سے آپ کہتے ہیں کہ آپ اسلامی انقلاب کے داعی ہیں!

•••------•••------•••

قابلِ احترام ساتھی، اسلامی انقلاب کا معاملہ دوسرے انقلابات سے بہت مختلف ہے۔ آپ اپنی کوششوں کے نتیجے میں اللہ کا کامل بندہ بننے کی آرزو رکھتے ہیں اور آخرت میں اس سے اجر کے خواہاں ہیں۔ آپ کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ آپ اسلامی انقلاب برپا کر دیں۔ اگر کچھ سعید روحوں کے تعاون سے یہ صبح سعادت آپ دیکھ بھی لیں اور آپ کی زندگی میں اس انقلاب کا کوئی اثر نہ ہو تو آپ سرتاسر ناکام ہیں۔ آپ اللہ کے مخلص بندوں کی طرح اگر اپنی زندگی کو اسلام کے رنگ میں رنگنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو اللہ کی نظر میں آپ کی کوئی قیمت نہیں ہے اور آپ

آخرت میں کسی اجر کے مستحق نہیں ہیں۔ اسلامی انقلاب کے اجر میں آپ کا حصّہ اتنا ہی ہے جتنا آپ اپنی زندگی میں انقلاب لے آنے کی کوشش کریں۔

میرے محترم! دوسروں کی عاقبت بنانے کے دعوؤں سے زیادہ اپنی عاقبت کی فکر کیجیے —— آج کے نام نہاد دین پسندوں کا ایک مرض یہ بھی ہے کہ وہ دوسروں کی عاقبت بنانے کے لیے بے چین ہیں اور اپنی صرف دنیا بنانے کے لیے سرگرداں ہیں۔ خدارا اس مرض کا کوئی سایہ اپنے اوپر نہ پڑنے دیجیے۔ دوسروں کی زندگی میں اسلامی رنگ لانے سے پہلے اپنی زندگی میں اسلامی رنگ لانے کی کوشش کیجیے۔ دوسروں کو جو کچھ بتائیں وہ خود کر کے دکھائیں، سب سے زیادہ اپنی فکر کیجیے اور قول وعمل کے اس فاصلے کو کم کرنے کی انتھک کوشش کیجیے جو آپ کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہوسکتا ہے۔ اس فاصلے کی موجودگی میں اللہ بھی آپ پر کرم کی نظر نہیں کرے گا اور بندوں کے درمیان بھی آپ کوئی عزت کا مقام نہ پاسکیں گے اور آپ کا انقلابی خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکے گا۔

مجھے ہرگز اصرار نہیں کہ میرا تجزیہ اور تبصرہ ہر پہلو سے مکمل ہے، ہوسکتا ہے کہ میرے الفاظ صحیح صورتحال کو واضح کرنے میں کوتاہ ہوں۔ بالکل ممکن ہے کہ میری اس یاد دہانی اور تذکیر میں حکمت وسوز کی کمی ہو، یہ بھی بعید نہیں کہ میرے اندازِ بیان میں غلو ہوگیا ہو اور میرا تراشا ہوا الفاظ کا یہ جامہ آپ کی شخصیت پر فٹ نہ آتا ہو —— لیکن راہِ حق کے مخلص ساتھی! اس کے باوجود بھی آپ اسے یکسر نظر انداز نہ کریں، نہ نفس کو یہ ڈھیل دیں کہ وہ دوسروں پر اس تنقید کو چسپاں کرنے میں وقت ضائع کرے، بلکہ سنجیدگی سے تنہائی میں اپنا جائزہ لیجیے —— میرا احساس تو یہ ہے کہ آپ کے ماضی اور حال میں بھی فرق ہے۔ بے شک دنیوی اعتبار سے آپ کا حال آپ کے ماضی سے بہتر ہوگا لیکن دینی اعتبار سے تو آپ کا حال ماضی سے بہتر ہونا کیا معنی اور کمتر ہی نظر آرہا ہے۔ مجھے تو آپ کے جذبات، آپ کے حوصلے، آپ کے ولولے اور آپ کے عزائم کچھ ٹھٹھرے ہوئے نظر آتے ہیں اور دینِ حق کے لیے آپ کا اضطراب جمود میں بدلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

رفیق محترم! اللہ نے آپ کو دین کی عظیم دولت سے نوازا ہے۔ آپ کو بہت بڑے کام کے لیے منتخب کیا ہے۔ اس دولت کی قدر کیجیے اور اس انتخاب پر اللہ کا شکر ادا کیجیے۔ پناہ بخدا آپ جانتے ہیں کہ اس عظیم دولت کی ناقدری اور اس حسن انتخاب کی ناشکری کا انجام کیا ہے۔ بیان کروں تو کیسے کروں، دل لرزتا ہے اور قلم میں تاب نہیں ——

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝

(آل عمران ۳:۸)

# اپنی دین داری کا جائزہ لیجئے

آپ خود کو دین دار سمجھتے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ ''کل'' اللہ آپ کو آپ کی دین داری کا صلہ عطا فرمائے گا — اللہ آپ کی امید کو پورا کرے اور آپ کی دین داری کو سند قبولیت بخشے لیکن کبھی آپ نے اپنی دین داری کا سنجیدگی سے جائزہ بھی لیا ہے؟ آپ اپنی نظر میں دین دار ہیں اور دین کے تقاضوں پر ٹھیک ٹھیک عمل کر رہے ہیں لیکن قرآن وسنت کی رو سے بھی آپ کی دین داری مطلوب ومقبول ہے یا نہیں؟ سوچنے کی بات یہ ہے! ''کل'' میدانِ حشر میں آپ کی فلاح ونجات کا فیصلہ اس بنیاد پر نہ ہوگا کہ آپ اپنی نظر میں دین دار تھے اور اپنی سمجھ کے مطابق دین کے مطالبے پورے کر رہے تھے بلکہ فیصلہ اس بنیاد پر ہوگا کہ اللہ کی نظر میں واقعی دین دار ہیں یا نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ دنیا میں آپ دین دار سمجھے جاتے رہے ہوں، لوگ آپ کو دین دار ہی نہیں دین کا نمائندہ تسلیم کرتے رہے ہوں۔ آپ بھی خود کو دین دار سمجھتے رہے ہوں اور اپنے زعم میں آپ دین پر عمل کرنے والے بھی ہوں لیکن اللہ کی نظر میں آپ کی دین داری وہ دین داری نہ ہو جو اللہ کو مطلوب ہے۔ قدم بڑھانے سے پہلے اپنی دین پسندی اور اپنی روش کا جائزہ لیجئے اور بے لاگ جائزہ لیجئے۔ اس معاملے میں لاپروائی اور تساہل کریں گے تو اپنے ساتھ ظلم کریں گے۔

''کل'' آپ کی دین پسندی اور دین داری کا فیصلہ ہوگا اور آپ کا انجام آپ کے سامنے آئے گا۔ یہ انجام انتہائی خوش کن بھی ہوسکتا ہے اور انتہائی بھیانک بھی — یہ ''کل'' بہت قریب ہے۔ اس کے لیے سورج ڈوبنے اور طلوع ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ ''کل'' کسی وقت بھی شروع ہوسکتی ہے۔ اس کا آغاز صرف آپ کی آنکھ بند ہونے کا منتظر ہے۔ آپ کی آنکھ کسی وقت بھی بند ہوسکتی ہے۔ کچھ نہیں معلوم موت کب آجائے اور کس حالت میں آجائے اور فکر وعمل کی یہ مہلت ختم ہوجائے۔ یہ مہلت پھر کبھی نہ ملے گی۔ ٹھہر کر سوچیے، کہیں آپ اس مہلت کو ضائع تو نہیں کر رہے ہیں؟

•••-------•••-------•••

آپ اپنی دانست میں دین پر عمل کر رہے ہیں، سوسائٹی میں ایک دین دار مسلمان کی حیثیت سے جانے

پہچانے جاتے ہیں، لوگ آپ کی ذات سے دین کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور میں آپ کو یاددہانی کرا رہا ہوں کہ اپنی دین داری کا جائزہ لیجئے۔ بے شک میری یہ جرأت کچھ عجیب سی ہے، ممکن ہے آپ بھی اپنے اندر کچھ برہمی محسوس کر رہے ہوں اور کڑھ رہے ہوں لیکن یقین مانئے میرا فرض مجھے اکسا رہا ہے' آپ کی خیر خواہی مجھے آمادہ کر رہی ہے' آپ کی محبت مجھے ابھار رہی ہے کہ آپ سے کرنے کی بات یہی ہے، میں اپنے ساتھ بھی ظلم کروں گا اور آپ کے ساتھ بھی اگر آپ کو متوجہ نہ کروں۔ آپ ٹالیں نہیں، رک کر غور کریں اور اللہ سے ہدایت کی دعا کر کے غور کریں۔ اللہ ہمیں اور آپ کو اس وقت کی رسوائی سے محفوظ رکھے جب تلافی کی کوئی شکل نہ ہوگی۔ ''آج'' فکر و عمل کا موقع ہے۔ سوچیے اور اپنے آپ کو بدل ڈالیے۔ ''کل'' صرف انجام دیکھنے کا وقت ہوگا۔

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (الحشر ۵۹:۱۸)

ہر شخص کو سوچنا چاہیے کہ وہ کل کے لیے کیا فراہم کر رہا ہے۔

بے شک اسلام کا نام لینے والوں میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو اس ''کل'' کی فکر سے بے نیاز ہیں، ان کو صرف ''آج'' سے شغف ہے، وہ ہرگز نہیں چاہتے کہ ''کل کی فکر'' سے اپنے ذہن کو بوجھل بنائیں۔ وہ صرف اس لیے جی رہے ہیں کہ دادِ عیش دیں، آپ مجھے ان کی طرف متوجہ نہ کریں، اس وقت میں صرف آپ سے بات کر رہا ہوں، آپ کو متوجہ کر رہا ہوں کہ آپ اپنے ذہن و فکر کا جائزہ لیں، اپنی روش کا جائزہ لیں، آپ کو ''کل کی فکر'' کا دعویٰ ہے، آپ سوچیں کہ دین کے معاملے میں آپ کا اندازِ فکر و عمل واقعی وہی ہے جو آپ کے اللہ کو مطلوب ہے اور جس سے صلہ پانے کی توقع میں آپ یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ''کل'' فیصلے کے دن اللہ آپ کی دین داری آپ کے منہ پر دے مارے اور آپ سے کہے ''تم نے میرے دین کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال لیا تھا، اپنی خواہشات کو میرے دین کا تابع نہیں بنایا تھا تم مؤمن نہیں ہو، میرے رسول ﷺ نے تمہیں صاف بتا دیا تھا:

لا یؤمن احدکم حتّٰی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ (مشکوٰۃ)

تم میں سے کوئی مؤمن نہیں ہے جب تک اس کی خواہش اس دین کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔

•••-----•••-----•••

دین کے مطابق زندگی گزارنے کی خواہش رکھنے والوں میں عام طور پر تین نقطۂ نظر پائے جاتے ہیں۔

۱- ترکِ دنیا

۲- دنیا کے ساتھ ساتھ دین

۳- دین کے لیے دنیا۔

مسلمانوں میں تین قسم کے نقطۂ نظر رکھنے والے لوگ موجود ہیں اور تینوں قسم کے لوگ اپنے اپنے اختیار کیے ہوئے نقطۂ نظر کو صحیح ثابت کرنے کے لیے قرآن وسنت سے دلائل فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

•••-------•••-------•••

پہلے نقطۂ نظر کا حاصل یہ ہے کہ دنیا مؤمن کے لیے قید خانہ ہے، مؤمن کا اصلی گھر آخرت ہے، اس کا سب سے بڑا دشمن اس کا اپنا نفس ہے، اس کی خواہشات کا گلا گھونٹنا، اس کی ضرورتوں کو پورا نہ کرنا بلکہ اس کو ایذا دینا اور دنیا کی ہر نعمت، لذت، آسائش اور سہولت سے اس کو محروم رکھنا ہی اس کی ترقی کا راستہ ہے۔

دین داری وہی ہے جو دنیا کے دھندوں سے دور رہے، دنیا والوں سے الگ تھلگ زندگی گزارے، دنیا کے معاملات سے تعلق نہ رکھے، دنیوی زندگی اور اس کے لوازم کی فکر سے بے نیاز رہے، جو ہمہ وقت ذکر وفکر، تسبیح و تہلیل، عبادت وریاضت میں لگا ہو—— دنیا کی زندگی میں اس کی مثال اس مسافر کی سی ہو جو دوپہر کی دھوپ میں چند لمحے ستانے کے لیے کسی درخت کے سائے میں ٹک گیا ہو، دین دار آدمی وہ نہیں ہے جو مردار دنیا پر للچائی نظر ڈالے—— اور اس کو حاصل کرنے کا دل میں خیال لائے۔ دین دار وہ ہے جو صرف آخرت کی سوچے اور اس ایک فکر کے سوا ہر فکر سے اس کا ذہن خالی ہو۔

دنیا کی لذتوں کو چھوڑنے اور یہاں کے عیش سے منہ موڑنے کا جس میں حوصلہ نہ ہو، دین میں اس کا کوئی حصّہ نہیں۔ آخرت کی کامرانی صرف انہی جواں مردوں کے لیے ہے جو دنیا کو ترک کرنے، اپنے دل سے اس کی محبت کھرچ پھینکنے اور اس کی رنگینیوں سے آنکھ بند کرنے کی ہمت رکھتے ہوں۔

•••-------•••-------•••

اس نقطۂ نظر کے بہت سے اجزاء صحیح ہیں۔ قرآن وسنت سے بھی ان کی تائید ہوتی ہے، اور بزرگوں کے اقوال واعمال سے بھی۔ امت کے اولیاء، صوفیاء، صلحاء کی زندگیوں کی جو تصاویر ہم تک منتقل ہوئی ہیں ان سے بھی اس نقطۂ نظر کے بہت سے اجزاء کو تقویت ملتی ہے—— اس صورتِ حال میں یہ جرأت تو نہیں ہوتی کہ ان حضرات پر کوئی تلخ تنقید کی جائے یا ان پر فہم دین سے محرومی کا الزام لگایا جائے لیکن یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ یہ نقطۂ نظر بحیثیت مجموعی نہ پوری امت کے لیے قابلِ عمل ہے نہ قرآن وسنت کی مجموعی تعلیمات اس کی حمایت کرتی ہیں، نہ دورِ سعادت میں امت کا یہ مجموعی نقطۂ نظر رہا ہے، نہ اس کو مطلوب بنا کر آپ اسلام کو اس حیثیت سے پیش کر سکتے ہیں کہ یہ پوری زندگی کا دین ہے، زندگی کے تمام مسائل کا حل اس میں موجود ہے اور یہ پوری زندگی کو اپنے نقشے کے مطابق تعمیر کرتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں کچھ افراد تو ایسے ہو سکتے ہیں جو اپنے مخصوص ذوق اور افتادِ طبع

کی بناء پر دنیا کے دھندوں سے نگاہیں بند کر لیں لیکن بحیثیت مجموعی پوری امت کے لیے یہ نقطۂ نظر قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔اسی لیے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا رھبانیہ فی الاسلام

اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔

•••-----•••-----•••

دوسرے نقطۂ نظر کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کے ساتھ ساتھ دین کو اپنایا جائے ، دنیا کی نعمتیں اور ترقیاں نظر انداز کرنے کی چیزیں نہیں ہیں، یہ دنیا کی رنگینیاں، یہ حسن و جمال، یہ سکون و آسائش، یہ عیش ولذت کے سامان، یہ کیف ومستی کے اسباب، یہ گونا گوں نعمتیں اسی لیے ہیں کہ اللہ کے بندے ان سے فائدہ اٹھائیں اور لذت اندوز ہوں۔اسی کے ساتھ ساتھ جس قدر ممکن ہو دین کے اصول واحکام کی بھی پابندی کی جائے۔دین ترکِ دنیا کا سبق نہیں دیتا۔وہ دنیا میں رہنے اور دنیا برتنے کے احکام دیتا ہے اور اس سے ہرگز نہیں روکتا کہ آدمی اپنی دنیا بنائے۔

•••-----•••-----•••

اس نقطۂ نظر کے بعض اجزا بھی صحیح ہیں اور بظاہر یہ نقطۂ نظر بڑا معتدل اور بے ضرر سا نظر آتا ہے کہ آدمی دنیا کی کامیابی بھی حاصل کرے اور اپنی عاقبت بھی سنوارے۔اس نقطۂ نظر میں بڑی جاذبیت ہے کہ دنیا بھی ہاتھ سے نہیں جاتی جو انسان کے لیے انتہائی دل کش ہے اور آخرت بننے کی بھی امید رہتی ہے، جس کا کھٹکا ہر باشعور انسان کو لگا رہتا ہے۔

•••-----•••-----•••

آپ مسرور ہیں کہ آپ نے دین داری کا یہ نہایت جامع تصور اپنا رکھا ہے، آپ دنیا میں رہ کر دین کے تقاضے پورے کر رہے ہیں اور صحیح تصور کے ساتھ دنیوی زندگی گزار رہے ہیں — بے شک آپ نے صحیح جذبات کے ساتھ دین کی راہ پر چلنے کا ارادہ کیا ہوگا لیکن شیطان اپنی ذہانت سے آپ کو دین سے بہت دور لے گیا ہے اور اب صرف دنیا آپ کا مطلوب بن گئی ہے۔بے لاگ جائزہ لیجیے اپنے نقطۂ نظر کا اور اپنی دوڑ دھوپ پر انصاف کی نظر ڈالیے۔اپنے نفس کے چور کو پکڑنے میں بصیرت و ذہانت سے کام لیجیے۔میرا خیال ہے، دنیا کی بے پناہ کشش، نفس کے فریب اور شیطان کی سازش نے آپ کو الجھا لیا ہے۔اندر سے آپ خالص دنیا پرست ہیں باہر سے دینی خول ہے اور نہایت موٹا خول۔نفس کی تاویلات نے آپ کو دھوکے میں مبتلا کر رکھا ہے، آپ کے نزدیک دنیا ہر حال میں مقدم ہوگئی ہے۔دین آپ کی زندگی میں صرف اس لیے ہے یا اس کی یہ حیثیت بن گئی ہے کہ وہ آپ کی دنیا بنانے کا ایک ذریعہ ہے۔

•••-----•••-----•••

بے شک آپ لوگوں کو دین کی طرف متوجہ بھی کرتے ہیں، اپنی حکیمانہ گفتگو اور شیریں انداز کلام سے انہیں متاثر بھی کرتے ہیں، سٹیج سے آپ دین پر مرتب تقریریں بھی کرتے ہیں، دین کے موضوع پر آپ کی تحریریں بھی نہایت جان دار ہیں، اسی حیثیت سے ملک میں آپ کا تعارف بھی ہے اور آپ کی تحریر و تقریر کے چرچے بھی ہیں لیکن جب میں قریب سے آپ کو دیکھتا ہوں یا کبھی آپ کے مصنوعی چہرے سے نقاب الٹ جاتی ہے اور آپ کے حقیقی چہرے کی جھلک نظر آجاتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دین داری آپ کا پیشہ ہے اور دین داری کو ایک فن کی حیثیت سے آپ نے اپنا رکھا ہے۔ آپ کا حقیقی نصب العین دنیا پرستی ہے، زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی فکر ہر وقت آپ پر غالب ہے اور بدقسمتی سے دین کو آپ نے اس کا ذریعہ بنالیا ہے یا بن گیا ہے۔

آپ یہود کے کردار پر تنقید کرتے ہیں کہ وہ تھوڑی قیمت میں اللہ کی آیتوں کو بیچتے تھے۔ بے شک آپ تھوڑی قیمت میں نہیں بیچ رہے ہیں' آپ بڑی قیمت وصول کررہے ہیں اور مگن ہیں کہ خدمتِ دین آپ کا مشغلہ ہے۔

•••-----•••-----•••

آپ سوچتے کیوں نہیں؟ آپ کے قریب ترین لوگ، شب و روز آپ کے ساتھ رہنے والے لوگ آپ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ یہ لوگ آپ کو قریب سے دیکھ کر دین سے برگشتہ کیوں ہو جاتے ہیں۔ یہ آپ کے معاملات سے غیر مطمئن کیوں ہیں، یہ آپ کو پکا دنیا دار اور مال پرست کیوں کہتے ہیں، یہ آپ کی دین داری کو ڈھونگ کیوں بتاتے ہیں؟ آپ اپنی تاویلات سے اپنے نفس کو دھوکا تو دے سکتے ہیں، اپنی چرب زبانی سے اللہ کی مخلوق کو خاموش بھی کرسکتے ہیں لیکن ان کے دلوں کو مطمئن نہیں کرسکتے۔

خدارا! اپنی روش پر غور کیجیے، اللہ نے آپ کو دین کی دولت سے نوازا تھا، آپ نے اسے دنیا سے بدل ڈالا، باقی کو چھوڑ کر فانی کے پیچھے پڑ گئے۔ اب آپ کی شخصیت میں نہ وہ جاذبیت ہے نہ وہ سوز ہے نہ دین کی وہ لگن ہے نہ دین کے لیے کچھ کرنے کی وہ تڑپ ہے۔ اگر کچھ ہے تو صرف یہ کہ دنیا بنانے کا کوئی موقع آپ کے ہاتھ سے نہ جانے پائے۔

•••-----•••-----•••

بے شک آپ خیرات بھی کرلیتے ہیں، دین کے نام پر کچھ خرچ بھی کرتے ہیں، خدمت دین کے لیے کچھ وقت بھی نکالتے ہیں — ممکن ہے یہ سب کچھ اس لیے ہو کہ سوسائٹی میں اسی حیثیت سے آپ کا تعارف ہے اور آپ اپنی ساکھ باقی رکھنے میں اپنا فائدہ محسوس کرتے ہیں۔ کیا آپ سوچتے ہیں کہ اپنی پوری قوت و صلاحیت، اپنے سارے وسائل و ذرائع دنیا سمیٹنے میں کھپا دینے کے ساتھ ساتھ چند ٹکے دین کے لیے صرف کرنے اور چند لمحے دین کے موضوع پر گفتگو کرنے سے دین کی خدمت کا حق ادا ہو جائے گا اور اللہ کی نظر میں آپ دین دار قرار پائیں

گے۔ زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھیے اور خلقِ خدا جو کچھ آپ کو کہتی ہے اس کو جاننے کی کوشش کیجیے۔ مشتعل ہونا چھوڑ یئے۔ اب موقع ہے سوچ لیجیے، اپنی ذات پر ظلم نہ کیجیے۔ ہدایت مل جانے کے بعد پھر اسے ٹھکرانا اور دین کے بجائے دنیا کو اپنا مطلوب بنانا بدترین قسم کی محرومی ہے۔ اللہ آپ کو اس سے محفوظ رکھے۔

بے شک آپ کو کچھ ایسے لوگ بھی مل جاتے ہیں جو آپ کی روش کو حق بجانب ٹھہراتے ہیں، اپنی سادہ لوحی سے آپ کی تاویلات سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ آپ کی کوششوں کو سراہتے ہیں اور آپ کی حمایت کرنے لگتے ہیں لیکن آپ کے حقیقی بہی خواہ وہی ہیں جو آپ پر بے لاگ تنقید کرتے ہیں۔ ان کی تنقید تلخ سہی، ان کا انداز جارحانہ سہی لیکن وہ آپ کے محسن ہیں۔ ''آج'' کا بڑے سے بڑا نقصان ''کل'' کے معمولی سے معمولی نقصان کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ''آج'' کی رسوائی کو خوشی خوشی برداشت کر لیجیے اور اس فکر میں لگ جایئے کہ ''کل'' رسوائی نہ ہو۔

آپ خود کو اور دوسروں کو مطمئن کرتے ہیں کہ دین دنیا سے کٹنے کی تلقین نہیں کرتا، وہ دنیا کی ترقیوں سے نہیں روکتا۔ محترم! بالکل بجا، لیکن بڑا فرق ہے اس بات میں کہ آدمی دین کا سہارا لے کر دنیا بنانے میں مگن ہو جائے' اور اس بات میں کہ دنیا کی طرف صرف اس لیے متوجہ ہو کہ اس کو اپنی عاقبت سنوارنے کا ذریعہ بنائے۔ اس کا صحیح فیصلہ تو کل حشر کے میدان میں علام الغیوب ہی کرے گا لیکن اللہ کے بندے بھی کسی نہ کسی درجے میں محسوس کر لیتے ہیں کہ آپ نے اپنی دنیا دین پر نثار کر دی ہے یا اپنے دین کو دنیا بنانے کے لیے قربان کر رہے ہیں۔ اس احساس کو سب سے بڑی نعمت سمجھیے اور اس سے فائدہ اٹھایئے۔ آپ یوں کیوں سوچتے ہیں کہ اپنے بارے میں جو فیصلہ کر رہے ہیں صرف وہی صحیح ہے، اگر آپ کو اپنا انجام عزیز ہے تو کھلے ذہن کے ساتھ لوگوں کے فیصلے سنیئے، ان کی رایوں کو بھی وزن دیجیے ــــ اور ان سے اپنی اصلاح میں مدد لیجیے۔

•••------•••------•••

دین داری کا تیسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دنیا سے کٹنا بھی صحیح نہیں ہے اور اس میں الجھنا بھی صحیح نہیں ہے۔ دنیا آزمائش اور امتحان کی ایک مہلت ہے، یہاں اللہ نے آپ کو جو کچھ دیا ہے جس حال میں رکھا ہے اور جن نعمتوں سے نوازا ہے انہی میں آپ کی آزمائش ہے ــــ ان پرچوں کو چھوڑ کر بھاگنا، ان کو حل کرنے سے جی چرانا، ان سے غفلت برتنا بھی آپ کی ناکامی ہے اور اس امتحان کی مہلت ہی کو سب کچھ سمجھ کر اسی میں مگن ہونا اور امتحان کے بعد نتیجے کی زندگی سے بے پروا ہو جانا بھی حماقت اور ناکامی ہے۔

دنیا اور دنیا کی نعمتوں سے آپ کا تعلق صرف یہ ہے کہ آپ ان سے اپنی عاقبت سنوارنے میں مدد لیں۔ دنیا میں ہر ترقی، ہر نعمت، ہر آسائش آپ کے لیے ہے، لیکن اس طرح کہ کبھی ان میں سے کوئی چیز آپ کا مقصود نہ بنے،

مسافر راستے کی ہر چیز سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن اس کی نگاہ ہمہ وقت منزل پر رہتی ہے۔ اگر اس کا سفر اس لیے ہو کہ اس کے ذریعے اسے اپنی منزل کو سنوارنا اور کامیاب بنانا ہے تو وہ سفر کی اس پوری مہلت میں ہر ہر چیز کو اسی حیثیت سے دیکھے گا اور صرف اتنا ہی تعلق رکھے گا جتنا اس کے مقصد اور منزل کے لحاظ سے ناگزیر ہوگا۔ سفر کے دوران میں ملنے والی نعمتوں اور آسائشوں کے پیچھے وہ اس طرح ہرگز نہیں پڑے گا کہ اپنی منزل بھول جائے اور سفر ہی کو منزل بنا بیٹھے۔

اس نقطۂ نظر کو اپنانے والا ہر عملی میدان میں پیش پیش ہوگا لیکن صرف اس لیے کہ اس کو اپنی آخرت بنانے کا ذریعہ بنائے۔ وہ کوئی موقع ضائع نہ ہونے دے گا۔ وہ آخرت کا حریص ہوگا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک حدیث میں نہایت جامع انداز میں اس نقطۂ نظر کو بیان فرمایا ہے اور اس کی تائید و تصدیق قرآن و سنت کے پورے ذخیرے سے ہوتی ہے:

ان الدنیا حلوۃ خضرۃ وان اللہ مستخلفکم فیھا فینظر کیف تعملون فاتقو الدنیا

(ترمذی' کتاب الزہد باب ۴۱)

بے شک یہ دنیا بڑی شیریں، شاداب اور دل کش ہے، اللہ نے اس میں تمہیں جانشین مقرر کیا ہے تاکہ وہ تمہیں جانچے کہ تم کیا روش اختیار کرتے ہو۔ پس دنیا سے بچ بچ کر رہو۔

•••-----•••-----•••

دوسرے اور تیسرے نقطۂ نظر میں بظاہر بڑی مشابہت ہے لیکن ان دونوں میں جوہری فرق ہے۔ دوسرے نقطۂ نظر کو اپنانے والا ہر چیز کو دنیوی منفعت کے پیمانے سے تولتا ہے اور اسی کے لحاظ سے اس کی قیمت متعین کرتا ہے۔ تیسرے نقطۂ نظر کو اپنانے والا ہر چیز کو آخرت کے پیمانے سے تولتا ہے اور اسی لحاظ سے اس کی قیمت متعین کرتا ہے۔ ایک دنیا کے ساتھ ساتھ دین سے تعلق جوڑے رکھنے کی خواہش رکھتا ہے اور ایک دین کی خاطر دنیا کو برتنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر کیسے ممکن ہو کہ دونوں کا انجام یکساں ہو؟



# میدانِ حشر کا ایک سوال

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ حشر کے میدان میں ہر ہر شخص سے پانچ سوال کیے جائیں گے اور جب تک وہ ان پانچ سوالوں کے جواب نہ دے لے گا، مجال نہیں کہ وہ اللہ کے حضور سے قدم ہٹا سکے۔

۱- اس نے اپنی زندگی کن کاموں میں لگائی۔

۲- اپنی جوانی کو کن کاموں میں کھپایا۔

۳- مال و دولت کن ذرائع سے حاصل کیا۔

۴- مال و دولت کن کاموں میں خرچ کیا۔

۵- اور جو علم حاصل تھا اس پر کہاں تک عمل کیا۔

بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب ہم اور آپ حشر کے میدان میں کھڑے ہوں گے اور ان سوالوں کے جوابات دے رہے ہوں گے۔ کس قدر خوش نصیب ہے وہ شخص جو اس زندگی میں ان سوالوں کے صحیح جوابات تیار کر رہا ہے اور ان سوالوں کو سامنے رکھتے ہوئے شعور کی زندگی گزار رہا ہے۔ زندگی آپ کو بھی ملی ہے، جوانی کی نعمت سے آپ بھی نوازے گئے ہیں، مال و دولت کے آپ بھی مالک ہیں، مال آپ بھی خرچ کر رہے ہیں، آپ کو بھی بہت کچھ علم حاصل ہے اور آپ بھی عمل کر رہے ہیں۔ سوچیے آپ کیا جوابات تیار کر رہے ہیں اور کل اللہ کو خوش اور مطمئن کرنے کے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں؟

اصلی زندگی آخرت ہی کی زندگی ہے ــــ دنیا کی زندگی بہت مختصر اور فانی ہے۔ آخرت کی زندگی ہمیشہ رہنے والی ہے۔ وہاں کا سکھ بھی ہمیشہ کا ہے اور وہاں کا دکھ بھی دائمی ہے۔ دنیا کی اس قلیل زندگی میں آپ کے ربّ نے آپ کو مہلت اور موقع دے رکھا ہے کہ آپ اپنی کوششوں سے اپنے لیے آخرت کی جیسی زندگی چاہیں بنا لیں ــــ ہمیشہ کا سکھ بھی آپ اپنے لیے فراہم کر سکتے ہیں اور ہمیشہ کا دکھ بھی آپ ہی کے اعمال کا نتیجہ ہوگا۔ آپ ہر لمحہ دنیا کی زندگی سے دور اور آخرت کے انجام سے قریب ہو رہے ہیں اور آپ کو شعور ہو یا نہ ہو، آپ کی زندگی ان پانچ سوالوں کا جواب تیار کر رہی ہے۔ یہ جوابات اللہ کے فضل سے آپ کو حسنِ انجام سے ہمکنار بھی کر سکتے ہیں اور یہی

جوابات آپ کو اللہ کے غضب میں گرفتار بھی کر سکتے ہیں۔

مسئلہ آپ کی اپنی زندگی کا ہے، اس مسئلہ کا تعلق محض عقلی طور پر حل کرنے سے نہیں ہے اور نہ اس کا تعلق کسی اور سے ہے۔ آپ سے اور صرف آپ سے اس کا تعلق ہے اور صرف آپ ہی کو اسے حل کرنا ہے۔ کوئی دوسرا اگر اس کے حل کرنے میں اپنا سب کچھ کھپا دے تب بھی آپ کے ہاتھ کچھ نہ آئے گا اور اگر آپ اپنے مسئلہ کو صحیح صحیح حل کرنا چاہیں تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی آپ کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ آپ کا ذاتی اور شخصی مسئلہ ہے۔ آپ ہی اس کے ذمہ دار ہیں اور آپ ہی کو اپنے کیے کا اچھا یا برا انجام دیکھنا ہے۔ آپ اس پر سوچنے کی زحمت اٹھائیں یا نہ اٹھائیں آپ کی زندگی بہر حال ان سوالات کے جوابات تیار کر رہی ہے اور اپنے وقت پر یہ جوابات بہر حال پیش ہوں گے۔

پھر معاملہ اس اللہ سے ہے، جس کے علم سے کوئی ذرہ پوشیدہ نہیں۔ آسمان کی فضائیں ہوں یا زمین کی تہیں، پہاڑوں کی چٹانوں کے سینے ہوں یا سمندر کی اتھاہ گہرائیاں، جہاں کہیں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے علم میں ہو رہا ہے۔ وہ عادل و حکیم ہے۔ اس کے یہاں کسی کے ساتھ ناانصافی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ آپ نے ذرّہ بھر نیکی کی ہوگی تو یقیناً اس کا صلہ آپ کے سامنے آئے گا اور ذرّہ بھر برائی کی ہوگی تو لازماً اس کا بدلہ آپ کو بھگتنا پڑے گا۔ نہ آپ اس کی گرفت سے بچ کر کہیں بھاگ سکتے ہیں نہ اسے دھوکا دے سکتے ہیں، نہ غلط بیانی یا چرب زبانی سے اسے مطمئن کر سکتے ہیں، نہ دنیا میں واپسی کا امکان ہے، نہ مزید مہلت مل سکتی ہے، نہ اللہ کے فیصلے کو چیلنج کیا جا سکتا ہے — حشر کا فیصلہ اٹل ہے، سنجیدگی سے سوچیے کہ آپ کیا فیصلہ چاہتے ہیں — کل دار الحساب میں ہوں گے اور عمل کی مہلت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہوگی۔

کیا آپ کو کبھی اس سوال نے لرزایا کہ آپ نے مال کہاں خرچ کیا۔ بظاہر یہ کتنا معمولی سا سوال ہے مگر یہ ہرگز معمولی سوال نہیں ہے۔ اس سوال پر آپ کی آخرت بننے اور بگڑنے کا مدار ہے۔ اس وقت ہم صرف اسی ایک سوال پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ اچھے اچھے دین دار اور باشعور افراد بھی اکثر اس سوال کی اہمیت کو محسوس نہیں کرتے اور انہیں یہ حقیقت لرزہ براندام نہیں کرتی کہ ہم جس طرح اور جن کاموں میں اپنا مال خرچ کر رہے ہیں اس کے بارے میں کل اللہ کے حضور کھڑے ہو کر ہمیں اللہ کو جواب دینا ہے۔

آپ پابندی سے زکوٰۃ دیتے ہیں، صدقہ و خیرات میں بھی خرچ کرتے ہیں اور کبھی تنگ دلی اور بخل کا مظاہرہ نہیں کرتے لیکن یہ بھی اطمینان کر لیجیے کہ آپ جہاں جہاں اور جس طرح خرچ کر رہے ہیں، ٹھیک ٹھیک اللہ کی مرضی کے مطابق کر رہے ہیں یا نہیں، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ دین کی ضرورت اور اللہ کی مرضی کچھ اور ہو اور آپ کا طرزِ عمل کچھ اور ہو۔

آپ نے حج ادا کر لیا اور اللہ نے آپ کو اتنا دیا ہے کہ بار بار آپ نفلی حج کریں۔ اس میں کیا شک ہے کہ بیت اللہ کی حاضری مؤمن کے لیے بہت بڑی سعادت ہے۔ آپ بار بار اس سعادت سے بہرہ ور ہو رہے ہیں —— آپ کے پڑوس میں ایک بیوہ ہے جو نانِ شبینہ کو محتاج ہے۔ محلّہ ہی میں ایک دق کا مریض ہے جس کے کئی بچے ہیں، خستہ حال، فاقوں کے مارے، تعلیم و مذہب سے محروم، آپ کی بستی میں کتنے ہی نوجوان واہی تباہی گھوم رہے ہیں، نہ ان کے روزگار کا کوئی بندوبست ہے، نہ ان کی تعلیم و تربیت کا، ان کی آوارگی اور بے راہ روی نہ صرف معاشرے کے لیے وبالِ جان ہے بلکہ ان کا وجود اسلام کے لیے بھی بدنامی کا باعث ہے۔ دق کے اس مریض نے آپ کو متوجہ بھی کیا، بیوہ نے بھی اپنی خستہ حالی آپ کو بتائی، نوجوانوں کی بے راہ روی سے بھی آپ کو روشناس کرایا گیا لیکن آپ نے کوئی نوٹس نہ لیا —— آپ کو تو یہ دھن ہے کہ بیت اللہ کی زیارت کر آئیں۔

برسات کی رات تھی، امجد شاہ کو آپ نے اپنے گھر سے نکال دیا، اس کی بیوی نے آپ سے گڑگڑا کر التجا کی کہ دو ماہ کی مہلت دے دیجئے، ہم آپ کا مکان خالی کر دیں گے لیکن آپ نے زبردستی دھکے دے کر اسے نکال دیا۔ اس کے ساتھ معصوم بچے بھی سہم سہم کر آپ سے درخواست کرتے رہے مگر آپ نے ایک نہ سنی، ان مظلوموں نے پیڑ کے نیچے بارش میں رات گزاری اور دوسرے دن آپ نے وہ مکان مدرسہ کے لیے وقف کر دیا۔ آپ کو دھن تھی کہ جلد از جلد زندگی ہی میں یہ کام کر جاؤں۔

آپ کی بستی میں سیلاب آیا، لوگوں کے گھر اجڑ گئے، لوگ دانے دانے کو محتاج ہو گئے۔ پریشان حالی سے لوگ پریشان ہو گئے۔ آپ ان کی مدد کر سکتے تھے۔ فاقہ مست بھوکے بچوں کے لیے کھانے پینے کا انتظام کر سکتے تھے۔ ان خانہ خراب لوگوں کے لیے چھپروں کا انتظام کر سکتے تھے، سیلاب کے مارے سسکتے مریضوں کی دوا دارو کا انتظام بھی کر سکتے تھے۔ آپ کو متوجہ بھی کیا گیا لیکن آپ نے ایک سن کر نہ دی اور یہ جواب دے کر لوگوں کو مطمئن کرنا چاہا کہ آپ کے سامنے بہت بڑا کام ہے، آپ کئی لاکھ دینی کتابیں چھاپنا چاہتے ہیں کہ اسلام کی تبلیغ کا کام ہو سکے۔

آپ کے ادارے میں کتنے ہی ملازم مالی پریشانی سے تنگ آ کر خودکشی کرنا چاہتے ہیں، کتنوں کی ضرورتیں پوری نہیں ہوئیں تو مجرمانہ زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے ہیں —— انہوں نے آپ کو اپنی خستہ حالی اور پریشانی کا حال سنانا چاہا تو آپ نے جھڑک دیا لیکن اخبارات میں خبریں شائع ہوئیں کہ آپ پبلک کے لیے مسافر خانہ کھول رہے ہیں تاکہ مسافروں کو تکلیف نہ ہو۔

آپ کی زندگی کی یہ چند جھلکیاں ہیں، خدارا! غور کیجئے کہ کل جب اللہ آپ سے پوچھے گا کہ تو نے مال کہاں خرچ کیا تو آپ اپنا یہ طرزِ عمل بتا کر واقعی اللہ کو خوش کر سکیں گے کہ آپ نے اپنا مال واقعی صحیح مصارف میں خرچ کیا،

کیا آپ مطمئن ہیں کہ آپ نے دین کے تقاضوں کے مطابق خرچ کیا اور آپ کا یہ صدقہ وخیرات اللہ کے یہاں قبول ہوگا؟

آپ کا کام صرف یہی نہیں ہے کہ آپ اللہ کی راہ میں خرچ کریں۔ یہ بھی آپ ہی کی ذمہ داری ہے کہ صحیح مصارف میں خرچ کریں، دین کا جہاں جہاں تقاضا ہو وہاں خرچ کریں —— بے شک مال آپ کا ہے لیکن آپ اگر اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اللہ سے صلہ چاہتے ہیں تو اللہ کے دین سے یہ بھی معلوم کیجئے کہ میں کہاں صرف کروں اور کس طرح صرف کروں۔ اپنے ذوق کی تسکین اور اپنے نفس وقلب کے اطمینان کے لیے خرچ کر رہے ہیں تو اللہ سے صلے کی طلب نہ کیجئے۔ اللہ سے صلہ تو اسی شخص کو مل سکتا ہے جو اللہ کی مرضی کے مطابق خرچ کرے۔ دین کے بتائے ہوئے مصارف میں صرف کرے اور دین کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق خرچ کرے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہوئے لرزتے رہیں کہ آپ نے واقعی جہاں جہاں خرچ کیا ہے اور جس جس انداز میں خرچ کیا ہے اس سے دین کا منشا بھی پورا ہوا یا نہیں اور اللہ کا جو حکم تھا وہ بھی پورا ہو سکا یا نہیں۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۝ (المؤمنون ۲۳:۶۰)

اور وہ دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور دل ان کے اس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ ہم کو اپنے ربّ کی طرف پلٹنا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص چوری، زنا اور شراب نوشی کرتے ہوئے اللہ سے ڈرے؟ فرمایا، نہیں اے صدیق کی بیٹی! اس سے مراد وہ شخص ہے جو نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے، زکوٰۃ دیتا ہے اور پھر اللہ عزوجل سے ڈرتا رہتا ہے۔



# اسلام کے پیغام کی اصل نوعیت

اللہ کا شکر ہے کہ آپ مسلمان ہیں اور اسلام پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسلام کو ماننے والے کی دو ذمہ داریاں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خود اس دین پر خلوص کے ساتھ عمل کرے، اس کے تقاضوں کو پورا کرے اور جب وہ مسلمان بنا ہے تو مخلص اور کامل مسلمان بن کر اللہ کی بندگی کا حق ادا کرے۔ دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اللہ کے دوسرے بندوں تک اسلام کی دعوت پہنچائے اور اسلام کا نمائندہ بن کر اس طرح زندگی گزارے کہ اس کے قول و عمل سے لوگ اسلام کو سمجھیں اور سیکھیں۔ تحریر، تقریر اور گفتگو سے بھی وہ اسلام کی نمائندگی کرے اور اپنی خانگی، سماجی اور شہری زندگی اور اعمال و اخلاق سے بھی اسلام کی نمائندگی کا حق ادا کرے۔

•••-------•••-------•••

اسلام کو ماننے والوں میں آج اکثریت ان لوگوں کی ہے جو ان دونوں قسم کی ذمہ داریوں میں کوتاہ ہیں — پہلی قسم کی ذمہ داری کا حق تو کسی قدر ادا ہو بھی رہا ہے لیکن جہاں تک دوسری قسم کی ذمہ داری کا تعلق ہے بالعموم مسلمانوں نے اسے بھلا رکھا ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کا حق ادا نہیں ہو رہا ہے' بلکہ بہت سے ایسے بھی ہیں جن کو یہ علم و شعور بھی نہیں ہے کہ یہ بھی ہماری ذمہ داری ہے — اور جو واقف ہیں وہ زبانی حد تک اس کو اپنی ذمہ داری تو سمجھتے ہیں لیکن عملاً وہ بھی غفلت اور لاپروائی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یا کم از کم اس ذمہ داری کو ادا کرنے میں اس قدر سرگرم نہیں ہیں کہ سماج میں ان کا تعارف اسلام کے نمائندے کی حیثیت سے ہو یعنی لوگ صرف یہ نہ سمجھتے ہوں کہ یہ مسلمان ہیں بلکہ یہ جانتے ہوں کہ یہ اسلام کے داعی ہیں اور اسلام کی طرف اللہ کے بندوں کو بلانا ان کی زندگی کا مشن ہے۔

•••-------•••-------•••

اسلام کی اشاعت و تبلیغ کا کام بلاشبہ آپ کو مسلمانوں میں بھی کرنا ہے، ان کے عقائد و اعمال کی اصلاح، ان کی خانگی اور معاشرتی زندگی کی اصلاح' ان کی نجی اور سماجی زندگیوں سے برائیوں کو دور کرنا اور بحیثیت مجموعی ان کو اونچا اٹھانا بھی یقیناً آپ کی ذمہ داری کا اہم حصہ ہے — لیکن یہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ محض مسلمانوں میں اصلاح

وارشاد کا کام انجام دے کر آپ کی ذمہ داری پوری نہیں ہو جاتی، مسلمانوں میں نماز روزے کی تبلیغ، بے جا رسموں کا انسداد اور حرام و حلال کی تفہیم یا نکاح و طلاق کے مسائل پر عمل کرانے کی کوشش کر کے آپ ہرگز مطمئن نہ ہو جائیں کہ آپ نے اسلام کی اشاعت اور نمائندگی کا حق ادا کر دیا۔ اصلاح و تبلیغ کے اس کام کی اہمیت اور ضرورت سے انکار نہیں ہے۔ یہ بھی اہم کام ہے۔ اس کا کرنا بھی ناگزیر ہے اور یقیناً اس کا بھی بڑا اجر و ثواب ہے لیکن یہ اشاعت دین اور دعوتِ دین کی ذمہ داری کا ایک جز ہے۔ آپ کا اصل کام یہ ہے کہ آپ ان لوگوں تک قول و عمل سے اسلام کی دعوت پہنچائیں جو اس سے ناواقف ہیں اور اس کو اپنا دین نہیں مانتے اور انہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ ان کے اللہ نے ان کو بھی اسی دین پر ایمان لانے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کا حکم دیا ہے۔

اسلام کی اشاعت اور عام اللہ کے بندوں تک اس کی دعوت پہنچانے کا فریضہ ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اسلام کی اصولی دعوت کی حیثیت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں، اسلام کے پیغام کی اصل حیثیت اور نوعیت کو سمجھنے کے بعد ہی آپ صحیح انداز سے دوسروں کے سامنے اس کی دعوت رکھ سکتے ہیں اور اسلام کی صحیح نمائندگی کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ اسلام کے پیغام کی اصل حیثیت سے واقفیت کے بغیر یہ بھی ممکن ہے کہ آپ اپنے اخلاص کے باوجود اسلام کو فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان پہنچا دیں اور اللہ کے بندوں کو اسلام سے قریب کرنے کے بجائے خدانخواستہ اور زیادہ دور کرنے کا باعث بن جائیں۔

•••-----•••-----•••

خوب سمجھ لیجیے کہ اسلام ایک عالمی اور انسانی دین ہے۔ رہتی دنیا تک کے انسان اس کے مخاطب ہیں خواہ وہ کسی خطہ زمین کے باشندے ہوں، کسی نسل اور قوم سے تعلق رکھتے ہوں، کوئی بھی زبان بولتے ہوں، کسی بھی تہذیب کو پسند کرتے ہوں، کسی بھی مذہب، نظام اور اِزم کے قائل ہوں یا سرے سے کسی مذہب اور طریق عبادت کے قائل ہی نہ ہوں ــــ اسلام سب کو مخاطب کرتا ہے، وہ صرف مسلمان قوم کی قومی اور ملی میراث نہیں ہے، نہ صرف مسلمانوں سے اس کا خطاب ہے، اسلام اللہ کی ایک نعمت ہے اور روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کا یکساں حق ہے۔ اللہ نے اپنی یہ نعمت اپنے سارے بندوں کے لیے بھیجی ہے، اللہ کی نظر میں اس کے تمام بندے برابر ہیں اور سب ہی سے اس کو پیار ہے۔ اس کی مرضی یہ ہے کہ اس نعمت سے اس کے تمام بندے فیض یاب ہوں۔ بالکل اسی طرح جس طرح سورج کی شعاعوں سے، چاند کی چاندنی سے، زمین کی پیداوار سے، دریاؤں اور سمندر کے پانی سے، صحرا کی وسعتوں سے اور ہوا کی لہروں سے سب ہی فیض یاب ہوتے ہیں۔

•••-----•••-----•••

بے شک اسلام اپنے احکام کی اتباع اور ایمان کے تقاضے پورے کرنے کے لیے انہیں متوجہ کرتا ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اسی لیے قرآن میں آپ کو جگہ جگہ یا یھا الذین امنوا کے الفاظ ملتے ہیں۔ یہ ایک مسلم اصولی حقیقت ہے کہ احکام کی تعمیل کا مطالبہ انہی لوگوں سے ہو جو اس کو اپنا دین تسلیم کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اس دین سے ناواقف ہیں اور اسے تسلیم نہیں کرتے ان سے احکام کی تعمیل کا مطالبہ نہیں ہونا چاہیے، ہاں انہیں یہ دعوت دی جانی چاہیے کہ وہ اس دین کو تسلیم کریں اور اس پر ایمان لائیں۔ اسی لیے قرآن پاک اپنی اصولی دعوت اور بنیادی عقائد کی تعلیم دینے کے لیے پوری نوع انسانی کو مخاطب کرتا ہے۔ اسلام کی بنیاد تین اہم انقلابی عقیدوں پر ہے۔ عقیدۂ توحید، عقیدۂ آخرت اور عقیدۂ رسالت۔ اور آپ قرآن کا مطالعہ فرمائیں گے تو دیکھیں گے کہ وہ ان عقائد پر ایمان لانے کے لیے دنیا کے سارے انسانوں کو پکارتا ہے اور یا یھا الذین امنوا کے بجائے یا یھا الناس کے الفاظ سے ساری انسانیت کو خطاب کرتا ہے۔

قرآن پاک کا یہ انداز خطاب آدم کے ہر بیٹے اور بیٹی کو جھنجھوڑتا ہے کہ اگر وہ اپنی خیر خواہی چاہتے ہیں تو لاپروائی کے ساتھ سر جھٹک کر آگے نہ بڑھ جائیں بلکہ رک کر غور کریں کہ ان کا اللہ انہیں کیوں پکار رہا ہے۔ وہ انہیں کیا دے رہا ہے اور ان سے کیا چاہتا ہے۔

•••-------•••-------•••

اسلام جن تین بنیادی عقیدوں کی دعوت دیتا ہے ان میں سب سے پہلا، سب سے اہم بلکہ دوسرے تمام عقائد کا سرچشمہ عقیدۂ توحید ہے، قرآن تمام انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے دعوت دیتا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱعْبُدُوا۟ رَبَّكُمُ ٱلَّذِى خَلَقَكُمْ وَٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○ ٱلَّذِى جَعَلَ لَكُمُ ٱلْأَرْضَ فِرَٰشًا وَٱلسَّمَآءَ بِنَآءً وَأَنزَلَ مِنَ ٱلسَّمَآءِ مَآءً فَأَخْرَجَ بِهِۦ مِنَ ٱلثَّمَرَٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا۟ لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ○ (البقرہ ۲: ۲۱-۲۲)

انسانو! بندگی کرو اپنے ربّ کی جس نے تم کو پیدا کیا اور ان کو جو تم سے پہلے گزرے ہیں تا کہ تم تباہی اور گھاٹے سے بچ جاؤ۔ اس ربّ کی بندگی کرو، جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش کی طرح بچھایا اور آسمان کو چھت کی طرح اونچا کیا پھر اوپر سے پانی برسایا اور اس سے طرح طرح کے پھل تمہارے کھانے کے لیے پیدا فرمائے۔ پس اس کی بندگی میں کسی کو اس کا شریک اور ہمسر نہ بناؤ جبکہ تم جانتے ہو کہ اس کا کوئی ہم پلہ نہیں۔

پوری نوع انسانی سے مطالبہ ہے کہ اللہ کی بندگی کرو۔ اس اللہ کی بندگی جس نے کسی فرق و امتیاز کے بغیر اپنے سارے بندوں کے لیے زمین کو فرش کی طرح بچھایا اور آسمان کو چھت کی طرح اونچا اٹھایا اور سب ہی کو پانی سے

سیراب کیا اور طرح طرح کے پھلوں اور غلوں سے نوازا۔ یہ ساری نعمتیں اللہ نے اپنے تمام بندوں کو دی ہیں اور ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی۔ اسی طرح تمام ہی بندوں سے بجا طور پر یہ مطالبہ ہے کہ وہ اپنے ربّ ہی کی بندگی کریں اور کسی کو اس کا ہمسر اور مدمقابل نہ بنائیں۔

اسلام کا دوسرا بنیادی عقیدہ، عقیدۂ آخرت ہے۔ یعنی یہ کہ ایک دن سارے انسانوں کو اللہ کے حضور اپنی پوری زندگی کا جواب دینا ہے اور اپنے اعمال کے مطابق اپنا انجام دیکھنا ہے۔ اس عقیدہ پر ایمان لانے کے لیے بھی قرآن پوری نوعِ انسانی کو خطاب کرتا ہے:

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ۝ یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰی وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰی وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ ۝ (الحج ۲۲:۱،۲)

انسانو! اپنے ربّ سے ڈرو، واقعہ یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی ہی ہولناک چیز ہے جس روز تم اسے دیکھو گے حال یہ ہوگا کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی، ہر حمل والی کا حمل گر جائے گا اور لوگ تمہیں مدہوش نظر آئیں گے۔ حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہوگا۔

•••------•••------•••

اسلام کا تیسرا بنیادی عقیدہ، عقیدۂ رسالت ہے، یعنی اللہ اپنے بندوں ہی میں سے کسی کو منتخب کر کے اس پر اپنی وحی نازل کرتا ہے اور اسے مامور کرتا ہے کہ وہ بندوں کو اس کے احکام بتائے۔ قرآن کا بیان ہے کہ ہر قوم میں اللہ نے اپنے رسول اور پیغمبر بھیجے۔

وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ ۝ (فاطر ۳۵:۲۴)

کوئی امت ایسی نہیں ہے جس میں کوئی ڈرانے والا نہ گزرا ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ (الرعد ۱۳:۷)

ہر قوم کی طرف ایک ہاد بھیجا گیا۔

اور قرآن نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ ان سارے رسولوں اور پیغمبروں کا پیغام ایک ہی تھا۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ (النحل ۱۶:۳۶)

ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ وہ انہیں خبردار کردے کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی

سے بچو۔

اور سب سے آخر میں حضرت محمد ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا گیا۔ آپ ﷺ پر نبوت ختم ہو گئی۔ اب قیامت تک کوئی نبی نہ آئے گا۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ (الاحزاب ۳۳:۴۰)

انسانو! محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔

حضرت محمد ﷺ پر نبوت ختم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اب رہتی دنیا تک اللہ کے دین پر عمل کرنے کا ذریعہ صرف یہ ہے کہ آپ ﷺ کی رسالت کو تسلیم کیا جائے اور آپ ﷺ کی پیروی میں زندگی گزاری جائے۔ آپ صرف، عرب کے رسول نہیں ہیں، نہ آپ صرف مسلمانوں کے رسول ہیں، آپ کی رسالت تمام انسانوں کے لیے ہے اور اب قیامت تک اللہ کی اطاعت کا ذریعہ صرف یہی ہے کہ رسول ﷺ کی بے چون و چرا اطاعت کی جائے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا ۳۴:۲۸)

اور اے رسول! ہم نے آپ کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

ایک دوسرے مقام پر خود رسول ﷺ سے اعلان کرایا گیا کہ میں پوری بنی نوع انسانی کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف ۷:۱۵۸)

اے رسول! کہہ دیجیے کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

•••-----•••-----•••

قرآن کی ان تصریحات سے یہ حقیقت پوری طرح نکھر جاتی ہے کہ اسلام ایک عالمی اور انسانی دین ہے۔ یہ تمام انسانوں کی مشترک میراث ہے، اس کو قبول کرنے والے اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے والے، مسلمان قوم کا دین قبول نہیں کرتے بلکہ اپنے اللہ کا دین قبول کرتے ہیں جو ان کے اللہ نے ان کے لیے ایک عام نعمت کی حیثیت سے بھیجا ہے۔ جس طرح اس کی دوسری نعمتیں عام ہیں اور ان سے سب کو فائدہ اٹھانے کا پورا پورا حق ہے۔ اسلام اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے اور وہ انسان یا گروہ واقعی انتہائی محروم ہے جو اللہ کی دوسری نعمتوں سے تو بھرپور فائدہ اٹھا رہا ہے لیکن اس کی سب سے بڑی نعمت سے محروم ہے۔

اسلام کی دعوت پیش کرنے اور اس کی نمائندگی کا حق ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اسلام کے پیغام کی اس نوعیت اور حیثیت کو اچھی طرح سمجھ لیں، اسلام آپ کا قومی اور ملی مذہب نہیں ہے، یہ اللہ کا دین ہے جو تمام انسانوں کا ربّ ہے، سارے ہی انسان اس کے بندے ہیں اور سب ہی سے اس کو یکساں پیار ہے۔ یہ ہر اس

انسان کا دین ہے جو اس کو اپنا کر اس کے مطابق زندگی گزارے۔ آپ مسلمان خاندان میں پیدا ہونے کے باوجود اگر عقیدۂ وعمل میں اسلام کے لیے مخلص نہیں ہیں تو آپ اسلام کی برکتوں سے ہرگز مستفیض نہیں ہو سکتے۔

•••-------•••-------•••

ان تین بنیادی عقیدوں کے ساتھ اسلام ایک اور بنیادی حقیقت بھی انسانوں کے ذہن نشین کراتا ہے۔ وہ یہ کہ دنیا کے سارے انسان ایک ہی انسانی جوڑے کی اولاد ہیں اور سب برابر ہیں۔ ان میں کسی کو کسی پر کوئی بڑائی حاصل نہیں۔ یہ مختلف نسلیں، قومیں، قبیلے، مختلف رنگ وروپ، صرف آپس کے تعارف اور جان پہچان کے لیے ہیں۔ اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے بھی وہ صرف اس ملت سے خطاب نہیں کرتا جو قرآن کو آسمانی صحیفہ تسلیم کرتی ہے اور خود کو مسلمان کہتی ہے' بلکہ پوری نوع انسانی کو خطاب کرتا ہے۔

يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَـٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ أُنْثٰى وَ جَعَلْنَـٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰـكُمْ ؕ (الحجرات ۴۹:۱۳)

اے انسانو! ہم نے تم کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا، پھر ہم نے تمہارے خاندان اور قبیلے بنا دیئے تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے کو جانو پہچانو۔ اللہ کی نظر میں تم میں سب سے زیادہ عزت واکرام والا وہ ہے جو سب سے زیادہ اس کی نافرمانی سے بچنے والا ہے۔

یہ چار حقیقتیں جو شخص بھی تسلیم کر کے ان کے مطابق زندگی گزارتا ہے وہ خواہ کسی قوم اور نسل سے تعلق رکھتا اور کسی خطہ زمین کا باشندہ ہو، وہ اس شخص سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو ان حقیقتوں کا انکار کرتا ہے--- ان حقائق کو تسلیم کرنے والے کی عملی زندگی ان لوگوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو ان حقیقتوں سے ناواقف ہیں یا انکار کرتے ہیں۔

اسی طرح ان حقیقتوں پر ایمان لانے والوں اور ان کے مطابق زندگی تعمیر کرنے والوں کا انجام بھی ان لوگوں سے بالکل مختلف ہے جو ان حقیقتوں کے منکر ہیں۔ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ دونوں کا انجام ایک نہ ہو اور اللہ کی کتاب بھی یہی شہادت دیتی ہے کہ دونوں کا انجام بالکل الگ الگ ہے۔ ماننے والا گروہ کامیاب ہے اور اللہ کی رحمت کا مستحق ہے۔ نہ ماننے والا گروہ ناکام ہے اور اللہ کے غضب کا مستحق ہے۔

ان حقیقتوں کی عظمت واہمیت کا تقاضا ہے کہ ہر انسان ان پر غور کرے، ہر تعصب اور جانبداری سے بالاتر ہو کر غور کرے —— اور سوچ سمجھ کر ان کے بارے میں فیصلہ کرے۔ ان حقیقتوں کے بارے میں فیصلہ دراصل اپنے انجام کے بارے میں فیصلہ ہے اور اس شخص سے زیادہ نادان اور کون ہوگا جو اپنے انجام کے بارے میں فیصلہ کرنے میں ہوش مندی اور سنجیدگی سے کام نہ لے۔

# فقر وفاقہ ایمان لیوا آزمائش

فقر وفاقہ، تنگ دستی، بے روزگاری اور معاشی بدحالی بڑی ہی ایمان لیوا اور ہوش وحواس کو خراب کر دینے والی آزمائشیں ہیں۔ بھوک، فاقہ اور بے روزگاری میں مبتلا ہو جانے والے شخص کے لیے اپنے ایمان و اخلاق کی حفاظت جوئے شیر لانے سے بھی زیادہ کٹھن اور صبر آزما کام ہے۔ دولت کی فراوانی اور خوش حالی میں دادِ عیش دینے والوں کو کیا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان ایمان شکن مصائب میں گرفتار ہونے والوں پر کیا گزرتی ہے۔ ڈوبنے والے کی دلی کیفیت اور پریشانی کا احساس اس شخص کو کیا ہو سکتا ہے جو دریا کی موجوں سے دور ساحل پر مامون ومحفوظ کھڑا ڈوبنے والے کا تماشا دیکھ رہا ہو۔

•••--------•••--------•••

اللہ ہر ایک کو ان لرزا دینے والی آزمائشوں سے اپنی پناہ میں رکھے، مگر یہ آزمائشیں بہر حال انسانوں ہی پر آتی ہیں، کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کل طلوع ہونے والی صبح کس کے لیے کیا لے کر آنے والی ہے، پرسکون رات کی آغوش میں بے غم سونے والوں کے وہم وخیال میں بھی نہیں ہوتا کہ آنے والی صبح ان کے لیے کیا مصائب اور ہنگامے لے کر آ رہی ہے۔ آسمان کی آنکھ نے نہ جانے کتنی بار کیسے کیسے عبرت ناک منظر دیکھے ہیں۔ شب وروز کی یہ گردش جب تک جاری ہے ہر ایک کو چار وناچار وہ کچھ دیکھنا ہی ہے جو اللہ نے اس کی تقدیر میں لکھ دیا ہے جس چیز کا فیصلہ اللہ نے فرما دیا ہے، اس سے نہ اپنی تدبیر بچا سکتی ہے اور نہ کسی اور کی مدد ہی سے آنے والی مصیبت ٹل سکتی ہے۔ مصیبت سے نجات دینے والا صرف وہی اللہ ہے جو انسان کو آزمائش میں مبتلا کرتا ہے۔

•••--------•••--------•••

مصیبت اور تکلیف تو کوئی بھی ہو پریشانی کا باعث ہوتی ہی ہے لیکن بھوک، فاقے اور تنگ دستی کی آزمائش میں آدمی بہت جلد گھبرا اٹھتا ہے۔ صبر کی قوت کھو بیٹھتا ہے اور ہوش وحواس گم ہو جاتے ہیں اور اکثر وبیشتر وہ ان قدروں کو بھی بھول جاتا ہے جو اسے جان سے زیادہ عزیز ہوتی ہیں، بالخصوص جب اس کی کفالت میں ننھے بچے اور دوسرے متعلقین بھی ہوں۔ فاقہ کی مار سہ جانا اور معصوم جانوں کو بھوک میں بلکتا دیکھ کر بھی بے حال نہ ہونا معمولی دل

گردے کا کام نہیں ہے۔ اس آزمائش میں بڑے بڑوں کی ہمتیں جواب دینے لگتی ہیں، دل بیٹھنے لگتے ہیں اور ہوش وحواس گم ہو جاتے ہیں۔ ''پراگندہ روزی پراگندہ دل'' بہت پرانا مقولہ ہے اور بہت ہی صحیح مقولہ ہے۔ اس پراگندہ دلی میں آدمی اللہ سے بھی بدگمانی کرنے لگتا ہے۔

•••-----•••-----•••

بے شک ہر مصیبت اور آزمائش اللہ کی جانب سے ہی آتی ہے، آدمی دیدہ و دانستہ خود کسی مصیبت اور آفت میں پھنسنے کی کوشش ہرگز نہیں کرتا لیکن اللہ کا ارشاد ہے:

وَمَآ اَصَابَكُم مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (الشوریٰ ۴۲:۳۰)

تم پر جو مصیبت بھی آتی ہے تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آتی ہے۔

اس ارشادِ خداوندی کا تقاضا ہے کہ آدمی جب بھی کسی مصیبت میں گرفتار ہو تو وہ اپنے فکر و عمل کا ضرور جائزہ لے۔ بعض اوقات کسی معاملے میں دین کی صحیح تعلیمات سے ناواقفیت اور صحیح تصور سے لاعلمی کے نتیجے میں بھی آدمی غلط روش اختیار کر لیتا ہے اور خواہ مخواہ ایک مصیبت میں گرفتار ہو کر دنیوی پریشانی بھی مول لیتا ہے اور دینی خسارے میں بھی مبتلا ہوتا ہے۔

•••-----•••-----•••

رزق کے معاملے میں دو باتوں کے بارے میں شرح صدر بہت ضروری ہے۔ ایک یہ کہ رزق رسانی کے باب میں قرآن وسنت کی تعلیمات کیا ہیں؟ اور دوسرے یہ کہ کسبِ معاش کے سلسلے میں دین کا صحیح تصور کیا ہے؟

تنگ دستی اور فقر و فاقے میں حد سے گزری ہوئی پریشانی کا اظہار، جزع و فزع، مایوسی اور اللہ سے بدگمانی کا سبب بالعموم یہ ہوتا ہے کہ آدمی یا تو ان تعلیمات سے ناواقف ہوتا ہے جو رزق کے متعلق قرآن وسنت میں دی گئی ہیں یا جاننے کے باوجود وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں اور کبھی کبھی فقر و فاقے میں آدمی اس لیے بھی مبتلا ہو کر دین سے دور جا پڑتا ہے کہ کسبِ معاش کے سلسلے میں قرآن وسنت کا دیا ہوا صحیح تصور اس کے سامنے نہیں ہوتا اور غلط تصور کے تحت اختیار کیا ہوا رَوّیہ ہی اس کے لیے پریشانی کا باعث بن جاتا ہے۔

•••-----•••-----•••

رزق دینے والا صرف اللہ ہے، روزی میں تنگی اور کشادگی صرف اسی کے قبضے میں ہے، وہی ہر ایک کو روزی پہنچا رہا ہے۔ نہ یہ ممکن ہے کہ آپ اپنی محنت، جانفشانی اور تدبیر و حکمت سے جتنی روزی چاہیں حاصل کر لیں اور نہ اللہ کے سوا کسی اور کی یہ طاقت ہے کہ وہ آپ کو روزی دے سکے یا آپ سے آپ کی روزی روک سکے، رزق کی کنجیاں صرف اللہ کے پاس ہیں اور وہی جس کو جتنا چاہتا ہے دیتا ہے، ہر جاندار کی روزی اس نے اپنے ذمے لے

رکھی ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ؕ (ھود ۱۱:۶)

زمین پر چلنے والے ہر جاندار کی روزی اللہ ہی نے اپنے ذمے لی ہے، وہ جانتا ہے کہ کون کہاں رہتا ہے اور کہاں سونپا جاتا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے علم سے نہ کسی جاندار کے رہنے بسنے کی جگہ پوشیدہ ہے اور نہ یہ بات پوشیدہ ہے کہ وہ کس جگہ اپنی جان اللہ کے سپرد کرے گا۔ اللہ نے ہر جاندار کی روزی اپنے ذمے لی ہے، پس یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی جاندار اپنے حصّے کی روزی سے محروم رہ جائے جس جسم میں بھی اللہ نے جان ڈالی ہے اور جب تک اس جان کو اس جسم میں رکھنے کا اس نے فیصلہ کیا ہے وہ اس کے نصیب کی روزی اسے ضرور پہنچائے گا چاہے وہ جہاں ہو اور جس حال میں ہو۔

•••-------•••-------•••

قرآن وسنت پر ایمان رکھنے والا بھلا یہ کیسے سوچ سکتا ہے کہ اس کا اللہ اسے روزی سے محروم کردے گا اور وہ یا اس کے متعلقین بھوک اور فاقے سے بلک بلک کر دم توڑ دیں گے، اللہ تو اپنے دشمنوں کو بھی رزق سے محروم نہیں کرتا پھر بھلا اپنے ماننے والے بندوں کو کیونکر محروم کرے گا۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ نے کیا پاکیزہ حقیقت بیان کی ہے۔

اے کریمے کہ از خزانہ غیب
گبرو ترسا وظیفہ خورداری
دوستاں را کجا کنی محروم
اے کہ با دشمناں نظر داری

اے کرم کرنے والے اللہ! جب تو اپنے غیب کے خزانے سے ان لوگوں کو روزی پہنچا رہا ہے جو تیرے بجائے آگ کو پوجتے ہیں تو اپنے دوستوں کو تو روزی سے کیوں کر محروم کردے گا جب کہ تو دشمنوں پر بھی عنایت کی نظر رکھتا ہے۔

اگر کسی وقت آپ تنگ دستی میں مبتلا ہو جائیں، معاشی بدحالی کا شکار ہو جائیں یا آپ کی لگی لگائی روزی کوئی چھین لے تو اس سے ہراساں ہونے کی کیا گنجائش۔ رزق تو نہ کسی خاص ذریعے اور حیلے پر منحصر ہے نہ کسی دوسرے انسان کے قبضے میں ہے، وہ تو صرف اس کے قبضے میں ہے جس نے آپ کی روزی کی ذمہ داری لی ہے، آپ نے اگر اس کے سوا کسی دوسرے اپنے جیسے محتاج انسان کو روزی رساں سمجھنے کی کبھی غلطی کی ہے تو فوراً توبہ کیجئے، اپنے فکر ونظر کی اصلاح کیجئے اور اللہ کی صفات کا صحیح تصور حاصل کر کے اپنے ایمان کی حفاظت کیجئے اور اگر کسی خاص ذریعہ

رزق پر آپ بھروسا کیے بیٹھے تھے تو پہلی فرصت میں اپنے قلب کا جائزہ لیجئے اور ہر غلط تصور اور فکر کو کھرچ ڈالیے کہ بھروسے کے لائق صرف اس اللہ کی ذات ہے، جو آپ سے بے پناہ پیار رکھتا ہے، آپ دنیا میں بھوکے آئے تھے اور آپ کی آمد سے پہلے آپ کی روزی اس نے آپ کی ماں کے سینے میں پیدا کردی تھی، آپ دنیا میں ننگے آئے تھے اور اس نے لباس کا انتظام کردیا تھا۔ وہ اللہ زندۂ جاوید ہے، نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ اسے نیند آتی ہے، وہ کسی وقت آپ کی فکر سے غافل نہیں ہوتا اور نہ وہ کبھی بھٹکتا ہے اور نہ کبھی بھولتا ہے۔

•••-------•••-------•••

آپ کے لیے اس کی گنجائش بھی نہیں ہے کہ آپ تنگ دستی اور معاشی بدحالی کے اندیشے سے غلط ذرائع اختیار کرنے کی بات سوچیں، آپ کچھ بھی کریں، آپ کو ملے گا صرف اتنا ہی جتنا اللہ نے آپ کے لیے مقدر کر رکھا ہے، روزی کی تنگی اور کشادگی کا دارومدار آپ کی تدبیر و حکمت اور محنت و کوشش پر ہے ہی نہیں، بلکہ اللہ کے فیصلے پر ہے، شب و روز دوڑ دھوپ کرنے والے کو بمشکل دو وقت کی روٹی مہیا ہوتی ہے اور معمولی محنت کرنے والے کو وہ کچھ مل جاتا ہے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بڑے بڑے دانش مند پریشاں حال رہتے ہیں اور نادانوں پر رزق کی بارش ہوتی ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہے ؎

اگر روزی بدانش در فزودے
زناداں تنگ تر روزی نہ بودے
بہ نادان ایں چنیں روزی رساند
کہ دانا اندراں حیراں بماند

اگر روزی میں اضافہ عقل و دانش پر منحصر ہوتا تو نادان شخص سے زیادہ کوئی تنگ دست نہ ہوتا لیکن وہ نادانوں اور بے وقوفوں کو ایسی ایسی راہوں سے روزی پہنچاتا ہے کہ بڑے بڑے عقل منداس معاملے میں حیران رہ جاتے ہیں۔

آپ کا کام تو صرف یہ ہے کہ آپ صحیح انداز میں سوچیں، صحیح اور جائز تدبیر اختیار کریں اور محنت و کوشش میں کبھی کوتاہی نہ کریں، اس کے بعد کیا ہونے والا ہے اس کی فکر میں آپ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں، جس اللہ نے اپنے ذمے یہ فکر لے رکھی ہے وہ ضرور آپ کو وہ سب کچھ دے گا جس کے دینے کا اس نے فیصلہ کیا ہے۔ حرام ذرائع اختیار کرکے آپ اپنی قسمت سے زیادہ ہرگز حاصل نہیں کر سکتے البتہ اپنے دین و ایمان کو خطرے میں ڈال کر اپنے اللہ کو غضب ناک ضرور کر سکتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

یاایھا الناس اتقوا اللّٰہ واجملوا فی الطلب فان نفسا لن تموت حتی تستو فی رزقھا وان ابطاعنھا فاتقوا اللّٰہ واجملوا فی الطلب خذوا ما حل ودعوا ما حرم

(ابن ماجۃ' کتاب التجارات' باب۲)

لوگو! اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو اور رزق کے حصول میں پسندیدہ طریقے اختیار کرو، اس لیے کہ کوئی انسان اس وقت تک نہیں مر سکتا جب تک اسے اس کے حصّے کا پورا پورا رزق نہ پہنچ جائے، اگر چہ اس کے ملنے میں کچھ تاخیر ہی ہو جائے اللہ سے ڈرتے رہو اور روزی کے حصول میں پسندیدہ طریقہ اختیار کرو۔ حلال روزی حاصل کرو اور حرام روزی کو چھوڑ دو۔

•••------•••------•••

رزق کے سلسلے میں دوسری بات جس پر شرح صدر ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ کسبِ معاش کی دین میں صحیح حیثیت کیا ہے اور حصولِ دولت کے لیے دین نے کیا صحیح تصور دیا ہے۔ عام طور پر کسبِ معاش کے سلسلے میں لوگ یوں سوچتے ہیں کہ یہ خالص دنیاداری کا کام ہے اور اس پر صرف کیا جانے والا وقت اللہ کی راہ میں لگنے کے بجائے دنیا کمانے میں لگتا ہے۔

دورِ رسالت میں ایک بار آپ ﷺ کے سامنے جب یہی ذکر آیا تو آپ ﷺ نے فوراً اس کی اصلاح فرمائی لیکن آپ ﷺ کی تنبیہ اور وضاحت کے باوجود امت میں یہ ذہن پھر بھی ملتا ہے اور دین داری کا اہتمام کرنے والوں میں ملتا ہے۔ حالانکہ دین داری کا صرف وہی تصور صحیح اور قابلِ قبول ہے جس کی تصدیق و تائید سنت رسول ﷺ سے ہوتی ہو۔

حضرت کعب بن عجرہ بلوی رضی اللہ عنہ ایک بار کا واقعہ بیان کرتے ہیں:

''نبی ﷺ کے پاس سے ایک شخص گزرا۔ آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے دیکھا کہ وہ کمانے میں انتہائی دھن کے ساتھ کوشش کر رہا ہے اور اس معاملے میں بڑا چاق و چوبند ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ سے کہا یا رسول اللہ ﷺ! اگر اس شخص کی یہ دوڑ دھوپ اور دلچسپی اللہ کی راہ میں ہوتی تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ یہ سن کر اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اگر وہ کمانے کی راہ میں دوڑ دھوپ کرنے کے لیے اس لیے نکلا ہے کہ اپنے چھوٹے بچوں کی پرورش کرے تو اس کی یہ محنت و کوشش اللہ کی راہ میں شمار ہوگی۔ اسی طرح اگر اس کی یہ دوڑ دھوپ بوڑھے والدین کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہے تو یہ بھی اللہ کی راہ میں ہی شمار ہوگی۔ اگر وہ یہ ساری تگ و دو اپنے لیے کر رہا ہے تاکہ اپنی ضروریات کے لیے اس کو کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے تو یہ محنت و کوشش بھی اللہ کی راہ میں ہی شمار ہوگی۔ ہاں اگر یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ مال و دولت جمع کرکے لوگوں پر اپنی برتری جتائے اور نمود و نمائش کرے تو

پھر یہ ساری دوڑ دھوپ شیطان کی راہ میں ہے۔''

یہ حدیث صاف صاف بتاتی ہے کہ دین و دنیا کی تفریق غلط ذہن کی پیداوار ہے۔ مؤمن کو دنیا میں بشری تقاضے پورے کرنے کے لیے کسبِ معاش میں بھی چاق و چوبند ہونا چاہیے اور کسبِ معاش کی جدوجہد بھی اللہ کی راہ میں جدوجہد ہی سمجھی جائے گی، البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے جذبات اور ارادوں پر ایمان وتقویٰ کی گرفت رکھے اور سب کچھ انہی جذبات اور ارادوں کے ساتھ کرے جو ایمان اور تقویٰ کے شایانِ شان ہوں۔

• بے شک دولت کا پجاری بننا اور مال و دولت جمع کرنے ہی کو زندگی کا مقصود بنا لینا انتہائی ناپسندیدہ ہے لیکن نیک جذبات کے ساتھ کسبِ معاش کی دوڑ دھوپ اور حصولِ دولت کی جدوجہد کو حقارت کے ساتھ دیکھنا اور ناپسندیدہ سمجھنا کسی طرح صحیح نہیں، قرآن وسنت میں گہری بصیرت رکھنے والے ایک عالمِ دین اور اپنے وقت کے امام حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

> ''دورِ حاضر سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور خلفائے راشدین کے عہد میں مال و دولت کو ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا لیکن آج کے دور میں مال و دولت مؤمن کی ڈھال ہے۔ اگر آج ہمارے پاس یہ درہم و دینار نہ ہوں تو یہ اصحابِ اقتدار ہمیں اپنا رومال بنا لیں۔ آج کے دور میں جس کے پاس کچھ بھی دولت ہو وہ اس کو کسی کام میں لگائے (تاکہ مال میں نفع ہو اور بڑھے) اس لیے کہ یہ وہ نازک دور ہے کہ اگر آدمی تنگ دست اور محتاج ہو تو وہ سب سے پہلے اپنے دین و ایمان کا سودا کرے گا۔ حلال کمائی کو اپنے اوپر خرچ کرنا فضول خرچی نہیں ہے۔'' (مشکوۃ)

رومال کو آدمی اپنے بدن سے میل کچیل صاف کرنے کے لیے جس طرح چاہتا ہے استعمال کرتا ہے۔ رومال بنا لینے سے مراد یہی ہے کہ صاحبِ اقتدار جس طرح چاہتے ہمیں اپنے اغراض کے لیے استعمال کرتے اور ہم اپنی تنگ دستی اور احتیاج کی وجہ سے مجبور ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ محتاجی ہی شیر کو لومڑی کا سا مزاج بنانے پر مجبور کرتی ہے۔ فقر و فاقے کی آفتوں کو جھیل لے جانا اور اپنے ایمان و اخلاق کو بچا لینا انتہائی مشکل کام ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم ہی کا دل گردہ تھا کہ وہ ان مصائب میں ثابت قدم رہے اور فقر و فاقے کے ہلا دینے والی آزمائشوں کو جھیل لے گئے۔ آج کے دور میں جب کہ ایمان نہایت کمزور ہیں دینی حکمت یہی ہے کہ آدمی حصولِ مال کی کوشش سے غافل نہ ہو، صحیح جذبات کے ساتھ روزی کے حصول میں انتھک محنت کرے، اپنی سستی یا غلط فکری سے اپنے ایمان کو کسی خطرے میں نہ ڈالے اور اللہ سے برابر دعا کرتا رہے کہ پروردگار! مجھے فقر و فاقے کی آزمائش سے بچا۔

ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا مانگا کرتے تھے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَانَ یَقُوْلُ: "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُوْعِ فَاِنَّهٗ بِئْسَ الضَّجِیْعُ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخِیَانَةِ فَاِنَّهَا بِئْسَتِ الْبِطَانَةُ

(رواہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجہ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیا کرتے تھے:

''اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں' بھوک اور فاقے سے' وہ بڑا تکلیف دہ رفیقِ خواب ہے۔ اور خیانت کے جرم سے وہ بہت بُری ہم راز ہے''۔



# اپنے ربّ سے ہی مانگنے کا تجربہ کیجئے



دہلی کا بادشاہ جنگل میں تنہا گھوڑا دوڑا رہا تھا، تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہرن کے تعاقب میں اپنے ساتھیوں سے بہت دور نکل گیا تھا، کئی میل تک گھوڑے نے برق رفتار ہرن کا تعاقب کیا لیکن آخر کار وہ گھنی جھاڑیوں میں غائب ہوگیا۔ سخت گرمی کا زمانہ تھا، دوپہر کا وقت تھا، گرم ہوا سے جسم جھلس رہا تھا، پیاس کی شدت سے ہونٹ خشک تھے اور حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے، شاہجہاں نے گھوڑا روک کر جسم سے پسینہ پونچھا اور سوچنے لگا کہ اب پانی کی تلاش میں کدھر جائے۔ گھوڑا بھی گرمی کی شدت سے ہانپ رہا تھا۔ آخر شاہ جہاں نے پیاس سے بے تاب ہو کر ایک طرف کو گھوڑا ڈال دیا۔

کئی میل چلنے کے بعد بھی کسی بستی کے آثار نظر نہ آئے — البتہ بہت دور کچھ سایے چرتے ہوئے نظر پڑے اور بانسری کی مدھر آواز بھی تیز جھونکوں کے ساتھ محسوس ہوئی۔ بادشاہ نے اسی سَمت اپنے گھوڑے کی باگ موڑ دی۔ چند میل چلنے کے بعد وہ جانوروں کے قریب پہنچے۔ بانسری کی مدھر آواز اب صاف سنائی دے رہی تھی، کوئی منچلا بڑی دردناک آواز میں بانسری بجا رہا تھا۔ بادشاہ نے گھوڑا روکا' کچھ فاصلے پر دیکھا کہ ایک نوجوان شکستہ اور میلے کپڑے پہنے ایک درخت کے نیچے بڑی بے نیازی کے ساتھ ریت پر نیم دراز ہے اور دنیا کی ہر فکر سے آزاد بڑی مستی کے ساتھ بانسری بجا رہا ہے — بادشاہ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ کیا اس جنگل کا بادشاہ یہی شکستہ حال نوجوان ہے، شاہ جہاں نے سوچا' نوجوان بانسری بجانے میں مگن تھا' اس نے سر اٹھا کر ایک نظر دیکھا۔ ہونہہ کوئی شکاری ہوگا۔ دل ہی میں سوچا اور بانسری بجانے میں لگ گیا۔ بادشاہ اس کے قریب پہنچا اور پوچھا:

''میاں صاحبزادے! یہاں کہیں پینے کے لیے پانی بھی مل جائے گا۔'' شاہجہاں کا شاہانہ لباس اور شاندار گھوڑا دیکھ کر چرواہا ذرا چونکا مگر جلد ہی سنبھلا اور بولا ''یہاں پانی کہاں، پانی تو بستی میں ملے گا۔ تھوڑی ہی دور بستی ہے''۔ ہاتھ کے اشارے سے چرواہے نے رہنمائی کی اور پھر بے نیازی کے ساتھ بانسری بجانے لگا۔ جانور چر رہے تھے اور وہ بانسری بجانے میں مست تھا۔ شاہجہاں گھوڑے پر سوار ہو کر جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ نوجوان نے پوچھا، کیا تمہیں پیاس لگی ہے؟

ہاں بھئی پیاس سے برا حال ہے، شاہجہاں نے اس عاجزی سے کہا کہ گویا آج چرواہا ہی بادشاہ ہو۔

چرواہا اٹھا اور درخت کی جڑ میں رکھا ہوا مٹی کا میلا کچیلا برتن اٹھا لایا، لو یہ پانی پی لو۔ اس میں مٹھا ہے۔

شاہجہاں نے بڑی بے قراری کے ساتھ مٹھا اپنے حلق میں انڈیل لیا۔ پیاس کی شدت سے شاہ جہاں بوکھلا گیا تھا، مٹھا تو اس نے پہلے بھی پیا تھا لیکن آج تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ شاید ایسی نعمت اسے کبھی نہ ملی تھی۔ وہ احسان مندی اور پیار کی نظروں سے چرواہے کو دیکھتے ہوئے بولا:

میاں صاحبزادے، تم رہتے کہاں ہو؟

اس بستی میں رہتا ہوں، چند میل دور اسی بستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گڈریئے نے بتایا۔

تم کبھی شہر بھی گئے ہو؟ شاہجہاں نے پوچھا۔

کیا تم شہر میں رہتے ہو؟ —— دہلی میں لال قلعہ ہے نا، وہاں پر ایک بہت بڑی مسجد ہے، وہ ہمارے بادشاہ نے بنوائی ہے، کیا تم وہیں رہتے ہو۔ میں ایک بار باپ کے ساتھ وہاں گیا تھا، چرواہے نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

تم کل وہاں آجانا —— لال قلعہ میں —— اور دیکھو کوئی چیز لاؤ تو میں تمہیں کچھ لکھ کر دے دوں —— بادشاہ نے انعام سے نوازنا چاہا۔

کیا تم لال قلعہ میں رہتے ہو، تب تو شاہجہاں بادشاہ کو ضرور دیکھا ہوگا۔ چرواہے نے حیرت سے شاہجہاں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

میں شاہجہاں ہوں، بادشاہ نے جواب دیا۔

تم بادشاہ ہو، ہمارے بادشاہ۔ حیرت سے چرواہا بادشاہ کو دیکھتا رہ گیا —— اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ واقعی شاہجہاں کو دیکھ رہا ہے —— آج چرواہا، اپنے بادشاہ سے باتیں کر رہا تھا۔ اسے اپنی قسمت پر رشک آرہا تھا، آج بادشاہ اس کا مہمان تھا مگر وہ ڈر رہا تھا کہ اس نے بادشاہ کو بڑی بے رخی سے جواب دیا تھا۔ وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

بادشاہ نے اس کا سکوت توڑتے ہوئے کہا، تم ہمارے پاس آنا، ہم تمہیں انعام دیں گے۔ دیکھو پیڑ کی چھال اٹھا لاؤ اور بادشاہ نے پیڑ کی چھال پر کوئلے سے کچھ لکھ کر اس کو دیا۔ تم یہ لے کر لال قلعہ میں آنا، میں تمہارا انتظار کروں گا اور شاہجہاں وہاں سے لوٹ آیا۔

کئی دن گزر گئے۔ شاہجہاں اپنے میزبان کا بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا میں اپنے میزبان کو انعام دے کر مالا مال کر دوں گا۔

جمعہ کا دن تھا۔ بادشاہ جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے جامع مسجد جا چکا تھا۔ لال قلعہ میں کئی روز سے

چرواہے کا انتظار تھا۔ آج دوپہر کے وقت چرواہا قلعہ کے پھاٹک پر پیڑ کی چھال لیے ہوئے پہنچا تو قلعہ کے محافظوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسی وقت دو سپاہیوں کے ساتھ اسے شاہجہاں کی خدمت میں جامع مسجد بھجوا دیا۔

چرواہا ڈرتا، سہمتا جامع مسجد کے اندر داخل ہوا۔ جمعہ کی نماز ہو چکی تھی، لوگ جا چکے تھے، کچھ جا رہے تھے، بادشاہ کے درباری جامع مسجد میں موجود تھے۔ سپاہی چرواہے کو کچھ درباریوں کے حوالے کر کے واپس ہو گئے۔

چرواہے نے پوچھا، بادشاہ کہاں ہے؟

دیکھو، وہ جو محراب کے قریب بیٹھے ہیں وہی بادشاہ ہیں۔ درباریوں نے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا، شاہجہاں اس وقت بڑی ہی عاجزی اور لجاجت سے دعا مانگ رہا تھا۔

''نہیں میں تو شاہ جہاں بادشاہ کا پوچھ رہا ہوں جنہوں نے لال قلعہ بنوایا ہے اور جو لال قلعہ میں رہتے ہیں۔ چرواہے نے نہایت سادگی سے اپنی الجھن صاف کرنا چاہی''۔

''ہاں بھائی یہی شاہجہاں بادشاہ ہیں —— درباریوں نے اسے اطمینان دلانے کی کوشش کی''۔

وہ کچھ دیر بادشاہ کو دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ شخص دونوں ہاتھ پھیلائے گڑگڑا کر فقیروں کی طرح کیا مانگ رہا ہے اور کیوں مانگ رہا ہے۔ اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے پوچھا،

''یہ بادشاہ کیا مانگ رہے ہیں اور کس سے مانگ رہے ہیں، یہ تو بادشاہ ہیں، لال قلعہ والے بادشاہ''۔

''ہاں یہ اللہ سے مانگ رہے ہیں، اللہ سے ہر ایک مانگتا ہے چاہے وہ بادشاہ ہو یا فقیر۔ چرواہا ایک دم خاموش ہو گیا اور پھر یکا یک وہ ایک طرف کو چل دیا۔ درباریوں نے اسے جاتے دیکھ کر روکنا چاہا لیکن وہ کسی طرح نہ رکا۔ لوگوں نے اسے بہت روکا، جانے کی وجہ پوچھی لیکن اس نے کچھ نہ بتایا اور اپنی راہ کو ہولیا''۔

شاہجہاں دعا سے فارغ ہوئے۔ خادم بادشاہ کو لینے دوڑے، خادموں نے شاہ جہاں کو بتایا کہ چرواہا آیا تھا، بادشاہ نے بڑی بے چینی سے پوچھا، کہاں ہے؟ شاہ جہاں تو کئی دن سے اپنے میزبان کا بڑی بے قراری سے انتظار کر رہا تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ واپس چلا گیا۔ ہم نے اسے بہت روکا لیکن وہ رکا نہیں۔

بادشاہ نے اسی وقت کچھ لوگوں کو گھوڑوں پر دوڑایا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ لوگ اس نوجوان کو لے کر واپس آ گئے۔ بادشاہ نے انتہائی عزت کے ساتھ اس نوجوان چرواہے کو اپنے پاس بٹھایا۔ دیر تک اس کی خاطر تواضع کرتے رہے —— لیکن چرواہا جیسے ہر عزت و اکرام سے بے نیاز تھا۔

شاہجہاں نے اس سے پوچھا،

''میاں تم مجھ سے ملنے آئے تھے اور پھر ملے بغیر ہی واپس ہو گئے''۔ آخر کیوں؟ وہ خاموش رہا۔

شاہجہاں نے دوبارہ اسے متوجہ کیا، ''میاں میں تو تمہارا بڑی شدت سے انتظار کر رہا تھا اور تم ملے بغیر ہی واپس جا رہے تھے۔ بتاؤ تو سہی آخر بات کیا ہوگئی''؟

''میں آپ سے انعام لینے آیا تھا مگر میں نے دیکھا کہ آپ تو خود ہاتھ پھیلا پھیلا کر مانگ رہے تھے، جب آپ خود مانگ رہے تھے تو بھلا مجھے کیا دیتے۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ میں بھی کیوں نہ اسی سے مانگوں جس سے آپ مانگ رہے تھے'' ـــــ چرواہے نے بڑی سادگی اور جرأت سے کہا۔

اس تاریخی کہانی کی حیثیت کیا ہے اور کہاں تک یہ صحیح ہے ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں۔ ہمیں تو مطلب اس ایمان افروز سبق سے ہے جو اس واقعہ سے ملتا ہے۔ اگر یہ واقعہ من گھڑت ہے تو بھی یہ حقیقت ہے کہ چرواہے کی زبانی ایسی تعلیم دی گئی ہے جس پر جتنا غور کریں گے، ایمان و یقین میں اضافہ ہی محسوس کریں گے۔

اس دنیا میں کون ایسا ہے جس کی کوئی نہ کوئی ضرورت نہ ہو اور قدرتی بات ہے کہ جب آدمی کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں تو وہ پریشان ہوتا ہے، پریشانی دور کرنے کی تدبیریں سوچتا ہے اور ہر طرف نظر دوڑاتا ہے کہ کس سے اپنی پریشانی بیان کرے، کس کے سامنے اپنی ضرورت رکھے ـــــ ضرورت اور حاجت ایک نادار فقیر کو بھی پیش آتی ہے اور ایک خوش حال کروڑ پتی کو بھی۔ کسی کو رہنے بسنے کے لیے مکان کی ضرورت ہے، کسی کو بدن ڈھانپنے کے لیے کپڑے کی ضرورت ہے، کسی کو اپنے بچوں کی شادی کرنا ہے اور واجبی خرچ کے لیے بھی کچھ نہیں ہے، کسی کا کاروبار نہیں چل رہا ہے، کسی کے پاس اتنا نہیں ہے کہ بچوں کو تعلیم دلوا سکے، کوئی بیمار ہے اور صحت کے لیے ترس رہا ہے ـــــ کسی کو ملازمت کی ضرورت ہے اور ملازم درکار ہے، غرض دنیا میں اللہ کے بندوں کی ضرورتیں گوناگوں ہیں۔ دوسروں کو چھوڑ یئے خود اپنی زندگی ہی پر غور کیجیے ـــــ آپ کی کتنی ضرورتیں ہیں جن کے لیے آپ پریشان رہتے ہیں۔

آپ بہت بڑے غنی ہیں اور آپ کا مقام بہت ہی بلند ہے اگر آپ کو یہ یقین فی الواقع حاصل ہو جائے کہ آپ کی ضرورتیں صرف اللہ ہی پوری کر سکتا ہے اور آپ اس کے سوا کبھی کسی کے سامنے دامن نہ پھیلائیں گے۔

یہ واقعہ ہے کہ دینے والا صرف اللہ ہے، وہ نہ دینا چاہے تو ساری دنیا مل کر بھی آپ کو ایک ذرّہ نہیں دے سکتی۔ اور وہ دینا چاہے تو ساری دنیا مل کر بھی اس کی نوازش کو روک نہیں سکتی۔

بندے کے پاس آپ کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ ہر بندہ محتاج ہے اور جو جتنا بڑا ہے اتنا ہی زیادہ محتاج ہے۔ لال قلعہ کا بادشاہ بھی اسی کی درگاہ کا فقیر ہے اور جنگل کا چرواہا بھی اسی کا محتاج ہے۔ پھر یہ کہاں کی دانائی ہے

کہ آپ فقیر اور محتاج بندوں کے سامنے اپنی ضرورتیں رکھیں اور ان تہی دستوں سے مانگیں جو خود اپنی ضرورتوں کے لیے اللہ کے حضور ہاتھ پھیلاتے ہیں اور گڑگڑا گڑگڑا کر اس سے بھیک مانگتے ہیں۔

آپ یہ فیصلہ فرمالیں اور اس پر جم جائیں کہ کبھی اپنی کوئی ضرورت کسی بندے کے سامنے نہیں رکھیں گے۔ ضرورت چھوٹی ہو یا بڑی، دینی ہو یا دنیوی، صرف اپنے ربّ کے سامنے رکھیں گے اور صرف اسی سے مانگیں گے۔ اپنے ربّ سے مانگنے کا تجربہ تو کیجئے، جتنی بار تجربہ کریں گے اپنے ایمان ویقین میں اور زیادہ پختگی پائیں گے — اللہ کبھی آپ کو اپنے دربار سے مایوس نہیں کرے گا جس کو جو کچھ ملا ہے اسی کے دربار سے ملا ہے۔ اس کے سوا کوئی دینے والا نہیں ہے۔ آپ کو جو ضرورت ہو اس سے کہئے، جو پریشانی ہو اس سے فریاد کیجئے جو تکلیف اور مصیبت ہو اس کے حضور گڑگڑائیے۔ جو درکار ہو اس سے مانگئے — جو کچھ مل سکتا ہے اسی کے در سے مل سکتا ہے — کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہارون الرشید کو زبردست سلطنت سے نوازے اور شاہ بہلول کو شام کی روٹی بھی نہ دے — یہ تو وہی جانتا ہے کہ کس کے مقدر میں کیا لکھا ہے اور کس کو کیا ملتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جو کچھ بھی ملے گا اسی کے دربار سے ملے گا — اس کے حکم کے بغیر کسی کو ایک گھونٹ پانی بھی نہیں مل سکتا۔ اسی سے مانگنے کا تجربہ کیجئے۔ اس کے خزانوں میں نہ کمی کے آنے کا خطرہ ہے اور نہ یہ اندیشہ ہے کہ اس کے خزانے کبھی ختم ہوں گے۔

آپ جب بھی کسی پریشانی میں مبتلا ہوں جب بھی کوئی حاجت اور ضرورت ہو، ضرورت چھوٹی ہو یا بڑی، دینی ہو دنیوی — اپنے ربّ کی طرف رجوع کیجئے۔ اس کے سامنے اپنی حاجت رکھیے اور اس یقین کے ساتھ کہ وہ آپ کو مایوس اور نامراد نہ لوٹائے گا۔ اس اندازِ فکر وعمل سے آپ کو وہ استغناء، اطمینان اور بے نیازی حاصل ہوگی کہ اس دولت کا مقابلہ دنیا کی کوئی دوسری دولت نہیں کرسکتی۔

اللہ سے مانگنے کا طریقہ اور اس کے آداب سکھاتے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی امت کو صلوٰۃ الحاجۃ پڑھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ یعنی وہ دو رکعت نفل نماز جس کے بعد بندہ اللہ کے حضور اپنی حاجت رکھے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ، سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، اَسْئَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ وَالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ وَّالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ اِثْمٍ لَا تَدَعْ لِيْ ذَنْبًا اِلَّا غَفَرْتَهُ وَلَا هَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَهُ وَلَا حَاجَةً هِيَ لَكَ رِضًا اِلَّا قَضَيْتَهَا يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ

(الترمذی، کتاب الوتر، باب ۱۷۱، ما جاء فی صلاۃ الحاجۃ ص ۱۶۹۰، ابن ماجہ ابواب اقامۃ الصلوٰت، باب ۱۸۹، صلاۃ الحاجۃ ص ۲۵۵۹)

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ انتہائی بردبار اور بہت ہی کرم فرمانے والا ہے۔ پاک و برتر ہے۔ اللہ عرش

عظیم کا مالک، شکر و تعریف اللہ کے لیے ہی ہے جو سارے جہانوں کا (پروردگار) اے اللہ! میں تجھ سے ان چیزوں کی بھیک مانگتا ہوں جو تیری رحمت کو واجب کرنے والی اور تیری مغفرت کو لازم کرنے والی ہیں۔ ہر بھلائی میں حصہ اور ہر گناہ سے سلامتی چاہتا ہوں۔ (اے اللہ!) تو میرا کوئی گناہ بخشے بغیر اور کوئی دکھ اور غم دور کیے بغیر نہ چھوڑ اور میری کوئی حاجت جو تیرے نزدیک پسندیدہ ہو پوری کیے بغیر نہ رہنے دے۔ اے رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والے!



# روزہ کس لیے؟

رمضان کا مہینہ ہے، دن کا وقت ہے، آپ روزے سے ہیں اور ایک شخص آپ سے نہایت سنجیدگی سے کہتا ہے، لیجئے ذرا یہ کھجور کھا کر دیکھئے، بڑی ہی میٹھی اور رسیلی ہے۔ بتایئے آپ کیا سوچیں گے۔ یہی نہ کہ آپ اس کو دماغی مریض سمجھیں گے ورنہ ہوش وحواس میں کوئی شخص ایسی نازیبا بات کہنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہے اور اگر آپ کو ذرا بھی محسوس ہو جائے کہ یہ شخص ہوش وحواس رکھتے ہوئے یہ حرکت کر رہا ہے تو سوچیے آپ کے غیض و غضب کی کیا کیفیت ہوگی۔ بھلا روزے میں بھی کوئی شخص کچھ کھا سکتا ہے، ذرا سی غذا بھی حلق سے نیچے اتارے گا تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔

•••-----•••-----•••

بے شک کھانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور مسلمان معاشرے میں ایسا ہو بھی نہیں سکتا کہ کوئی شخص رمضان کے دنوں میں کسی کو کچھ کھانے کی دعوت دے اور نہ کوئی شخص روزہ رکھ کر کچھ کھانے کی حماقت ہی کر سکتا ہے، کون مسلمان نہیں جانتا کہ کھانے پینے اور دوسری لذتوں سے باز رہنے کا نام ہی روزہ ہے۔ روزہ رکھنے کے بعد بھلا دن میں کچھ کھانے یا چکھنے کا کیا سوال!

•••-----•••-----•••

مگر انتہائی حیرت کی بات یہ ہے کہ بعض اوقات آپ نہایت اطمینان سے مزے لے لے کر انسانی بوٹیاں چباتے ہیں اور آپ کو ذرا احساس نہیں ہوتا کہ آپ کا روزہ دم توڑ رہا ہے۔ ایک کھجور کھانے کے لیے آپ تیار نہیں ہیں کہ آپ کا روزہ ٹوٹ جائے گا لیکن انسان کا گوشت آپ مزے سے کھاتے رہتے ہیں اور آپ کا سخت جان روزہ ذرا مجروح نہیں ہوتا ـــ!

•••-----•••-----•••

رمضان کا مہینہ ہے، دن کا وقت ہے، آپ روزے سے ہیں، اپنے دوستوں کی ایک مجلس میں پہنچتے ہیں۔ مجلس میں ادھر ادھر کی گفتگو ہو رہی ہے اور پھر یکا یک یہ سب آدم خور بن جاتے ہیں، چٹخارے لے لے کر مردہ

انسانوں کا گوشت کھانے لگتے ہیں، آپ بھی بڑی بے باکی سے دستر خوان پر ہاتھ مارنے اور انسانی لاش کو نوچنے لگتے ہیں--- اور آپ کا ضمیر آپ کو ذرا بے چین نہیں کرتا کہ آپ روزے سے ہیں، انسان کا گوشت تو ویسے بھی حرام ہے اور آپ روزے میں بھی مردار کھانے سے باز نہیں رہتے۔

•••------•••------•••

آپ حیران ہو رہے ہیں کہ بھلا میں کب آدم خوروں کی مجلس میں گیا، کب میں نے کسی مردہ انسان کا گوشت کھایا۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں!--- جی ہاں صحیح کہہ رہا ہوں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپ آدم خوروں کی مجلس میں موجود ہوتے ہیں جب وہ انسانی گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے ہوتے ہیں تو آپ کے منہ میں بھی پانی بھر آتا ہے، اور بے اختیار آپ بھی مردہ انسان کے گوشت پر منہ مارنے لگتے ہیں، اور آپ کو ذرا پریشانی نہیں ہوتی کہ آپ ایک انتہائی گھناؤنا جرم کر رہے ہیں۔

•••------•••------•••

وہ مجلسیں جن میں آپ شریک ہوتے ہیں، کیا وہاں دوسروں کے عیوب اور کمزوریوں پر گفتگو نہیں ہوتی، کیا وہاں دوسروں پر الزام نہیں تراشے جاتے، کیا وہاں دوسروں کے خلاف بدگمانیاں نہیں کی جاتیں اور بدگمانیاں نہیں پھیلائی جاتیں، کیا وہاں دوسروں کی غیبت نہیں کی جاتی---؟ آپ ان مجلسوں میں اطمینان سے دوسروں کی غیبت سنتے ہیں، مزہ لیتے ہیں اور اکثر خود بھی شریک ہو جاتے ہیں۔

•••------•••------•••

اللہ کی کتاب بتاتی ہے کہ غیبت کرنے والے آدم خور ہیں، غیبت کرنا دراصل مردہ انسان کا گوشت کھانا ہے۔

وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ط اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ط

(الحجرات ۴۹:۱۲)

اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا--- دیکھو تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔

•••------•••------•••

رمضان کا روزہ بے شک اہم ترین عبادت ہے، اللہ نے اس کا عظیم صلہ اپنے ہاتھوں سے دینے کا وعدہ فرمایا ہے مگر اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ کا روزہ اللہ کی نظر میں بھی روزہ قرار پائے۔ روزے کی حفاظت سے آپ یکسر غافل نہیں ہیں، روزے کی حفاظت ہی تو ہے کہ آپ غذا کا ایک ذرّہ منہ میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ آپ کا روزہ ٹوٹ جائے گا۔ اسی احساس و شعور کو ذرا اور بیدار کیجیے، کھانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، مگر غیبت سے روزہ

مردار ہو جاتا ہے اور وہ ہرگز اس لائق نہیں رہتا کہ اللہ کے حضور کل آپ اسے پیش کر سکیں۔ نہ اس کے ذریعے پرہیز گاری اور تقویٰ کا کوئی جوہر آپ میں پیدا ہو سکتا ہے۔ حالانکہ اللہ نے روزے کی یہی غرض بتائی ہے۔

•••-----•••-----•••

علامہ ابن جوزی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"بہت سے روزے دار روزے تو بہت پابندی سے رکھتے ہیں لیکن وہ یہ خیال نہیں رکھتے کہ جس چیز سے روزہ افطار کر رہے ہیں وہ حلال ہے یا حرام! وہ دن بھر غیبت سے پیٹ بھرتے ہیں، اجنبی چہروں سے آنکھیں سینکتے ہیں اور ذرا باک نہیں کرتے، فضول گفتگوؤں میں لگے رہتے ہیں اور شیطان انہیں اطمینان دلاتا رہتا ہے کہ آپ روزے دار ہیں، یہ بھی شیطانی دھوکا ہے۔"

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کیمیائے سعادت میں لکھتے ہیں:

"نبی ﷺ کے مبارک دور میں دو عورتوں نے روزہ رکھا، روزے میں ان دونوں کی حالت غیر ہو گئی، پیاس کی شدت سے ان کی جان لبوں پر آ گئی۔ دونوں نے نبی ﷺ سے روزہ کھولنے کی اجازت منگوائی۔ آپ ﷺ نے دونوں کے پاس ایک بڑا پیالہ بھیجا اور حکم دیا کہ دونوں اس میں قے کریں، دونوں عورتوں نے ہدایت کے مطابق اس پیالے میں قے کی، دونوں کی قے میں خون کے ٹکڑے نکلے۔ یہ دیکھ کر لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی —— حضور ﷺ نے فرمایا، ان دونوں عورتوں نے ان چیزوں سے تو روزہ رکھا جو اللہ نے حلال کی ہیں اور ان چیزوں سے روزہ توڑا جو اللہ نے حرام کی ہیں —— یعنی یہ دوسروں کی غیبت کرتی رہیں۔ یہ انسانوں کی بوٹیاں ہیں جو ان کی قے میں نکلی ہیں۔"

•••-----•••-----•••

غیبت ہی کی طرح ان دوسری تمام برائیوں سے بھی روزہ برباد ہو جاتا ہے جن کو اللہ نے حرام کیا ہے اور عام طور پر لوگ ان میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حضرت علامہ ہجویری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

اذا صمت فليصم سمعك وبصرك ويدك وكل عضو منك

یعنی جب تو روزہ رکھے تو چاہیے کہ اپنے کانوں، اپنی آنکھوں، اپنی زبان، اپنے ہاتھوں اور اپنے جسم کے تمام اعضا کو اللہ کی ناپسندیدہ باتوں اور اس کے منع کردہ کاموں سے باز رکھے۔

•••-----•••-----•••

اس سے بڑی نادانی اور اس سے بڑا گھاٹا اور کیا ہوگا کہ آدمی دن بھر بھوکا پیاسا بھی رہے، لذتوں سے محروم بھی رہے اور پھر بھی اس سے کہا جائے کہ تیرے حصے میں بھوک اور پیاس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اللہ کی پناہ اس سے

کہ آپ کا روزہ صرف بھوک پیاس کی شدت بن کر رہ جائے اور اللہ کی نظر میں اس کی کوئی قیمت نہ ہو، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

بہت سے روزے دار ایسے ہوتے ہیں جن کے پلے روزے سے بھوک اور پیاس سے مرنے کے سوا اور کچھ نہیں پڑتا۔

اللہ نے آپ کو روزہ رکھنے کا شعور دیا ہے تو اس کی قدر کیجیے، آپ روزہ رکھتے ہیں تو روزے کو روزہ بنانے کی فکر بھی کیجیے --- اللہ کے رسول ﷺ نے مقبول روزے کے لیے دو باتوں کے اہتمام کی تاکید فرمائی ہے۔

☆ --- ایمانی شعور

☆ --- احتساب

ایمانی شعور کے ساتھ روزہ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جن حقیقتوں پر ایمان لایا ہے وہ اس کے ذہن میں تازہ ہوں، اللہ کی عظمت کا احساس، اس کے حضور جواب دہی کا تصور، اس کے وعدوں پر یقین، اس کے غضب سے بچنے کی فکر، اس کے عذاب کا خوف، رسول ﷺ سے قلبی تعلق، ان کی سنت پر چلنے کا عزم، یہ ساری باتیں آدمی کے ذہن میں تازہ رہیں، اس ایمانی شعور کے ساتھ جو روزہ رکھا جائے گا وہی روزہ حقیقت میں روزہ ہوگا۔

احتساب سے مراد یہ ہے کہ آدمی خالص اجرِ آخرت کے لیے روزہ رکھے اور ہر وقت چوکنا رہے کہ کوئی اور محرک اس کے اخلاص کو گدلا نہ کر دے اور اپنے روزے کو ان تمام برائیوں سے بچائے رکھے جو روزے کو مجروح یا بے اثر کرنے والی ہیں۔

•••-------•••-------•••

اگر روزہ رکھ کر بھی آپ وہ سب کچھ کرتے رہے جس سے اللہ روکنا چاہتا ہے اور انہی گناہوں میں سرگرم رہے جن سے باز رہنے کی قوت پیدا کرنے کے لیے اللہ نے آپ کو روزہ رکھنے کی تاکید فرمائی ہے تو پھر آپ ہی بتائیے اللہ کو ایسے روزے کی کیا ضرورت ہے اور ایسے روزے سے آپ اس بے پایاں اجر و اکرام اور عظیم صلوں کی توقع کیسے کر سکتے ہیں جن کا وعدہ اللہ نے آپ سے کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''جس شخص نے (روزہ رکھ کر) جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ کو اس سے کیا مطلب کہ اس نے اپنا کھانا پینا چھوڑ رکھا تھا۔''

آپ کو اللہ نے روزہ رکھنے کی توفیق دی ہے اور پابندی سے روزہ رکھتے ہیں --- تو یہ ضرور سوچیے کہ آپ کس لیے روزہ رکھتے ہیں؟

# عید یا وعید

رمضان کے مبارک شب و روز رخصت ہو گئے۔عید کی صبح نمودار ہو گئی۔مسلمان عید کی خوشیوں سے سرشار، عید کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔آج اظہارِ مسرت کا دن ہے، جشن منانے کا دن ہے، ایک دوسرے سے ملنے اور مبارکباد لینے دینے کا دن ہے، اللہ کی حمد وثنا اور تکبیر و تہلیل کا دن ہے، اللہ کے حضور سجدہ شکر بجا لانے کا دن ہے، عید اللہ کا مقرر کیا ہوا تہوار ہے۔آج کے دن نہانا دھونا، صاف ستھرے کپڑے پہننا، خوشبو لگانا، تکبیر و تہلیل کہتے ہوئے عید گاہ جانا، عید گاہ جانے سے پہلے کچھ میٹھا کھانا، ایک راستے سے جانا اور دوسرے راستے سے آنا اور سب کے ساتھ مل کر شوکتِ اسلام کا مظاہرہ کرنا اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور مطلوب اعمال ہیں۔

•••-----•••-----•••

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ جب مکے سے مدینے تشریف لائے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ مدینے کے لوگ دو مخصوص دنوں میں کھیل وتفریح کرتے اور خوشیاں مناتے ہیں۔آپ ﷺ نے پوچھا ''یہ دو دن کیسے ہیں؟'' لوگوں نے بتایا ''یہ ہمارے تہوار ہیں، ہم دورِ جاہلیت سے ان دو دنوں میں اسی طرح خوشی مناتے رہے ہیں۔'' نبی ﷺ نے فرمایا:

''اللہ نے تمہیں ان دو دنوں کے بدلے زیادہ بہتر دو دن عطا فرمائے ہیں، ایک عید الفطر اور دوسرا عید الاضحیٰ'' (سنن ابوداؤد)

اس مختصر سی روایت سے ایک نہایت اہم حقیقت پر روشنی پڑتی ہے، وہ یہ کہ ایک بامقصد ملت کے تہوار بھی بامقصد ہوتے ہیں، اسلامی تہواروں کا مقصد صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ دوسری قوموں کی طرح مسلمان ملت بھی سال بھر میں دو جشن مسرت منا لیا کرے اور تہوار منانے کے فطری جذبے کو تسکین دے لیا کرے، اگر بات صرف اتنی ہی ہوتی تو ان دو دنوں کے بدلے دوسرے دو دن مقرر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔مسلمان انہی دو دنوں میں جشن مسرت مناتے رہتے جیسا کہ مدینے والے ایک زمانے سے مناتے چلے آرہے تھے لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ''ان دو دنوں سے بہتر دو دن اللہ نے تمہیں اظہارِ مسرت کے لیے عطا فرمائے ہیں، ایک عید

الفطراوردوسراعیدالاضحیٰ''

•••------•••------•••

عیدالفطرشوال کی پہلی تاریخ کومنائی جاتی ہے اورعیدالاضحیٰ ذوالحجہ کی دس تاریخ کو—یکم شوال کوعیدالفطر منانے کا بھی ایک اہم مقصد ہے اوردس ذوالحجہ کواظہارمسرت کابھی ایک خاص پس منظر ہے۔ وقت کی مناسبت سے ان سطروں میں صرف عیدالفطر کے مقصد پراظہارخیال کرناہے۔

رمضان کے شب وروز کی عبادتوں سے فارغ ہوتے ہی خوشی منانااوردوگانہ شکراداکرنادراصل اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ ہی کے فضل وکرم سے ہمیں رمضان کی یہ مبارک ساعتیں حاصل ہوئیں اوراسی کی توفیق سے ہم قیام وصیام، تلاوت وتسبیح، صدقہ وخیرات اوردوسری عبادتیں بجالاسکے، اگراللہ کی توفیق واطاعت نہ ہوتی توہم کچھ بھی نہ کرسکتے۔

•••------•••------•••

عیدمنانے کی اس حقیقت کوسامنے رکھیے تواس بات کودہرانے کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی کہ عید کی خوشی میں اس بدنصیب کاکوئی حصہ نہیں ہے، جورمضان کی برکتوں سے محروم رہااوررمضان کے بابرکت شب وروز پانے کے باوجوداس نے اپنی مغفرت کاسامان نہیں کیا۔ لیل ونہارکی گردش جب تک باقی ہے یکم شوال کی تاریخ آتی رہے گی مگرمحض اس صبح کاطلوع ہوناہی پیغام مسرت نہیں ہے۔ یہ صبح توہرایک پرطلوع ہوتی ہے لیکن اس جشن میں حقیقی مسرت صرف اسی کاحصہ ہے جواپنے ربّ کے حضورکھڑے ہوکریہ کہہ سکے کہ پروردگارتونے جومبارک مہینہ مجھے عطافرمایاتھامیں نے اسے ضائع نہیں کیا، میں دن میں بھی تیری خوشی کے کام کرتارہااورشب میں بھی تیری عبادت میں لگارہا۔

•••------•••------•••

عیدکادن عیدبھی ہے اوروعیدبھی۔ یہ مبارک بادکادن بھی ہے اورتعزیت کادن بھی۔ مبارکبادکادن ان خوش نصیبوں کے لیے ہے جن کارمضان شکرگزاری کی حالت میں گزرااورتعزیت کادن ان کم نصیبوں کے لیے ہے جن کارمضان اس طرح گزراکہ وہ اس کی برکتوں سے محروم ہی رہے، بے شک ایسے لوگوں کے لیے عید، وعیدکادن ہے، یہ مبارکبادکے نہیں تعزیت کے مستحق ہیں۔

یوم التهنیه و یوم التعزیه، تهنیه لمن مضی عنه رمضان مشکورا، تعزیه لمن قضی عنه رمضان مهجورا.

یہ مبارکبادکادن بھی ہے اورتعزیت کادن بھی۔ مبارکباداس کے لیے جس سے رمضان خوش خوش

رخصت ہوا اور تعزیت کا دن ہے اس کے لیے جس سے رمضان رخصت ہو گیا اور وہ اس سے محروم ہی رہا۔

عید الفطر یقیناً مسلمانوں کے لیے اظہارِ مسرت کا دن ہے۔ یہ اللہ کا دیا ہوا تہوار ہے —— مگر یہ ضرور سوچنے کی بات ہے کہ خوشی کس بات کی؟ رمضان اپنی تمام برکتوں اور رحمتوں کے ساتھ آپ پر سایہ فگن ہوا۔ آپ نے اس کو اللہ کا انعام سمجھ کر اگر اپنی عاقبت بنانے اور مغفرت و نجات کا سامان کرنے کی فکر کی ہے تو بے شک یہ خوشی کی بات ہے اور آپ عید الفطر کا تہوار منانے کے مستحق ہیں مگر جس کم نصیب نے رمضان کی مبارک ساعتوں میں ذرا بھی اپنی مغفرت و نجات کی فکر نہیں کی، رمضان کا سارا مہینہ اس نے یونہی غفلت اور محرومی میں گزار دیا۔ اللہ کو خوش کرنے کے بجائے اس نے اللہ کا غضب اور بھڑکایا۔ اس کو بھلا کیا حق ہے کہ وہ عید کا تہوار منائے اور خوشی کا اظہار کرے۔ وہ آخر کس بات کی خوشی منائے اور کس منہ سے اللہ کی بڑائی ظاہر کرنے کے لیے تکبیر کہے۔

•••------•••------•••

اس شخص کی ہلاکت اور محرومی میں کس کو شک ہو سکتا ہے جس کی تباہی اور ہلاکت کے لیے جبرئیل امین علیہ السلام بددعا کریں اور اس بددعا پر رسول مقبول ﷺ آمین کہیں۔

ایک دن نبی ﷺ خطبہ دینے کے لیے منبر پر چڑھنے لگے، پہلے زینے پر جب آپ ﷺ نے قدم رکھا تو فرمایا آمین۔ دوسرے زینے پر قدم رکھا تو پھر فرمایا آمین۔ تیسرے زینے پر قدم رکھا تو پھر فرمایا آمین۔ خطبہ دے کر جب آپ ﷺ فارغ ہوئے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا، حضور ﷺ! آج ہم نے یہ ایسی بات دیکھی کہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ فرمایا جب میں خطبہ دینے کے لیے منبر پر چڑھنے لگا اور منبر کے پہلے زینے پر قدم رکھا تو جبرئیل امین نمودار ہوئے اور انہوں نے کہا ''اللہ اس شخص کو ہلاک کر دے جس نے رمضان کا مہینہ پایا اور پھر بھی اپنی مغفرت کا سامان نہیں کیا۔'' اس پر میں نے کہا آمین۔'

جن کم نصیبوں کو اللہ کے رسول ﷺ محروم اور تباہ حال کہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ ان کو بھی عید کی خوشی منانے اور مبارکباد لینے کا حق ہے۔

•••------•••------•••

جو خوش نصیب عید کی مبارکباد اور خوشی کے واقعی حق دار ہیں ان کا ایمان افروز حال خود نبی کریم ﷺ کی زبان سے سنئے اور اس آرزو کو پورا کرنے میں لگ جائیے کہ آپ کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہو۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

''جب عید کی صبح نمودار ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو ہر شہر اور ہر بستی کی طرف روانہ کر دیتا ہے، فرشتے زمین میں اتر کر ہر گلی اور ہر راستے کے موڑ پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور پکارتے ہیں۔ ان کی پکار ساری مخلوق سنتی ہے

مگر انسان اور جن نہیں سن پاتے —— وہ پکارتے ہیں:

اے محمد ﷺ کی امت کے لوگو! نکلو اپنے گھروں سے اور چلو اپنے پروردگار کی طرف! تمہارا پروردگار بہت ہی زیادہ دینے والا اور بڑے سے بڑے قصور کو معاف کرنے والا ہے۔

اور جب مسلمان عیدگاہ کی طرف جانے لگتے ہیں تو اللہ عزوجل اپنے فرشتوں سے مخاطب ہو کر پوچھتا ہے:

''میرے فرشتو! اس مزدور کا صلہ کیا ہے؟ جس نے اپنے ربّ کا کام پورا کیا؟''

فرشتے کہتے ہیں ''اے ہمارے معبود! اے ہمارے آقا! اس مزدور کا صلہ یہ ہے کہ اسے بھرپور مزدوری دی جائے۔'' اس پر اللہ کا ارشاد ہوتا ہے:

''فرشتو! تم سب گواہ ہو جاؤ کہ میں نے اپنے بندوں کو جو رمضان بھر روزے رکھتے رہے اور تراویح پڑھتے رہے۔ اس کے صلے میں اپنی خوشنودی سے نواز دیا اور ان کی مغفرت فرما دی۔''

پھر اللہ اپنے بندوں سے کہتا ہے ''میرے پیارے بندو! مانگو مجھ سے جو کچھ مانگتے ہو، مجھے میری عزت کی قسم! مجھے میرے جلال کی قسم! آج عید کے اس اجتماع میں تم آپنی آخرت بنانے کے لیے مجھ سے جو مانگو گے، عطا کروں گا اور اپنی دنیا بنانے کے لیے جو چاہو گے، اس میں بھی تمہاری بھلائی کو پیشِ نظر رکھوں گا —— جب تک تم میرا دھیان رکھو گے، میں تمہارے قصوروں پر پردہ ڈالتا رہوں گا۔ مجھے میری عزت کی قسم! مجھے میرے جلال کی قسم! میں تمہیں مجرموں کے سامنے ہرگز ذلیل اور رسوا نہ کروں گا۔ جاؤ تم اپنے گھروں کو بخشے بخشائے لوٹ جاؤ۔ تم مجھے راضی کرنے میں لگے رہے ہو، میں تم سے راضی ہو گیا۔''

فرشتے اس بشارت پر خوشی سے جھوم اٹھتے ہیں اور اللہ کی اس بخشش اور نوازش پر خوشیاں مناتے ہیں، جو وہ اپنے بندوں پر فرماتا ہے، جو رمضان بھر کے روزے رکھ کر آج اپنا روزہ کھولتے ہیں۔'' (الترغیب، ج۲ص۱۰۱)



# عیدِ قرباں کس لیے؟

عید الاضحیٰ میں دنیا بھر کے مسلمان اللہ کے حضور اپنے جانوروں کی قربانی کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت کو تازہ کرتے ہیں۔ ایک بار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسی کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

ما هذه الاضاحی ؟ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم !

یہ قربانی کیا ہے؟ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!

ارشاد فرمایا:

سُنَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ صَلٰوةُ اللّٰهِ وَ سَلَامُهٗ (ابن ماجہ ابواب الاضحیٰ باب ۳)

یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت ہے۔

بے شک ہر سال مسلمانانِ عالم کروڑوں جانوروں کی قربانی کر کے جاں نثاری اور فدائیت کے اس بے نظیر واقعہ کی یاد تازہ کرتے ہیں جو آج سے تقریباً سوا پانچ ہزار سال پہلے عرب کی سرزمین میں اللہ کے گھر کے پاس پیش آیا تھا ---کیسا رقت انگیز اور ایمان افروز ہوگا وہ منظر جب ایک بوڑھے اور شفیق باپ نے اپنے نوخیز لختِ جگر سے کہا:

يٰبُنَيَّ اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَا ذَا تَرٰى ؕ (الصافات ۳۷:۱۰۲)

پیارے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، بتا تیری کیا رائے ہے؟

اور لائق فرزند نے بے تامل کہا:

يٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ٞ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ○ (الصافات ۳۷:۱۰۲)

ابا جان! آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالیے، آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔

اور پھر اخلاص و وفا کے اس پیکر نے خوشی خوشی اپنی معصوم گردن زمین پر اس لیے ڈال دی کہ اللہ کی رضا اور تعمیلِ حکم کے لیے اس پر تیز چھری پھیر دی جائے اور ایک ضعیف اور رحم دل باپ نے اپنے محبوب لختِ جگر کے سینے پر گھٹنا ٹیک کر اس کی معصوم گردن پر اس لیے تیز چھری پھیر دینے کا ارادہ کر لیا کہ اس کے ربّ کی مرضی اور حکم یہی ہے۔

اطاعت وفرماں برداری کا یہ بے نظیر منظر دیکھ کر رحمت خداوندی جوش میں آ گئی اور ندا آئی:

وَنَادَيْنَٰهُ أَنْ يَٰٓإِبْرَٰهِيمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ ٱلرُّءْيَآ ۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِى ٱلْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ ٱلْبَلَٰٓؤُا۟ ٱلْمُبِينُ ۝ (الصافات ۳۷:۱۰۴-۱۰۶)

اور ہم نے انہیں ندا دی کہ اے ابراہیم! تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم وفادار بندوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی۔

اور اس وقت ایک فرشتے نے ابراہیم علیہ السلام کے سامنے ایک مینڈھا پیش کیا کہ وہ اس کے گلے پر چھری پھیر کر جاں نثاری اور وفاداری کے جذبات کی تسکین کریں اور اللہ نے رہتی دنیا تک یہ سنت جاری کر دی کہ دنیا بھر کے مسلمان ہر سال اسی دن جانوروں کے گلے پر چھری پھیر کر اس بے نظیر قربانی کی یاد تازہ کریں۔

وَفَدَيْنَٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ۝ (الصافات ۳۷:۱۰۷)

اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دیکر اس (نوعمر بچے) کو چھڑا لیا۔

بڑی قربانی سے مراد قربانی کی یہی سنت ہے جس کا اہتمام ہر سال اسی دن مسلمانان عالم دنیا کے گوشے گوشے میں کرتے ہیں اور لاکھوں مسلمان تو مکے کی اس سرزمین پر اس سنت کو تازہ کرتے ہیں جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔

ابراہیم علیہ السلام سے نہ تو اس قربانی کا یکا یک مطالبہ کیا گیا تھا اور نہ وہ یکا یک اس عظیم قربانی کے لیے تیار ہو گئے تھے بلکہ ان کی پوری زندگی ہی قربانیوں کی یادگار ہے۔ حیات ابراہیم کو اگر قربانی کی تفسیر کہا جائے تو زیادہ صحیح ہو گا۔ اللہ کی راہ میں قربانی دینے کا مفہوم اگر آپ جاننا چاہیں تو ضروری ہے کہ آپ ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کو پڑھیں۔ اللہ کی خاطر آپ ماں باپ کی شفقتوں سے محروم ہوئے' ان کی دولت اور آسائش سے محروم ہوئے، خاندان اور برادری کی حمایت اور سہارے سے محروم ہوئے، خاندانی گدی سے محروم ہوئے، وطن عزیز سے نکلنا پڑا۔ اللہ ہی کی خاطر آتش نمرود میں بے خطر کود کر آپ نے اللہ کے حضور اپنی جان نذر کر دی اور اللہ ہی کی رضا اور اطاعت میں آپ نے اپنی محبوب بیوی اور اکلوتے بچے کو ایک بے آب وگیاہ ریگستان میں لا کر ڈال دیا اور جب یہی بچہ ذرا سنِ شعور کو پہنچ کر کسی لائق ہوا تو حکم ہوا کہ اپنے ہاتھوں سے اس کے گلے پر چھری پھیر کر دنیا کے ہر سہارے اور تعلق سے کٹ جاؤ اور مسلم حنیف بن کر اسلام کامل کی تصویر پیش کرو۔

إِذْ قَالَ لَهُۥ رَبُّهُۥٓ أَسْلِمْ ۖ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ۝ (البقرہ ۲:۱۳۱)

جب ان سے ان کے ربّ نے کہا، مسلم ہو جا تو اس نے بے تامل کہا "میں ربّ العالمین کا مسلم ہو گیا۔"

اسلام کے معنی ہیں کامل اطاعت، مکمل سپردگی اور سچی وفاداری۔ قربانی کا یہ بے نظیر عمل وہی کر سکتا ہے جو واقعتاً اپنی پوری شخصیت اور پوری زندگی میں اللہ کا مکمل اطاعت گزار ہو، جو زندگی کے ہر معاملے میں اس کا وفادار

ہو اور جس نے اپنا سب کچھ اللہ کے حوالے کر دیا ہو۔

اگر آپ کی زندگی گواہی نہیں دے رہی ہے کہ آپ اللہ کے مسلم اور وفادار ہیں اور آپ نے اپنی پوری زندگی اللہ کے حوالے نہیں کی ہے تو آپ محض چند جانوروں کا خون بہا کر ابراہیم علیہ السلام کی سنت کو تازہ نہیں کر سکتے۔ اور اس عہد میں پورے نہیں اتر سکتے جو قربانی کرتے وقت آپ اپنے اللہ سے کرتے ہیں۔

دنیا کے مسلمان اس دن جانوروں کا خون بہا کر اللہ سے عہد کرتے ہیں کہ اے ربّ العالمین، ہم تیرے مسلم ہیں۔ تیری کامل اطاعت ہی ہمارا شیوہ ہے، ہم تجھ سے وفاداری کا اعلان کرتے ہیں اور اپنے بزرگوار اسماعیل کی طرح تیرے حضور اپنی گردن پیش کرتے ہیں۔ پروردگار تو نے ہی قربانی کی یہ سنت جاری کر کے اسماعیل علیہ السلام کی گردن چھڑائی تھی، ہم جانوروں کا خون بہا کر اپنی گردن چھڑاتے ہیں مگر ہمارا سب کچھ تیرا ہی ہے، تیرا اشارہ ہو گا تو ہم تیرے دین کی خاطر اپنی گردن کٹانے اور اپنا خون بہانے سے ہرگز دریغ نہ کریں گے۔ ہم تیرے ہیں اور ہمارا سب کچھ تیرا ہے۔ ہم تیرے وفادار اور جاں نثار بندے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے پیرو ہیں اور انہی کی عقیدت سے سرشار ہیں۔ قربانی کرتے وقت آپ جو دعا پڑھتے ہیں وہ دراصل وفاداری اور جاں نثاری کے انہی جذبات کا اظہار ہے:

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ○ إِنَّ صَلَاتِي وَ نُسُكِي وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ○ لَا شَرِيكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ○ اَللّٰهُمَّ لَكَ وَ مِنْكَ ○ (الانعام:۶: ۷۹، ۱۶۳، ۱۶۴)

میں نے پوری یکسوئی کے ساتھ اپنا رخ ٹھیک اس اللہ کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ بلاشبہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب ربّ العالمین کے لیے ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں مسلم اور فرماں بردار ہوں، خدایا! یہ تیرے ہی حضور پیش ہے اور تیرا ہی دیا ہوا ہے۔

پھر سپردگی کی عجیب کیفیت کے ساتھ جانور کے گلے پر تیز چھری پھیرتے ہوئے آپ کہتے ہیں:

بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْهُ مِنِّي كَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ خَلِيلِكَ إِبْرَاهِيمَ وَحَبِيبِكَ مُحَمَّدٍ عَلَيْهِمَا الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ

اللہ کے نام سے اللہ سب سے بڑا ہے۔ اے اللہ! تو اس قربانی کو میری جانب سے قبول فرما جس طرح تو نے اپنے دوست ابراہیم علیہ السلام اور اپنے حبیب محمد ﷺ کی قربانی قبول فرمائی۔

دراصل اسی واقعہ کو تازہ کرنا اور انہی جذبات کو دل و دماغ پر حاوی کرنا قربانی کی روح اور اس کا مقصد ہے۔

اگر یہ جذبات اور ارادے نہ ہوں، اللہ کی راہ میں قربان کی آرزو اور خواہش نہ ہو، اللہ کی کامل اطاعت اور سب کچھ اس کے حوالے کر دینے کا عزم اور حوصلہ نہ ہو تو محض جانوروں کا خون بہانا، گوشت کھانا اور تقسیم کرنا قربانی نہیں ہے بلکہ گوشت کی ایک تقریب ہے جو ہر سال آپ منا لیا کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی سنت کو تازہ کر دیا۔ اللہ کو نہ جانوروں کے خون کی ضرورت ہے نہ گوشت کی۔ اس کو تو اخلاص و وفا اور تقویٰ و جاں نثاری کے وہ جذبات مطلوب ہیں جو آپ کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ کا ارشاد ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰـكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ (الحج ۲۲:۳۷)

اللہ کو نہ ان جانوروں کے گوشت پہنچتے ہیں اور نہ ان کا خون، اسے تو صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

یہی تقویٰ اور اطاعت و فرماں برداری کا جو ہر قربانی کی روح ہے اور اللہ کے یہاں صرف وہی قربانی شرفِ قبول پاتی ہے جو متقی لوگ اطاعت اور فرماں برداری و جاں نثاری کے جذبات کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ○ (المائدہ ۵:۲۷)

اور انہیں آدم کے دو بیٹوں کا قصہ ٹھیک ٹھیک سنا دو۔ جب ان دونوں نے قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی۔ اور دوسرے کی قبول نہ کی گئی۔ اس نے کہا، میں تجھے مار ڈالوں گا۔ اس نے جواب دیا ''اللہ تو متقیوں ہی کی قربانی قبول کرتا ہے۔''

یعنی تیرے دنبے کو اگر آسمانی آگ نے نہیں جلایا اور اللہ نے اسے قبول نہیں کیا تو اس میں میرا کیا قصور ہے جو مجھے قتل کی دھمکی دے رہا ہے۔ اپنی اصطلاح کی فکر کر، تیرے اندر ہی کھوٹ ہے، اللہ تو صرف متقی لوگوں کی قربانی ہی قبول کرتا ہے۔

تقویٰ اور اخلاص اور وفاداری و جاں نثاری کے یہ جذبات اس طرح پیدا نہیں ہوتے کہ آپ گاہے گاہے اللہ کو یاد کر لیں اور کچھ ایسے مخصوص اعمال کبھی کبھی کر لیں جو اللہ سے تعلق اور اس کی راہ میں قربانی کی علامت ہیں اور پھر اپنے افکار و خیالات، احساسات و جذبات، اخلاق و معاملات اور اطاعت و فاداری میں آپ آزاد ہیں کہ جو چاہیں سوچیں، جو چاہیں ارادے رکھیں، جو چاہیں کریں اور جس کی اطاعت و فرماں برداری کا چاہیں دم بھریں — اللہ سے یہ عہد کرنے کے بعد کہ ''میں ربّ العالمین کا مسلم ہوں'' اس کی کیا گنجائش ہے کہ ہم دوسرے ازموں اور طریقوں کو اطاعت کے لیے اپنائیں یا ایک کو دوسرے پر ترجیح دے کر اپنے لیے جائز اور قابلِ قبول قرار دیں اور اپنے من مانے طریقوں کی پیروی کریں۔ کیا جانوروں کا فدیہ دے کر ہم نے اپنی جانوں کو اس لیے چھڑایا ہے کہ ہم اپنی جانوں اور اپنی قوت و صلاحیت کو جہاں چاہیں کھپائیں اور قربان کریں اور اللہ سے یہ امید کریں کہ وہ ان

جانوروں کے گوشت اور خون کو قبول کر لے گا۔

اللہ کا دین آپ کی پوری شخصیت اور آپ کی پوری زندگی چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آپ اس کی اطاعت کے ساتھ کسی اور کی اطاعت کا جوڑ نہ لگائیں۔ جن برگزیدہ بندوں کی سنت کو آپ تازہ کر رہے ہیں، انہیں دیکھیں کہ وہ کس طرح زندگی کے ہر معاملے میں مسلم حنیف تھے۔ اللہ سے اسلام اور بندگی کا عہد کرنے والے ابراہیم علیہ السلام کی پوری زندگی اسلام کی کیا تصویر پیش کرتی ہے، ان کی زندگی کو آپ بار بار پڑھیں اور ذی الحجہ کے پہلے دس ایام میں خصوصی اہتمام کے ساتھ پڑھیں اور اپنے دل و دماغ اور شخصیت اور معاشرے پر ان جذبات اور کیفیات کو طاری کرنے کی کوشش کریں جو اس پاکیزہ زندگی میں آپ کو نظر آئیں ورنہ قربانی کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ عام دنوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ گوشت کھانے اور کھلانے کے لیے آپ ایک جشن منا رہے ہیں۔



# نواسۂ رسول ﷺ کی شہادت اور آپ

ماہِ محرم آتے ہی پوری امت کا غم تازہ ہو جاتا ہے۔ چودہ صدیاں گزر گئیں، امت کی آہ و بکا سے دشت و جبل گونج اٹھے۔ صدیوں سے برابر بہنے والے یہ آنسو جمع کیے جائیں تو نہریں بہہ نکلیں۔ کون کہتا ہے کہ نواسہ رسول ﷺ کی مظلومانہ شہادت پر آپ دل نہ دکھائیں، آنسو نہ بہائیں اور عقیدت و محبت میں اظہارِ غم نہ کریں، اگر رسول ﷺ سے آپ کو تعلق ہے، رسول ﷺ کی اہلِ بیت سے تعلق ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ عاشورہ کی بھیانک رات اور کربلا کی صبحِ قیامت کی یاد آپ کو نہ تڑپائے، فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر کا چراغ گل ہو جائے اور مسلمان کا دل نہ روئے، بحرِ ہند کے پانی میں آگ لگنا تو ممکن ہے لیکن یہ ناممکن ہے۔

دس محرم کی ان قیامت خیز گھڑیوں کا تصور تو کیجئے کہ دوشِ رسول ﷺ کے سوار فرات کے ساحل پر پیاس سے بے تاب ہیں، لب خشک ہیں، حلق سوکھ رہا ہے، عزیزوں اور بچوں کی بے بسی اور مظلومانہ شہادت سے دل زخمی ہے، کسی طرح دشمنوں کے نرغے سے بچ کر فرات کے کنارے سے پانی پینا چاہتے ہیں کہ حصین ابن نمیر تاک کر نیزہ مارتا ہے اور نواسہ رسول ﷺ کے مبارک منہ سے سرخ تازہ خون کا فوارہ پھوٹ نکلتا ہے، نوجوانانِ جنت کے سردار یہ خون چلو میں لے کر آسمان کی طرف اچھالتے ہیں اور کہتے ہیں:

”اے بے نیاز! تیرے نبی ﷺ کے نواسے کے ساتھ یہ سنگ دل جو سلوک کر رہے ہیں اس کی فریاد تجھی سے کرتا ہوں۔“

اور پھر آسمان کی آنکھوں نے یہ دلدوز منظر بھی دیکھا کہ نواسہ رسول ﷺ کی گردن میں تیر چھدا ہوا ہے، آپ رضی اللہ عنہ ہاتھ سے کھینچ کر نکالتے ہیں کہ زریعہ گردن مبارک پر تلوار سے وار کرتا ہے اور مظلوم کربلا زخموں کی تاب نہ لا کر گر پڑتے ہیں ـــــ اسی دوران سنان ابن انس کا ایسا نیزہ لگتا ہے کہ آپ ہمیشہ کے لیے امت کو اپنے غم میں روتا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں ـــــ اور یہی سنان شقی نواسہ رسول ﷺ کا سرِ مبارک جسمِ اطہر سے جدا کر کے ابن زیاد کے پاس کوفہ بھیج دیتا ہے۔

اور پھر اس منظر پر کس کا کلیجہ پھٹ نہ پڑے گا کہ ابن زیاد کے سامنے فاطمہ کے لختِ جگر کا سرِ مبارک رکھا ہے

اور وہ گستاخ اپنی چھڑی سے آپ رضی اللہ عنہ کے مبارک دانتوں اور ہونٹوں کو چھیڑ رہا ہے ــــ ایک بوڑھے صحابی زید بن ارقم سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ غصے سے بے تاب ہو کر بولے:

''چھڑی ہٹا لو، اللہ واحد کی قسم! میں نے رسول پاک ﷺ کے لبوں کو ان لبوں کا بوسہ لیتے ہوئے دیکھا ہے''

ــــ یہ کہا اور بے اختیار دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

اور پھر اس منظر کا تصور کیجئے کہ شہداء کربلا کی لاشیں غاضریہ کے باشندے دفن کر رہے ہیں، انہی میں ایک لاشہ بے سر بھی رکھا ہے۔ یہ امام مظلوم کا لاشہ ہے، یہ بے سر کے دفن کیا جا رہا ہے۔

زمین سہمی پڑی تھی، آسماں ساکت تھا بے چارہ

بے شک محرم ہر سال ان غموں کی یاد ساتھ لاتا ہے اور آپ کی گریہ وزاری، نالہ و ماتم ایک فطری حقیقت ہے، لیکن سوال صرف یہ ہے کہ یہ نالہ و ماتم اور یہ آہ و بکا کس لیے ــــ کیا حسین رضی اللہ عنہ نے جان عزیز کی قربانی دے کر اور اپنے نونہالوں کی گردنیں کٹا کر امت کو یہ سبق دینا چاہا تھا کہ وہ چند دن سوگ منا کر بیتِ رسول ﷺ کے ساتھ عقیدت و محبت کا اظہار کیا کرے، یا آپ رضی اللہ عنہ نے فرات کے کنارے میدان کربلا میں، قربانی شہادت، جہاد اور باطل سے پنجہ آزمائی کی تاریخ اس لیے تیار کی کہ نوجوانان اسلام اپنے سردار کے نقش قدم پر چل کر حق کے لیے ہمیشہ سینہ سپر رہیں اور جیتے جی کبھی بھی باطل کو اپنے ناپاک قدم جمانے کا موقع نہ دیں، کربلا کے مصائب کا خیر مقدم کریں لیکن باطل کے آگے ہرگز گردن نہ جھکائیں۔

کوفہ جاتے ہوئے راستے میں ''بیضہ'' کے مقام پر شہید کربلا رضی اللہ عنہ نے جو خطبہ دیا ہے اسے بار بار پڑھئے اور غور کیجئے کہ نوجوانان جنت کے سردار کی شہادت، قربانیاں، میدان کربلا کا جہاد آپ سے کیا مطالبہ کر رہا ہے:

لوگو! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص کسی ایسے بادشاہ کو دیکھتا ہے جو ظالم و جابر ہے، اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کر رہا ہے، اللہ سے کیے ہوئے عہد کو توڑ رہا ہے، رسول ﷺ کی سنت کو تہس نہس کر رہا ہے، اللہ کے بندوں پر گناہ اور زیادتی کے ساتھ حکومت کر رہا ہے اور پھر بھی اس شخص کو غیرت نہ آئے، نہ زبان سے وہ اس ظالم کے خلاف آواز اٹھاتا ہے نہ عملی طور پر ظالم کے خلاف کوئی قدم اٹھاتا ہے تو اللہ کو یہ حق ہے کہ وہ اس ظالم بادشاہ کی جگہ اس شخص کو دوزخ کی آگ میں جھونک دے۔''

لوگو! خبردار ہو جاؤ۔ یہ لوگ شیطان کی اطاعت قبول کر چکے ہیں اور رحمٰن کی اطاعت سے آزاد ہو گئے ہیں، ان لوگوں نے اللہ کی زمین کو فساد سے بھر دیا ہے، حدود الٰہی کو پامال کر دیا ہے۔ مال غنیمت میں سے اپنے لیے زیادہ وصول کرنے لگے ہیں، اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کر لیا ہے اور حلال چیزوں کو حرام کر دیا ہے۔ اس لیے میں حق بجانب ہوں کہ مجھے غیرت آئے ــــ اور میں ان کی سرکشی اور بغاوت کو حق و عدل سے بدلنے کی کوشش کروں۔

وقت آ گیا ہے کہ مؤمن حق کی راہ میں جان قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ میں شہادت کی موت چاہتا ہوں۔ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا خود بہت بڑا جرم ہے۔میری ذات تم لوگوں کے لیے نمونہ ہے۔

تقریر کرنے والا خاموش ہو گیا۔اس کی آرزو پوری ہو گئی اور اب قیامت ہی میں آپ اس کی آواز سن سکیں گے، لیکن اس کی آواز کی گونج اب بھی آپ کو جھنجھوڑتی ہے، آج بھی دنیا اللہ کی اطاعت سے آزاد ہے، آج بھی حدود اللہ پامال ہیں — آج بھی دنیا میں حلال حرام ہے اور حرام حلال ہے، اور دنیا میں ہر طرف فساد پھیل گیا ہے — یہ گونج ملت کے نوجوانوں کو آج بھی غیرت دلا رہی ہے اور انہی مرحلوں سے گزرنے کی دعوت دے رہی ہے، جن مرحلوں سے شہید کربلا رضی اللہ عنہ گزرے تھے۔

داستانِ کربلا پر اظہارِ غم ایک فطری تقاضا ہے لیکن یہ اظہارِ عقیدت ومحبت اگر محض ذاتی اور شخصی نوعیت کا ہے تو نہ اللہ کی نگاہ میں اس کی کوئی قدر و قیمت ہے اور نہ خود شہید کربلا رضی اللہ عنہ کی نظر میں اس کی کوئی حیثیت۔نواسۂ رسول ﷺ کی نظر میں قدر و قیمت کی چیز حق تھا جس کے لیے انہوں نے اپنی جان عزیز قربان کر دی۔اگر اپنی ذات نواسہ رسول ﷺ کو عزیز ہوتی تو وہ اسے قربان ہی کیوں کرتے۔کربلا کی تاریخ آپ سے مطالبہ یہ کرتی ہے کہ آپ حق کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیں جس طرح حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نہ صرف اپنی جان اس راہ میں قربان کی بلکہ اپنے کنبے کے معصوم بچوں تک کو خوشی خوشی کٹوا دیا۔

شہید کربلا کی مظلومیت اور بے بسی آپ سے وہی عملی جواب چاہتی ہے جو ان کے ہمراہ جانے والے جاں نثاروں نے دیا تھا۔

محرم کی نو تاریخ تھی۔حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''میں اللہ کا بہترین ثنا خواں ہوں اور راحت ورنج ہر حال میں اس کا شکر گزار ہوں، پروردگار! میں تیری حمد کرتا ہوں کہ تو نے ہمیں نبوت کی عزت بخشی اور ہمیں حق سننے والے کان، حق دیکھنے والی آنکھیں اور حق شناسا دل دیا، ہمیں قرآن کا علم دیا اور فہم دین سے نوازا — الٰہی، تو ہمیں اپنے شکر گزار بندوں میں شامل فرما! مجھے کسی کے ساتھی اپنے ساتھیوں سے زیادہ وفادار اور اپنے گھرانے سے زیادہ نیک اور صلہ رحمی کرنے والا کوئی دوسرا گھرانا نہیں معلوم ہوتا۔اللہ تعالیٰ تم سب کو میری جانب سے بہترین جزا عطا فرمائے — میں ان بدترین دشمنوں کے ارادے بھانپ کر آج کے دن کو کل ہی کا دن سمجھ رہا ہوں — میں آپ لوگوں کو خوشی خوشی اجازت دے رہا ہوں، میری طرف سے کوئی ملامت نہ ہوگی۔رات چھا چکی ہے، ایک ایک اونٹ لے لو اور اپنی اپنی بستیوں کو لوٹ جاؤ۔اللہ تم سب کو جزائے خیر عطا فرمائے — یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ لوگ مجھی کو تلاش کریں گے، میرے بعد انہیں کسی کی تلاش نہ ہوگی۔''

نوجوانانِ جنت کے سردار کی یہ مظلومانہ تقریر سن کر جاں نثاروں نے جو جوابی تقاریر کیں وہ اس لائق ہیں کہ انہیں بار بار پڑھا جائے، انہیں اپنے لیے مشعل راہ بنایا جائے اور ان کی روشنی میں اپنے لیے لائحہ عمل تیار کر کے، حسین رضی اللہ عنہ سے سچی عقیدت کا ثبوت دیا جائے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تقریر سن کر بنو عقیل کے جوانمردوں نے کہا: اے ہمارے سردار! ہم صرف اس لئے لوٹ جائیں کہ آپ کے بعد زندہ رہیں؟ اللہ ہمیں یہ دن نہ دکھائے ہم لوگوں کو کیا جواب دیں گے' کیا یہ کہیں گے کہ اپنے سردار' اپنے آقا اور اپنے چچا کے لخت جگر کو ہم چھوڑ آئے' ان کی طرف سے ہم نے ایک تیر بھی نہ چلایا' ایک نیزہ بھی نہ مارا' تلوار کا ایک وار بھی نہ کیا' اب معلوم نہیں کہ ان کا کیا حشر ہوا...... اللہ کی قسم! ہم سے ہرگز ایسا نہ ہو سکے گا ہم اپنی جان' اپنا مال اور اپنے اہل وعیال سب کچھ آپ پر قربان کر دیں گے آپ کے ساتھ آپ کی حمایت میں لڑیں گے جو انجام آپ کا ہوگا وہی ہمارا بھی ہوگا...... آپ کے بعد جینا بے کار ہے۔

بنو عقیل کی تقریر کے بعد مسلم بن عوسجہ اٹھے اور کہا: ہم آپ کو چھوڑ کر چلے جائیں اور کل اللہ کے حضور میں یہ عذر نہ کریں کہ ہم نے آپ کا حق ادا کر دیا' اللہ کی قسم! میں اس وقت تک آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گا جب تک دشمنوں کے سینے میں اپنا نیزہ نہ اتارلوں اور تلوار کے جوہر نہ دکھالوں' اللہ کی قسم! اگر میرے پاس ہتھیار نہ بھی ہوتے تو دشمنوں سے پتھر مار مار کر لڑتا اور آپ پر اپنی جان فدا کر دیتا۔

آپ کے بعد سعد بن عبداللہ حنفی اٹھے اور فرمایا: اللہ کی قسم! ہم اس وقت تک آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے جب تک اللہ کو یہ معلوم نہ ہو جائے کہ ہم نے رسول ﷺ کے بعد بھی آپ کا فرمان ملحوظ رکھا' اگر مجھ کو یہ یقین ہو کہ میں ستر بار قتل کیا جاؤں گا اور ہر بار دوبارہ زندہ کر کے مجھے آگ میں جلا کر میری خاک اڑادی جائے گی تو بھی اس وقت تک میں آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گا جب تک خود کو موت کے حوالے نہ کر دوں جب کہ مرنا صرف ایک ہی بار ہے اور اس موت کے بعد ہمیشہ کی عزت ہے۔

ان کے بعد زہیر بن قیس اٹھے اور اپنی فداکاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا: اللہ کی قسم! میری تمنا ہے کہ میں قتل ہوں پھر زندہ ہوں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ ہوں اسی طرح ہزار بار زندہ ہو ہو کر قتل کیا جاؤں اور اللہ اس قتل کے بدلے آپ کو اور اہل بیت کے نوجوانوں کو بچالے۔

محرم کے یہ قیامت خیز شب وروز آپ سے انہی جذبات وعزائم اور اسی فداکاری اور جاں نثاری کا مطالبہ کرتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ فداکاری اور جاں نثاری کے جذبات وعزائم کا بدل آپ محض نالہ وفغاں اور اظہار غم کے کچھ اعمال سے فراہم نہیں کر سکتے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ جذبات' عزائم اور یہ جاں نثاری وفداکاری بھی اسی وقت نتیجہ خیز ہو سکتی ہے جب کسی امام ورہنما کی قیادت میں ہو اور کسی نظم اور منصوبے کے تحت ہو۔

# اُسوۂ حسین رضی اللہ عنہ کا پیغام

اللہ کے فضل سے آپ نئے سال کا آغاز کر رہے ہیں۔ پروردگار سے دعا ہے کہ یہ سال عالمِ اسلام کے لیے عزت و سربلندی، ترقی و خوشحالی، امن و آزادی اور خیر و برکت کا سال ہو ـــــ اسلامی سال ماہ محرم سے شروع ہوتا ہے۔ اس ماہ میں ایک ایسا تاریخی اور انقلابی سانحہ پیش آیا تھا جس کی یاد ہر سال مسلمانوں کو یہ سبق دیتی ہے کہ اصل زندگی اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دینا ہے، یہی اسوۂ حسین کا پیغام ہے۔

انسانی تاریخ کے مطالعہ سے بھی یہ بات سامنے آتی ہے اور اللہ کی کتاب بھی یہی بتاتی ہے کہ زندہ رہنے اور زندوں کی طرح زندگی گزارنے کا حق صرف اسی کو ہے جو حق کی خاطر جان دینے کے لیے تیار رہے ـــــ اس قوم کے لیے موت ہی مقدر ہے جو موت سے لرزتی ہے ـــــ بنی اسرائیل ہزاروں کی تعداد میں تھے لیکن جب موت کے خوف سے وہ اپنے گھروں سے نکلے تو اللہ نے ان کی قومی موت کا فیصلہ فرما دیا اور پھر مسلسل چالیس سال تک وہ سرزمین میں ادھر ادھر زندگی سے محروم سرگرداں مارے مارے پھرتے رہے۔ یہاں تک کہ جنگل کی گود میں جب ان کی نئی نسل پل کر جوان ہوئی اور موت سے پنجہ آزمائی کے لیے وہ تیار ہوئے تو اللہ نے ان کو فتح و نصرت سے نوازدیا۔

یہ پوری داستان اللہ نے اپنی کتاب میں نازل فرمائی ہے اور مسلمانوں کو متوجہ کیا ہے کہ وہ اس داستان عبرت سے سبق لیں اور اچھی طرح سمجھ لیں کہ عزت و سربلندی کی زندگی یہی ہے کہ آدمی اللہ کی راہ میں جان و مال قربان کرنے کے لیے تیار رہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ ۚ (البقرۃ ۲: ۲۴۳)

تم نے ان لوگوں کی تاریخ پر بھی عبرت کی نگاہ ڈالی ہے جو موت کے خوف سے اپنے گھربار چھوڑ کر نکلے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں تھے، اللہ نے ان سے فرمایا مرجاؤ، پھر ان کو دوبارہ زندگی سے نوازا۔

اس آیت پر تشریحی نوٹ دیتے ہوئے مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ صاحب فرماتے ہیں:

''یہ اشارہ بنی اسرائیل کے واقعہ خروج کی طرف ہے۔ سورہ مائدہ کے چوتھے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اس کی تفصیل بیان کی ہے، یہ لوگ بہت بڑی تعداد میں مصر سے نکلے تھے، دشت و بیابان میں بے خانماں پھر رہے تھے، خود ایک ٹھکانے کے لیے بے تاب تھے مگر جب اللہ کے ایماء سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو حکم دیا کہ ظالم کنعانیوں کو ارض فلسطین سے نکال دو اور اس علاقے کو فتح کرلو تو انہوں نے بزدلی دکھائی اور آگے بڑھنے سے انکار کردیا۔ آخر کار اللہ نے انہیں چالیس سال تک زمین میں سرگرداں پھرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ ان کی ایک نسل ختم ہوگئی اور دوسری نسل صحراؤں کی گود میں پل کر اٹھی تب اللہ تعالیٰ نے انہیں کنعانیوں پر غلبہ عطا کیا۔ معلوم ہوتا ہے اسی معاملہ کو موت اور دوبارہ زندگی کے الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

مسلمانوں کو یہ عبرت کی داستان سنا کر اللہ کی راہ میں جان و مال قربان کرنے پر ابھارا گیا ہے اور انہیں ان کمزوریوں سے بچنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے جن کی وجہ سے آخر کار بنی اسرائیل زوال و انحطاط سے دوچار ہوئے۔ مسلمانوں کو یہ ہدایت اس وقت دی جارہی ہے جب کہ وہ مکہ کی سرزمین سے ہجرت کرکے جاچکے تھے اور سال ڈیڑھ سال سے مدینہ منورہ میں پناہ گزین تھے اور کفار کے مظالم سے تنگ آکر خود بار بار مطالبہ کرچکے تھے کہ ہمیں جنگ کی اجازت دی جائے۔ ان کو اس داستانِ عبرت سے سبق دینا ہے کہ عزت و سربلندی کی زندگی چاہتے ہو تو اللہ کے بھروسے پر میدان میں ڈٹ جاؤ۔ اگر تم نے موت سے ڈر کر میدان جہاد سے منہ موڑا اور اللہ کی راہ میں لڑنے سے جی چرایا تو پھر تمہیں عبرتناک ذلت سے کوئی چیز نہیں بچاسکتی اور تاریخ بتاتی ہے کہ اس مٹھی بھر جماعت نے جب موت سے بے خوف ہوکر دشمن کے مقابلے میں قدم جمائے تو قلت تعداد اور وسائل کی زبردستی کی کے باوجود ان کے قدم جمتے ہی چلے گئے اور اللہ نے ان کو فتح و نصرت سے نوازا۔

دراصل زندگی کا راز ہی یہ ہے کہ قوم مسلسل جدوجہد، قربانی اور راہِ حق میں جمنے اور آگے بڑھنے کے لیے ہر وقت مستعد رہے۔ کاش عالمِ اسلام ہوشِ گوش سے سنے۔'

کربلا کی داستان بھی ہمیں یہی سبق دیتی ہے اور محرم ہر گیارہ مہینے کے بعد یہی یاد تازہ کرنے کے لیے آتا ہے کہ اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی زندگی، باطل کے مقابلے میں جمنے اور حق کے لیے جان عزیز کی شہادت دینے میں مضمر ہے——''اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد''

آج دجلہ اور فرات کے پڑوس میں پھر باطل نے عالمِ اسلام کو للکارا ہے اور نواسہ رسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے پیار کرنے والوں کے لیے پھر ایک موقع فراہم ہوا ہے کہ وہ حق کی طرف سے اپنی جانیں لڑادیں اور یہ ثابت کردیں کہ حسین رضی اللہ عنہ سے عقیدت رکھنے والے حسین رضی اللہ عنہ کی یاد میں صرف آنسو بہانا ہی نہیں جانتے بلکہ حق اور آزادی کی خاطر ان کے اسوہ پر چلنے اور گردنیں کٹانے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ جو قوم جان دینے

کے لیے تیار ہوتی ہے باعزت زندگی کا حق اس سے کوئی نہیں چھین سکتا — اللہ گواہ ہے کہ راہِ حق میں مارے جانے والے کبھی نہیں مرتے بلکہ انہی لوگوں کو اصل زندگی حاصل ہوتی ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰـكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ○ (البقرہ۲:۱۵۴)

اور ان لوگوں کو مردہ نہ کہو جو اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں، ایسے لوگ حقیقت میں زندہ ہیں مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے عقیدت و محبت کا حق وہی لوگ ادا کرتے ہیں جو سرفروشی اور جاں نثاری کے جذبات سے سرشار ہو کر اللہ کی راہ میں سب کچھ قربان کرنے ہی کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔



# آپ اور آپ کے پڑوسی

اسلامی دنیا کے مشہور بزرگ حضرت سہل تستری رحمۃ اللہ علیہ کو دنیا سے رخصت ہوئے زمانہ گزر چکا لیکن ان کی روشن زندگی کی ہر جھلک آج بھی روشنی دکھاتی ہے۔ حضرت کے پڑوس میں بالکل ہی دیوار کے نیچے ایک مجوسی رہا کرتا تھا، حضرت اپنے پڑوسی کے ساتھ ہر طرح سلوک کرتے لیکن پڑوسی نہ جانے کیوں حضرت سے دلی بغض رکھتا تھا۔ دل کی جلن نکالنے کے لیے وہ روزانہ رات گئے اپنی دیوار پر سے اپنے گھر کا کوڑا اور غلاظت حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں ڈال دیا کرتا۔

حضرت تستری رحمۃ اللہ علیہ بھی ظاہر ہے انسان ہی تھے۔ اس بدسلوکی پر تکلیف فطری بات تھی لیکن طبیعت پر جبر کرتے، صبر سے کام لیتے اور خاموشی سے کوڑا اور غلاظت اپنے ہاتھ سے اٹھا کر باہر پھینک آتے —— عرصہ تک ایسا ہی ہوتا رہا، مجوسی کوڑا پھینکتا رہا اور حضرت صاف کرتے رہے، اس دوران حضرت نے خاموشی سے مجوسی کو متوجہ کرنے کی بھی کوشش کی لیکن وہ اپنی حرکت سے باز نہ آیا۔ حضرت یہ تکلیف سہتے رہے لیکن جواب میں صبر اور خاموشی کے سوا کبھی کوئی اور حرکت نہیں کی۔ گھر والے زیادہ پریشان ہوتے اور کچھ کرنا چاہتے تو حضرت صبر کی تلقین کرتے اور رات ہی میں کوڑا کرکٹ اٹھا کر باہر پھینک دیتے تاکہ گھر والے دیکھ کر مشتعل نہ ہوں۔

حضرت بیمار ہوگئے اور بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو آپؒ نے پڑوسی مجوسی کو بلوایا اور تنہائی میں اس سے کہا —— ''بھائی تم جو رات کو کوڑا کرکٹ پھینکتے تھے میں صحت مند تھا اور میں رات ہی میں اٹھا کر پھینک دیا کرتا تھا اور اب میں جس حال میں ہوں تم دیکھ ہی رہے ہو۔ اللہ کے لیے اب تم ایسا نہ کرو۔ اس لیے کہ میرے بعد میرے گھر کے لوگ تمہاری اس حرکت کو برداشت نہ کرسکیں گے اور اندیشہ ہے کہ وہ تمہیں کوئی سخت تکلیف پہنچا دیں۔ میں نے زندگی بھر تمہاری اس حرکت کو برداشت کیا، اب تم مان جاؤ۔''

حضرت نے کچھ اس انداز سے مجوسی سے بات کی کہ اس کا دل بھر آیا۔ شرمندگی سے اس نے سر جھکا لیا اور بولا ''حضرت اللہ کے لیے آپ مجھے معاف فرمائیں، میں نے واقعی آپ کو بہت ستایا اور آپ نے جس صبر و تحمل سے کام لیا وہ حقیقت میں آپ ہی کا حصہ ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ صبر کی یہ بے مثال قوت اسلام ہی کی دین

ہے، حضرت مجھے معاف فرمائیے اور مجھے اسلام کا کلمہ پڑھائیے۔“

حضرت نے لرزتا ہوا ہاتھ مجوسی کی طرف بڑھایا اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور لڑ کھڑائی ہوئی زبان میں مجوسی کو کلمہ شہادت پڑھایا:

اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمد رسول الله.

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

اس طرح دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے بھی حضرت ایک سخت دل مجوسی کو اسلام کی دولت سے مالا مال کر گئے۔ حضرت کے بے پناہ صبر اور حسن سلوک نے مجوسی کا دل موہ لیا اور ایک مثالی مسلمان کا حسین کردار دیکھ کر اسلام کے لیے اس کا دل کھل گیا۔

آپ کے پڑوس میں بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی غیر مسلم رہتا ہو اور نہ رہتا ہو تو ہم میں سے کتنے ہیں جن کے پڑوس میں برسہا برس سے غیر مسلم رہتے ہیں اور اپنی اس ملت کے بارے میں سوچیے کہ اس ملک میں اس کے کروڑوں پڑوسی غیر مسلم ہیں آپ جو کچھ کرتے ہیں، اسے ہر ایک کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ آپ کا کوئی عمل، آپ کا کوئی سلوک، آپ کا کوئی معاملہ، آپ کی کوئی بات، آپ کا کوئی برتاؤ، فضا میں تحلیل ہو کر بے اثر نہیں ہو جاتا، آپ کی ہر حرکت کو دیکھ کر وہ صرف آپ کے بارے ہی میں کوئی رائے قائم نہیں کرتا بلکہ اس دین کے بارے میں بھی رائے قائم کرتا ہے جس کا آپ دعویٰ کرتے ہیں۔

آپ کے قول وعمل کو دیکھ کر یا تو لوگوں کے دل اسلام کے لیے کھلتے ہیں یا وہ اسلام سے دور ہوتے ہیں۔ مسلمان ہونے کے ناطے پڑوسیوں کا آپ پر یہ بھی حق ہے کہ وہ آپ کے گھر سے، آپ کے برتاؤ سے، آپ کے معاملے سے اور آپ کی گفتگو سے اسلام کی روشن تعلیمات سیکھیں اور آپ کے اخلاق و کردار کو دیکھ کر وہ بے اختیار پکار اٹھیں کہ یہ دین یقیناً حق ہے جو ایسی پاکیزہ زندگیاں بناتا ہے۔

حضرت سہل تستری رحمۃ اللہ علیہ کو دنیا سے گزرے زمانہ ہو چکا لیکن کتابوں میں لکھا یہ واقعہ آج بھی پڑھیے تو روح تازہ ہو جاتی ہے اور کتابوں میں دفن ان زندگیوں سے لوگ آج بھی اسلام کی طرف کھنچتے ہیں، لیکن یہ ہماری زندگی کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ ہم چلتے پھرتے انسان زندہ ہوتے ہوئے بھی اپنی زندگیوں سے لوگوں کو اسلام کی طرف لانے میں کامیاب نہیں ہیں۔

اس ملک میں آپ اللہ کے دین کے امین ہیں، آپ کے وجود کا مقصد اس ملک میں یہ ہے کہ آپ کی زندگی سے اللہ کے بندے دین کو سمجھیں اور سیکھیں اور اندھیروں میں ٹھوکریں کھانے کے بجائے اللہ کی تعلیمات کی روشنی میں زندگی کا راستہ طے کریں —— آپ اور آپ کی ملت اپنی اس ذمہ داری کو کس حد تک ادا کر رہی ہے، یہی وہ

فریضہ ہے جس پر ہر مسلمان بھی غور کرے اور یہ ملت بھی جو اس دین کی محافظ بھی ہے اور اس کی داعی بھی — خواہ اسے اپنی اس حیثیت کا شعور ہو یا نہ ہو۔

اگر آپ کی اور آپ کی ملت کی زندگی اللہ کے بندوں کو یہ روشنی نہیں دے رہی ہے اور آپ انفرادی اور اجتماعی زندگی سے اللہ کے بھٹکے ہوئے بندوں کو صحیح راہ نہیں مل رہی ہے تو سوچیے کل حشر کے میدان میں اللہ کے حضور آپ کا جواب کیا ہوگا — اور ملتِ اسلامیہ کیا جواب دے گی؟



# مؤمن کی زندگی

''کل حشر کے میدان میں اگر یہ اعلان ہو جائے کہ ایک شخص کے سوا سب کو جہنم میں جھونک دو' تو مجھے اللہ کی رحمت سے یہ امید ہے کہ جہنم سے بچنے والا وہ خوش نصیب میں ہی ہوں گا۔ اور اگر یہ اعلان ہو جائے کہ ایک شخص کے سوا سب کو جنت میں لے جاؤ' تو اپنے اعمال کو دیکھتے ہوئے مجھے یہی اندیشہ ہے کہ خدانخواستہ وہ شخص میں ہی ہوں گا۔''

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ بار بار پڑھنے کے لائق ہیں' آپ نے ان الفاظ میں مؤمن کی نہایت ہی دلکش' موزوں اور صحیح تصویر کھینچ دی ہے۔

ایمان دراصل خوف اور امید کی اسی مطلوب کیفیت کا نام ہے اور مؤمن کی زندگی کا اصل جوہر یہی خوف و امید کی ملی جلی کیفیت اور فکر ونظر کا یہی اعتدال ہے ـــ اسی کیفیت اور اعتدال کی بدولت وہ زندگی کا پُرخطر سفر سکون ونشاط کے ساتھ اس طرح طے کرتا نظر آتا ہے کہ اللہ کے قہر وغضب سے ڈرتا لرزتا' معصیت ولغزش کی ہر جھاڑی سے اپنا دامن حیات بچاتا' سمیٹتا اور اللہ کی رحمت اور عفو وکرم کا نہ ٹوٹنے والا سہارا پکڑتا ہوا' شاداں وفرحاں اپنی منزل سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔

## فکر ونظر کا اعتدال

اللہ کے خوف سے لرزتے رہنا اور کسی حال میں اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔ فکر ونظر کا یہی اعتدال ایمان کی صحیح حالت ہے' اور اس توازن کو کھونا اور افراط تفریط میں پڑنا ہی صراط مستقیم سے بھٹکنا ہے۔

## فلسفیوں کی انتہا پسندی

یونان میں فلسفیوں کے دو گروہ گزرے ہیں۔ ایک رونے والے فلسفی کہلاتے ہیں اور ایک ہنسنے والے۔ رونے والے فلسفیوں کو ہر چیز میں مایوسی اور ناامیدی نظر آتی ہے۔ کائنات کے اس پُر بہار باغ میں انہیں ہر طرف کانٹے ہی کانٹے نظر آتے ہیں۔ چاند کی چاندنی اور سورج کی تابانی کے باوجود انہیں دنیا تاریک ہی تاریک نظر آتی ہے۔ وہ خاموش رہنے اور زندگی میں موت کی صورت بنا لینے ہی کو کامیابی سمجھتے ہیں۔ اللہ کی نعمتوں سے فیضیاب

ہونے اور کائنات کو سنوارنے سدھارنے میں جسم و جان کی قوتیں کھپانا ان کے نزدیک انتہائی نادانی اور ان نعمتوں سے محروم رہنا اور اللہ کی دنیا سے بیزار رہنا ہی روحانی ترقی ہے۔ وہ دھرتی پر بسنے والے انسانوں کو ایسے ڈھانچوں میں دیکھنا چاہتے ہیں‘ جن کے قوائے عمل سرد‘ دل شکستہ‘ چہرے غمزدہ اور روحیں افسردہ اور مایوس ہوں۔ یہ اللہ کی بھری پری دنیا میں نفرت‘ بیزاری‘ ناامیدی اور مایوسی کے سائے میں زندگی کے دن جوں توں کاٹنا اپنی معراج سمجھتے ہیں۔

اس کے برخلاف ہنسنے والے فلسفی‘ کل کی فکر کے غم سے آزاد‘ محض کھانے پینے اور دادِ عیش دینے کو زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کی معراج یہ ہے کہ وہ ہر فکر سے آزاد‘ عیش و عشرت میں سرمست جانور کی طرح اچھے برے کی تمیز سے بے نیاز جس کھیت میں موقع ملے منہ ڈال دے اور رنگین تتلی کی طرح رنگ رنگ کے پھولوں کے رس چوسے اور ذہن پر کسی ادنیٰ فکر کا بوجھ لیے بغیر عیش و مستی میں عمرِ طبعی کے دن گزار دے۔

اسلام ان دونوں انتہاؤں میں اعتدال کا نام ہے۔



# پُرجوش زندگی کا آغاز

''کاش میں نے ہوش سے کام لیا ہوتا' کاش میں نے فلاں کرم فرما کا مشورہ مان لیا ہوتا' میں نے فلاں حماقت نہ کی ہوتی' تو آج میری حیثیت ہی کچھ اور ہوتی اور اگر فلاں ڈگری حاصل کر لیتا یا بے جا جوش سے کام نہ لیتا' تو آج یہ خستہ حالی اور پریشانی نہ ہوتی۔''

یہ کلمات جن میں حسرت بھی ہے' افسوس بھی ہے' پشیمانی بھی ہے اور دکھ کا اظہار بھی ہے' اکثر لوگوں کی زبان سے آپ نے سنے ہوں گے اور سنے کیا ہوں گے خود آپ کی زبان سے بھی ممکن ہے اس طرح کے کلمات کبھی نکل جاتے ہوں اور اس طرح کے جذبات واحساسات آپ کو بھی پریشان کرتے ہوں — آپ کے لیے پہلا مشورہ یہ ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے اس دلدل سے باہر نکل آیئے۔ یہ حسرت وافسوس' پشیمانی اور کڑھن صرف یہی نہیں کہ لا حاصل ہے' بلکہ اس سے غیر محسوس طور پر آپ کی شخصیت مجروح ہوتی ہے۔ آپ کے عزائم میں اضمحلال پیدا ہوتا ہے۔ حوصلوں میں پستی آتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ دل شکستہ ہو کر آپ کسی میدان میں بھی کوئی کارنامہ انجام دینے کے قابل نہ رہیں۔

سب سے پہلی بات یہ پیش نظر رکھنی چاہئے کہ آپ کا رب آپ پر نہایت مہربان ہے۔ وہ سب سے بڑا مہربان ہے۔ آپ سے محبت کرتا ہے۔ آپ اس کی شاہکار تخلیق ہیں۔ وہ ہر آن آپ کا بھلا چاہتا ہے۔ یقین کیجیے آپ جس حال میں ہیں' جو کچھ آپ کو ملا ہے اور جو حیثیت آپ کو حاصل ہے اسی میں آپ کے لیے خیر ہے۔ آپ کی بھلائی کس میں ہے — آپ نہیں جانتے' آپ کا رب جانتا ہے اور اگر آپ واقعی اس کے مخلص بندے ہیں تو دل میں یہ بات جما لیجیے کہ اس کا ہر فیصلہ آپ کی بھلائی کا فیصلہ ہے۔

جو مال ودولت آپ کو حاصل نہ ہو سکا' جس تعلیم کی تکمیل آپ نہ کر سکے' جو حیثیت اور منصب آپ کو حاصل نہ ہو سکا' جو آرزوئیں آپ کی پوری نہ ہو سکیں' یقیناً اسی میں آپ کی بہتری ہوگی — یہ بالکل ممکن ہے کہ جن چیزوں کے نہ ملنے پر آپ حسرت وافسوس کر رہے ہیں' جن آرزوؤں کے خون ہونے پر آپ دل دکھا رہے ہیں' اگر اصل حقیقت آپ کے سامنے آجائے تو آپ کی آنکھیں کھل جائیں اور اپنی اس محرومی پر آپ لاکھوں بار شکر ادا کر کے

بھی تسکین نہ محسوس کریں — آپ کو دولت مند بننے اور صاحب جائیداد ہونے کا ایک زریں موقع ملا اور آپ نے اپنی لاپروائی سے اسے کھو دیا' یہ یاد کبھی کبھی آپ کا دل کھرچنے لگتی ہے اور اپنی خستہ حالی آپ کو کاٹنے لگتی ہے۔ مگر آپ یوں کیوں نہیں سوچتے کہ اس متاعِ قلیل سے آپ کو محروم رکھ کر آپ کے رب نے کچھ ایسی نعمتیں آپ کو عنایت فرما دیں جو اس متاعِ قلیل کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بہتر اور عظیم ہیں۔ آپ محروم نہیں' خوش نصیب ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا' کہ یہ دولت و جائیداد آپ کو کیا کچھ بنا دیتی اور یہ دولت کیا کیا خرابیاں اور گندگیاں اپنے ساتھ لاتی اور آپ کے خیالات اور جذبات اس وقت کیا ہوتے۔ اطمینان کیجیے کہ آپ کے رب کا فیصلہ آپ کے حق میں سرتا سرِ خیر ہے۔ اللہ کے فیصلوں پر دل کی گہرائیوں سے خوش اور مطمئن رہنے کے لیے قرآن پاک کا یہ سبق آموز واقعہ بار بار پڑھنے کے قابل ہے:

''اور عبرت حاصل کرو اس واقعہ سے جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم سے کہا تھا کہ' میں اپنا سفر برابر جاری رکھوں گا جب تک کہ دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں' یا ایک زمانے تک یوں ہی چلتا رہوں گا۔ پس وہ دونوں ان کے سنگم پر پہنچے تو اپنی مچھلی سے غافل ہو گئے اور وہ نکل کر دریا میں اس طرح چلی گئی جیسے کوئی سرنگ لگی ہو' پھر آگے جا کر موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم سے کہا: لاؤ ہمارا ناشتہ۔ آج کے سفر نے تو ہمیں بری طرح تھکا دیا۔ خادم نے کہا: دیکھئے تو ہوا یہ کہ جب ہم اس چٹان کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے' اس وقت مجھے مچھلی کا خیال نہ رہا اور شیطان نے میرے ذہن سے یہ بات اس طرح بھلا دی کہ میں مچھلی کا ذکر کرنا ہی بھول گیا۔ مچھلی تو عجیب طریقے سے دریا میں چلی گئی۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یہی تو ہے وہ جس کی ہمیں تلاش تھی۔ چنانچہ وہ دونوں الٹے پاؤں پھر واپس ہوئے اور وہاں انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک خاص بندے کو پایا جس کو ہم نے اپنی خاص رحمت سے نوازا تھا۔

موسیٰ علیہ السلام نے اس بندے سے کہا: کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں' تاکہ آپ مجھے بھی اس علم و دانش کی تعلیم دیں جو آپ کو سکھائی گئی ہے۔ اس نے جواب دیا: آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے اور جس چیز کی حقیقت سے آپ واقف نہ ہوں' اس پر آپ آخر صبر بھی کیسے کر سکتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ان شاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔ اور کسی معاملہ میں آپ کے کہنے کے خلاف نہ کروں گا۔ اس نے کہا: اچھا' اگر آپ میرے ساتھ چلتے ہیں تو مجھ سے کوئی بات آپ پوچھیں گے نہیں' جب تک میں خود اس کا ذکر آپ سے نہ کروں۔

پس وہ دونوں روانہ ہوئے' یہاں تک کہ وہ جب ایک کشتی میں سوار ہو گئے تو اس شخص نے کشتی میں شگاف کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: آپ نے اس کشتی میں شگاف کر دیا' تاکہ سب کشتی والوں کو ڈبو دیں۔ یہ تو آپ نے سخت حرکت کر ڈالی۔ اس نے کہا: میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: بھول

چوک پر مجھے نہ پکڑیے اور میرے معاملے میں آپ ذرا سختی سے کام نہ لیجیے۔

پھر وہ دونوں چلے' یہاں تک کہ ان کو ایک لڑکا ملا اور اس شخص نے اسے قتل کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: آپ نے ایک بے گناہ کو قتل کر دیا۔ حالانکہ اس نے کسی کا خون نہ کیا تھا؟ یہ کام تو آپ نے بہت برا کیا۔ اس نے کہا "میں نے کہا نہ تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے۔"

موسیٰ علیہ السلام نے کہا' اس کے بعد اگر میں آپ سے کچھ پوچھوں تو آپ مجھے ساتھ نہ رکھیں' لیجیے اب تو میری جانب سے آپ کو عذر مل گیا۔

پھر وہ دونوں آگے چلے۔ یہاں تک کہ ایک بستی میں پہنچے اور بستی کے لوگوں سے کھانا طلب کیا' مگر بستی والوں نے ان کی مہمان نوازی سے انکار کر دیا۔ وہاں انہوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرا ہی چاہتی تھی' اس شخص نے اس دیوار کو پھر اٹھا دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا' اگر آپ چاہتے تو دیوار اٹھانے کی اجرت لے سکتے تھے۔ اس نے کہا: بس میرا تمہارا ساتھ ختم ہوا۔ اب میں ان باتوں کی اصل حقیقت بتاتا ہوں جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔

اس کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند غریب آدمیوں کی تھی' جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں' کیونکہ آگے ایک ایسے حکمران کا علاقہ تھا' جو ہر کشتی کو چھین لیتا تھا۔

رہا وہ لڑکا تو اس کے ماں باپ مؤمن تھے۔ ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ لڑکا اپنی سرکشی اور کفر سے ان کو تنگ کرے گا۔ اس لیے ہم نے چاہا کہ ان کا رب اس کے بدلے ان کو ایسی اولاد دے جو اخلاق میں بھی اس سے بہتر ہو اور جس سے صلہ رحمی بھی زیادہ متوقع ہو۔

اور اس دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ یہ دو یتیم لڑکوں کی ہے جو اس بستی میں رہتے ہیں۔ اس دیوار کے نیچے ان بچوں کا ایک خزانہ دفن ہے۔ اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ اس لیے تمہارے رب نے چاہا کہ یہ دونوں بچے بالغ ہوں اور اپنا خزانہ نکال لیں' یہ تمہارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا ہے۔ میں نے کچھ اپنے اختیار سے نہیں کیا ہے —— یہ ہے اصل حقیقت ان باتوں کی' جن پر تم صبر نہیں کر سکے۔"

کشتی کو عیب دار بنانا' بچے کو قتل کر دینا' اخلاق سے عاری لوگوں کی دیوار بلا اجرت اٹھا دینا' بظاہر ایسے امور ہیں کہ ان کو گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ چند غریب مزدوروں کی کشتی عیب دار ہوگئی اور ان کا وسیلہ معاش ہی ختم ہو گیا۔ نوعمر لڑکے کے قتل سے ماں باپ کے دل پر کیا بیتی ہوگی۔ جو لوگ بھوکے مسافروں کو ایک وقت کھانا دینے کے بھی روادار نہ ہوئے' ان کی دیوار اٹھا کر کھڑی کر دی گئی۔ بظاہر یہ سارے امور آدمی کو دکھ پہنچانے والے' دل شکستہ کرنے والے اور پریشان کر دینے والے ہیں۔ لیکن ان کی تہ میں بڑی زبردست حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ ہیں جن تک عام حالات میں انسان کی نگاہ نہیں پہنچتی اور بے صبری میں وہ گھبرا جاتا ہے۔ حالانکہ اصل حقیقت اگر اس پر کھل

جائے تو اس کا سینہ شکر کے جذبات سے سرشار ہو جائے۔

پھر جن محرومیوں کو یاد کر کے آپ کف افسوس ملتے ہیں' آپ یوں کیوں نہیں سوچتے کہ جو کچھ آپ کو نہیں ملا' وہ آپ کا تھا ہی نہیں۔ آپ کو صرف وہی ملنا تھا' جو آپ کی قسمت میں تھا۔ آپ کچھ کر لیجیے' قسمت سے زیادہ ہرگز آپ کو نہیں مل سکتا تھا۔ پھر شکوہ کس بات کا' افسوس اور حسرت کیوں۔ آپ تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں۔ تقدیر پر ایمان رکھے بغیر آدمی مؤمن ہو ہی نہیں سکتا اور تقدیر پر ایمان آدمی کو وہ طمانیت' وہ سکون اور وہ یکسوئی عطا کرتا ہے جس کا تصور بھی وہ شخص نہیں کر سکتا' جو ایمان بالقدر کی دولت سے محروم ہے۔

تقدیر پر ایمان کی حکمت بیان کرتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ

(الحدید ۵۷:۲۲-۲۳)

''کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس میں نازل ہوتی ہے اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب میں لکھ نہ رکھا ہو' ایسا کرنا اللہ کے نزدیک بہت آسان ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کہ جو کچھ نقصان تمہیں ہو اس پر تم دل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ اللہ تمہیں عطا فرمائے اس پر پھول نہ جاؤ۔''

پھر یہ حقیقت کسی ذہن سے اوجھل نہ ہونی چاہئے کہ غیب کا علم اللہ کو ہے۔ اس لیے ہمیں نہیں معلوم کہ کس نقصان یا تکلیف میں ہمارے لیے کتنا بڑا خیر ہے' ایسا اکثر ہوتا ہے کہ ہمیں کوئی دکھ یا نقصان پہنچتا ہے اور فطری طور پر ہمیں وہ نہایت ہی ناگوار ہوتا ہے' لیکن اسی میں ہماری زبردست بھلائی پوشیدہ ہوتی ہے۔ ہم کسی شر کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں' لیکن اس سے اللہ ایسی خیر پیدا کر دیتا ہے کہ جب وہ ہمارے سامنے آتا ہے تو بے اختیار شکر کے کلمات زبان پر آتے ہیں اور اپنی بے صبری پر انتہائی پشیمانی ہوتی ہے۔

پھر مؤمن کے لیے ایک پہلو اور بھی سوچنے کا ہے۔ مؤمن کا معاملہ دوسروں سے بالکل مختلف ہے۔ اللہ کا شکر ادا کیجیے کہ آپ مؤمن ہیں' آپ کے لیے ہر معاملے میں خیر ہی خیر ہے۔ آپ کے لیے کسی حال میں گھاٹا نہیں ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

عجبا لا مر المؤمن ان امره کله له خیر و لیس ذالك الا للمؤمن ان اصابته ضراء صبرفکان خیرًا له وان اصابته سراء شکر فکان خیرله۔

(مسلم' کتاب الزہد' باب ۱۲' حدیث ۶۴' ص ۱۱۹۶)

''مؤمن کا معاملہ عجیب وغریب ہے۔ اس کا سارا کام خیر ہی خیر ہے اور یہ شرف مؤمن کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اگر اسے کوئی دکھ پہنچتا ہے تو وہ صبر کرتا ہے اور یہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے اور اگر اسے کوئی بھلائی حاصل ہوتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے اور یہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ مؤمن ہر حال میں خیر ہی سمیٹتا ہے اور اس عالم میں اس پر کوئی حالت اور کوئی کیفیت ایسی نہیں آتی جب وہ دل شکستہ ہو کر آس توڑ بیٹھے۔ غم میں گھلتا رہے یا پریشان ہو کر ہمت ہار بیٹھے۔

اگر آپ کی زندگی کے چند سال گھاٹے اور تکلیفوں میں گزر گئے ہیں تو ان کی تکلیف دہ یاد سے ذہن کو خالی کیجیے —— یہی ہونا تھا اور اسی میں کوئی خیر ہوگی۔ آپ آج سے نئے عزم' تازہ حوصلے اور نئی امنگ کے ساتھ پرجوش زندگی کا آغاز کیجیے اور شاندار مستقبل کی طرف استقلال' جواں مردی اور بلند ہمتی کے ساتھ رواں دواں ہو جائیے۔ آپ کی زندگی میں مایوسی کا کوئی مرحلہ نہیں ہے۔ جو اللہ نے آپ کے لیے مقدر کر دیا ہے وہ آپ سے کوئی چھیننے والا نہیں۔ آپ کا کام یہ ہے کہ صحیح رخ پر سوچیں' نیک روش پر قائم رہیں اور اپنا دین و دنیا بنانے کے لیے مسلسل سرگرمِ کار رہیں۔ اس میں آگے نتیجہ کیا رہتا ہے اس پر خواہ مخواہ اپنے ذہن کو پریشان نہ کریں۔ یہ آپ کی حد سے آگے کی بات ہے۔ نتیجہ صرف اللہ کے قبضہ میں ہے۔ اس کے حدود میں دخل دینے کی حماقت ہرگز نہ کیجیے —— وہ آپ پر ماں باپ سے زیادہ مہربان ہے اور وہ نہ کسی کی کوشش وعمل سے بے خبر ہے اور نہ کسی کے اجر کو ضائع کرنے والا ہے —— اسے نہ کسی وقت اونگھ آتی ہے اور نہ وہ کسی وقت سوتا ہے —— وہ ہر لمحہ اپنے بندوں پر نظر رکھے ہوئے ہے اور اپنے وفاداروں کو کبھی محروم نہیں کرتا۔



# دین میں آپ کا مقام؟

دین میں آپ کا مقام کیا ہے؟ آپ ہی سے سوال کر رہا ہوں۔ جی نہیں۔ یہ سوال کچھ مذہبی قسم کے لوگوں کے سوچنے ہی کا نہیں ہے' بلکہ ہر ایک کے سوچنے کا ہے۔ یہ سوال ہر اس شخص کے سوچنے کا ہے' جو خود کو مسلمان کہتا ہو۔ آپ مسائل پر سوچنے کے عادی ہوں یا نہ ہوں' اس سوال پر تو آپ کو غور کرنا ہی ہے اور سب سے پہلے کرنا ہے۔ آپ کی ہر ضرورت سے زیادہ یہ اہم ضرورت ہے اور آپ کے ہر مسئلہ سے زیادہ یہ اہم مسئلہ ہے۔ یہ حقیقت سورج سے زیادہ روشن اور موت کی طرح یقینی ہے کہ ''کل'' آپ کا انجام وہی ہوگا جو آج دین میں آپ کا مقام ہے۔ اگر آپ کو انجام کی ذرا بھی فکر ہے' اگر آپ اپنی عاقبت کے بارے میں سنجیدہ ہیں' اگر آپ واقعی اپنے خیر خواہ ہیں' اگر آپ اپنی زندگی کی قدر و قیمت کا احساس رکھتے ہیں تو اس سوال کو آپ ٹال نہیں سکتے' بے فکری سے سر جھٹک کر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ آپ کو رک کر سوچنا ہوگا۔ اس سوال سے آپ کی دائمی زندگی کی کامیابی یا ناکامی وابستہ ہے۔ آپ کی دائمی سرخروئی یا رسوائی وابستہ ہے۔ ہر سوال سے زیادہ آپ کے لیے یہ اہم سوال ہے' اس سوال سے لاپروائی اپنے انجام سے لاپروائی ہے۔ اس سوال کی تحقیر اپنی زندگی کی تحقیر ہے۔ اور اس سوال سے صرفِ نظر کرنا اپنی ذات کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔

دین میں آپ کا مقام کیا ہے؟ یہ کوئی دوسرا شخص نہیں جان سکتا۔ دوسرے کچھ اندازے لگا سکتے ہیں۔ اپنے تاثر اور خیالات ظاہر کر سکتے ہیں۔ لیکن فی الواقع حقیقت حال کیا ہے۔ یہ عالم الغیب ہی جانتا ہے یا آپ جان سکتے ہیں۔ اگر واقعی جاننے کا سنجیدہ داعیہ رکھتے ہوں اور انصاف کے ساتھ صحیح صورت حال معلوم ہی کرنا چاہتے ہوں' عام طور سے آدمی اس معاملے میں اپنے ساتھ انصاف نہیں کرتا' اپنے بارے میں وہ ضرورت سے زیادہ خوش گمان ہوتا ہے۔ نفس کے دھوکوں میں مبتلا رہتا اور اس کی تاویلوں سے متاثر ہوتا ہے اور اپنا بے لاگ جائزہ کم ہی لے پاتا ہے۔

آدمی کی ایک بنیادی کمزوری اور بھی ہے اور اسی میں اس کی آزمائش بھی ہے۔ کمزوری یہ ہے کہ جب وہ دنیا میں اپنے مقام پر غور کرتا ہے تو خواہ کتنے ہی اونچے مقام پر ہو اسے کمتر سمجھتا ہے اور اس سے اونچا اٹھنے کے لیے

ہاتھ پیر مارتا ہے۔ لیکن دین میں اس کا کیا مقام ہے اول تو اس پر سنجیدگی سے سوچنے والوں کی تعداد ہی کتنی ہے۔ پھر جو لوگ سوچتے بھی ہیں' ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ کم سے کمتر مقام پر بھی قناعت کر لیتے ہیں۔ وہ اس میدان کے شہسواروں کو سامنے رکھنے کے بجائے ان لوگوں کو سامنے رکھتے ہیں جو خود پست حوصلہ ہوتے ہیں۔ دنیا کے معاملے میں اونچے سے اونچا مقام بھی حقیر معلوم ہوتا ہے اور دین کے معاملے میں نیچے سے نیچا مقام بھی غنیمت شمار کیا جاتا ہے۔

---

دین میں فی الواقع آپ کا مقام کیا ہے۔ اس کا ایک ہی صحیح جواب ہے اور وہ یہ کہ دین میں آپ کا مقام وہی ہے جو دین کا مقام آپ کے دل میں ہے۔ آپ کے دل میں دین کا مقام کیا ہے یہ صرف وہی جانتا ہے جو آپ کے دلی جذبات کو آپ سے پہلے جانتا ہے۔ جو شہ رگ سے بھی زیادہ آپ سے قریب ہے۔ یا آپ جان سکتے ہیں اور آپ کو جاننا ہی چاہیے بلکہ جاننے کے لیے فکر مند ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اسی پر آپ کی نجات اور فلاح کا دارومدار ہے۔ اگر یہ حقیقت جاننے کے لیے آپ فکر مند نہیں ہیں تو یہ انتہائی تشویشناک بات ہے۔ یہ بے فکری دراصل اپنے انجام سے بے فکری ہے۔ اپنی ہمیشہ کی زندگی سے بے فکری ہے اور روئے زمین پر اس شخص سے زیادہ نادان اور تباہ حال اور کون ہوگا' جسے اپنے انجام کی فکر نہ ہو اور جو اپنی لازوال زندگی سے غافل ہو۔

عام حالات میں جب معمول کے مطابق زندگی گزر رہی ہو اور ماحول بھی مناسبِ حال میسر ہو تو آدمی اپنے بارے میں صحیح اندازہ نہیں کر پاتا کہ اس کے دل میں دین کا کیا مقام ہے؟ وہ اپنی حالت پر مطمئن ہوتا ہے' حالانکہ بات اطمینان کی نہیں ہوتی۔

لیکن اللہ تعالیٰ اپنی بے پایاں رحمت اور بے مثال حکمت کے تحت ہر شخص کے لیے ایسے مواقع فراہم فرماتا رہتا ہے جن کے ذریعے اس کی جانچ ہوتی رہتی ہے اور اس کے لیے یہ اندازہ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ اس کے دل میں دین کا کیا مقام ہے' پھر اگر اللہ کی توفیق شاملِ حال ہوتی ہے تو وہ عزم و ہمت سے کام لے کر اپنی دینی شخصیت کو اور زیادہ نکھار لیتا ہے اور دین سے اس کا شغف اور بڑھ جاتا ہے' دین کی قدر و عظمت اس کے دل میں اور زیادہ بیٹھ جاتی ہے اور اللہ کی نظر میں اس کا مقام و مرتبہ اور زیادہ بلند ہو جاتا ہے۔

آزمائش کی گھڑیاں ہر زندگی میں آتی ہیں۔ خوشی اور غم کے مواقع ہر زندگی میں آتے ہیں' حادثات سے ہر شخص دوچار ہوتا ہے۔ آزمائش کی نوعیت بے شک مختلف ہوتی ہے' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس کی قوت برداشت کے مطابق ہی آزماتا ہے۔ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ البتہ آزمائش کے مواقع ہر ایک کے لیے فراہم کرتا ہے اور اسی لیے کہ وہ اپنے کو جانچ کر اپنے بنانے سنوارنے کی فکر کرے' آزمائش کی گھڑیاں

بتاتی ہیں کہ آدمی کو اپنی جان' اپنی مرغوبات' اپنے احساسات اور میلانات زیادہ عزیز ہیں یا اللہ کا دین' اپنے کاروبار' اپنے مشغولیتیں اور اپنے دھندے زیادہ محبوب ہیں' یا اللہ کا دین' اپنے بیوی بچوں سے زیادہ محبت ہے یا اللہ کے دین سے' اپنے مال اور جائیداد کو اللہ کے دین پر قربان کر کے مسرور ہوتا ہے یا ان کو بچانے کی خاطر وہ دین کو قربان کر ڈالتا ہے۔ پھر یہ کہ وہ اپنی خودی اور انانیت کو اللہ اور رسول ﷺ کے مقابلے میں روند ڈالنے کے لیے تیار ہے یا اپنے نفس کو اور پھلانے اور اپنی انانیت کو اور بڑھاوا دینے کی ذلیل بیماری میں مبتلا ہے اور یہ آزمائش کی گھڑیاں ہی مخلص اور وفادار بندوں کے درجات بلند کرتی ہیں۔

آیئے ذرا تصور کی آنکھ سے دورِ رسالت کا ایک وجد انگیز منظر دیکھیں اور سردمہری کی شکار اپنی زندگی کو ایمان کی آنچ پہنچانے کی فکر کریں۔

تبوک کی فیصلہ کن جنگ میں اپنی بہادری کے جوہر دکھانے کے لیے اسلامی فوج پہنچ چکی تھی۔ مگر تین جاں نثار کعب بن مالک رضی اللہ عنہ' ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ اور مرارہ بن ربیع رضی اللہ عنہ میدان تبوک میں نہ پہنچ سکے اور اس غزوہ میں شرکت کی سعادت سے محروم رہے۔



وفادار بندوں کی معمولی سستی اور غفلت بھی کیسے برداشت کی جاتی۔ اللہ نے انہیں سخت تنبیہ فرمائی اور ایسی کڑی آزمائش میں مبتلا کیا جس میں پورا اترنا انہی مردانِ حق کا کام تھا۔ آزمائش کی یہ کٹھن مدت پچاس دن کی تھی اور ہر اگلا دن یہ شہادت فراہم کر رہا تھا کہ ان دلوں میں دین کا مقام ہر چیز سے زیادہ بلند ہے اور یہ کہ وفا شعار مخلصین دین کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے اور اپنے جذبات' اپنی ساری خواہشیں روند دینے کے لیے تیار ہیں۔ ان کی یہ داستانِ عبرت سیرت و تاریخ کی کتابوں میں بھی محفوظ ہے اور اللہ نے بھی لفظوں میں ان کی داستان عبرت کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ جتنی بار پڑھیے ایمان میں تازگی پیدا ہوتی ہے:

''اور ان تینوں کو بھی اللہ نے معاف کر دیا' جن کے معاملے کو ملتوی کر دیا گیا تھا' جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامن رحمت کے سوا نہیں ہے تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا' تا کہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں' یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔''

(التوبہ ۹:۱۱۸)

ان تین عظیم بزرگوں میں سے ایک حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ تھے' آخری عمر میں ان کی آنکھیں جاتی رہی تھیں اور وہ اپنے بیٹے حضرت عبداللہ کا ہاتھ پکڑے پکڑے چلا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے اپنے بیٹے کو یہ اپنی داستانِ عبرت اس طرح سنائی:

اللہ کے رسول ﷺ جب مسلمانوں کو تبوک کی مہم پر جانے کے لیے ابھارتے تو میں طے کر لیتا کہ مجھے ضرور اس جنگ میں جانا ہے۔ مگر آپ ﷺ کی مجلس سے اٹھ کر آتا تو سستی کرنے لگتا، سوچتا جلدی کیا ہے۔ تیز سواریاں بھی ہیں، صحت مند بھی ہوں، پہلے سے زیادہ خوشحال بھی ہوں۔ تیار ہونے میں کیا دیر لگتی ہے۔ وقت آنے پر فوراً چل پڑوں گا۔ بات ٹلتی رہی۔ یہاں تک کہ اسلامی لشکر جوشِ جہاد سے سرشار میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ پھر بھی یہ سوچا کہ کوئی بات نہیں۔ میرے پاس تیز سواریاں ہیں۔ تین چار روز کے بعد بھی روانہ ہوں گا، تو بھی راستے ہی میں لشکر سے جا ملوں گا۔ اسی ٹال مٹول میں دن گزرتے رہے۔ مسلمان میدانِ جہاد میں پہنچ گئے اور میں گھر میں بیٹھا ارادہ ہی کرتا رہا۔

مدینے میں جب بھی میں باہر نکلتا میرا دل بیٹھنے لگتا کہ یہاں جن لوگوں کے ساتھ میں رہ گیا ہوں وہ یا تو منافق ہیں یا پھر وہ لوگ ہیں جو معذور ہیں اور جن کو اللہ نے ہی جنگ سے رہ جانے کی رخصت دے دی ہے۔ رسول پاک ﷺ میدانِ جہاد میں پہنچے تو پوچھا ''کعب کو کیا ہوا؟''

''حضور ﷺ انہیں اپنے دیدہ زیب لباس اور شاہانہ چال ڈھال دیکھنے ہی سے کب فرصت ہے جو ہمارے ساتھ آتے'' بنی سلمہ کے ایک صاحب بولے۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے یہ سنتے ہی کہا ''آپ نے اچھی بات نہیں کہی۔ یارسول اللہ! کعب ہمارے خیال میں تو بہت ہی اچھے آدمی ہیں۔'' رسول پاک ﷺ خاموش رہے۔ اتنے میں دور سے گرد اڑتی ہوئی نظر آئی۔ کوئی سفید پوش سوار اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ دیکھتے ہی اللہ کے رسول ﷺ نے کہا ''ابوخیثمہ۔'' یہ وہی ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ تھے جنہوں نے اس موقع پر تھوڑی سی کھجوریں اللہ کی راہ میں پیش کی تھیں اور منافقین ان کی اس پیش کش پر ان کا مذاق اڑا رہے تھے۔ مگر اللہ نے ان کو شرفِ قبول بخشا اور یہ میدانِ جہاد میں پہنچ گئے۔

دن گزرتے رہے، پھر مجھے خبر ملی کہ اللہ کے رسول ﷺ جلد ہی غزوۂ تبوک سے واپس آنے والے ہیں۔ مجھے بڑی فکر ہوئی۔ دل میں طرح طرح کے جھوٹے بہانے آنے لگے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ واپس تشریف لے آئے۔ واپس آنے پر آپ نے معمول کے مطابق مسجد میں جا کر پہلے شکرانے کی دو رکعت نماز پڑھی، پھر لوگوں سے ملاقات کے لیے بیٹھے۔

منافقین نے آگے بڑھ بڑھ کر اپنے جھوٹے عذرات پیش کرنے شروع کر دیے اور لمبی چوڑی قسمیں کھا کر اپنی مجبوریاں ثابت کرنے لگے۔ ان جھوٹے مکاروں کی تعداد کچھ اوپر ۸۰ تھی۔ حضور ﷺ نے ان سب کے عذرات سنے اور ان کی باطنی حالت کو اللہ کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا ''جاؤ اللہ تمہیں معافی دے۔''

اب میری باری تھی، میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ مسکرائے، لیکن آپ ﷺ

کی مسکراہٹ میں غیظ وغضب تھا۔ پھر فرمایا: آؤ تم بھی آؤ۔ کہو تمہیں کیا رکاوٹ پیش آ گئی تھی۔ کیا تمہارے پاس سواری نہ تھی؟ میں نے کہا: یارسول اللہ! میں کسی دنیوی بادشاہ کے حضور ہوتا تو طرح طرح کے عذرات تراش کر اور چھوٹی سچی باتیں بنا کر اس کو راضی کر لیتا۔ لیکن آپ ﷺ کے بارے میں میرا یقین یہ ہے کہ اگر آج میں باتیں بنا کر آپ ﷺ کو راضی کر بھی لوں تو کل اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے اصل حقیقت آپ ﷺ پر واضح فرما کر پھر آپ کو مجھ سے ناراض کر دے گا اور اگر اس وقت میں ٹھیک ٹھیک حقیقت حال ظاہر کر کے آپ کو ناراض کر بھی دوں تو میری سچائی کی بدولت مجھے توقع ہے کہ اللہ ضرور میری معافی کی کوئی صورت پیدا فرما دے گا۔ یارسول اللہ! مجھے کوئی مجبوری نہیں تھی۔ اس موقع پر جو سہولت اور کشادگی مجھے میسر تھی پہلے کسی موقع پر نہیں تھی۔ صرف میری سستی اور لاپروائی تھی جس نے مجھے اس سعادت سے محروم رکھا۔

میری روداد سن کر نبی صادق ﷺ نے فرمایا: یہ شخص ہے جس نے سچی بات کہی ہے اور مجھ سے فرمایا: اچھا جاؤ اور اپنے معاملہ میں فیصلہ الٰہی کا انتظار کرو۔ میں اٹھ کر اپنے قبیلے کے لوگوں میں آ بیٹھا۔

بنی سلمہ کے لوگ میرے پیچھے پڑ گئے اور بولے، ہمیں نہیں معلوم کہ تم نے کبھی کوتاہی کی ہو۔ جھوٹے مکاروں نے کیسے کیسے بہانے تراشے اور صاف چھوٹ گئے۔ اگر تم بھی کوئی عذر پیش کر دیتے تو حضور ﷺ تمہارے لیے استغفار فرما دیتے اور حضور ﷺ کا استغفار تمہاری کوتاہی کا کفارہ ہو جاتا۔ تم نے بہت بڑی غلطی کی۔ ان سب لوگوں کی یہ باتیں سن کر میرے جی میں آیا کہ ٹھیک تو ہے میں بھی جا کر کوئی بات کیوں نہ بنا دوں۔

اب میں نے ان لوگوں سے پوچھا، اچھا یہ بتاؤ، میری طرح اور کوئی بھی ہے؟ لوگوں نے کہا، ہاں کیوں نہیں، دو آدمی اور ہیں، انہوں نے بھی وہی بات کہی جو تم نے کہی اور ان کو بھی وہی جواب دیا گیا جو تمہیں دیا گیا ہے —— میں نے پوچھا، ذرا بتاؤ کہ وہ کون دو آدمی ہیں؟ بولے ایک مرارہ بن ربیع رضی اللہ عنہ ہیں اور دوسرے ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ —— میں ان دونوں کا نام سنتے ہی گھر چلا آیا، مجھے اطمینان ہو گیا کہ جو کچھ میں نے کہا بالکل ٹھیک کیا۔ یہ دونوں وہ مسلمان تھے جو بدر کی جنگ میں شریک ہوئے تھے اور یہ دونوں میرے لیے بہترین نمونہ تھے۔

اب ہماری آزمائش کا دوسرا دور شروع ہوا۔ نبی ﷺ نے عام مسلمانوں میں اعلان کرا دیا کہ ہم تینوں سے کوئی شخص بات نہ کرے، یہ دونوں بوڑھے تو اس صدمے کی تاب نہ لا کر گھر بیٹھ رہے اور شب و روز روتے رہے۔ مگر میں جوان تھا، برابر باہر نکلتا رہا، بازاروں میں بھی برابر فروخت کے لیے آتا جاتا رہا اور مسجد میں بھی جماعت سے نمازیں پڑھتا رہا، لیکن کوئی مسلمان اس کا روادار نہ تھا کہ مجھ سے بات چیت کرے، کچھ اپنی کہے یا کچھ میری سنے۔ لوگوں نے ایسا رخ بدلا گویا میری کسی سے جان پہچان ہی نہیں ہے اور میں اپنے ہی شہر کے گلی کوچوں میں اجنبی بن کر رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سرزمین ہی بدل گئی ہے۔ زمین اپنی تمام تر وسعتوں کے

باوجود مجھ پر تنگ ہوگئی اور مجھے اپنی جان بوجھ معلوم ہونے لگی —— میں معمول کے مطابق مسجد میں جاتا اور اللہ کے رسول ﷺ کو سلام کرتا' مگر جواب کے لیے بس انتظار ہی کرتا رہتا کہ کاش حضور ﷺ کے لب مبارک جنبش کریں —— میں بھی نظریں چرا چرا کر آپ ﷺ کو دیکھا کرتا کہ آپ ﷺ مجھ پر نظریں ڈالتے ہیں یا نہیں' لیکن وہاں حال یہ تھا کہ میں جب تک نماز میں ہوتا حضور ﷺ کی مبارک نظر مجھ پر پڑتی رہتی اور جوں ہی میں سلام پھیر لیتا آپ ﷺ بھی یکبارگی نگاہیں پھیر لیتے۔ ایک دن کچھ زیادہ گھبراہٹ ہوئی تو میں ابوقتادہ کے پاس گیا۔ یہ میرے چچازاد بھائی بھی تھے اور بچپن کے دوست بھی۔ ان کے باغ کی دیوار پر چڑھا اور کہا' ابوقتادہ! السلام علیکم۔ مگر ہائے افسوس' اس جگری دوست نے سلام کا جواب تک نہ دیا۔ میں نے کہا' یار ابوقتادہ! میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں' تم بتاؤ کیا مجھے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت نہیں ہے؟ مگر ابوقتادہ خاموش رہے۔ میں نے پھر پوچھا' مگر وہ خاموش ہی رہے۔ تیسری بار جب میں نے قسم دے کر پوچھا تو بس اتنا کہا ''اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔'' یہ بے رخی دیکھ کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور میں غم سے نڈھال دیوار سے نیچے آ گیا۔

ایک دن میں کسی کام سے بازار میں تھا کہ شام کا ایک قبطی جو تجارت کے لیے غلہ لے کر آیا تھا' لوگوں سے میرا پتا پوچھ رہا تھا۔ لوگوں نے میری طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہی کعب بن مالک ہیں' وہ میرے پاس آیا اور مجھے شاہ غسان کا ایک خط دیا جو حریر میں نہایت سلیقے سے پلٹا ہوا تھا۔ میں نے کھول کر پڑھا تو لکھا تھا:

ہمیں پتا چلا ہے کہ تمہارے صاحب تم سے آج کل برگشتہ ہیں اور تم پر ستم توڑ رہے ہیں' تم کوئی ایسے ذلیل آدمی تو ہو نہیں کہ تمہارے ساتھ یہ برتاؤ کیا جائے۔ تم بے فکری سے ہمارے پاس چلے آؤ۔ ہم تمہارے شایانِ شان تمہاری قدر کریں گے۔

یہ خط پڑھ کر بے اختیار میرا دل بھر آیا اور میں نے سوچا' یہ ایک اور مصیبت نازل ہوئی۔ صدمے سے میرے دل کا برا حال تھا۔ میں نے اسی وقت اس خط کو چولھے میں جھونک دیا۔

اس کسمپرسی اور بے بسی کی حالت میں پورے چالیس دن جیسے تیسے گزر گئے —— رسول اللہ ﷺ کے پاس کافی دنوں سے وحی بھی نہیں آئی تھی —— اچانک ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کا قاصد پہنچا۔ میرا دل دھک دھک ہونے لگا۔

قاصد نے کہا' رسول اللہ ﷺ کا حکم ہے کہ اپنی بیوی سے الگ ہو جاؤ۔ میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا' کیا طلاق دے دوں؟ نہیں' بس الگ ہو جاؤ' قاصد نے کہا —— میں نے اپنی شریک حیات کو بھی میکے بھیج دیا اور کہہ دیا' وہیں رہ کر انتظار کرو۔ دیکھو اللہ کیا فیصلہ فرماتا ہے۔

قصہ مختصر اس کسمپرسی اور بے چارگی کے عالم میں دس راتیں اور بیت گئیں۔ پچاسویں دن نماز فجر ادا کرنے کے بعد میں اپنی چھت پر جا بیٹھا۔ میں اپنی جان سے بیزار' مایوس بیٹھا ہوا تھا اور زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود مجھ پر تنگ تھی کہ میں نے سلع کی پہاڑی سے ایک پکار سنی' کوئی زور زور سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا' مبارک ہو کعب مبارک ہو۔ یہ سنتے ہی میں بے اختیار اپنے رب کے حضور سجدے میں گر پڑا۔ میری دونوں آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہ پڑا۔ میں سمجھ گیا کہ میری خوشیوں کی گھڑی آن پہنچی۔

نماز فجر کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے ہماری معافی کا اعلان فرمایا' تو لوگ ہمارے پاس بھاگے چلے آ رہے تھے۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ پہلے میں پہنچ کر مبارکباد دوں۔

ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور پہاڑی پر چڑھ گیا' اس کی آواز گھوڑے کی آواز سے بھی زیادہ تیز تھی۔ جب وہ میرے پاس آیا تو میں نے خوشی میں اپنے کپڑے ہی اتار کر اس کے حوالے کر دیئے۔ اللہ گواہ ہے کہ اس وقت میرے پاس یہی دو کپڑے تھے' میں نے مانگ کر دوسرے کپڑے پہنے اور اپنے آقا محمد ﷺ کی خدمت میں حاضری کے لیے روانہ ہوا۔ آج میرے لیے مدینہ کے زمین و آسمان بدل گئے تھے۔ لوگ بڑی گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے مل رہے تھے' بغل گیر ہو رہے تھے' مجھے مبارکباد دے رہے تھے کہ اللہ نے تمہاری توبہ قبول فرمائی۔ میں خوش خوش مسجد نبوی ﷺ میں پہنچا۔

دیکھا کہ رسالت پناہ ﷺ جلوہ افروز ہیں' چہرۂ مبارک چاندی کی طرح چمک رہا ہے' روشن ستارے آس پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے' بڑھ کر گرمجوشی میں مجھ سے بغل گیر ہوئے اور مبارکباد دی۔ اللہ کی قسم میں ان کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ مہاجرین میں صرف یہی مجھے دیکھ کر کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے بڑھ کر اللہ کے رسول ﷺ کو سلام کیا۔ آپ ﷺ کا چہرہ فرط مسرت سے جگمگا رہا تھا۔ فرمایا ''کعب! مبارک ہو۔ یہ دن تمہاری زندگی کا بہترین دن ہے۔''

میں نے کہا' حضور ﷺ یہ معافی آپ ﷺ کی طرف سے ہے یا اللہ کی طرف سے! ارشاد فرمایا' اللہ کی طرف سے جبریل امین یہ آیتیں لے کر آئے ہیں:

''اور ان تینوں کو بھی اللہ نے معاف کر دیا جن کا معاملہ ملتوی کر دیا گیا تھا۔
جب زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان پر ان کی جانیں بار ہونے لگیں اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لیے خود اللہ کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں ہے۔ تو اللہ انکی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں۔ بلاشبہ وہ بڑا ہی معاف فرمانے والا اور انتہائی مہربان ہے۔''

(التوبہ)

یہ آیتیں سن کر میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو رواں ہو گئے۔ میں نے عرض کیا' یا رسول اللہ! میری توبہ میں یہ بھی شامل ہے کہ میں اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں صدقہ کر دوں۔

آپ نے فرمایا: ''کعب! کچھ مال اپنی ضرورت کے لیے روک لو' یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔'' میں نے حضور ﷺ کے مشورے کے مطابق خیبر والا حصہ روک کر باقی سب اللہ کی راہ میں دے دیا۔ پھر میں نے کہا: یا رسول اللہ! اللہ نے مجھے سچائی کے صلے میں معاف فرمایا ہے۔ میں اللہ سے عہد کرتا ہوں کہ ہمیشہ سچائی پر قائم رہوں گا۔ اور آج تک میں نے جان بوجھ کر کبھی کوئی غلط بات نہیں کہی۔ جہاں تک مجھے علم ہے' ایسا کبھی نہیں ہوا ہے اور مجھے اپنے رب سے توقع ہے کہ تا زیست وہ میری اسی طرح حفاظت فرماتا رہے گا۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی مقبولیت پر مدینے کے مسلمان گواہ ہیں' اللہ کا رسول ﷺ گواہ ہے' خود اللہ گواہ ہے اور اس سے زیادہ بلند مقام اور کیا ہوگا کہ رہتی زندگی تک جہاں جہاں بھی یہ قرآن پاک پڑھا جائے گا' اللہ کے بندے حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی توبہ کی مقبولیت کے گواہ بنتے رہیں گے۔ یہ مقام بلند حضرت کعب رضی اللہ عنہ کو اسی لیے ملا کہ ان کے دل میں دین کے لیے ایسا ہی بلند مقام تھا اور پچاس دن کی لرزہ خیز آزمائش کے ایک ایک لمحے نے یہ ثبوت دیا کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے اللہ اور رسول ﷺ اور دین کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا' اپنے جذبات' اپنا آرام' اپنی مرغوبات' اپنی خودی' اپنی انانیت' ہر چیز کو دین کی خاطر روند ڈالا' تو اللہ نے انہیں اتنا اونچا اٹھایا جس کے تصور سے ہی روح جھوم اٹھتی ہے۔

تفصیلی واقعہ کے لئے (بخاری' کتاب المغازی باب ۸۰ حدیث کعب بن مالک ص ۳۶۲)



# عبرتناک غفلت

آپ کی خوش نصیبی یہ بھی ہے کہ آپ صحت منداور توانا ہیں۔آپ کی خوش نصیبی یہ بھی ہے کہ آپ خوش حال اور دولت مند ہیں۔آپ کی خوش نصیبی یہ بھی ہے کہ اللہ نے آپ کو رہنے کے لیے وسیع اور آرام دہ مکان دے رکھا ہے۔آپ کی خوش نصیبی یہ بھی ہے کہ اللہ نے آپ کو سعادت منداولا دعطا فرمائی ہے۔آپ کی خوش نصیبی یہ بھی ہے کہ آپ کو عزت اور شہرت سے اللہ نے نوازا ہے۔اور آپ کی خوش نصیبی یہ بھی ہے کہ اللہ نے آپ کو آرام دہ سواریاں بھی دے رکھی ہیں اور نہایت سکون کے ساتھ آپ کی زندگی بسر ہورہی ہے۔لیکن آپ کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہے کہ اللہ نے آپ کو ایمان عطا فرمایا ہے۔آپ مسلمان ہیں' مسلمان رہنا چاہتے ہیں اور آپ کی آخری تمنا یہ ہے کہ اسلام اور ایمان پر آپ کا خاتمہ ہو۔

کبھی آپ نے سوچا ہے کہ آپ کیوں مسلمان ہیں؟ کیا اس لیے کہ آپ مسلمان خاندان میں پیدا ہوئے؟ یا محض اس لیے کہ آپ کا نام مسلمانوں جیسا ہے۔یا آپ اس لیے مسلمان ہیں کہ مسلمان سماج میں آپ کی شادی ہوئی؟ یا محض اس لیے آپ مسلمان ہیں کہ مردم شماری کے خانے میں آپ مسلمان شمار کیے گئے ہیں۔جی نہیں' آپ اس لیے مسلمان ہیں کہ آپ نے اسلام کو اپنا دین مانا ہے۔آپ کو یہ یقین حاصل ہے کہ آپ کی دین و دنیا کی کامیابی اسلام کو اپنانے ہی میں ہے۔آپ کو بجا طور پر فخر ہے کہ اللہ نے آپ کو شعور کے ساتھ اپنا دین قبول کرنے کی سعادت بخشی ہے اور بے شک یہی آپ کی سب سے بڑی خوش نصیبی ہے۔

آپ کو احساس ہو یا نہ ہو اسلام کو اپنا دین ماننے سے قدرتی طور پر آپ کی ایک حیثیت یہ بھی قرار پاتی ہے کہ آپ اسلام کے نمائندے اور ترجمان ہیں۔آپ جو کچھ کہتے اور کرتے ہیں' دنیا کے لوگ اس کو صرف اس نظریئے سے نہیں دیکھتے کہ وہ آپ کا قول و فعل ہے' بلکہ بجا طور پر یہی سمجھتے ہیں کہ یہی اسلام ہے اور ہونا بھی یہی چاہیے کہ مسلمان جو کچھ کرے وہ اسلام ہی ہو۔آخر دنیا اس شخص کو مسلمان کیوں سمجھے اور کیسے سمجھے جس کا قول و فعل وہ نہ ہو جو اسلام بتاتا ہے اور اسی طرح دنیا ایک مسلمان کے اعمال کو دیکھ کر یہ نہ سمجھے کہ یہی اسلام ہے۔اس حیثیت سے آپ سوچیں تو آپ کی حیثیت انتہائی نازک ہو جاتی ہے اور بہت بڑی ذمہ داری آپ کے سر آجاتی ہے۔آپ کوئی غلط

قدم اُٹھائیں گے تو اپنی غلطی کا خمیازہ تو بھگتیں گے ہی' آپ کے عمل کو دیکھ کر جو لوگ بھی گمراہی میں مبتلا ہوں گے' یا اسلام کے نام پر غیر اسلام کو اپنائیں گے یا اسلام سے بدگمان ہوں گے ان سب کا خمیازہ بھی آپ کو بھگتنا پڑے گا۔ سنجیدگی سے غور کیجیے' کیا آپ اس کے لیے تیار ہیں کہ آپ کے قول و عمل کو دیکھ کر لوگ اسلام سے بیزار ہو جائیں' یا کچھ ایسی باتوں کو اسلام سمجھ کر اختیار کرنے لگیں جن کو مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا — اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو خدارا اپنے اعمال کا جائزہ لیجیے۔ اس مسئلے کو بڑھاپے کی زندگی کا موضوع قرار دے کر ٹالنے کی کوشش نہ کیجیے' بلکہ سنجیدگی سے غور کیجیے' اپنے نفس کو تاویلیں کرنے کی مہلت دینے کے بجائے اس سے کڑا محاسبہ کیجیے۔ اس لیے کہ یہ آپ کی زندگی کے تمام اہم مسائل سے زیادہ اہم مسئلہ ہے۔ یہ آپ کی دائمی کامیابی اور ناکامی کا مسئلہ ہے۔ اور کسی کو نہیں معلوم کہ اس کی مہلتِ عمل کب ختم ہو جائے۔

میں ہرگز نہیں کہتا کہ آپ اس مسئلے پر سوچتے نہ ہوں گے' نہ میں یہ کہتا ہوں کہ آپ کے دل میں دین کا درد نہیں ہے۔ میں یہ کہنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا کہ آپ کا دل رسول اکرم ﷺ کی محبت سے خالی ہے۔ نہ میں یہ کہتا ہوں کہ آپ اپنے ربّ کو بھولے ہوئے ہیں اور آپ نے اس سے اپنا تعلق توڑ لیا ہے۔ بھلا مجھے ایسا سوچنے اور کہنے کا کیا حق ہے' البتہ آپ کے بعض اعمال دیکھ کر یہ فکر اور تشویش ضرور ہوتی ہے' کہ یا تو آپ اسلام کی صحیح تعلیم سے ناواقف ہیں' یا سخت غفلت کا شکار ہیں۔ آپ اپنے ساتھ بھی ظلم کر رہے ہیں اور اپنے دین کے ساتھ بھی۔ زندگی کے ہر مسئلے پر آپ سوچتے ہیں' نہایت ہوشیاری' دانائی اور جزرسی کے ساتھ اپنے ایک ایک معاملے پر غور کرتے ہیں۔ سماج اور خاندان کے دوسرے لوگ بھی آپ کو سمجھدار کہتے ہیں اور آپ خود بھی اپنے کو سمجھداروں میں شمار کرتے ہیں تو پھر آپ اللہ کی دی ہوئی اس عقل و ذہانت اور ہوشیاری و دانش مندی کو اپنے دین کے معاملے میں کیوں استعمال نہیں کرتے' آخر یہ بھی تو آپ کا اپنا ہی معاملہ ہے' اس معاملے میں غفلت آپ کا اپنا ہی نقصان ہے۔ آپ عبرتناک لاپروائی سے کام لے رہے ہیں۔ یقین مانیئے اس طرزِ عمل سے آپ کی زندگی سراسر خسارے میں ہے۔ کیا اچھی بات کہی ہے حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے:

''تیرا عمل تیرے عقائد کی دلیل ہے اور تیرا ظاہر تیرے باطن کی دلیل ہے۔''

آپ کا ایمان ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اسی کے حکم اور فیصلے سے ہوتا ہے۔ نفع بھی وہی پہنچاتا ہے اور نقصان بھی اسی کے اختیار میں ہے۔ وہی ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ مسلمان کو اسی سے دعا مانگنی چاہیے' وہی دعائیں قبول کرتا ہے۔ اسی سے مدد مانگنی چاہیے' وہی مدد فرماتا ہے اور کسی کے قبضے میں کچھ نہیں ہے۔ دولت' عزت' اچھائی' برائی' نفع' نقصان' موت' زندگی' صحت' بیماری' شفا' سب کچھ اسی کے اختیار میں ہے۔ وہ کچھ نہ دینا چاہے تو ساری دنیا مل کر ایک ذرّہ نہیں دے سکتی۔ اور وہ دینا چاہے تو ساری دنیا مل کر روک نہیں سکتی۔

وہ مارنا چاہئے تو کوئی جلا نہیں سکتا اور وہ جلانا چاہے تو ساری دنیا مل کر مار نہیں سکتی۔ قرآن پاک کی یہ آیت آپ نے پڑھی بھی ہوگی اور سنی بھی ہوگی:

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○ (یونس ۱۰:۱۰۷)

''اگر اللہ تمہیں مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے اور اگر وہ تمہارے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو کوئی نہیں ہے جو اس کے فضل کو پھیر دے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اسے فضل سے نوازتا ہے اور وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔''

آپ کا ایمان ہے کہ قرآن پاک کا یہ فرمان سرتاسر حق ہے' لیکن پھر بھی آپ کی زندگی میں بعض ایسے اعمال ملتے ہیں جو اس فرمان اور ایمان کی تائید نہیں کرتے تو تشویش ہونے لگتی ہے۔ اپنے ایک تازہ عمل پر ہی غور کیجیے۔

اللہ کا شکر ہے کہ آپ کے بھائی کا آپریشن کامیاب رہا اور انہیں اللہ نے گویا نئی زندگی عطا فرمائی۔ بے شک ان کی تیمارداری' علاج اور خدمت میں آپ نے محبت اور تعلق کا حق ادا کر دیا۔ شب و روز آپ ان کی فکر اور خدمت میں سرگرداں رہے۔ دوڑ دھوپ بھی کی اور روپیہ پیسہ بھی صرف کیا اور اس وقت تو آپ کی حالت واقعی انتہائی قابل رحم تھی جب انہیں آپریشن روم میں لے جایا گیا۔ آپ کی حالت زار دیکھ کر ہر ایک کو آپ پر بے اختیار رحم آ رہا تھا۔

پھر اللہ نے کرم کیا کہ آپ کا مریض تندرست ہو گیا —— اور معلوم ہوا کہ آپ جذبات شکر سے لبریز روزانہ بانکے میاں کے مزار پر جاتے رہے۔ آپریشن کی کامیابی کی خبر سنی تو ایک دم بانکے میاں کے مزار پر دوڑے۔ وہاں جا کر آپ نے سجادہ نشین کو نذرانہ دے کر خواجگان کا ختم کرایا اور جب آپ اپنے مریض کو گھر لائے تو پھر دوڑے دوڑے گئے اور مزار پر جذبات شکر پیش کیے۔ اور نذرانے گزارے —— مگر اس دوران ایک بار بھی آپ کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ آپ مسجد میں جاتے' اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوتے۔ دوگانہ شکر ادا کرتے کہ پروردگار صحت دینے والا تو ہی ہے۔ صحت کی خبر سن کر آپ بانکے میاں کے مزار کی طرف تو دوڑے' لیکن مسجد آپ کو یاد نہ آئی۔ گھر پہنچے تو محلے کی مسجد آپ کا انتظار ہی کرتی رہ گئی۔ اور آپ کئی میل کا سفر طے کر کے بانکے میاں کے مزار پر پابندی سے جاتے رہے بھول کر بھی آپ کو اپنا وہ رب یاد نہ آیا جس پر ایمان رکھنے کی وجہ ہی سے آپ مسلمان ہیں۔ ایک بار بھی آپ کو خیال نہ آیا کہ شفا اور صحت جس اللہ کے اختیار میں ہے' اس سے دعا مانگ لیں' اس کے بھی آپ پر کچھ حقوق ہیں؟ —— آپ غور کیجیے' صحت دینے والا اللہ ہے یا بانکے میاں؟ —— بانکے میاں کے نام کی آپ نے دیگ بھی پکوائی' چادر بھی چڑھائی' ان کے مزار پر بار بار حاضری بھی دی۔ ان کے مزار پر ختم بھی کرائے اور اللہ کے حضور ایک بار بھی آپ کو جھکنے کی توفیق نہ ہوئی۔ نہ اللہ کے نام کا آپ کوئی صدقہ دے سکے۔ کم از کم نماز ہی کے پابند ہو

جاتے' آخر یہ کیسی غفلت ہے' کیسی لاپروائی ہے' آپ اسلام کے کیسے نمائندے ہیں؟ سوچیے تو سہی۔ کیا یہ عمل اسلامی عقیدے کی نمائندگی کرتا ہے؟ کیا آپ کو یہ سب کچھ کرتے دیکھ کر کوئی یقین کر سکتا ہے کہ آپ توحید کے قائل ہیں۔ آپ نے جو کچھ کیا وہ کسی طرح ایک توحید پرست مسلمان کے شایان شان نہیں۔ میں آپ کو قرآن پاک کی ایک آیت یاد دلاتا ہوں' سنجیدگی سے اس پر غور کیجیے اور سوچیے کہ قرآن پاک آپ سے کس فکر و عمل کا تقاضا کرتا ہے۔ آپ میری بات مانیں یا نہ مانیں — قرآن تو بہر حال آپ کا ایمان ہے اور آپ کا عقیدہ ہے کہ ہدایت کا سرچشمہ قرآن ہی ہے۔ قرآن پاک کی یہ آیت بار بار پڑھیے اور غور کیجیے کہ آپ کا یہ طرز عمل کس گروہ کی نمائندگی کر رہا ہے؟

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّاۤ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَىِٕنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ۝ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِیْمَاۤ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝ اَیُشْرِكُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْـًٔا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ ۝ (الاعراف: ۱۸۹'۱۹۰'۱۹۱)

''وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا ایک جوڑا بنایا کہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک خفیف سا حمل رہ گیا' جسے لیے لیے وہ چلتی پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں نے مل کر اللہ' اپنے رب سے دعا کی کہ اگر تو نے ہم کو ایک اچھا سا بچہ دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔ مگر جب اللہ نے ان کو ایک صحیح سالم بچہ دے دیا تو وہ اس کی بخشش و عنایت میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگے۔ اللہ بہت بلند و برتر ہے' ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ کیسے نادان ہیں یہ لوگ کہ ان کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ جو کسی چیز کو بھی پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔''



# ماہِ صیام کا استقبال

چند دن بعد رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہو جائے گا اور اللہ جن لوگوں کو توفیق عمل سے نوازے گا وہ رحمت و مغفرت کے اس مہینے میں زیادہ سے زیادہ خیر و برکت کے حصول میں مشغول ہوں گے۔ خیر و برکت کا یہ حصول محض سحری کھانے، دن بھر کھانے پینے سے اجتناب کرنے اور شام کو افطار کرنے اور تراویح کی ۸ یا ۲۰ رکعت نماز ادا کرنے پر ختم نہیں ہو جاتا، یہ تمام سرگرمیاں تو اوپر کی سطح کی ہیں۔ اصل روح اس سطح کے نیچے ہے۔ اگر وہ حاصل نہ ہو جیسا کہ رسول ﷺ نے آگاہ فرمادیا ہے، اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی پروا نہیں کہ کوئی شخص بھوکا رہتا ہے، یا پیاسا۔ اس کا تعلق حصول تقویٰ سے ہے اور کلام الٰہی میں رمضان کے روزوں کی یہی غرض و غایت بھی بتلائی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

''روزہ تم پر اس لیے فرض کیا جا رہا ہے کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔'' (البقرۃ ۲:۱۸۳)

تقویٰ ہی وہ اجالا ہے جو زندگی کی شاہراہ کو روشن کرتا ہے۔ رضائے رب کی منزل کو پہنچاتا ہے اور انسان کے اندر یہ صلاحیت پیدا کرتا ہے کہ زندگی کی راہ میں اللہ کی نافرمانی کی جو خاردار جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں ان سے اپنے دامن کو بچاتے ہوئے اپنا سفر حیات طے کرے۔ اسلامی زندگی تقویٰ کے محور پر گھومتی ہے۔ یہ ایک مکمل ذمہ داری کی زندگی ہے۔ اس میں کوئی کام، کوئی بات اور کوئی سرگرمی ایسی نہیں ہے جو انسان کو ایک غیر ذمہ دار اور غیر مسئول وجود قرار دے۔ ایک معین نصب العین ہے۔ ایک طے شدہ اور سیدھی راہ منزل ہے جس پر زندگی کا راہی رواں دواں رہتا ہے۔

تقویٰ کی روح کو بیدار کر کے رمضان انسان کے اندر وہ ذمہ دارانہ نقطۂ نگاہ اور طرز عمل پیدا کرتا ہے جو مؤمن کے لیے سرمایۂ حیات ہوتا ہے۔

قرآن پاک کی بنیادی دعوت توحید کی دعوت ہے۔ قرآن یہ پیغام دیتا ہے انسان اپنی پوری زندگی میں اللہ ہی کو اپنا معبود بنائے، اس پیغام کو انسان کے ذہن اور عمل میں راسخ کرنے کے لیے قرآن نے نماز اور روزہ کی شکل میں ایک عملی پروگرام بھی پیش کر دیا ہے تا کہ مؤمن بندوں میں وہ صلاحیتیں پوری طرح اجاگر ہو جائیں جو رضائے

رب کی راہ کے لیے زادِ سفر کا کام دیتی ہیں۔

رمضان المبارک کے آداب و احکام پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالنے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ تقویٰ کی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت اس کے ذریعہ کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ تقویٰ کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی ہمہ بیں نگاہوں کی نگرانی محسوس کرنے پر ہے' اللہ کو حاضر و ناظر جاننے کا ملکہ حاصل کیے بغیر انسان تقویٰ کی زندگی نہیں بسر کر سکتا اور روزہ یہی ملکہ پیدا کرتا ہے' اس کے لیے حلال چیزوں سے ایک وقت معین کے لیے پرہیز کیا جاتا ہے۔

تقویٰ کی یہ روح حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ روزہ شعور اور احساس کے ساتھ رکھا جائے۔ خصوصاً جہاں زندگی کا پورا ڈھانچا نا خدا پرستی کی بنیاد پر اٹھانے کی کوششیں ہو رہی ہوں' وہاں اس شعور و احساس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ رمضان کی غرض و غایت یہ ہے کہ امت مسلمہ کے اندر تقویٰ کی روح کو بیدار کر کے اسے رضائے رب کی راہ پر چلنے کا خوگر بنایا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پورے مہینے کے روزوں کو فرض قرار دیا گیا' اسی پس منظر میں یہ بات بھی نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ ہر بندۂ مؤمن کے لیے جہاں یہ بات ضروری ہے کہ وہ روزے کے آداب و احکام کو پورے شعور' پورے یقین اور پورے احساس کے ساتھ بجا لائے وہیں اس کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی اللہ کی رضا کے مطابق بنانے کی کوشش کرے اور زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہ جائے جس پر رضائے رب کی چھاپ نہ پڑی ہو۔ اللہ سب لوگوں کو توفیق عمل سے نوازے کہ وہ رمضان کی برکتوں کو زیادہ سے زیادہ حاصل کر سکیں۔

رمضان المبارک' تربیت و تزکیہ کا مہینہ ہے۔ اللہ کے وفاداروں کا مہینہ ہے۔ ان کا مہینہ ہے جو اللہ کا ذکر کرنے والے اور سچے ہیں۔ اگر یہ مبارک مہینہ بھی تمہارے قلوب کی اصلاح نہ کرے گا' گناہوں سے نہ بچائے گا اور تمہیں اہل بدعت اور گنہگاروں سے محفوظ نہ رکھے گا تو پھر اور کیا چیز تمہیں ان چیزوں سے بچا سکے گی۔ اور اس سے زیادہ مؤثر اور بہتر کون سی چیز ہوگی جو تم پر اثر کرے گی۔ اگر ماہ رمضان کی خیر و برکت سے تم محروم رہے تو تم سے کسی نیکی اور خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی اور نہ یہ امید ہو سکتی ہے کہ تم سے کوئی بدبختی دور ہو جائے۔

اے مسکینو اور نادار بھائیو! غفلت سے بیدار ہو جاؤ۔ آنکھیں کھولو' اپنا سر اٹھاؤ' جو نعمت اور عظمت تمہیں اللہ نے بخشی ہے اس پر سوچ بچار کرو۔ اللہ سے توبہ و استغفار کرو۔ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو۔ وہ بڑا ہی کارساز ہے۔ اس کی اطاعت میں لگ جاؤ۔ کیا معلوم آنے والے سال میں پھر خیر و برکت کا مبارک مہینہ نصیب ہوگا یا نہیں۔ بہت سے قیام و تراویح کا اہتمام کرنے والے ایسے ہیں کہ ان کو زندگی میں دوبارہ قیام اور تراویح کا موقع نہ مل سکے گا۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اپنی مصروفیات اور مشاغل میں لگے رہو اور خیر و برکت کا یہ مہینہ نکل جائے۔ اگر ایسا ہوا تو تم بڑے خسارے میں رہو گے۔ اگر ہم نے اس خیر و برکت کے عظیم مہینہ سے استفادہ میں تساہلی اور غفلت سے کام لیا تو یاد رکھو کہ یہ مہینہ اپنا وقت پورا کرنے میں غفلت کا ثبوت نہیں دے گا۔ اور بڑی ہی تیز رفتاری سے یہ گزرتا چلا جائے گا۔ یہ تو صرف ان لوگوں کو سعادت اور عظمت تقسیم کرتا ہے اور دونوں ہاتھ سے تقسیم کرتا ہے جو خود اس سے سعادت اور عظمت کے طلبگار رہوں۔ پیچھے ہٹنے والوں اور اعراض کرنے والوں سے تو اس کو سخت نفرت ہے اور ایسے لوگوں کے لیے یہ شقاوت اور بدبختی میں اضافہ کر دیتا ہے۔

دیکھو' کہیں ایسا نہ ہو کہ رمضان کا مہینہ تو تم سے یہ کہے کہ تم اپنا منہ بند رکھو اور تم اس پر عمل نہ کر سکو' کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا مطالبہ تو یہ ہو کہ تم اپنی زبان پر لگام لگائے رہو اور تم اس پر عمل نہ کر سکو' کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تم سے اس بات کا خواہش مند ہو کہ تم اپنی آنکھ کو بھٹکنے نہ دو اور تم اس کی خواہش کا احترام نہ کر پاؤ اور کہیں ایسا نہ ہو کہ تم سے وہ نیکی اور بھلائی کے راستے کی طرف قدم اٹھانے کے لیے کہے اور تم کسی دوسری راہ کی طرف بڑھنے لگو۔ تمہیں معلوم ہے کہ رمضان کے بارے میں اس نبی ﷺ نے جس کی امت میں تم ہو اور اس نبی ﷺ نے جس پر ہر ایک اپنے ماں باپ اور عزیز ترین اشیاء کو قربان کر سکتا تھا' کیا فرمایا ہے؟ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابن آدم کا ہر عمل اس کے لیے ہے سوائے روزے کے کہ وہ خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا اور روزہ ایک ڈھال ہے۔ تو جب تم میں سے کوئی روزے سے ہو تو بے حیائی اور لغویات سے بچنا چاہیے۔ اور اگر اس سے کوئی گالی گلوچ اور لڑائی جھگڑا کرنا چاہے تو اسے کہہ دینا چاہیے کہ میں روزے سے ہوں "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے' روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بہتر ہے۔"" روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں جب وہ افطار کرتا ہے تو افطاری سے خوشی ہوتی ہے اور جب وہ اپنے رب سے ملے گا تو اپنے روزے کی وجہ سے خوش ہو گا۔" (بخاری' کتاب التوحید' باب ۳۵' ص ۶۲۴)

ذرا غور کرو اور آنکھیں بند کر کے دیکھو کہ اللہ کے رسول ﷺ اور تمہارے نبی کیا فرما رہے ہیں کہ "روزہ اللہ کے لیے ہے اور اس کا اجر وہ خود دے گا۔ بھائیو! روزہ اللہ تعالیٰ کا ایک مہمان ہے' اس کی قدر کرو گے اور اس کے حقوق اور ذمہ داریاں پوری یکسوئی اور دل سے ادا کرو گے تو یہ تمہارے لیے ایسا مہمان ثابت ہو گا جو جب جاتا ہے تو اپنے میزبان کو اس کی میزبانی سے نوازتا ہے اور یہ تو اللہ کا مہمان ہے۔ اس کی نوازشیں تو تمہارے لیے دین اور دنیا دونوں میں معین و مددگار ثابت ہوں گی۔



# بندگی کس کی؟

بندگی کس کی؟ یہ بھی کوئی سوال ہے۔ بندگی صرف اس کی ہونی چاہیے جس نے پیدا کیا ہے اور جو ہمارا پروردگار ہے۔

بے شک آپ کا جواب صحیح ہے۔ بندگی کے لائق صرف اللہ ہے اور آپ سے تو یہ سوال کرنا اس لیے بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ آپ کو میں نے بار بار قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے دیکھا ہے' جس کے ہر ہر صفحے میں بار بار اسی حقیقت کو دہرایا گیا ہے۔ اور پھر میں نے آپ کو نماز پڑھتے بھی بار بار دیکھا ہے' جس کی ہر رکعت میں آپ یہ الفاظ کہتے ہیں اِیَّاکَ نَعْبُدُ' اے اللہ! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں۔ بلکہ میری خوش گمانی تو یہ ہے کہ آپ کو تہجد کے لیے اٹھنے کی توفیق بھی ہوتی ہے۔ اور رات کی تنہائی میں بھی آپ بار بار یہ الفاظ دہراتے ہیں اِیَّاکَ نَعْبُدُ' پروردگار! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں۔ یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے کہ آپ یہ الفاظ بے شعوری میں دہراتے ہیں' یا پورے شعور کے ساتھ اپنے رب سے اقرار کرتے ہیں۔ لیکن آپ کے اس مستقل طرزِ عمل کے بعد آپ سے یہ سوال بظاہر واقعی بے جوڑ ہے کہ "آپ کس کی بندگی کرتے ہیں؟"

لیکن معاف فرمائیں آپ کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا تو بعض الجھنوں نے ذہن کو بری طرح جھنجھوڑا ــــ آپ کے بعض اعمال کھٹکے اور ہزار خوش گمانی کے باوجود ذہن یہی فیصلہ کرتا رہا کہ اللہ کی بندگی نہیں نفس کی بندگی ہے ــــ معاف کیجیے میں نے بہت سخت الفاظ استعمال کیے مگر واقعی میں اس کی کوئی اور توجیہہ کرنے سے معذور رہا اور سوچا کہ اپنا دردِ دل آپ سے ضرور بیان کروں۔ ممکن ہے یہ نفس کی بندگی بے شعوری میں ہو رہی ہو۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو' مگر بے شعوری کے ساتھ بھی میرے اچھے ساتھی' آپ کے سفید لباس پر مجھے یہ دھبا کسی طرح اچھا نہیں لگتا اور بے اختیار کہنے کو جی چاہتا ہے' وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ' اور کردار کے لباس کو پاک و صاف رکھیے۔

ایک ساتھی سے آپ کی ان بن ہو گئی۔ آپ کو ان پر غصہ آ گیا۔ غصے میں آپ کی زبان سے ایسے الفاظ بھی نکل گئے جو مؤمن کے لیے کسی بھی طرح مناسب نہیں ہیں۔ مگر خیر' جذبات کی رو میں بعض اوقات آدمی بہ جاتا ہے۔ مگر اس کے بعد میں نے دیکھا کہ آپ نے ہفتوں اپنے ساتھی سے سلام کلام ترک کر دیا ہے ــــ میں نے

آپ کو توجہ دلائی، مگر آپ نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ پھر میں نے کسی قدر اور زیادہ سوز کے ساتھ آپ کو آپ کے پیارے رسول حضرت محمد ﷺ کا فرمان سنایا ''کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے مسلمان بھائی سے قطع تعلق کیے رہے'' — آپ نے حدیث توجہ سے سنی، ضمیر نے ملامت کی، آغاز بھی کیا۔ آپ کے چہرے کا اتار چڑھاؤ بتا رہا تھا کہ اطاعت کے جذبات ابھر رہے ہیں، لیکن نفس نے پھنکاریں مارنا شروع کیں اور آپ اس ناگ سے مغلوب ہو گئے — پھر آپ اپنے ساتھی سے بدستور کٹے رہے۔ صحیح یا غلط یہ فیصلہ آپ کریں۔ میری الجھن یہ ہے کہ آپ نفس کی بندگی کر رہے ہیں۔

آپ کے ایک عزیز معاشی آزمائش میں مبتلا ہو گئے۔ انہوں نے آپ کو اپنی بپتا سنائی۔ آپ نے محسوس کیا کہ ان کی معاشی آزمائش میں کسی پہلو سے میری معاشی ترقی ہو سکتی ہے — آپ نے کسی دردمندی اور بہی خواہی کا اظہار کرنے کی بجائے خاموشی اختیار کی اور ان کو کوئی مشورہ دینے سے اس لیے گریز کیا کہ آپ کی نگاہیں اپنی معاشی ترقی پر لگی ہوئی تھیں۔ میں نے آپ کو متوجہ کیا اور پھر آپ کو آپ کے آقا ﷺ کی بات سنائی کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

''مؤمن وہی ہے جو دوسرے کے لیے بھی وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

مگر میں نے دیکھا کہ آپ اپنے رویہ پر قائم رہے اور آپ کی چمکدار پیشانی پر ندامت کا ایک چھوٹا سا قطرہ بھی نمودار نہ ہوا اور میرا ذہن پریشان ہونے لگا کہ یہ تو نفس کی بندگی ہے۔

اپنے ایک قریبی عزیز کے یہاں آپ نے کھانا نہیں کھایا، اس لیے کہ ان کے یہاں باجا بج رہا تھا اور کیمرہ برابر رنگین تصویریں کھینچنے میں سرگرم تھا۔ میرے دل میں آپ کی بڑی قدر ہوئی، مگر شام کو میں نے دیکھا کہ آپ ایسی دعوت میں شریک ہیں جو شہر کے ایک نئے سرمایہ دار کے یہاں ہوئی تھی جنہیں لاٹری کے ٹکٹ سے حال ہی میں ایک بہت بڑی رقم ملی تھی اور اس مجلس میں آپ بڑے اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے۔ جہاں برابر تصویریں کھینچی جا رہی تھیں۔

میں نے تنہائی میں نہایت درد کے ساتھ آپ کو متوجہ کیا۔ آپ نے تاویل کے دفتر کھول دیئے۔ اور میں آپ کی ذہانت پر رشک کرنے کے باوجود دل مسوس کر رہ گیا۔ نہ صرف دوسری مجلس میں آپ کا بیٹھنا نفس کی بندگی تھی۔ بلکہ اپنے قریبی عزیز کے یہاں کھانا نہ کھانا بھی اللہ کی بندگی میں نہیں، نفس کی بندگی میں تھا۔ آپ نے کسی اور وقت کا بدلہ لینے کے لیے اس وقت اس کی بے دینی پر حملہ کیا تھا۔

اللہ کا واقعی انعام ہے کہ اس نے آپ کو بہت کچھ دے رکھا ہے، پچھلے دنوں آپ ہی سے معلوم ہوا کہ نئی بیوی کے بیٹوں اور بیٹیوں کے نام سے آپ نے بہت کچھ خریدا ہے اور ان کی خوش حالی کے لیے آپ نے بہت سے

انتظامات کیے ہیں' مگر مطلقہ بیوی کی اولاد کے نام سے آپ نے کچھ نہیں خریدا۔ وہ خستہ حال جگہ جگہ فریاد کرتے نظر آتے ہیں۔ آپ کا کہنا یہ ہے کہ وہ اپنی ماں کے کہنے پر چلتے ہیں۔ آپ کے طرزِ عمل سے انہیں شکایت ہے' اس اطلاق کو بھی وہ ظلم سے تعبیر کر رہے ہیں کہ آپ کے بعد بھی وہ کچھ نہ پاسکیں۔

میں نے آپ کو متوجہ کیا اور سورۂ نساء کا دوسرا رکوع پڑھ پڑھ کر سنایا کہ اللہ نے اپنے اٹل قانون میں اس طرح حصے بیان کیے ہیں اور مؤمن کا کام تو صرف اس قانون کی تعمیل ہے۔ مگر آپ ٹس سے مس نہ ہوئے اور آپ کا دل ذرا بھی اس قانون کے آگے نہ جھکا۔ میں نے آپ کو بارہا مسجد میں اللہ کے حضور جھکتے دیکھا ہے۔ لیکن اس موقع پر میں نے آپ کو اللہ کے قانون کے آگے جھکانے کی ہر ممکن تدبیر کی لیکن آپ کی گردن برابر اکڑی رہی۔ میں سوچتا ہوں' یہ نفس کی بندگی نہیں تو اور کیا ہے؟

مجھے معلوم ہے کہ آپ نے بہن کی شادی میں کئی ہزار روپیہ صرف کیے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ آپ وقتاً فوقتاً اپنی بہن کے لیے چھوٹے بڑے تحفے بھی لے جاتے ہیں —— لیکن پچھلے دنوں جب آپ نے مرحوم باپ کی ایک بڑی جائیداد فروخت کی تو بہن کو کچھ بھی نہ دیا۔ بینک بیلنس بھی اپنے نام کرالیا۔ باقی مکانات پر بھی آپ ہی قابض ہیں۔ مگر معمولی تحفوں سے بہن کو برابر خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور صلہ رحمی کے پرچار کے ساتھ کرتے ہیں۔ میں نے آپ کو یاد دلایا کہ مرحوم باپ کے مال میں دو حصے آپ کے ہیں اور ایک حصہ آپ کی بہن کا ہے —— اور اللہ کا شکر ہے آپ کے والد صاحب نے تو اتنا کچھ چھوڑا ہے کہ بہن کا پورا حصہ دینے کے باوجود جو کچھ بچے گا وہ آپ کی پوری زندگی کے لیے کافی ہے —— آپ نے اللہ کی کتاب میں یہ آیت بار بار پڑھی ہے ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ﴾ (النساء۴:۱۱) ''مرد کے لیے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے۔'' اور آپ اسی طرح بدستور کمزور بہن کے مال پر قابض رہے۔ کیا یہ اللہ کی بندگی ہے۔ جی نہیں یہ نفس کی بندگی ہے اور آپ ہولناک دھوکے میں مبتلا ہیں۔ میں زیادہ کچھ کہہ کر آپ کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا۔ ورنہ میرے عزیز دوست اور بھی کتنے ہی دھبے ایسے ہیں جن کی سیاہی میں بندگی نفس کا کریہہ منظر دکھائی دیتا ہے اور میرا دل ہرگز گوارا نہیں کرتا کہ آپ کے دامن پر ایسے بدنما داغ ہوں۔ آپ کا کہنا بجا ہے کہ تم مجھے کہہ رہے ہو؟ کیا تم اس طرح کی بندگی نفس میں مبتلا نہیں ہو۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اس وقت مجھے متوجہ نہ کریں۔ مجھے متوجہ کرنے کا فرض انجام دینے پر آئیں گے تو آپ کا ضمیر پھر ٹھنڈا پڑ جائے گا —— اور یہ ذرا سی گرمی جو اس وقت آپ کے ضمیر نے قبول کی' ختم ہو جائے گی —— میری دعا ہے کہ اللہ آپ کی آنکھیں کھول دے اور آپ بندگی نفس کی اس دلدل سے باہر نکل آئیں۔

مگر میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ مجھے متوجہ نہ کریں۔ کسی اور وقت یہ فریضہ انجام دیں' ضرور دیں۔ میرا آپ پر یہ حق ہے اور آپ کو یاد ہی ہوگا کہ ہمارے اور آپ کے رسول ﷺ نے مجھے اور آپ کو ایک دوسرے کا

آئینہ بتایا ہے ــــ آپ میرے دامن کے دھبوں کو صاف کرنے کی فکر کریں اور میں آپ کے دامن کے دھبوں کو دور کرنے کی کوشش کروں۔ آیئے اپنے آقا کے الفاظ دہرا کر اپنے رب سے عمل کی توفیق چاہ کر ہم ایک دوسرے سے جدا ہوں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

وان احدکم مراۃ اخیه فان رای به اذی فلیمطه ۔(ترمذی)

''اور بلاشبہ تم میں سے ہر ایک اپنے بھائی کا آئینہ ہے۔ پس اگر وہ کوئی عیب دیکھے تو اسے دور کردے۔''



# ہر حال میں خیر ہی خیر صرف مؤمن کا حصہ

بیماری، دکھ، مصیبت، نقصان، پریشانی میں سب ہی مبتلا ہوتے ہیں، کوئی ایک شخص بھی اس زمین کے سینے پر ایسا نہیں ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ میں مصائب و آلام سے یقینی طور پر محفوظ ہوں، گردش ایام کا وار سب پر ہوتا ہے۔ آج اگر آپ کا کاروبار ٹھپ ہو گیا ہے تو کل کسی اور کا نمبر ہے۔ آج اگر آپ کو زخم لگا ہے، تو آپ کیوں بھول رہے ہیں کل کوئی اور زخم کھا چکا ہے اور آنے والا کل نہ معلوم کس کے لیے کیا لانے والا ہے۔ مصائب و آلام، پریشانیاں اور الجھنیں سبھی کو پیش آتی ہیں۔ غریب کو بھی اور امیر کو بھی، بادشاہ وقت کو بھی اور ایک فقیر کو بھی، مؤمن اور صالح کو بھی، اللہ کے منکر اور فاسق کو بھی۔ گردش لیل ونہار کی چکی میں آج ایک پس رہا ہے تو کل کسی اور کی باری ہے۔

وَ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ج (آل عمران ۳: ۱۴۰)

''یہ زمانے کے نشیب وفراز ہیں، جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔''

آپ کا شدید مالی نقصان ہو گیا ہے۔ اس کے معاشی ذرائع مسدود ہو گئے ہیں۔ وہ بستر مرگ پر لیٹا صحت کے لیے ترس رہا ہے۔ یہ بیوی بچوں کے مسائل سے پریشان ہے۔ وہ ایک ناگہانی مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اس پر ایک عجیب ہی آفت ٹوٹ پڑتی ہے۔ انہی مناظر کا نام دنیوی زندگی ہے۔ پھر یہ آفتیں اور مصیبتیں اللہ کے باغیوں پر بھی آتی ہیں اور اللہ کے پرستاروں پر بھی اور قدرتی بات ہے کہ آفات و آلام سے سب ہی متاثر ہوتے ہیں، خدا پرست بھی متاثر ہوتے ہیں اور خدا بیزار بھی، دکھ کا احساس سب کو ہوتا ہے۔ درد کی ٹیسیں سب کے سینے میں اٹھتی ہیں، تکلیف میں آہ سب کی زبان سے نکلتی ہے۔

آپ آنے والی مصیبت سے پریشان ہیں، مسکراتا چہرہ مغموم ہے، دل غمزدہ ہے، طبیعت بجھی ہوئی ہے اور آپ کے شب و روز نشاط و ولولہ کی رونق سے خالی ہیں، یہ ایک فطری بات ہے، آپ کو ہرگز ملامت نہیں کی جا سکتی۔ آپ کو ملامت کرنے والا انسانی فطرت سے ناواقف ہے، چوٹ لگے اور تکلیف نہ ہو، زخم پہنچے اور دکھ نہ ہو، خوف ہو اور دل نہ لرزے، کیسے ممکن ہے؟

البتہ دو باتیں ضرور پیش نظر رکھیے۔ بلکہ ان کو جذب کیجیے۔ آپ دل میں سکون کی ٹھنڈک محسوس کریں گے۔ غم غلط

ہوگا اور آپ کو اپنی مصیبت ہلکی معلوم ہونے لگے گی۔ پہلی بات تو یہ کہ مصیبت تکلیف‘ الجھن‘ پریشانی وقتی اور ہنگامی چیزیں ہیں۔ ان کی مدت بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ آپ ہی سوچیے اگر آج آپ پر کوئی مصیبت آئی ہے تو آپ عمر عزیز کے کتنے سال آرام وراحت میں گزار چکے ہیں۔ چند سال کے راحت وعیش کے مقابلے میں چند گھنٹوں اور چند دنوں کی تکلیف ومصیبت کی کیا اہمیت! صبح وشام کی چند گردشوں میں دکھ کے یہ دن بیت جائیں گے اور پھر ذہن پر زور دے کر ہی یاد کریں گے تو یاد آئے گا‘ کہ ہم کبھی اس مصیبت سے بھی دوچار ہوئے تھے اور پھر آپ کو اللہ کے کلام کا یہ فقرہ بھی یاد ہوگا کہ ہر دکھ کے ساتھ راحت ہے اور ہر تنگی کے ساتھ خوشحالی ہے۔ اور اللہ نے بندے کے دل میں یہ حقیقت جمانے کے لیے یہ فقرہ دوبارہ دہرایا ہے:

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ (الانشراح‘ ۹۴:۵-۶)

’’یہ حقیقت ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی ہے‘ بے شک تنگی کے ساتھ فراخی ہے۔‘‘

اور یہ بھی ایک اطمینان بخش حقیقت ہے کہ اللہ نے ہر چیز کی مدت اور مقدار طے کردی ہے۔ کسی کے بس میں نہیں جو اس سے کمی بیشی کرسکے۔ مصیبت تو اپنا وقت پورا کرکے ہی دور ہوگی اور ضرور دور ہوگی۔ کیا اچھی بات کہی ہے جگر مرحوم نے ؎

طولِ غم حیات سے گھبرا نہ اے جگر
ایسی بھی کوئی رات ہے جس کی سحر نہ ہو

دوسری بات جسے آپ خود بھی جانتے ہیں صرف تذکرے کے طور پر آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ اللہ نے آپ کو ایمان کی دولت سے نوازا ہے‘ آپ مؤمن ہیں اور آپ کو اپنے مؤمن ہونے کا شعور بھی ہے‘ مؤمن کو ایک ایسی چیز حاصل ہے جو صرف مؤمن ہی کا حصہ ہے۔ مؤمن کے سوا یہ بات کسی اور کو حاصل نہیں۔ مؤمن کے لیے ہر معاملہ میں خیر ہی خیر ہے‘ خواہ وہ دکھ ہو یا راحت‘ مؤمن ہر حال میں خیر ہی سمیٹتا ہے۔ اپنے رسول اللہ ﷺ کے مبارک الفاظ میں اس حقیقت کو دیکھئے اور مسرت وشادمانی سے جھوم جائیے۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عجبا لامر المؤمن ان امره كله له خير و ليس ذالك الا للمؤمن ان اصابته ضراء صبر فكان خيراً له وان اصابته سراء شكر فكان خيرا له۔

(صحیح مسلم‘ کتاب الزہد‘ باب ۱۲‘ حدیث ۶۴‘ ص ۱۱۹۶)

مؤمن کا معاملہ عجیب وغریب ہے۔ اس کا ہر معاملہ اس کے لیے خیر ہی ہے اور یہ سعادت صرف مؤمن ہی کو حاصل ہے۔ اگر اسے کوئی دکھ پہنچتا ہے اور وہ صبر کرتا ہے تو یہ اس کے لیے خیر ہے اور اگر اسے کوئی

خوشی پہنچتی ہے اور وہ شکر کے جذبات سے سرشار ہوتا ہے تو یہ اس کے لیے خیر ہے۔''

اللہ اکبر! ایمان کی بدولت کتنی بڑی سعادت حاصل ہے اور یہ سعادت صرف آپ ہی کو حاصل ہے' مؤمن کے سوا کسی کو یہ سعادت نصیب نہیں ہو سکتی۔

اللہ کی حکمت اور مصلحت کے تحت اگر آپ کسی دکھ اور تنگی میں مبتلا ہو گئے ہیں تو صبر ہی آپ کا شیوہ ہونا چاہیے۔ مؤمن جزع فزع اور ہائے واویلا نہیں کرتا۔ وہ مصائب کے ہجوم میں بھی صبر وضبط اور تحمل ووقار کا ثبوت دیتا ہے اور مستقل مزاجی کے ساتھ ہر دکھ اور آفت کا مقابلہ کرتا ہے۔ یہ یقین اس کے پائے استقلال کو قوت پہنچاتا رہتا ہے کہ ہر حال میں خیر ہی خیر اسی کا حصہ ہے — یہ جو کچھ بپتا اس پر آ پڑی ہے اس کے مولیٰ کے اشارے سے ہی آئی ہے۔ وہی اس کو دور کرے گا اور جو وقت اس کے لیے اس کے مولیٰ نے مقرر کر دیا ہے وہ وقت پورا کر کے ہی یہ دور ہو گی۔



# وہ ایک خوبی جو صرف مؤمن کو حاصل ہے

اللہ نے اپنے کسی بندے کو بھی خوبیوں سے محروم نہیں رکھا ہے۔ آپ غور کریں گے تو ہر شخص میں کوئی خوبی ضرور پائیں گے' مگر ایک خوبی ایسی ہے جو صرف اللہ پر ایمان لانے ہی سے پیدا ہوتی ہے' مؤمن کے سوا کسی کو یہ خوبی نصیب نہیں۔ آپ غور کیجیے کہ کس حد تک آپ اس خوبی سے بہرہ ور ہیں۔ کمی ہو تو بڑھانے کی کوشش کیجیے' نہ ہو تو فکر مند ہو کر پیدا کرنے کی کوشش کیجیے اور موجود ہو تو اللہ کا شکر بجا لایئے کہ آپ کو ایمان کی وہ خوبی حاصل ہے جو صرف مؤمن ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

قرآن و حدیث نے مؤمن کا تعارف یہ ہرگز نہیں کرایا ہے کہ اس سے خطا نہیں ہوتی' وہ انتقامی جذبات کا شکار نہیں ہوتا' اسے غصہ نہیں آتا' وہ جذبات کی رو میں بہنے سے محفوظ رہتا ہے اور کبھی کسی گناہ میں مبتلا نہیں ہوتا۔ جی نہیں' اس دنیا میں ہر انسان سے غلطی ہوتی ہے۔ پیغمبروں کی تو بات الگ ہے۔ ان کو تو اللہ اپنی نگرانی میں رکھتا ہے اور وہ معصوم ہوتے ہیں۔ بات عام مؤمنوں کی ہو رہی ہے۔ مؤمنوں کا تعارف قرآن و حدیث میں کرایا گیا ہے' وہ یہی ہے کہ ان سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ وہ گناہوں میں بھی مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر غلط کام بھی کرتے ہیں وہ دوسروں کے ساتھ زیادتی بھی کر جاتے ہیں اور اپنی جانوں پر بھی ظلم کر بیٹھتے ہیں —— لیکن ان کے اندر خوبی ایسی ہوتی ہے جو مؤمن کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہوتی' بلکہ حاصل ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ خوبی ایمان کی بدولت ہی ان میں پیدا ہوتی ہے اور ایمان سے محروم انسان اس کی لذت سے قطعی ناآشنا ہوتا ہے۔ ہم اپنی بات سمجھانے کے لیے آپ کو قرآن پاک کی چار آیتوں پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان آیات سے مؤمن کا صحیح تعارف بھی سامنے آئے گا اور اس خوبی کی حقیقت بھی معلوم ہو گی جو صرف مؤمن ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا

لِذُنُوْبِهِمْ وَ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ○ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ○ (آل عمران ۳: ۱۳۳-۱۳۶)

''رواں دواں چلتے رہو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت آسمانوں اور زمین جیسی ہے اور وہ تیار کی گئی ہے ان متقی بندوں کے لیے جو ہر حال میں اپنے اموال خرچ کرتے ہیں' خواہ تنگ دست ہوں یا خوش حال۔ جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں' اللہ کو یہ محسن بندے بہت پسند ہیں اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو اسی لمحے انہیں اپنے اللہ کا خیال آ جاتا ہے اور وہ اس سے اپنے قصوروں کی معافی مانگنے لگتے ہیں' کیونکہ اللہ کے سوا اور ہے کون جو گناہ معاف کر سکتا ہو اور وہ دیدہ دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے' ایسے لوگوں کا صلہ ان کے رب کے ہاں یہ ہے کہ وہ ان کی بخشش فرمائے گا اور ایسے باغوں میں ان کو داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیا ہی خوب صلہ ہے' نیک عمل کرنے والوں کے لیے۔''

پہلی آیت میں کہا گیا' جنت تیار کی گئی ہے متقین کے لیے۔ پھر الذین سے ان کی تین خوبیاں بیان کی گئی ہیں (۱) ہر حال میں وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں (۲) غصہ پی جاتے ہیں (۳) قصور معاف کر دیتے ہیں۔ پھر ان کو محسن کے لقب سے نواز کر ان کو اللہ کا محبوب بتایا گیا ہے۔ اس کے بعد پھر الـذین سے ایک چوتھی خوبی بیان کی گئی ہے—اور یہی وہ خوبی ہے جس کی طرف ہم توجہ دلانا چاہتے ہیں' ارشاد ہے' ان متقی اور محسن بندوں سے جب کوئی فحش کام سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ میں مبتلا ہو کر یہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً انہیں اپنے رب کی یاد آ جاتی ہے۔ یکایک ان کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ اپنے رب سے اپنے قصوروں کی معافی مانگنے لگ جاتے ہیں۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ گناہوں کی بخشش کا ایک ہی دروازہ ہے—وہ ڈھیٹ نہیں ہوتے کہ دیدہ دانستہ اپنے قصوروں پر جمے رہیں اور اپنی خطاؤں پر تاویل کے پردے ڈال کر اپنے دل سیاہ کرتے رہیں۔

تقویٰ اور احسان ایمان کے دو اعلیٰ ترین درجات ہیں۔ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی اللہ کی نافرمانی کے تصور سے کانپ جائے اور احسان یہ ہے کہ آدمی کے دل میں اللہ کی وفاداری اور محبت اس طرح رچ بس جائے کہ وہ اپنا سب کچھ اللہ کی مرضی پر لٹا کر بھی یہ محسوس کرتا رہے کہ ''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔'' مگر ان متقی اور محسن بندوں کا تعارف بھی قرآن پاک نے یہ نہیں کرایا کہ وہ فرشتہ ہوتے ہیں اور کبھی کوئی گناہ نہیں کرتے بلکہ ان کا صحیح تعارف یہ

ہے کہ نفس کی تحریک پر یہ بھی قصور کر بیٹھتے ہیں' ان سے بھی گناہ سرزد ہو جاتے ہیں اور یہ اپنے رب سے اپنے قصوروں کی معافی مانگتے مانگتے اور گریہ وزاری کرتے کرتے گناہ کی سیاہی کو اس طرح دھو ڈالتے ہیں' کہ ان کے دل کی جلا کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔

مؤمن کی اسی خوبی کو قرآن نے ایک دوسرے مقام پر اس طرح بیان کیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ○ (الاعراف ۷:۲۰۱)

''حقیقت میں جو لوگ متقی ہوتے ہیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کی وسوسہ اندازی سے ان کو برائی کا خیال چھو بھی جاتا ہے تو فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں کہ ان کے لیے کونسا طرزِ عمل صحیح ہے۔''

مؤمن کے دل میں برا خیال بھی آ سکتا ہے اور جذبات کی رو میں بہ کر وہ غلط طرزِ عمل بھی اختیار کر سکتا ہے لیکن ایمان کی بدولت اسے فوراً تنبیہ ہو جاتی ہے۔ اسے اپنا رب یاد آ جاتا ہے' اس کی پیشانی سے شرمندگی کے قطرے ٹپکنے لگتے ہیں اور وہ اسی دم اس غلطی سے باز آ جاتا ہے' وہ نہ تو اپنے قصور پر اڑا رہتا ہے اور نہ تاویلوں سے اسے صحیح ثابت کرنے کی باغیانہ کوشش کرتا ہے بلکہ وہ توبہ واستغفار اور گریہ وزاری سے اپنے گناہ کی سیاہی دھونے میں لگ جاتا ہے۔

اگر آپ سے کوئی قصور ہو گیا ہے' کسی دوسرے پر زیادتی کی ہے یا اپنے نفس پر ہی ظلم کر بیٹھے ہیں تو ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ آپ ایمان سے محروم ہیں۔ گناہ میں مبتلا ہونا ایمان کے منافی نہیں۔ البتہ یہ ایمان کے منافی ہے کہ گناہ ہو جائے اور آدمی کو اپنا رب یاد نہ آئے۔ اس کی آنکھ نہ کھلے' اسے تنبیہ نہ ہو' وہ اپنے گناہ پر اصرار کرے اور خود کو جذبات کے حوالے کر کے گناہ کی دلدل ہی میں پڑا رہے۔ غلطی کے بعد اگر آپ چوکنے ہو جاتے ہیں' آپ کو صاف نظر آنے لگتا ہے کہ آپ کے لیے صحیح طرزِ عمل کیا ہے' توبہ واستغفار کی توفیق ہو جاتی ہے تو سمجھئے آپ ایمان کی دولت سے مالا مال ہیں۔ آپ انہی مؤمنوں' متقیوں اور محسنوں کی راہ پر ہیں جن کا اللہ نے تعارف کرایا ہے۔ اللہ کی ذات سے مایوس ہونا ہرگز مؤمن کی شان نہیں ـــــ بار بار پھسل کر جو سنبھلتا ہے' بار بار گر کر جو اٹھتا ہے' اس کا شمار اللہ کے انہی بندوں میں ہے جن کو اللہ نے اپنا محبوب کہا ہے۔ یاد رکھیے آپ کا رب بے پایاں بخشش کرنے والا اور بے انتہا مہربان ہے۔ اس کا خطاب آپ ہی سے ہے۔ سنئے اور گوش و ہوش سے سنئے:

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ○ (الزمر ۳۹:۵۳)

''اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے' اللہ کی رحمت سے ہرگز مایوس نہ ہونا'

بلاشبہ وہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے' وہ تو غفور ورحیم ہے۔''

مگر ان کا تصریحات کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ اپنے نفس کو ڈھیل دینے لگیں۔ غلط طرزِ عمل اختیار کرتے ہوئے ان آیات کا سہارا لینے لگیں اور اپنی کوتاہیوں پر اطمینان کی سانس لینے کی عادت ڈالنے لگیں' جی نہیں' مؤمن کبھی اس طرح نہیں سوچتا۔ دراصل ان تصریحات کی حکمت یہ ہے کہ بندہ زندگی کے کسی مرحلے میں بھی مایوس نہ ہو' کبھی کسی گناہ میں مبتلا ہو جائے تو ہاتھ پیر نہ چھوڑ بیٹھے۔ گناہوں کی دلدل سے نکلنے کے لیے یہ یقین ضروری ہے کہ ان گنت بار بھٹکنے اور بڑے سے بڑے گناہ میں مبتلا ہونے کے بعد بھی بندہ جب اللہ کی طرف پلٹتا ہے' تو وہ آغوشِ رحمت کو اپنے لیے کھلا پاتا ہے۔

سوچنے کا پہلو یہ ہے کہ گناہ کے بعد کی جس کیفیت کو قرآن پاک نے مؤمن کی خوبی بتایا ہے وہ خوبی کس حد تک آپ کو حاصل ہے — حاصل ہے تو اس کی حفاظت کیجیے' کمی ہے تو اسے بڑھانے کی فکر کیجیے اور نہیں ہے تو اسے پیدا کرنے کے لیے اپنے ایمان کا جائزہ لیجیے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ ایک دن حضرت عیینہ بن حصن رضی اللہ عنہ' فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ذرا تلخ لہجے میں کہا ''او خطاب کے بیٹے! تم ہمیں نہ خاطر خواہ کثیر مال و دولت دیتے ہو اور نہ ہمارے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلے کرتے ہو۔'' یہ سنتے ہی فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا غصہ بھڑک اٹھا اور اندیشہ ہو گیا تھا کہ وہ عیینہ رضی اللہ عنہ پر جھپٹ ہی پڑیں گے۔ یہ دیکھ کر حصن رضی اللہ عنہ کے بھتیجے حر رضی اللہ عنہ نے کہا ''امیر المؤمنین! اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ○ (الاعراف ۷:۱۹۹)

''معافی اور درگزر کا رویہ اختیار کرو۔ اچھائی کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ آیت سنتے ہی یکایک رک گئے' انہوں نے پھر بال برابر زیادتی نہ کی۔ بے شک حضرت عمر رضی اللہ عنہ اللہ کی کتاب کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والے تھے۔ (بخاری)

قرآن نے جن مؤمنوں کا تعارف کرایا ہے' انہی میں ایک اعلیٰ کردار یہ ہے جس کی ایک جھلک حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے آپ کے سامنے پیش کی اور دورِ سعادت کے ان مؤمنوں کی سیرت پڑھیے تو آپ کو ایسے ہی کردار نظر آئیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہو۔



# اپنے ضمیر سے جواب لیجیے

حیرت ہے' آپ کو اپنی عظمت و رفعت کا احساس کیوں نہیں ہے۔ بالکل غلط ہے کہ آپ کی عظمت و رفعت تاریخ کے گمشدہ اوراق ہیں یا دورِ ماضی کی بھولی بسری داستان ہے۔ آپ کو کونین کی دولت حاصل ہے۔ وہ دولت جس کے مقابلے میں ہر دولت ہیچ ہے۔ جی نہیں' بلکہ اس دولت سے دنیا کی کسی بڑی سے بڑی متاع کا مقابلہ بھی اس کی توہین اور فکر و دانش کے ساتھ ظلم ہے۔ آپ کیوں بھول رہے ہیں کہ آپ کو عشق رسول ﷺ کی عظیم دولت حاصل ہے۔ آپ کے دل میں محبت رسول ﷺ کی شمع فروزاں ہے۔ عشق رسول ﷺ ایمان کی علامت ہی نہیں اصل ایمان ہے' ایمان کائنات کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ دونوں جہان کی نعمت اور آپ کا سینہ اس سرمایہ کا مخزن ہے جسے اللہ کے رسول ﷺ نے ایمان کہا ہے۔

ایمان کا اصل سرچشمہ اللہ کی ذات ہے اور اس وقت روئے زمین پر اللہ کی معرفت اور اس پر ایمان کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے حضرت محمد ﷺ کی ذات اقدس' آپ ﷺ سے تعلق دراصل اللہ سے تعلق ہے اور آپ ﷺ کے تعلق سے محرومی دراصل اللہ کے تعلق سے محرومی ہے۔ اللہ کا بننے کے لیے ناگزیر ہے کہ آپ محمد ﷺ کے بن جائیں۔ اللہ پر ایمان کا ایک ہی راستہ ہے کہ آپ محمد ﷺ پر ایمان لائیں اور ایمان کی تکمیل اسی وقت ہوگی جب عشق رسول ﷺ سے آپ کا سینہ سرشار ہو اور آپ کے دل میں رسول ﷺ کی محبت ہر چیز سے زیادہ اور ہر چیز پر غالب ہو۔ خود رسول پاک ﷺ کا ارشاد ہے:

''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے باپ' اس کے بیٹے اور دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔'' (بخاری' کتاب الایمان' باب ۸' حب الرسول من الایمان ص ۳)

ایک دوسرے موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

''کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے اہل و مال سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔'' (مسلم' کتاب الایمان' حدیث نمبر ۶۹' ص ۶۸۸)

حضرت عبداللہ بن ہشام رضی اللہ عنہ ایک بار کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ہم سب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ آپ ﷺ اپنے ہاتھ میں عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے کہا' یا رسول اللہ! آپ مجھے

ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، مگر اپنی جان سے نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں عمر! قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ تم مؤمن تو اسی وقت ہو گے جب میری محبت تمہارے دل میں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو گی۔ یہ سنتے ہی عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، یا رسول اللہ! اللہ کی قسم! اس لمحے سے آپ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ہاں عمر! اب ہوئے تم مؤمن کامل۔

دراصل ایمان یہی ہے کہ دل میں عشق رسول ﷺ کی آگ فروزاں ہو، جو سینہ اس آگ سے ٹھنڈا ہے اسے اللہ سے کوئی سروکار نہیں اور وہ ایمان سے محروم ہے۔ اللہ کی رضا پانے کی بس یہی ایک سبیل ہے کہ آپ کا دل عشق رسول ﷺ کی تپش سے گرمائے اور رسول اللہ ﷺ کا تعلق آپ کو ہر تعلق سے زیادہ عزیز ہو۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

''مصطفیٰ سے تعلق جوڑو کہ دین سرتاسر یہی ہے کہ اگر تم رسول ﷺ تک نہ پہنچے تو پھر جو کچھ ہے، وہ دین نہیں بولہبی اور گمراہی ہے۔''

آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ کو عشق رسول ﷺ کی دولت حاصل ہے اور آپ کو اپنی اس سعادت پر فخر بھی ہے۔ بے شک یہ بہت بڑی دولت ہے، بہت بڑی سعادت ہے اور اس پر فخر بالکل بجا ہے۔ لیکن میرا احساس یہ ہے کہ آپ کو اس کی عظمت و رفعت کا صحیح شعور نہیں ہے۔ آپ کو وہ کچھ حاصل ہے جو اس روئے زمین پر کسی کو حاصل نہیں ہے۔ آپ کے پاس وہ سرمایہ ہے جو کسی کو میسر نہیں، پھر آپ آخر مایوسی، احساس کمتری، مسکنت اور حقارت کا شکار کیوں ہیں؟ اگر آپ کا یہ احساس بیدار ہو کہ آپ کو بیش بہا نعمت حاصل ہے تو کبھی آپ مایوسی کا شکار نہ ہوں۔ کبھی آپ یہ نہ سوچیں کہ آج کی زندگی میں آپ کے لیے کچھ نہیں ہے اور آپ خالی ہاتھ ہیں۔ اس دولت و عظمت کا احساس جس حد تک بیدار ہوتا جائے گا۔ آپ کی زندگی میں اس کے اثرات نمایاں ہوتے جائیں گے۔ یہ احساس آپ کو آپ کے مقام یاد دلائے گا اور آپ کو بے چین رکھے گا کہ جو دعویٰ آپ نے کیا ہے اس کا ثبوت دیجیے۔ جس دولت پر آپ کو فخر ہے اور جسے آپ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں، اپنی زندگی سے اس کی قدر و قیمت کا اظہار کیجیے —— یہ احساس جوں جوں جاندار ہوتا جائے گا، آپ کے دعوے اور عملی زندگی کے درمیان فاصلہ کم ہوتا جائے گا اور پھر سماج میں آپ کو یہ شرف بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ اسی دولت و عظمت سے آپ پہچانے جائیں، اسی سے سماج میں آپ کا مقام و مرتبہ متعین ہو اور اسی کی نسبت سے لوگ آپ پر رشک کی نگاہیں ڈالیں۔

عشق رسول کا دعویٰ کرنے والے کے لیے اللہ نے ایک لائحہ عمل دیا ہے۔ یہ لائحہ عمل ہے تو چند لفظوں میں مگر ایسا دشوار اور مشکل کہ زندگی بھر اس پر سرگرم عمل رہنے پر بھی حق یہی ہے کہ اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ یہ لائحہ عمل رہتی

زندگی تک کے واسطے ان سب لوگوں کے لیے ایک کسوٹی بھی ہے' جو عشق رسول ﷺ کا دعویٰ کریں۔ اس لائحہ عمل کو ذہن میں تازہ کیجیے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۳۳:۲۱)

''رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے۔''

میں چند سوالات آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ آپ ان کے جوابات اپنے ضمیر سے حاصل کیجیے اور پھر انہی کی روشنی میں سوچیے کہ آپ اپنے دعوے میں کس حد تک صادق ہیں۔ عشق رسول ﷺ کی دولت پر فخر کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہیں اور اس لائحہ عمل پر کس حد تک سرگرم عمل ہیں۔

۱- رسول اللہ ﷺ نے آپ کی خاطر جو لرزہ خیز دکھ اٹھائے' ان کو یاد کر کے کتنی بار آپ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے ہیں؟

۲- رسول ﷺ کو یاد کر کے کتنی بار پیار کے جذبات سے سرشار ہو کر آپ نے بے اختیار دل کی گہرائیوں سے درود و سلام پڑھا ہے؟

۳- رسول ﷺ کے حالات جاننے کے لیے آپ کس حد تک بے چین رہتے ہیں اور سیرت پاک کے مطالعے کا کس حد تک اہتمام کرتے اور کتنا وقت اس پر صرف کرتے ہیں؟

۴- رسول ﷺ کی یاد نے کتنی بار آپ کو تڑپایا اور کتنی بار آپ کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ آپ روضہ اقدس پر حاضری دیں؟

۵- آپ کی ذاتی مصروفیات' آپ کے اخلاق و کردار' آپ کی رفتار و گفتار میں سیرت رسول ﷺ کی کس قدر جھلک ہے؟

۶- آپ کی گھریلو زندگی کس حد تک ان احکام کے مطابق ہے' جو رسول ﷺ سے آپ کو اس سلسلے میں ملے ہیں؟

۷- اگر اللہ نے آپ کو علم و دانش' تحریر اور دولت و ثروت سے نوازا ہے تو آپ کی یہ قوت و صلاحیت اور یہ وسائل و ذرائع کس حد تک دین کی اشاعت و اقامت اور ملت کی فلاح و بہبود میں کام آ رہے ہیں؟

۸- آپ اپنے سماج اور سوسائٹی کو تعلیمات رسول ﷺ کی خیر و برکت سے مالا مال کرنے کے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں؟

۹- اگر آپ نوجوان ہیں تو جوانی کی امنگیں کیا ہیں اور آپ کا گرم خون کس حد تک اس باغ کو سینچنے کے کام آ رہا ہے' جو رسول اللہ ﷺ نے لگایا تھا؟

۱۰- اگر آپ خاتون ہیں تو اپنے دائرہ کار میں دین کی اشاعت اور سنت کا شوق ابھارنے کے لیے آپ کے

پروگرام کیا ہیں؟

۱۱- اللہ نے آپ کو اولاد کی جو بے بہا نعمت دی ہے' ان کو اسلام کے مطابق پروان چڑھانے اور اسلام کا فدا کار بنانے کے لیے کیا کر رہی ہیں؟

۱۲- دنیا کی زندگی میں قدم قدم پر آپ کے سامنے یہ موڑ آتا ہے کہ رسول ﷺ کا منشا کچھ اور ہے اور دنیا کا منشا کچھ اور' ایسے موقع پر آپ کا فیصلہ کیا ہوتا ہے؟

۱۳- کتنی بار اس فکر نے آپ کے سکون کو برباد کر دیا ہے اور آپ بے چین ہو گئے ہیں کہ کل حشر کے میدان میں حضور ﷺ کا سامنا ہو گا ___ میرا قول و عمل ایسا نہ ہو کہ آپ ﷺ مجھ سے خفا ہو کر رخ پھیر لیں؟

۱۴- کتنی بار اس آرزو نے آپ کو مضطرب کیا ہے کہ دوسری زندگی میں آپ کو رسول پاک ﷺ کی معیت اور رفاقت حاصل ہو؟

یہ چند سوالات ہیں۔ تنہائی کی گھڑیوں میں ان کا جواب اپنے ضمیر سے لیجیے اور پھر دوسروں کو مطمئن کرنے کی فکر سے بے نیاز ہو کر خود کو ہی مطمئن کرنے کی فکر میں لگ جایئے۔ دوسروں کو اطمینان دلانے کے غم میں ہرگز وقت ضائع نہ کیجیے۔

آپ کے جذبات کو گرمانے کے لیے میں سیرت کے ضخیم ذخیرے سے ان لوگوں کی زندگیوں کی دو چار جھلکیاں پیش کرتا ہوں' جنہیں عشق رسول ﷺ کے دعوے کا پاس تھا اور جن کا عشق ان کے قلب کو گرماتا اور ان کی روح کو تڑپاتا رہتا تھا۔

○ ___ ایک دن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا' جمعرات کا دن اور جمعرات کا دن کس قدر سخت تھا۔ اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ زار و قطار رونے لگے اور اس قدر روئے کہ زمین کی کنکریاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے پوچھا' جمعرات کا دن کیا؟ فرمایا اسی دن آپ ﷺ کے مرض میں شدت پیدا ہوئی تھی۔

○ ___ ایک بار عمر فاروق رضی اللہ عنہ کاشانہ نبوت میں تشریف لے گئے' دیکھا کہ حضور ﷺ چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور نیچے کوئی بستر نہیں ہے' جسم اطہر پر صرف ایک تہبند ہے۔ پہلو میں کھجور کی چٹائی سے بدھیاں پڑ گئی ہیں۔ گھر میں صرف ایک مٹھی بھر جو ہیں۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ حضور ﷺ نے فرمایا' ''عمر! کیوں رو رہے ہو؟'' عرض کی ''کیسے نہ روؤں' آپ ﷺ کی یہ حالت ہے اور قیصر و کسریٰ ٹھاٹ کر رہے ہیں۔'' ارشاد فرمایا ''عمر! کیا تمہیں یہ پسند نہیں ہے کہ ہمارے لیے آخرت اور ان کے لیے دنیا ہو۔''

○ —— حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد ماجد جب غزوۂ احد کی شرکت کے لیے روانہ ہونے لگے تو اپنے بیٹے سے کہا "میرا خیال ہے مجھے ضرور شہادت نصیب ہوگی اور دیکھو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی عزیز نہیں ہے۔ تم میرا فرض ادا کرنا اور اپنے بھائیوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔"

○ —— حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا' آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنی محبت تھی۔ ارشاد فرمایا "اللہ پاک کی قسم! حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں کو اپنے مال' اپنی جان' اپنی اولاد اور اپنی ماں سے اور جب پیاس سے دم نکل رہا ہو' اس حالت میں ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ محبوب اور عزیز تھے۔"

○ —— ایک صحابی رضی اللہ عنہ بیمار پڑ گئے' رنگ زرد ہو گیا اور نہایت ہی کمزور ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ان کی عیادت کو تشریف لے گئے —— بیماری کا حال پوچھا۔ تو کہنے لگے' یارسول اللہ! کوئی بیماری نہیں ہے' بس ایک غم مجھے گھلا رہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حیران ہوئے۔ پوچھا بھائی! آخر کیا غم ہے؟ صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا "یارسول اللہ! بس ایک ہی غم ہے۔ میں سوچتا ہوں جنت میں آپ کا جو بلند مقام ہوگا' وہاں تو کوئی دوسرا نبی بھی نہ پہنچ سکے گا۔ پھر ہم جیسے عام لوگوں کا گزر وہاں کیسے ہو سکے گا اور جب جنت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار ہی حاصل نہ ہوگا تو میں ایسی جنت میں جا کر کیا کروں گا —— بس یہی ایک غم ہے جس نے مجھے نڈھال کر رکھا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر خوشی کی چمک دوڑ گئی اور فرمایا "جنت میں تم میرے ساتھ رہو گے۔"



# بائیں جانب کا سرمایہ

سفر سے نکلے ہوئے آج دوسرا دن ہے۔ کل کا دن بھی سفر میں گزرا اور کل کی رات بھی' گاڑی مختلف اسٹیشنوں پر رکتی رکاتی برق رفتاری سے چل رہی ہے۔ مختلف مقامات آئے اور گزر گئے۔ کتنے لوگ گاڑی میں چڑھے اور اتر گئے۔ مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی' جوان بھی ہیں' بوڑھے بھی ہیں اور بچے بھی' صاف ستھرا لباس پہنے خوش سلیقہ لوگ بھی ہیں اور میلے کچیلے کپڑے پہنے معمولی لوگ بھی' طرح طرح کے لوگوں سے سابقہ ہے' میں انتہائی ہوشیار' چوکنا اور بیدار بیٹھا ہوں' کبھی اپنے تکیے پر کہنی ٹیک کر ذرا سہارا بھی لے لیتا ہوں' لیکن کیا مجال ذرا غافل ہو جاؤں' ادھر ادھر دیکھ کر خاموشی سے میں کوٹ کی اندر والی جیب کو ٹٹولتا ہوں اور سینے کی داہنی جانب سے اطمینان کر کے پھر سکون سے بیٹھ جاتا ہوں' آس پاس بیٹھے ہوئے افراد باتوں میں مشغول ہیں۔ زمانے کی خرابی کے تذکرے ہیں' مہنگائی اور گرانی کا رونا ہے۔ خاندانی جھگڑوں کا ذکر ہے' کاروباری پریشانیوں کا حال ہے۔ میں بھی کبھی کبھی کسی بات میں حصہ لیتا ہوں۔ بعض اوقات سفر کے کچھ ساتھی میری طرف کچھ زیادہ متوجہ ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن میری سرد مہری کو بھانپ کر وہ کچھ بجھ سے جاتے ہیں اور میں پھر نہایت ہوشیاری' حکمت اور خاموشی سے سینے کے داہنی جانب پر ہاتھ پھیر لیتا ہوں' ہاتھ پھیرتے ہوئے میرے چہرے پر ضرور اطمینان اور سکون کی لہر پھیل جاتی ہوگی۔ اس لیے کہ ہاتھ پھیرتے ہوئے میرے دل کو بڑا مسرت انگیز سکون حاصل ہوتا ہے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد مجھے پھر فکر ہوتی ہے۔ سکون کے آثار کچھ دھیمے ہونے لگتے ہیں اور کسی قدر فکر مندی کے ساتھ میرا ہاتھ پھر کوٹ کی اندر والی جیب پر سینے کی داہنی جانب پہنچ جاتا ہے اور میں اطمینان کی سانس لیتا ہوں۔ یہ حرکت میں بار بار کرتا ہوں۔ مگر ایک جہاں دیدہ تجربہ کار آدمی کی طرح نہایت ہوشیاری اور حکمت کے ساتھ۔ سب طرف نظر ڈال کر کہ کوئی تاڑ نہ سکے۔ رات بھی میں نے بڑی بیداری سے گزاری' نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے مگر میں غافل نہیں سویا۔ کچھ دیر سویا' کچھ دیر اونگھا۔ مگر ہاتھ مستقل طور پر سینے پر رکھا رہا۔ ذرا کچھ کھٹکا ہوتا اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ ممکن ہے میری اس فکر مندی' بیداری اور بے اطمینانی کو ساتھیوں نے بھانپ لیا ہو' مگر مجھے ان سے کیا مطلب' مجھے تو فکر مند' ہوشیار اور چوکنا رہنا ہی چاہیے — سینے کے دائیں جانب والی اندرونی جیب ہی میں تو میرا سب کچھ ہے' سفر کا

سہارا، کاروبار کی بنیاد، عزت کا ذریعہ اگر کسی سنگدل نے اڑا لیا تو —— تصور ہی سے آنکھوں تلے اندھیرا آنے لگتا ہے —— اللہ وہ گھڑی نہ لائے۔ آپ بھی تائید ہی کریں گے کہ مجھے چوکنا، فکرمند اور ہوشیار رہنا ہی چاہیے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی تو یہاں سفر میں کون ساتھ دینے والا ہے اور سفر ہی میں کیا اپنے شہر میں بھی کون پوچھنے والا ہے!

یہی وہ چیز ہے جسے قرآن میں خیر کہا ہے، اپنا فضل کہا ہے اور قیام زندگی سے تعبیر کیا ہے۔ قیام یا قوام ہی تو ہر چیز کا بنیادی جز ہے۔ قوام نہ ہو تو کیا کوئی چیز بن سکتی ہے۔ اس سے لگاؤ بھلا کیوں نہ ہوگا، ایک مقام پر اللہ نے انسان کی اس کمزوری کو اس طرح بیان کیا ہے —— اور یہ انسان ''خیر'' کی محبت میں بڑا سخت ہوتا ہے۔ آپ سمجھے خیر سے کیا مراد ہے۔ خیر سے مراد مال ہے، یعنی انسان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ مال سے شدید محبت کرتا ہے۔

اور کیوں نہ کرے، سارے کام اسی سے ملتے ہیں۔ اگر انسان مال کا پرستار نہ ہو تو مال سے محبت کوئی بری چیز بھی نہیں ہے، اللہ کا انعام ہے اور اللہ نے جو نعمت بھی دی ہے، اس کی حفاظت کرنی چاہیے۔

مجھے اپنے سرمایے کی حفاظت کے لیے فکرمند ہونا ہی چاہیے۔ ہشیار، سمجھدار اور عاقبت اندیش آدمی اپنے سرمایہ کی ہر ممکن حفاظت کرتا ہے —— اور میں نے ادھر ادھر دیکھ کر سینے کی داہنی جانب والی اندر کی جیب پر پھر ہاتھ پھیرا۔ اللہ کا شکر ہے میرا سرمایہ محفوظ ہے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ سرمایہ کو جیب میں موجود پا کر کیسی خوشی اور کیسا سکون حاصل ہوتا ہے —— ممکن ہے آپ کو بھی اس کا تجربہ ہو۔

میں بار بار یہ حرکت کر رہا تھا کہ ایک خیال آیا اور میں ایک دم سنجیدہ ہوگیا، فکر میں ڈوب گیا، میں نے سوچا، سینے کی بائیں جانب بھی تو میرا ایک سرمایہ ہے، اس سرمایہ سے کہیں زیادہ گراں قدر، ہمیشہ رہنے والا اور ہمیشہ کام آنے والا سرمایہ۔ یہ مادی سرمایہ ضائع ہو جائے تو صرف یہی دنیا اندھیری ہو جاتی ہے۔ مگر سینے کی بائیں جانب والا سرمایہ ضائع ہو جائے تو گویا سب کچھ لٹ گیا۔ یہ دنیا بھی اندھیری، قبر کی دنیا بھی اندھیری اور آخرت کی دنیا بھی اندھیری، پھر تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ میں اس عظیم سرمایہ کی قیمت پر سوچتا ہی چلا گیا۔ سوچتے سوچتے میرا دماغ تھک گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ عام انسانوں کے الفاظ و بیان میں یہ تاب و طاقت نہیں ہے کہ وہ اس زبردست سرمایے کی قدر و عظمت بیان کر سکیں —— زبان نبوت ہی کو اللہ نے یہ اعجاز بخشا ہے کہ وہ ہمیں اس بے مثال سرمایے کی قدر و قیمت کا احساس کرا سکے۔

ایک موقع پر رہبر انسانیت ﷺ نے جنت اور جہنم کا منظر پیش کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا اس سے ہم اس انمول سرمائے کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں جو ہمارے سینے میں بائیں جانب دھڑکنے والے دل میں محفوظ ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے روز ایک دنیا پرست، ایمان سے محروم جہنمی شخص کو لایا جائے گا۔ جس نے دنیا کی

زندگی انتہائی خوشحالی اور عیش و عشرت میں گزاری ہوگی۔ پھر اس کو جہنم میں ڈال کر نکال لیا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا' اے فرزند آدم! کیا تو نے کبھی اچھی حالت بھی دیکھی ہے۔ کیا کبھی تجھ پر کبھی عیش و عشرت کا دور بھی گزرا ہے۔ وہ کہے گا: اے میرے رب! تیری قسم میں نے تو کبھی ایک گھڑی کا عیش بھی نہیں دیکھا ہے۔ پھر ایک صاحب ایمان شخص کو لایا جائے گا جس کی دنیاوی زندگی سرتاسر دکھ' مصیبت' پریشانی اور تنگی میں گزری ہوگی ـــــ اس کو جنت کی پر بہار فضا میں پہنچا کر واپس لایا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا ـــــ اے فرزند آدم! کیا تو نے کبھی دکھ دیکھا ہے' کبھی کوئی تنگی اور مصیبت کا دور گزرا ہے؟ وہ کہے گا: اے میرے رب! تیری قسم' میں نے تو کبھی تنگی اور مصیبت نہیں دیکھی ہے۔ میری زندگی میں تو کبھی کوئی دکھ اور پریشانی کا دن نہیں آیا ہے۔''

زبان رسالت ﷺ کی اس ایمان افروز منظر کشی سے ہم اپنی اپنی بساط کے مطابق محسوس کر سکتے ہیں کہ ہمارے سینے میں کتنا عظیم سرمایہ محفوظ ہے۔ وہ سرمایہ جس کی بدولت اللہ کے پسندیدہ بندوں کو وہ ''جنت'' ملنے والی ہے جس کی بے بہا نعمتوں کی ایک جھلک سے پوری زندگی دکھ اٹھانے والا دکھوں کا مارا بندہ بالکل بھول جائے گا کہ اس پر دکھ اور پریشانی کا کوئی دن بھی آیا ہے اور جس جنت سے محرومی اس قدر ہولناک ہو جس کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ اللہ کی پناہ' جہنم کا ایک لمحہ زندگی بھر کے عیش و عشرت کو اس طرح بھلا دے گا کہ آدمی اللہ کے حضور اللہ کی قسم کھا کر کہے گا' پروردگار! میری زندگی میں تو کوئی ایک دن بھی عیش و آرام کا نہیں گزرا ہے' نہ میں نے کبھی ایک دن بھی آرام کا گزارا ہے۔

اللہ اکبر! کتنی بڑی دولت ہے ہمارے سینے میں' کیا نسبت ہے اس دولت میں اور اس دولت میں جو فنا ہونے والی ہے۔ مگر کتنی عبرت ناک ہے یہ غفلت کہ فنا ہونے والی دولت کی حفاظت کے لیے میں کس قدر ہشیار' چوکنا' بیدار اور فکر مند ہوں' لیکن اس دولت کی حفاظت کی کوئی فکر نہیں ـــــ مادی دولت کو لوٹنے والا نظر آتا ہے' اس کی حرکت کو تاڑا جا سکتا ہے' اس کی حرکتوں پر نظر رکھنے والے حکومت کے کارندے بھی گھات میں ہیں۔ لیکن دل کی اس دولت پر ڈاکہ ڈالنے والا نظر نہیں آتا' اس کی چالیں انتہائی باریک اور زمین دوز ہیں۔ اس عیار اور مکار کی سازشیں اکثر پکڑ میں نہیں آتیں' مادی دولت لٹ جائے تو صرف یہ دنیا تباہ ہو جاتی ہے۔ ایمان کی دولت لٹ جائے تو دونوں جہان تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ کیا قیامت ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے میں اس قدر فکر مند نہیں ہوں۔ آپ بھی اپنا جائزہ لیجیے۔ آپ کا کیا حال ہے؟ دوسروں سے بھی سوال کیجیے ہو سکتا ہے کہ سوال و جواب کا یہ سلسلہ ہمارے اندر کچھ بیداری اور فکر مندی پیدا کر سکے۔ اور ہماری زندگی میں اس بے چینی اور اضطراب کی کوئی جھلک نمایاں ہو سکے' جو مطلوب بھی ہے اور محبوب بھی۔

# ایک تمنا جو زندگی کا حاصل ہے

سنجیدگی سے دل کو ٹٹولیے' کیا آپ کے دل میں یہ تمنا بھی ہے کہ آپ کا اللہ آپ سے محبت کرنے لگے اور آپ کو اپنا محبوب بنالے؟ کیسی پاکیزہ ہے یہ تمنا اور کتنا اونچا ہے وہ انسان جس کے دل میں یہ تمنا ہو۔ اللہ کی محبوبیت بندے کی معراج ہے' یہ تمنا زندگی کا حاصل ہے' زندگی کی ساری تمنائیں اس ایک تمنا پر قربان کی جاسکتی ہیں۔ جو اللہ کا محبوب ہوگیا' اب اسے اور کیا چاہیے۔ اس سے بڑا مقام اور بڑی نعمت اور کون سی ہے جس کو حاصل کرنے کی وہ تمنا کرے۔ اس تمنا کے ہوتے ہوئے وہ آخر اور کیا تمنا کرے اور کیوں کرے۔ اللہ جو تمام کائنات کا رب ہے' تمام قوتوں کا سرچشمہ ہے' جس کی چٹکی میں سب کچھ ہے۔ اس اللہ کا محبوب بننے کی تمنا' تصور سے ہی دل کا ریشہ ریشہ روشن و مسرور ہوجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو دل اس تمنا سے خالی ہے وہ دل نہیں ویران کھنڈر ہے۔ وہ اگر دھڑکتا ہے تو افسوس ہے اس کے دھڑکنے پر' دل تو حقیقت میں وہی دل ہے جو اس تمنا سے روشن اور آباد ہے۔

مگر بڑا فرق ہے وہم و خیال میں اور تمنا میں' بات وہم و خیال کی نہیں ہورہی ہے۔ تمنا کی ہورہی ہے' سچی تمنا کی۔

سچی تمنا وہی ہے جو آدمی کو ہر وقت مضطرب اور بے قرار رکھے کہ وہ اسے پورا کرنے کی مسلسل کوشش کرتا رہے۔ اور کسی وقت بھی اپنے اس مقصد سے غافل نہ ہو' وہ تمنا نہیں محض وہم و خیال ہے جو آدمی کی زندگی پر اثر انداز نہ ہو اور آدمی کو اپنے مقصد کے لیے بیتاب نہ رکھے۔ اللہ کا محبوب بننے کی تمنا واقعی آپ کے دل میں موجود ہے تو خود اپنے آپ سے پوچھیے کہ اس تمنا کو پورا کرنے کے لیے آپ کیا کچھ کررہے ہیں۔ جس سے آپ کے دل کو یہ اطمینان حاصل ہو کہ آپ واقعی اللہ کے محبوب ہیں۔

قرآن و سنت کے مطالعے سے میں آپ کے سامنے دو عمل رکھ رہا ہوں' اگر آپ ان دو باتوں میں مخلص ہیں اور واقعی یہ دو کام کرنے میں لگے ہوئے ہیں تو اللہ اور رسول ﷺ کی جانب سے آپ کے لیے بشارت ہے کہ آپ اللہ کے محبوب اور اللہ آپ سے محبت رکھتا ہے۔ ان دو اعمال سے اپنی زندگی کو آراستہ کیجیے:

رسول اللہ ﷺ کی کامل اتباع سے اور اللہ والوں سے' اللہ ہی کے لیے محبت سے۔

قرآن پاک میں اللہ کا صاف صاف اعلان ہے کہ جو بندہ رسول ﷺ کی پیروی کررہا ہے وہ اللہ کا محبوب

ہے۔قرآن کا ارشاد ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران۳:۳۱)

''اے رسول! کہہ دیجیے اگر تم واقعی اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو' اللہ تم سے محبت کرے گا۔''

یعنی اللہ کا محبوب بننے کا ذریعہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی کامل اتباع اور پیروی میں زندگی گزارے۔ آیت کا خطاب مؤمنوں سے ہے اور مؤمن وہی ہے جو اللہ سے شدید محبت رکھے اور یہ ایک قدرتی امر ہے کہ آدمی جس سے محبت کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرے۔ اللہ سے محبت ایمان کی علامت بلکہ شہادت ہے اور اللہ کی محبت کی کسوٹی اتباع رسول ﷺ ہے۔ اتباعِ رسول ﷺ اس حقیقت کی گواہی ہے کہ دل میں اللہ کی محبت موجود ہے۔

پھر جس دل میں اللہ کی محبت ہوگی وہ یقیناً چاہے گا کہ اللہ بھی مجھ سے محبت کرے اور اس کا یقینی ذریعہ بھی یہی ہے کہ رسول ﷺ کی اتباع کی جائے ـــ رسول ﷺ کی پیروی اللہ کی محبت کا تقاضا بھی ہے اور اللہ کا محبّ بننے کا ذریعہ بھی۔

آیئے اب سنت رسول ﷺ سے بھی اس سلسلے میں اطمینان قلب کا سامان کریں۔

حضرت ابو ادریس خولانی رحمہ اللہ کہتے ہیں' ایک بار میں دمشق کی جامع مسجد میں گیا۔ جامع مسجد میں میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے سفید سفید دانت موتی کی طرح چمک رہے ہیں۔ ان کے اردگرد بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ آپس میں کچھ مسائل پر بحث و گفتگو کر رہے ہیں اور جب ان میں باہم رائے کا اختلاف ہوتا ہے اور کچھ طے نہیں ہو پاتا' تو یہ سب ان بزرگ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یہ بزرگ جو کچھ فرما دیتے ہیں' سب اسے قبول کر لیتے ہیں۔ میں نے لوگوں سے دریافت کیا' یہ کون بزرگ ہیں؟ لوگوں نے بتایا' یہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں۔ دوسرے دن میں ظہر کی نماز کے لیے مسجد میں کسی قدر اول وقت پہنچا۔ مگر میں نے دیکھا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ مجھ سے پہلے ہی پہنچ چکے ہیں اور اللہ کے حضور نماز میں مصروف ہیں۔ میں انتظار میں بیٹھا رہا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور کہا' حضرت! اللہ کی قسم میں آپ سے اللہ کے لیے محبت رکھتا ہوں۔ فرمایا' کیا کہا' اللہ کے لیے محبت رکھتے ہو؟ میں نے دوبارہ وہی بات کہی' واللہ! میں اللہ کے لیے آپ سے محبت رکھتا ہوں۔ انہوں نے پھر فرمایا' کیا واقعی اللہ کے لیے مجھ سے محبت رکھتے ہو؟ میں نے عرض کیا: بخدا میں اللہ کے لیے آپ سے محبت رکھتا ہوں۔

اب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے میری چادر پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچا اور فرمایا' تمہارے لیے بشارت ہے۔ میں

نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''میں لازماً ان لوگوں سے محبت رکھتا ہوں جو محض میرے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں' محض میری خاطر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور محض میرے لیے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔

اللہ کا یہ ارشاد ہم تک اللہ کے سچے رسول ﷺ کے ذریعے پہنچا ہے اور ان بزرگ صحابی کے واسطے سے جن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سردارِ دو جہاں ﷺ نے ارشاد فرمایا' معاذ! مجھے تم سے محبت ہے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے دو مرتبہ حضرت ابوادریس خولانی رحمۃ اللہ علیہ سے تصدیق کی کہ کیا واقعی اللہ ہی کے لیے تم مجھ سے محبت کرتے ہو اور جب حضرت خولانی رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ کو گواہ بنا کر دو مرتبہ کہا کہ ہاں میں اللہ ہی کے لیے آپ سے محبت کرتا ہوں تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے انہیں بشارت دی کہ تم اللہ کے محبوب ہو اور اللہ تم سے محبت کرتا ہے۔

اگر آپ کو اپنے پالنہار سے واقعی تعلق ہے اور آپ کے دل میں تمنا ہے کہ آپ کا رب آپ کو چاہنے لگے تو آپ اللہ والوں سے اللہ کی خاطر محبت کیجیے۔ اور بار بار اپنے دل کو ٹٹولیے کہ یہ محبت محض اللہ کے لیے ہے یا نہیں اور جب بار بار آپ کو یہی تصدیق ہو کہ اللہ والوں سے یہ محبت اللہ ہی کے لیے ہے تو آپ مسرور ہو جائیں کہ آپ کے لیے بھی وہی بشارت ہے جو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوادریس خولانی رحمۃ اللہ علیہ کو دی تھی۔

''محبوبیت خدا'' پر پہنچنے کے یہ دو ذریعے' اتباع رسول ﷺ اور اللہ والوں سے اللہ ہی کے لیے محبت' وہ مستند اور یقینی ذریعے ہیں۔ جو خود اللہ اور رسول ﷺ نے قرآن وسنت میں بتائے ہیں۔ یہ کسی انسان کے ذہن کی اپج یا پیداوار فکری نہیں ہے کہ ان کے بارے میں کوئی شک اور تردد ہو۔ ان کے علاوہ سارے ذرائع خواہ کتنے ہی خوش نما نظر آئیں ہرگز توجہ دینے کے قابل نہیں ہیں جنہیں اللہ اور رسول ﷺ کی سند حاصل نہیں ہے۔ اللہ اپنے بندوں کو جو کچھ بتانا چاہتا تھا وہ سب اس نے اپنے رسول برحق کے ذریعے بتا دیا اور رسول نے ٹھیک ٹھیک اس امت کو سب کچھ پہنچا دیا' کر کے دکھایا اور کوئی چیز چھپا کر نہ رکھی۔

اگر آپ کے سینے میں اپنی تمنا پوری کرنے کے لیے واقعی کوئی اضطراب ہے تو کسی طرف بھٹکنے اور بہکنے کی ضرورت نہیں' اطمینان کے ساتھ اللہ اور رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کو اختیار کیجیے۔ اللہ گواہ ہے کہ آپ کی تمنا ضرور پوری ہوگی۔



# مالک ہی کو پکاریے

ایک بزرگ نے اپنے شاگرد سے پوچھا:

''عزیز من! اگر تمہارا ازلی دشمن تمہیں ورغلانے لگے اور گناہ کو لذیذ اور حسین بنا کر تمہارے سامنے پیش کرنے لگے تو تم کیا کرو گے؟''

''میں پوری قوت سے اس دشمن کا مقابلہ کروں گا'' نوجوان شاگرد نے جواب دیا۔

بزرگ استاد نے پھر سوال کیا ''اور اگر وہ تمہیں دوبارہ ورغلانے اور پھانسنے کی کوشش کرے تو کیا کرو گے؟''

تازہ دم شاگرد نے جواب دیا ''میں پھر بھی اس سے مقابلہ کروں گا اور اسے زیر کر کے دم لوں گا''۔

درویش استاد نے جواب دیا ''عزیز من! یہ کشاکش تو بڑی سخت اور طویل ہے جس کا حوصلہ کر رہے ہو۔ نہیں کہا جا سکتا کہ نتیجہ کیا رہے۔''

پھر تجربہ کار استاد نے ذرا رخ بدل کر ایک اور سوال کیا ''اچھا یہ بتاؤ اگر بکریوں کے کسی ریوڑ کے پاس سے تمہارا گزر ہو اور بکریوں کا رکھوالا کتا تمہارے اوپر بھونکنے لگے اور تمہارا راستہ روکنے لگے تو تم کیا کرو گے؟''

''میں جرأت کے ساتھ کتے کو مار دوں گا اور اسے اپنے سے ہٹانے میں پوری قوت لگا دوں گا'' حوصلہ مند شاگرد نے جواب دیا۔ یہ سن کر بزرگ استاد نے ذرا لفظوں کو کھینچ کھینچ کر کہا —— ''مگر بھائی یہ مقابلہ ہے بڑا سخت اور مشقت انگیز۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس سنگین آزمائش کا نتیجہ کیا ہو۔

اور پھر شاگرد کو نہایت دل سوزی اور تاثر کے ساتھ سمجھاتے ہوئے کہا ''کتنا اچھا ہو کہ تم کتے سے الجھو ہی نہیں۔ اسے یوں ہی بھونکنے دو۔ اور تم بکریوں کے مالک کو مدد کے لیے پکارو۔ مالک کے متوجہ ہوتے ہی کتا خاموش ہو جائے گا۔ مالک ہی کتے کے شر سے تمہیں بچائے گا۔''

یہ بزرگ کون تھے۔ نام تو ان کا علامہ ابن جوزی کو بھی نہیں معلوم ورنہ وہ ضرور لکھتے۔ نام سے ہمیں مطلب بھی کیا۔ ہمیں تو مطلب ان کی اس نصیحت سے ہے کیسی بصیرت افروز اور حکیمانہ نصیحت ہے —— ''بکریوں کے مالک ہی کو مدد کے لیے پکارو۔ مالک کے متوجہ ہوتے ہی کتا خاموش ہو جائے گا۔ مالک ہی تمہیں کتے کے شر سے بچائے

گا۔'' جس قدر غور کریں گے اس نصیحت کی حکمت اور صداقت پر اطمینان بڑھتا ہی جائے گا۔

شیطان اپنی ذرّیت کے ساتھ ہر ہر میدان میں مؤمن کا راستہ روک رہا ہے۔ ہر موڑ پر وہ حملہ آور ہے اور بھونک رہا ہے۔ اس کے تابڑ توڑ حملے ہر وقت جاری ہیں۔ کوئی ایسا لمحہ نہیں آتا کہ یہ بیدار دشمن اونگھ جائے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا' حضرت! کیا شیطان سوتا بھی ہے؟ حضرت نے فرمایا ''اگر شیطان کو نیند آتی تو ہمیں بڑی راحت ملتی۔'' حیرت ہے کہ یہ ناگ صفت دشمن اس قدر چوکنا ہے۔

اس عیار' بیدار' ذہین اور فتنہ انگیز دشمن کے سنگین حملوں سے بچنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ آپ اس سے اور اس کی ذریت سے زور آزمائی میں اپنا بہترین وقت قوت وصلاحیت ضائع کرنے لگیں ـــــ ایسی کشاکش میں ہر وقت اور ہر مرحلے پر یہ اندیشہ ہے کہ یہ مکار ازلی دشمن آپ پر قابو پالے' آپ کو بے بس کردے اور ذرا آگے نہ بڑھنے دے۔ اس سے بازی لے جانے کی ایک ہی کارگر اور صحیح تدبیر ہے کہ مالک کو مدد کے لیے پکاریں۔ وہ تدبیریں کریں جن سے مالک ہماری جانب متوجہ ہو' وہ ہمیں اپنی پناہ میں لے لے اور اپنے ان بندوں میں شامل فرمالے' جن کے بارے میں خود اس نے شیطان کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان پر تیرا قابو نہیں چلے گا۔

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝ (الاسراء ۱۷: ۶۵-۶۴)

''تو جس جس کو اپنی دعوت سے پھسلا سکتا ہے' پھسلا لے۔ ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا' مال اور اولاد میں ان کے ساتھ ساجھا لگا۔ اور ان کو اپنے وعدوں کے جال میں پھانس۔ اور شیطان کے وعدے ایک دھوکے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ـــــ یقیناً میرے بندوں پر تجھے کوئی اقتدار اور قابو حاصل نہ ہوگا اور توکل کے لیے آپ کا رب کافی ہے۔''

شیطان کے نرغے میں آپ کیا' ہم میں سے ہر ایک ہے اور ہر وقت ہے۔ اس کی حیرت انگیز مکاریوں کو رونا بے سود ہے۔ اس کی بے بس کر دینے والی سازشوں کے تذکرے لاحاصل ہیں۔ اسے لعنت وملامت کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ اس سے الجھنا بے کار ہی نہیں بلکہ اپنے بہترین وقت اور قوت وصلاحیت کا ضیاع ہے۔ اس ازلی دشمن کو شرم ناک شکست دینے اور ذلیل کرنے کی صحیح تدبیر ہے کہ آپ مالک کو اپنی مدد کے لیے پکاریں۔ سب کچھ اسی کی چٹکی میں ہے۔ اس کو آپ نے اپنی طرف متوجہ کر لیا تو شیطان کی پوری ذریت اپنے تمام ہتھکنڈوں کے باوجود آپ کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ مالک کی پناہ میں آنے کے بعد کس کی یہ ہمت ہے کہ آپ کو نظر اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔

شیطان پر آپ کا برسنا بجا ہے۔ وہ یقیناً لعنت بھیجنے ہی کے قابل ہے۔ لیکن صرف لعنت ملامت سے تو آپ اس کی سازشوں سے نہیں بچ سکتے۔ اگر واقعی آپ سنجیدہ ہیں کہ آپ اس سے بازی لے جائیں اور اسے شرمناک شکست دے دیں تو خود اس کی زندگی سے سبق لیجیے۔ اس کی زندگی کا بھی ایک پہلو تو واقعی اس لائق ہے۔ کہ اس سے سبق لینا چاہیے۔ وہ یہ کہ اسے اپنے نصب العین سے سچا پیار ہے۔ وہ اپنے نصب العین سے شب و روز کسی گھڑی میں غافل نہیں ہوتا' وہ ہر وقت چوکنا' تازہ دم اور مسلح رہتا ہے۔ اس کی معاندانہ پالیسی وقتی اور ہنگامی نہیں ہوتی' اس اللہ کے دشمن نے اپنے کو چیلنج کرتے ہوئے کہا تھا:

فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ○ (ص ۸۲:۳۸)

''تیری عزت کی قسم' میں ان سب کو گمراہ کر کے ہی دم لوں گا۔''

یہ اس وقت کی بات ہے جب اللہ نے غضبناک ہو کر اس مردود کو نکال دیا تھا اور اس گھڑی سے برابر یہ اپنے کام میں سرگرم ہے۔ اس کا سازشی ذہن ہر وقت اسی ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہے۔ اسے ایک ہی دھن ہے کہ اپنے نصب العین کو پورا کر کے دکھائے۔ کیا مجال کہ کسی ایک لمحے کے لیے بھی اس کے ذہن میں کسی نیک خیال کی لہر آسکے۔ اسے انسان سے ازلی خار ہے۔ وہ انسان کو اپنی راہ سے ہٹانے اور ذلیل کرنے کی وہ سازشیں کرتا ہے کہ بے اختیار اس کی ذہانت کی داد دینی پڑتی ہے۔ یہ بعض اوقات انسان پر وہاں سے وار کرتا ہے جہاں تک کبھی کبھی انسان کی نگاہ بھی نہیں جاتی' یہ لعین ہمہ وقت اسی دھن میں رہتا ہے' کہ آگے پیچھے دائیں بائیں ہر طرف سے اپنے شکار کو گھیروں اور کسی طرف سے نکلنے نہ دوں۔ حسن بن صالح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں' شیطان آدمی کو پھانسنے کے لیے ننانوے دروازے کھولتا ہے' جس سے ایک برائی کا دروازہ کھولنا اس کا مقصود ہوتا ہے۔ (تلبیس ابلیس' علامہ ابن جوزی)

اس کی اسی سرگرمی' زبردست ذہانت' دھن اور مقصد سے بے پناہ عشق کا یہ کرشمہ ہے کہ اس نے اپنے منصوبے اور پروگرام کو پورا کرنے کے لیے ان انسانوں میں بھی افراد حاصل کر لیے ہیں جو بظاہر شیطان کو اپنا دشمن کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ مگر ان کی سازشیں کسی طرح شیطان سے کم تباہ کن نہیں ہیں۔

ایسے ہوشیار اور دھن کے پکے دشمن کو زیر کرنے اور اس کی تباہ کن سازشوں سے بچنے کے لیے آپ کے پاس ایک ہی صحیح اور کارگر تدبیر ہے کہ آپ مالک حقیقی کو پکاریں' اس کو اپنی طرف متوجہ کریں' اس کی پناہ میں آجائیں اور اس سے ایسا تعلق پیدا کر لیں کہ وہ آپ کو اپنے بندوں میں شمار کرنے لگے۔ پھر یہ دشمن کسی بھی جہت سے آپ پر حملہ کرے اس کا کوئی وار کارگر نہیں ہو سکتا۔ اب یہ آپ کے سوچنے کی بات ہے کہ آپ مالک حقیقی کو پکارنے' اس سے اپنا تعلق جوڑنے اور اس کو اپنے حال پر متوجہ کرنے میں کس قدر اخلاص' یکسوئی' تندہی اور دل بستگی کے ساتھ سرگرم ہیں۔

آپ کو گمراہ کرنا جس دشمن کا نصب العین ہے۔اس کی سرگرمی' انہماک اور دھن کا حال آپ کے سامنے ہے' اسی سے کچھ سبق حاصل کیجیے۔ایسے جاندار دشمن کی ہلاکت خیز یلغار سے بچنے اور اسے بے بس کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ بھی اپنے مالک کی مدد حاصل کرنے کے لیے کچھ ایسی ہی سرگرمی' انہماک اور دھن سے کام لیں' ان شاء اللہ میدان آپ ہی کے ہاتھ رہے گا۔



# سماجی اصلاح کا گر

اختلافات' کشیدگی' نفرت' بیزاری۔ غیبت' الزام تراشی' سخت کلامی اور لڑائی جھگڑے کہاں نہیں ہوتے۔ چند انسان جب ساتھ رہتے بستے ہیں تو ان میں ٹکراؤ ہوتا ہی ہے۔ آپ بھی انسان ہیں۔ انسانوں ہی کے درمیان رہتے ہیں اور ہر طرح کے گھریلو' خاندانی اور معاشرتی تعلقات میں جکڑے ہوئے ہیں۔ کسی سے رشتہ داری کے تعلقات ہیں' کسی سے پڑوس کے روابط ہیں کسی سے کاروبار اور لین دین کے معاملات ہیں۔ انھی تعلقات اور معاملات کا نام سماجی زندگی ہے۔ آپ جس سماج میں رہتے ہیں۔ وہاں کچھ لوگ اگر آپ سے خلوص و محبت اور تعلق کا اظہار کرتے ہیں' تو کچھ لوگ ناخوش اور بیزار بھی ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ کے گھر' خاندان اور سماج کے سارے ہی لوگ آپ سے خوش اور مطمئن رہیں۔ باہمی اختلافات' کشیدگی' کشاکش اور لڑائی جھگڑے ہر خاندان اور ہر سماج میں ہوتے ہیں اور آپ بھی کسی خاندان اور سماج کے فرد ہیں۔

ہر انسان ایک طبعی اور اخلاقی کمزوری میں مبتلا ہے۔ آپ بھی اس کمزوری کا شکار ہیں اور یہی کمزوری سماج کے ان تمام فسادات کی جڑ ہے۔ ہر انسان اپنا حق لینے میں انتہائی حریص اور دوسرے کا حق دینے میں انتہائی بخیل ہے۔ اور یہی بخل اور حرص انسان کی وہ سب سے بڑی کمزوری ہے جس سے سماج میں ہر طرح کی کشاکش' کشیدگی اور لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں۔

انسانی زندگی بہت سے تعلقات میں جکڑی ہوئی ہے۔ آپ کسی کے بھائی ہیں' کسی کے باپ ہیں' کسی کے بیٹے ہیں' کسی کے استاد ہیں' کسی کے شاگرد ہیں' کسی کے چھوٹے اور کسی کے بڑے ہیں اور ان رشتوں اور مرتبوں کے لحاظ سے کچھ حقوق دوسروں کے آپ پر ہیں اور کچھ حقوق آپ کے دوسروں پر ہیں۔ جو حقوق دوسروں کے آپ پر ہیں وہ آپ کے فرائض ہیں اور دوسروں پر آپ کے جو حقوق ہیں' وہ ان کے فرائض ہیں ___ اور انسان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ فرائض کی ادائیگی میں تو کوتاہ اور بخیل ہے' لیکن حقوق کے مطالبے میں نہایت تیز اور حریص ہے۔

یہی حال مالی لین دین اور معاملات کا ہے' کسی سے کچھ آپ لیتے ہیں' کسی کو آپ کچھ دیتے ہیں۔ کسی سے

آپ کچھ خریدتے ہیں اور کسی کے ہاتھ کچھ بیچتے ہیں' کوئی آپ کا مقروض ہے' کسی کے آپ مقروض ہیں۔ کوئی آپ کا ملازم ہے' کسی کے آپ ملازم ہیں۔ کسی سے آپ کا کچھ مطالبہ ہے کسی کا آپ سے کچھ مطالبہ ہے' کوئی آپ کا حاجت مند ہے' کسی سے آپ کی ضرورت وابستہ ہے۔ ان سارے معاملات میں بھی انسان ہر ہر مرحلے پر اسی اخلاقی کمزوری کا شکار رہتا ہے' اپنے لیے ''کچھ زیادہ'' اور دوسرے کے لیے ''کچھ کم'' اسی پر یہ معاملات کی بنیاد رکھتا ہے۔

اپنا حق جتانے' سمجھانے اور وصول کرنے میں آپ نہایت ذہین' باریک بین' چرب زبان ہوتے ہیں' بار بار انصاف کی دہائی دیتے ہیں اور ہر ہر پہلو سے اپنے معاملے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے دلائل فراہم کرنے میں زبردست ذہانت کا ثبوت دیتے ہیں۔ لیکن دوسرے کا حق تسلیم کرنے میں آپ کی ذہنی وفکری قوتیں کچھ مضمحل ہی ہو جاتی ہیں اور آپ ذہین ہوتے ہوئے بھی کچھ غبی سے بن جاتے ہیں۔ پھر آپ کا مقابل بھی پوری قوت سے اسی ذہن وفکر کا مظاہرہ کرتا ہے' وہ بھی اپنا حق سمجھانے' دوسروں کو مطمئن کرنے اور اپنے کو حق بجانب ٹھہرانے میں زبان وبیان کی بہترین قوتیں کام میں لاتا ہے۔ ذہانت وبصیرت کے کمالات دکھاتا ہے۔ دونوں فریق اپنے لیے کچھ زیادہ اور دوسرے کے لیے کچھ کم' حق وصول کرنے میں ''حرص'' اور حق دینے میں ''بخل'' کی کمزوری کا بری طرح شکار ہوتے ہیں — پھر ہر شخص جب اپنے معاملے پر غور کرتا ہے تو اس کی نظر' اس کی فکر' اس کی زبان' اس کے جذبات' اس کے احساسات' اس کا دل' اس کا دماغ' ہر چیز اس کو بحق بجانب ثابت کرنے میں اس کے ساتھ بہترین تعاون کرتے ہیں اور وہ انصاف کا خون کرتے ہوئے بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتا ہے کہ وہ بہترین انصاف کر رہا ہے۔

اللہ کے بندوں کے حقوق کا شعور' خدائے علیم وخبیر اور حاضر وناظر کے سامنے جواب دہی کا یقین اگر موجود ہو مگر زندہ اور شعوری یقین میراث میں ملا ہوا بے جان یقین نہیں تو آدمی اکثر وبیشتر اپنی اس کمزوری پر قابو پاتا رہتا ہے — ایسا تو زندگی کے کسی مرحلے میں نہیں ہوتا کہ آدمی کے اندر سے یہ کمزوری بالکل ناپید ہو جائے اور وہ اطمینان کی سانس لے کہ میں اس کمزوری سے بالکل ہی پاک ہو گیا۔ دنیا آزمائش کی جگہ ہے۔ کمزوریوں پر قابو پانا اور پاتے رہنا زندگی بھر کا کام ہے۔ یہ کام کسی وقت ختم نہیں ہوتا۔ کمزوریاں دب جاتی ہیں' مسلسل تربیت' توجہ اور کوشش سے دبی رہتی ہیں لیکن بار بار سر اٹھاتی ہیں اور بار بار آدمی ان میں مبتلا ہوتا ہے اور اچھا خاصا نیک' دیندار اور اخلاقی حیثیت سے قابل اعتماد شخص بھی معاملات میں کبھی کبھی اس کمزوری سے شکست کھاتا نظر آتا ہے۔ اسے توجہ دلائی جائے تو کبھی کبھی وہ اعتراف بھی کر لیتا ہے اور اپنے آپ کو سنبھال لیتا ہے اور یہی ایک بندے کا اخلاقی کمال ہے۔

لیکن جن لوگوں کے دل اللہ کے حضور حاضری کے یقین سے محروم ہیں یا ان کا یہ یقین بے جان ہو گیا ہے ان کو یہ اخلاقی کمزوری اس قدر سنگ دل' بے رحم' ظالم اور بے حس بنا دیتی ہے' کہ جنگلی درندوں سے بھی ان کی سفا کی اور درندگی بڑھ جاتی ہے۔ سماج میں ایسے کردار آپ ہر طرف دیکھ سکتے ہیں۔

مسٹر زیڈ ایک مل کے مینجر ہیں۔ بڑے ذہین اور تیز آدمی ہیں۔ ان کو اپنے مل مالک سے یہ شکایت ہے کہ وہ ان کی بہترین صلاحیتوں اور جانفشانیوں سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ وہ ان کو صرف دو ہزار ماہانہ تنخواہ دے رہا ہے جب کہ یہ مینجر صاحب ہزاروں روپے ماہانہ مل مالک کو کما کر دے رہے ہیں۔ مینجر صاحب نہایت پابندی سے جم کر پانچ گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں۔ مل سے انہیں دلچسپی تو کیوں ہوتی' البتہ اپنی ڈیوٹی نہایت ذمہ داری سے پوری کرتے ہیں۔ کئی بار انہوں نے مل مالک کو توجہ بھی دلائی۔ مگر اس کا کہنا یہ ہے کہ یہ دو ہزار بھی کچھ زیادہ ہی ہیں۔ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ مینجر صاحب کچھ کم کے لیے تیار ہیں ___ یہ جملہ سن کر مینجر کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگتا ہے اور نفرت وانتقام کی آگ دل میں بھڑکنے لگتی ہے۔

مینجر صاحب کے یہاں کلو ملازم ہے۔ ۱۵ سال سے ان کی خدمت کر رہا ہے۔ چوبیس گھنٹے ان کی خدمت کرتا رہتا ہے۔ رات ہو یا دن اس کو کسی کام سے عذر نہیں۔ پرسوں وہ پریشان حال گھبرایا ہوا آیا۔ مینجر صاحب اپنے دوست احباب کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے اپنے مل مالک کی ظلم وزیادتی' سنگ دلی' بے رحمی اور بخل وزر پرستی کا تذکرہ کر رہے تھے۔ کلو آتے ہی مینجر کے پاؤں پر گر پڑا اور سسک سسک کر رونے لگا۔ مینجر صاحب نے کلو کو اٹھایا' واقعہ پوچھا۔ کلو نے رو رو کر اپنے پندرہ سالہ مالک کو اپنی بپتا سنائی۔ حضور' میری بیوی اسپتال میں ہے۔ اس کا آخری وقت ہے۔ میرے چھوٹے چھوٹے پانچ بچے ہیں۔ حضور' ان پانچ معصوم بچوں پر رحم کھائیے۔ ڈاکٹر کہتا ہے' خون کی دو بوتلیں چڑھیں گی۔ نہیں تو مر جائے گی۔ حضور' مجھے صرف دو بوتلوں کے پیسے چاہئیں' میں ہمیشہ آپ کے بچوں کو دعا دوں گا۔

مینجر صاحب کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔ تیوری چڑھا کر بولے کیا' میرے پاس پیسے برس رہے ہیں۔ اس مہینے کی پوری تنخواہ پیشگی لے چکا ہے اور پھر منہ کھلا ہوا ہے ___ حضور' وہ مر جائے گی' چند منٹ کی مہمان ہے' اللہ آپ کو غیب سے دے گا۔ حضور' میرے معصوموں پر ترس کھائیں۔ حضور' مجھے اور کون دے گا' کلو نے نہایت عاجزی سے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

تو کیا میں نے تیرا ٹھیکہ لے لیا ہے ___ جا اس وقت میرے پاس پیسے نہیں ہیں اور کلو روتا بلکتا' دکھے دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ باہر چلا گیا۔

اب مینجر صاحب نے اپنے یار دوستوں سے کہا' نوکر تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے جیسے ان کے ہر کام کا ٹھیکہ لے رکھا

ہے' پچھلے مہینہ سے اس کی بیوی بیمار ہے' پورے مہینے کی تنخواہ پیشگی لے چکا ہے۔ میں اسے اب تک ۷۰ روپے دے رہا تھا۔ پچھلے مہینہ سے ۷۵ دے رہا ہوں۔ اب بتاؤ اور کیا کروں۔ میں نے ترس کھا کر پورے مہینے کی تنخواہ پیشگی دے دی اور ابھی تو مہینے میں بھی تین دن باقی ہیں کہ اب یہ دکھڑا لے کر آ گیا۔

پاپا' راجہ کی کار سے ایک لڑکا کچل گیا۔ اس کی دونوں ٹانگیں بے کار ہو گئیں۔ مینجر صاحب کے بڑے لڑکے پپو نے آ کر تشویشناک خبر سنائی۔ مینجر صاحب ہڑ بڑا کر کھڑے ہوئے اور زور سے چیخے' کہاں ہے راجہ بیٹا؟

پاپا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ راجہ وہیں کار کے پاس ہے۔ بچہ ایک غریب آدمی کا ہے۔ پانچ سو بھی اسے دے دیئے جائیں تو خوش ہو جائے گا۔ البتہ پولیس کو ہزار دو ہزار دینا پڑیں گے۔ مینجر صاحب نے ذرا اطمینان کی سانس لی اور بولے' تو پھر روپیہ لے جاؤ اور معاملہ رفع دفع کرآؤ اور مینجر صاحب نے اسی وقت ڈھائی ہزار کے نوٹ گن کر پپو کو دے دیئے۔

مل مالک کو سنگدل' بے رحم اور مطلب پرست کہنے والے مینجر صاحب سے کوئی پوچھے آخر آپ کو ان القاب سے کیوں نہ یاد کیا جائے۔ مگر مینجر یہ سب کچھ کرتے ہوئے بھی مطمئن ہے کہ وہ انصاف کے تقاضے پورے کر رہا ہے۔ اپنے سماج پر ناقدانہ نظر ڈالیئے تو آپ کو ایسے کردار ہزاروں نظر آئیں گے۔ دراصل اللہ کے حضور جوابدہی کے یقین سے جب آدمی محروم ہوتا ہے یا یہ یقین مضمحل ہو کر بالکل ہی بے جان ہو جاتا ہے تو آدمی کی یہ اخلاقی کمزوری ایسا ہی بھیانک روپ اختیار کر لیتی ہے اور یہ انسان سماج درندوں کے جنگل سے زیادہ بدتر ہو جاتا ہے۔

بے شک یہ فطری کمزوری ہر انسان میں موجود ہے۔ کوئی انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ اس کمزوری سے محفوظ ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ توحید کا عقیدہ' وحدتِ آدم کا تصور اور آخرت کی جوابدہی کا یقین اس کمزوری پر قابو پانے کی بہترین قوت اور شعور آدمی میں پیدا کر دیتا ہے۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ اس قوت و شعور کو بیدار رکھیں۔ اس سے کام لیتے رہیں اور ایک لمحہ کے لیے بھی اس خیام خیالی میں مبتلا نہ ہوں کہ آپ اپنا حق لینے میں حرص اور دوسرے کا حق دینے میں بخل کی کمزوری سے محفوظ ہیں۔

بے شک عقیدۂ توحید' عقیدۂ آخرت اور وحدت آدم کا تصور اس کمزوری پر قابو پانے کے لیے انتہائی کارگر ہتھیار ہیں۔ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ سارے انسانوں کا خالق ایک ہے' جو میرا رب ہے' مجھ جیسے سارے انسانوں کا رب ہے' اسے اپنے سارے بندوں سے یکساں پیار ہے اور اسی اللہ کے سامنے ایک دن حاضر ہو کر اپنے اعمال کا جواب دینا ہے اور جو یہ شعور بھی رکھتا ہو کہ سارے انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں' سارے انسان دکھ درد کا یکساں احساس رکھتے ہیں اور خوشی و غم کے یکساں جذبات رکھتے ہیں' بلاشبہ وہ اپنی اس کمزوری پر قابو پانے کے لیے بہترین ہتھیاروں سے مسلح ہے۔ مگر صرف مسلح ہونے پر قناعت اور فخر کرنا ہرگز کافی نہیں۔ وہ سپاہی میدان میں کبھی

فتح نہیں پا سکتا جو اپنے بہترین ہتھیاروں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور فخر کرتا ہے۔

میدان میں فتح تو اسی سپاہی کو نصیب ہوتی ہے جو اپنے ہتھیاروں سے کام لیتا ہے' اپنی مردانگی کے جوہر دکھاتا ہے' گر گر کر اٹھنے کی ہمت رکھتا ہے اور یہ حوصلہ رکھتا ہے کہ آخری سانس تک وہ ان ہتھیاروں سے کام لیتا رہے گا۔

جب آپ دیکھیں کہ آپ کے گھر اور خاندان میں کوئی کشاکش ہو رہی ہے۔ آپ کے عزیز اور رشتہ دار آپ سے روٹھ رہے ہیں۔ آپ کے ملازمین کو آپ سے شکایت پیدا ہو رہی ہے تو آپ فوراً چوکنے ہو جائیں اور ان کی کوتاہیوں کو پکڑنے کی بجائے یہ دیکھیں کہ آپ کی فطری کمزوری نے کوئی گل تو نہیں کھلایا ہے—— ہر موقع پر اپنے کو بے قصور سمجھنے اور دوسرے کے قصوروں کو طشت از بام کرنے کی غلطی نہ کریں۔ یہ غلطی ہمیشہ فساد کو بڑھا دیتی ہے۔ جس کمزوری کو دوسروں میں محسوس کر کے آپ کڑھتے اور افسوس کرتے ہیں' کسی بحث اور حجت کے بغیر مان لیجیے کہ وہی کمزوری آپ میں بھی موجود ہے اور اصلاح کی کامیاب تدبیر اور بہترین گر یہ ہے کہ آپ دوسروں پر افسوس کرنے' ان کے ساتھ خیر خواہی جتانے سے پہلے اپنے اوپر افسوس کریں اور اپنے ساتھ خیر خواہی کریں۔ اصلاح کا آغاز ہمیشہ اپنی ذات سے کریں۔ جس پر آپ کو دوسروں کے وجود سے کہیں زیادہ قابو حاصل ہے۔



# قسمت کا شکوہ نہ کیجیے

آپ نے یہ حوصلہ شکن شکوہ کس بنیاد پر کیا ہے کہ آپ کبھی ایک کامیاب انسان نہیں بن سکتے' مجھے تسلیم ہے کہ آپ کی ذہنی اور فکری صلاحیتیں غیر معمولی نہیں ہیں' جسمانی طور پر بھی آپ عام قسم کی صحت کے مالک ہیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ آپ اس وقت کامیاب نہیں ہیں۔ لیکن ان سب باتوں کا لازمی نتیجہ یہ نہ ہوگا کہ آپ کامیاب انسان بن ہی نہیں سکتے۔ قسمت کا شکوہ کرنے سے پہلے قسمت کو آزما کر دیکھیے۔ ناکامی کا رونا رونے سے پہلے کامیابی کے لیے وہ کچھ کر دکھایئے جو آپ کے بس میں ہے۔ منزل کا تصور کر کے ہی اپنے اوپر ہول طاری کر لینا' چلنے سے پہلے شکستہ دل ہو کر بیٹھ رہنا' ایک دو بار کی ناکامی سے مایوس ہو کر اپنی تقدیر کی خرابی کا فیصلہ کر بیٹھنا اور اپنے مستقبل سے مایوس ہو جانا عقل کی کوتاہی بھی ہے' ہمت کی کمزوری بھی ہے اور بے پناہ نوازنے والے اللہ سے بدگمانی بھی۔

بے شک آپ کی بدگمانی بھی آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ سب کچھ اللہ کے قبضے میں ہے۔ کامیاب وہی ہو سکتا ہے جس کو اللہ کامیاب کرے اور وہ ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا جس کی ناکامی کا فیصلہ اللہ فرما دے۔ لیکن اسی کے ساتھ آپ یہ بھی یاد رکھیے کہ یہ فیصلہ بھی اللہ ہی کا ہے: ان لیس للانسان الاماسعی (انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے اس نے سعی کی ہے)۔

اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنی جدوجہد کا پھل پاتا ہے اور یہ بھی کہ جدوجہد کے بغیر وہ کچھ نہیں پا سکتا۔

یہ دنیا جدوجہد کی جگہ ہے۔ یہاں آپ اسی لیے آئے ہیں کہ اپنی جدوجہد سے اپنے مستقبل کو تابناک بنائیں۔ اپنے مستقبل کو بنانا یا بگاڑنا آپ کے اختیار میں ہے۔ جدوجہد کے بغیر آپ کا مستقبل بن جائے' یہ بھی ناممکن ہے۔ اور جدوجہد کا حق ادا کرنے کے بعد آپ ناکام رہیں' یہ بھی اللہ کے عدل وانصاف سے بعید ہے۔ آپ اگر ناکام ہیں تو یقین کیجیے کہ اس میں آپ کی اپنی ہی کوتاہی ہے' آپ محض تمناؤں اور آرزوؤں کی دنیا میں رہتے ہیں اور محض اچھی اور دور از قیاس تمناؤں سے اپنے مستقبل کو روشن کرنے کی طفل تسلیوں کا شکار ہیں' جدوجہد کا معروف راستہ اپنانے کی بجائے آپ کی تن بہ تقدیر طبیعت آپ کو محض آرزوؤں سے خوش رکھنے کی ناکام کوشش

کرتی ہے اور اسی لیے آپ پر اکثر مایوسیوں کے دورے پڑتے ہیں:

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

تاریخ کے اوراق میں آپ کو جو کامیاب انسان نظر آتے ہیں اور جن پر تاریخ فخر کرتی ہے وہ سب کے سب نہ تو غیر معمولی ذہن وفکر کے لوگ تھے' نہ انہوں نے قابل فخر کارنامے انجام دیئے تھے اور نہ بیٹھے بٹھائے وہ سب کچھ انہوں نے پالیا تھا جس پر تاریخ انسانی کو فخر ہے۔ ان باہمت انسانوں میں سے بہت سے وہ بھی تھے جو معمولی طبقوں سے تعلق رکھنے والے تھے اور عام قسم کی زندگی سے اتنے اونچے اٹھ گئے تھے — مگر آج دنیا ان کی عظمت کا اعتراف کرتی ہے۔ ان کی بڑائی کو تسلیم کرتی ہے اور ان کی زندگی سے سبق حاصل کرتی ہے۔ ایسے نام چند نہیں ہیں کہ آپ کو گنائے جائیں۔ حافظے پر زور ڈالیے۔ دس بیس نام تو آپ کو بھی یاد آ جائیں گے۔

کوئی وجہ نہیں کہ آپ زندگی میں کوئی اعلیٰ مقام حاصل نہ کر سکیں اور آئندہ آپ کو ایک کامیاب انسان کی حیثیت سے لوگ یاد نہ کریں۔ گر کی بات یہ ہے کہ زندگی آپ کو جو امید دلائے' یا زندگی سے آپ جو امید رکھیں اسے پورا کرنا خود آپ کا کام ہے۔

---

کامیاب زندگی پر غور کیجیے — کامیابی کا آپ جو بھی تصور رکھتے ہوں۔ یہ بہرحال طے ہے کہ دو ہی چیزیں زندگی کو کامیاب بناتی ہیں — مقصد سے لگن — اور مسلسل جدوجہد — شاندار مستقبل کی ساری رونق انہی دو چیزوں کے دم سے ہے اور تاریخ کی یادگار ہستیوں کی زندگی انہی دو چیزوں سے عبارت ہے۔ یہی دو چیزیں ہیں جن کا حق ادا کر کے یقیناً آپ ایک کامیاب انسان بن سکتے ہیں۔

تاریخ میں ایسے لوگوں کا کارنامہ آپ نہیں دکھا سکتے جو کاہل' کام چور' آرام طلب' سہل انگار اور لاپرواہوں' جن کی زندگی کا مقصد ہی کوئی نہ ہو۔ یا وہ محض مقصد زندگی کا دعویٰ کرتے ہوں' لیکن ان کی زندگیوں سے اس کا کوئی تعلق ہو۔ حالات سے ساز باز کرنے والے دوسروں کے رحم وکرم پر جینے والے اور دوسروں کے دسترخوان سے ریزے چننے والے' یا دوسروں کے لگائے ہوئے باغوں سے پھل کھانے پر غرور کرنے والے نہ کبھی قابل ذکر ہوئے اور نہ ہو سکتے ہیں۔

ان زندگیوں میں آپ کوئی نشاط' ولولہ' ترتیب اور کشش ہرگز نہیں پا سکتے جن کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ یا مقصد کا دعویٰ ہے' مگر سینے مقصد کی لگن اور گرمی سے خالی ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں کا بھی زندگی میں کوئی حصہ نہیں ہے جو جدوجہد کے تصور ہی سے کانپتے ہیں یا صرف جدوجہد کے اچھے منصوبوں سے خود کو بہلاتے رہتے ہیں۔

کامیاب مستقبل صرف ان کا حصہ ہے جو اپنے مقصد کی لگن بھی رکھتے ہیں اور اس کے لیے مسلسل جدو جہد کی ہمت بھی، جو سخت کوشی، جاں فشانی اور سعی پیہم کی ہمت اور لذت محسوس کرتے ہیں۔ تن آسانی اور لاپروائی سے تو زندگی کے عام کام بھی انجام نہیں پاتے، کوئی بڑا کارنامہ بھلا کیا انجام پائے گا۔

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

غافل افغان سے خطاب کرتے ہوئے شاعر مشرق نے کیا پتے کی بات کہی ہے ؎

اونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا
جس کی ہوائیں تند نہیں ہیں وہ کیسا طوفان



# تلاوتِ قرآن مجید

''ایک بار چین اور روم کے دو گروہوں میں باہم مقابلہ ٹھن گیا۔ چینیوں کا دعویٰ تھا کہ ہم نقاشی اور آرٹ کے استاد ہیں۔ اس فن میں ہمارا کوئی ثانی نہیں اور رومیوں کا دعویٰ تھا کہ اس فن میں ہم یکتائے روزگار ہیں۔ ہمارا کوئی مدمقابل نہیں۔ بات بادشاہ وقت تک پہنچی۔ بادشاہ نے دونوں کی بات سنی اور کہا' اچھا میں دونوں کا امتحان لوں گا اور امتحان ہی یہ بتا سکے گا کہ کون اپنے دعویٰ میں سچا ہے اور کس کا دعویٰ محض دعویٰ ہے۔ بادشاہ کی بات دونوں نے منظور کر لی اور دونوں نے اپنی اپنی جگہ یہ ٹھان لی کہ وہ اپنے فن کے مظاہرے میں وہ کمال دکھائے گا کہ مقابل منہ دیکھتا رہ جائے گا۔

ان دونوں نے اپنے فن کے جوہر دکھانے کے لیے دو مکانوں کا انتخاب کیا جو بالکل آمنے سامنے تھے۔ طے ہوا کہ ایک مکان میں رومی اپنے فن کا کمال دکھائیں گے اور ایک مکان میں چینی اپنے نقش و نگار کا مظاہرہ کریں گے۔ اور دونوں اپنے اپنے فن کے جوہر دکھانے اور مکان کو سجانے میں تن دہی سے لگ گئے۔ چینیوں نے نقش و نگار کے کمالات دکھانے کے لیے بادشاہ سے طرح طرح کے رنگ و روغن طلب کئے۔ بادشاہ نے مہیا کر دیئے۔ لیکن رومیوں نے کوئی رنگ وغیرہ طلب نہیں کیا۔ چینیوں نے مختلف رنگوں کی آمیزش سے ایسے دل آویز اور دلفریب نقش و نگار بنائے کہ دیکھنے سے عقل دنگ رہ جائے۔ رومی صرف صیقل ہی کرتے رہے اور شب و روز کی محنت سے دیواروں کو چمکاتے رہے۔ کمالات کے جوہر دکھانے کی مدت پوری ہوگئی اور بادشاہ معائنے کے لیے تشریف لائے۔ بادشاہ پہلے چینیوں کے مکان میں داخل ہوئے اور چینیوں کے بنائے ہوئے دل فریب اور دلکش نقش و نگار دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ پھر وہ رومیوں کے مکان میں داخل ہوئے۔ رومیوں نے جونہی اپنی جھل مل کرتی ہوئی دیواروں پر سے پردہ اٹھایا تو بادشاہ حیران رہ گئے۔ آئینے کی مانند صاف شفاف اور مجلّٰی دیواروں میں ہر طرف چینیوں کے نقش و نگار کا عکس نظر آ رہا تھا اور چمکدار چھتوں اور دیواروں میں یہ عکس اصل سے بھی زیادہ دل فریب منظر پیش کر رہا تھا۔ بادشاہ دیر تک اس منظر کو دیکھتے رہے۔ پھر بادشاہ نے اپنا فیصلہ سنایا اور رومی چینیوں سے بازی لے گئے۔''

یہ دلچسپ کہانی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کی ہے۔ دراصل اس کے ذریعہ وہ یہ حقیقت ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ جو لوگ شب و روز اپنے قلوب کو صاف و شفاف کرنے میں لگے رہتے ہیں اور دل کو بغض' کینہ' حسد' لالچ'

بخل، حرص جیسی کدورتوں سے صاف کر کے آئینے کی طرح چمکا لیتے ہیں، ان کے دلوں میں اللہ کی تجلیات اور جمال کے ایسے ہی دلکش اور دل آویز نقش نظر آنے لگتے ہیں اور ان کی شخصیت اس قدر حسین اور پر کشش ہو جاتی ہے کہ ہر متنفس عقیدت سے ان کی طرف کھنچنے لگتا ہے۔ جو دیکھتا ہے، بے اختیار ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے اور روحانی ترقی اور تزکیے کے میدان میں ایسے ہی لوگ بازی لے جاتے ہیں۔

روحانی ترقی اور تزکیہ قلوب کی بات وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو اس فن کی باریکیوں سے علمی طور پر پوری طرح آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ اس ہنر کے فلسفے اور نکتے خوب جانتے ہیں۔ وہ اس کی باریکیاں بیان کریں گے تو ایسی موشگافیاں کریں گے کہ لوگ حیران رہ جائیں۔ لیکن میدان انہی سادہ لوح بندوں کے ہاتھ رہتا ہے جو عملی طور پر تو ان سے لوہا نہیں منوا سکتے۔ لیکن وہ عملی طور پر شب و روز اپنے تزکیہ میں لگے رہتے ہیں۔ ان کا محبوب مشغلہ صرف یہ ہوتا ہے کہ اپنے دل کو ہر طرح کے زنگ سے صاف کریں۔ طمع، لالچ، حرص، بخل، بغض، کینہ، حسد اور ہر طرح کی کدورت سے دل کو صاف کر کے آئینے کی طرح صاف و شفاف بنائیں، تاکہ اس میں اللہ کی تجلیات اور جمال کا عکس آ سکے اور بازی یہی لوگ لے جاتے ہیں۔

رمضان کا مہینہ خاص طور پر دلوں کی صفائی، روح کی ترقی اور نفس کے تزکیے کا مہینہ ہے۔ یوں تو اس مہینہ کی ساری ہی عبادتیں روزہ، صدقہ، تراویح، تلاوت قرآن اور اعتکاف اسی لیے ہیں کہ دل ہر طرح کی کدورت اور گناہوں کے زنگ سے صاف ہو کر آئینے کی طرح شفاف اور مجلی ہو جائے۔ مگر خاص طور پر قرآن پاک کی تلاوت قلب کی صفائی اور جلا کے لیے مؤثر ترین اور یقینی ذریعہ ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

ان هذه القلوب تصدء كما يصدء الحديد اذا اصابه الماء قيل يارسول الله وما جلاء ها ؟ قال كثيرة ذكر الموت وتلاوة القران۔ (مشکوٰۃ عن ابن عمر رضی اللہ عنہما)

''یہ انسانی قلوب بھی زنگ آلود ہو جاتے ہیں جس طرح لوہے کو پانی سے زنگ لگ جاتا ہے۔ پوچھا گیا، اے اللہ کے رسول! پھر دلوں کے زنگ کو دور کرنے والی اور جلا بخشنے والی چیز کیا ہے؟ ارشاد فرمایا: کثرت سے موت کی یاد اور قرآن پاک کی تلاوت۔''

رمضان میں خاص طور پر مسلمان تلاوت قرآن کا اہتمام کرتے ہیں، شب کی تاریکی میں اللہ کے حضور کھڑے ہو کر تراویح میں قرآن پڑھتے ہیں اور سنتے ہیں۔ مسلمانوں کی ہر بستی میں عام طور پر اس کا اہتمام اور انتظام ہوتا ہے۔ تراویح کے علاوہ بھی اس مبارک مہینے میں قرآن پاک پڑھنے پڑھانے کا اہتمام ہوتا ہے۔ اور اس میں کسی تذبذب اور شک کی کوئی گنجائش قطعاً نہیں ہے کہ مسلمانوں نے اپنے قلوب کو ہر طرح کی اخلاقی کدورت اور گناہوں کے زنگ سے صاف کرنے کا یقینی طور پر صحیح طریقہ اپنا رکھا ہے۔

حیرت اس وقت ہوتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس عمل سے مسلمانوں کو انتہائی شغف بھی ہے، نہایت ذوق وشوق سے اس کا اہتمام اور التزام بھی ہے، لیکن دلوں کی صفائی نہیں ہو رہی ہے، ان کا زنگ دور نہیں ہو رہا ہے۔ قرآن پاک پڑھنے پڑھانے کا اس قدر اہتمام ہے لیکن پھر بھی دلوں میں حرص، لالچ، کینہ، بغض، نفاق اور کدورتیں موجود ہیں۔ خاندانی جھگڑے، ایک دوسرے سے نفرت وعناد، دوسرے کے حقوق سے غفلت، ماں اور باپ کی نافرمانی، اولاد کے حقوق سے لاپروائی، غرض طرح طرح کی کوتاہیوں اور گناہوں کے زنگ سے دل آلودہ ہیں۔ قلب کی صفائی، خوشگوار تعلقات، تزکیہ نفوس کے آداب اور زنگ بیان کرنے والوں کی تو کوئی کمی نہیں۔ لیکن عملی طور پر قلوب بدستور زنگ آلود رہتے ہیں۔ آخر تلاوت قرآن سے قلوب کی جلا اور صفائی کیوں نہیں ہو رہی ہے۔ رسول صادق ﷺ کا ارشاد یقیناً حق ہے، اصل بات یہ ہے کہ تلاوت قرآن کا مفہوم نہیں سمجھا جا رہا ہے اور اسی لیے تلاوت قرآن کا حق ادا نہیں ہو رہا ہے۔ تلاوت قرآن کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ آپ قرآن کے الفاظ کو جوں توں زبان سے ادا کر لیں اور آپ کچھ نہ سمجھیں کہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ اپنی کن ذمہ داریوں کو تازہ کر رہے ہیں اور ان ذمہ داریوں کا کس حد تک آپ کو پاس ولحاظ ہے۔

تلاوت قرآن کا مفہوم ہے قرآن کو صحیح صحیح پڑھنا، اس کی تعلیمات پر غور کرنا، اس کے احکام کو سمجھنا، اس کی تعلیمات اور ہدایات پر عمل کرنا۔ ساتھ ہی قرآن کی تلاوت کا یہ بھی مفہوم ہے کہ اس کی اشاعت کی جائے۔ اس کی تعلیمات دوسروں تک پہنچائی جائیں۔ قرآن وسنت پر آپ غور فرمائیں گے تو اس مفہوم پر آپ کو شرح صدر ہوگا۔

قرآن کا ارشاد ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ ط اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ ط (البقرۃ۲:۱۲۱)

''وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ کتاب کی تلاوت کا واقعی حق ادا کرتے ہیں اور یہی لوگ حقیقت میں اس پر ایمان رکھتے ہیں۔''

اس آیت میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ پہلی بات تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ''جن کو ہم نے کتاب دی۔'' پورے قرآن میں جہاں جہاں اہل کتاب کو کتاب دینے کا ذکر آیا ہے ان سب آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب میں دو گروہ ہیں اور ان دونوں گروہوں کا ذکر اللہ تعالیٰ الگ الگ انداز سے کرتا ہے۔ اہل کتاب کے اس گروہ کا جب ذکر فرماتا ہے جو کتاب کے محافظ رہے اور اس پر عمل کرتے رہے تو اللہ تعالیٰ کتاب دینے کی نسبت اپنی طرف کرتا ہے اور کہتا ہے، اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ ''ہم نے ان کو کتاب دی۔'' اور جب اس نافرمان گروہ کا ذکر کرتا ہے جس نے کتاب کو ضائع کر دیا تو اپنی طرف نسبت نہیں کرتا، بلکہ کہتا ہے، اُوْتُوا الْکِتٰبَ ''وہ لوگ جن کو کتاب دی گئی تھی، (مگر انہوں نے ضائع کر دی)۔'' اس تفصیل کو نگاہ میں رکھ کر اوپر کی آیت پر غور کیجیے تو یہ حقیقت

واضح ہوگی کہ تلاوت کتاب کا حق وہی ادا کرتے ہیں جو واقعی اس کے حامل اور امین ہیں۔ ان لوگوں کی تلاوت کتاب کی کوئی حیثیت نہیں ہے جو اس پر کاربند نہیں ہیں اور جن لوگوں نے اسے ضائع کر دیا ہے۔

دوسری بات آیت میں یہ کہی گئی ہے کہ تلاوت کتاب کا حق ادا کرنے والے ہی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ انتہائی اہم بات ہے اور یہ رک کر سوچنے کا مقام ہے۔ قرآن کا کہنا یہ ہے کہ جو لوگ کتاب کی حفاظت کرتے ہیں' اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں' وہی لوگ اس پر ایمان کے دعوے میں سچے ہیں۔ یہی بات اللہ کے رسول ﷺ نے اس انداز میں بیان فرمائی ہے۔ غور کیجیے' آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

ما امن بالقران من استحل محارمہ۔

''وہ شخص قرآن پر ایمان نہیں رکھتا جس نے اس کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کر رکھا ہے۔''

یعنی قرآن پر ایمان کے دعوے میں وہی شخص سچا ہے جو قرآن کے قانون حلال وحرام کو تسلیم کرتا ہے اور عملی زندگی میں اس پر کاربند رہنے کی مخلصانہ کوشش کرتا ہے۔ اس شخص کے ایمان بالقرآن کا کیا اعتبار جو قرآن کے حلال وحرام سے بے نیاز ہو کر زندگی گزارے۔ ایسا شخص اگر قرآن پاک کی آیتیں دہرا رہا ہے اور رمضان کی مبارک ساعتوں میں اس کے پڑھنے سننے کا اہتمام کر رہا ہے تو اس کا یہ عمل وہ عمل نہیں ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔ وہ یقیناً تلاوت قرآن کا حق ادا نہیں کر رہا ہے۔ اس کی تلاوت وہ تلاوت نہیں ہے جس کا قرآن نے حکم دیا ہے اور جس کی تاکید نبی ﷺ نے امت کو فرمائی ہے۔

قرآن پاک کی ایک اور آیت پر غور کیجیے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آخری نبی کی بعثت کے لیے جو دعا کی تھی اس میں رسول خاتم ﷺ کے چار کاموں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيهِمْ ط (البقرہ۲:۱۲۹)

''اے ہمارے رب! ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک ایسا رسول اٹھا جو انہیں تیری آیات پہنچائے۔ ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیوں کو سنوارے۔''

۱۔ تلاوت آیات' ۲۔ تعلیم کتاب' ۳۔ تعلیم حکمت' ۴۔ تزکیہ

اور ایک بالکل واضح حقیقت ہے کہ یہاں تلاوت آیات سے مراد قرآن کی آیات وتبلیغ اور اس کی تعلیمات کو سنانا اور پہنچانا ہے۔ ایک اور موقع پر نبی اللہ کو ہدایت دی گئی ہے:

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لا (الکہف۱۹:۲۷)

''اور اے رسول! تمہارے رب کی جو کتاب تم پر نازل کی جا رہی ہے اسے ان لوگوں تک پہنچا دو۔''

قرآن و سنت کی ان تشریحات سے تلاوت قرآن کا جو مفہوم واضح ہوتا ہے اس مفہوم میں تلاوت ہی دراصل تلاوت قرآن ہے اور یہ تلاوت قرآن وہی شخص کر سکتا ہے اور اسی کو زیب بھی دیتا ہے جس کی اپنی زندگی قرآنی تعلیمات کا صحیح نمونہ ہو۔ وہ علمی اور فنی لحاظ سے چاہے اس کی باریکیاں اور نکتے نہ بیان کر سکتا ہو' لیکن اپنی زندگی میں اخلاص' یکسوئی اور شغف کے ساتھ قرآن کے احکام پر عمل کر رہا ہو اور جس کو اس یقین کی دولت حاصل ہو کہ قرآن ہی اس کے لیے دنیا اور آخرت کی فلاح و کامرانی کا واحد ذریعہ ہے۔ اس یقین سے محروم اور اس عمل سے بے بہرہ انسان اگر قرآن پڑھ رہا ہے یا سن رہا ہے تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ تلاوت قرآن کا وہ عظیم فائدہ حاصل کر رہا ہے اور اسے تلاوت قرآن کا وہ عظیم فائدہ حاصل ہو سکتا ہے' جس کو نبی ﷺ نے تلاوت قرآن کا لازمی فائدہ بتایا ہے۔

قرآن پاک کی ان آیات کے ساتھ اگر نبی ﷺ کی وہ حدیثیں بھی سامنے رہیں جن میں تلاوت قرآن کی ہدایت کی گئی ہے تو یہ حقیقت اور زیادہ نکھر کر سامنے آ جاتی ہے۔

حضرت عبیدہ ملیکی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اے قرآن کے ماننے والو! قرآن کو تکیہ نہ بنا لینا' شب و روز کی گھڑیوں میں اس کی تلاوت کا حق ادا کرنا' اس کی اشاعت اور اس کے پڑھنے پڑھانے کو رواج دینا۔ اس کے الفاظ کو صحیح صحیح ادا کرنا اور اس پر غور و فکر کرتے رہنا' تاکہ تم کامیاب ہو اور جلد بازی کر کے اس کے ذریعے دنیا کا صلہ مت چاہنا' اللہ کی خوشنودی کے لیے اس کی تلاوت کرنا کہ آخرت میں اس کا صلہ لازمی ہے''۔ (مشکوٰۃ)

قرآن کو تکیہ بنانے سے مراد ہے اس سے غفلت برتنا اور اس کی طرف سے لاپروا ہو جانا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ہدایت فرمائی ''قرآن کی تلاوت کا حق ادا کرنا' اور پھر آگے آپ ﷺ نے حق تلاوت ادا کرنے کی تشریح میں چار باتیں بیان فرمائی ہیں:۔

۱۔ قرآن کی اشاعت اور اس کے پڑھنے پڑھانے کو رواج دینا۔

۲۔ اس کے الفاظ کو صحیح ادا کرنے کا اہتمام کرنا۔

۳۔ قرآن پر غور و فکر اور تدبر کرنا۔

۴۔ اور آخری بات یہ کہ یہ عمل خالص رضائے الٰہی اور اجر آخرت کے لیے کرنا' دنیوی صلے کی طلب سے اپنے دل کو پاک رکھنا۔

ایک بار حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی' یارسول اللہ! مجھے وصیت فرمایئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اللہ کا تقویٰ تمہارے دین و دنیا کے سارے

معاملات سدھارنے اور سنوارنے والی چیز ہے۔'' حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے درخواست کی کہ حضور کچھ اور وصیت فرمائیے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تلاوت قرآن اور اللہ کا ذکر پابندی سے کرتے رہنا۔ اس کے ذریعہ آسمان والوں میں تمہارا ذکر اور چرچا ہوگا اور یہ عمل زندگی کی تاریکیوں میں تمہیں روشنی کا کام دے گا''۔ (مشکوٰۃ)

قرآن وسنت کی نظر میں قرآن سے تعلق رکھنے والے وہ لوگ نہیں ہیں' جو بے سوچے سمجھے اس کے الفاظ دہراتے ہیں اور اس کی ہدایات اور تعلیمات سے غافل و بے نیاز ہو کر کوئی ذمہ داری محسوس کیے بغیر قرآن پڑھنے سننے اور ختم کرنے کرانے ہی کو کارنامہ سمجھتے ہیں۔ دین کی نظر میں قرآن والے وہ لوگ ہیں جو اپنی زندگی میں قرآن پر عمل کرتے ہیں' اس کو اپنی زندگی کا دستور بناتے ہیں اور اس کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

یوتی یوم القیٰمه بالقران واهله الذین کانوا یعملون به فی الدنیا تقدمه سورة البقرة و ال عمران تحاجان عن صاحبها۔ (مسلم' فضائل القرآن' حدیث ۲۵۳' ص ۸۰۴)

''قیامت کے روز قرآن اور قرآن کے ماننے والے' جو دنیا کی زندگی میں اس پر عمل کرتے تھے' اللہ کے حضور لائے جائیں گے۔ اس وقت سورہ البقرہ اور سورہ آل عمران پورے قرآن کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنے عمل کرنے والے کے لیے رب سے سفارش کریں گے کہ پروردگار یہ بندہ تیری رحمت و مغفرت کا مستحق ہے''۔

اس حدیث میں قرآن کو ماننے والے کی تشریح خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لفظوں میں فرمائی وہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ فرمایا: الذین امنوا کانوا یعملون به فی الدنیا (وہ لوگ جو دنیا کی زندگی میں قرآن پر عمل کرتے تھے)۔ یعنی قرآن کو ماننے والے حقیقت میں وہی ہیں جو دنیا کی زندگی میں اس پر عمل کرتے ہیں —— بے شک مسلمان معاشرے میں آج بھی رمضان کی مبارک راتوں میں قرآن پڑھنے پڑھانے اور سننے سنانے کا خاصا رواج ہے اور بعض بستیوں میں تو اس کا بڑا چرچا رہتا ہے' لیکن جب ہم یہ جائزہ لیتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل خیز کا جو فائدہ بتایا ہے وہ بھی حاصل ہو رہا ہے یا نہیں تو مایوسی ہونے لگتی ہے اور یہ خوش گمانی محض فریب نظر آتی ہے کہ مسلمان معاشرے میں تلاوت قرآن کا اہتمام اور رواج ہے۔ مسلمان قرآن پڑھتے پڑھاتے' تو ہیں لیکن وہ تلاوت قرآن کے اس مفہوم اور مقصود سے نا آشنا ہیں جو قرآن و سنت نے بتایا ہے اور ان کی تلاوت وہ تلاوت قرآن نہیں ہے جس کی تاکید اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے:

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

# عید کی مبارکباد کس کے لیے؟

اللہ کی پناہ' ریگستانی سفر کی جان لیوا دشواریاں' دور دور تک تپتی ہوئی ریت' آتشیں کرّے سے نکلنے والی تیز شعاعوں سے دہکتی ہوئی فضا' جسم کو جھلس دینے والی لو کے تیز و تند جھکڑ' حدِ نظر تک نہ کہیں سایہ' نہ پانی اور نہ بھوک مٹانے کا کوئی سامان' ابھی ابھی ان قافلوں نے یہاں پڑاؤ ڈالا ہے۔ ہر ایک بھوک پیاس سے بدحال ہے۔ ہونٹ خشک ہیں۔ حلق میں کانٹے ہیں۔ بدن گرمی کی شدت سے تپ رہا ہے۔ پڑاؤ کی یہ ٹھنڈی ہوا' سایہ' پانی' اللہ کی کتنی بڑی نعمتیں ہیں۔ قافلہ کا ہر فرد نہ صرف اپنی بھوک پیاس مٹانے اور آرام لینے میں مصروف ہے' بلکہ قافلہ کے دور اندیش لوگ اپنے اپنے برتنوں میں پانی بھر رہے ہیں۔ کھانے پینے کے دوسرے سامان حاصل کر کے ذخیرہ کر رہے ہیں' اپنی تکان دور کر کے اپنے کو آنے والے سفر کے لیے تازہ دم بنانے میں لگے ہوئے ہیں' کہ نہ جانے اب سایہ اور پانی کتنے فاصلہ پر مہیا ہو گا اور کب آرام و راحت کا موقع میسر آ سکے گا۔

مگر ان قافلوں میں کچھ ایسے لاپروا' نادان اور بےفکرے بھی ہیں' جنہوں نے چند گھونٹ پیے' دو چار نوالے حلق سے اتارے اور مٹر گشتی میں لگ گئے۔ انہیں کچھ ہوش نہیں کہ چند لمحوں میں قافلہ چل پڑے گا۔ پھر وہی جان لیوا گرمی ہو گی' سورج کی تمازت ہو گی' لو کے جھکڑ ہوں گے' تپتی ریت اور دہکتی فضا ہو گی' سایہ اور پانی دور دور تک نظر نہ آئے گا۔ اگلا پڑاؤ نہ معلوم کتنے فاصلے پر ہو گا اور پھر کیا خبر کون پڑاؤ تک پہنچ سکے گا اور کون راستے کی جان لیوا صعوبتوں کے مقابلے کی تاب نہ لا کر راستے ہی میں دم توڑ دے گا۔ کس قدر افسوسناک ہے قافلے کے ان غیر سنجیدہ افراد کی نادانی' لاپروائی' بےفکری اور غیر ذمہ داری' اپنے سفر کی ضرورت اور سہولت کا ہر سامان یہ لوگ اس پڑاؤ سے حاصل کر سکتے تھے' لیکن انہیں کوئی فکر نہیں' نہ انہوں نے اپنے برتنوں میں پانی بھرا کہ آگے کے دشوار سفر میں ان کے کام آئے' نہ کھانے کا کوئی سامان حاصل کیا' کہ یہ اپنی بھوک مٹا سکیں' نہ سخت گرمی سے بچنے کے لیے انہوں نے کچھ اپنے ساتھ لیا۔ نادانی' بےپروائی اور بچگانہ پن کے ساتھ یہ دوسروں کو دیکھتے رہے۔ وقت گزر گیا اور قافلہ پھر چل پڑا۔

ذرا اندازہ کیجیے ان دانش مندوں کے سفر کی سہولتوں کا جو سفر کی تکلیفوں سے بچنے اور مقابلہ کرنے کا ہر سامان

پڑاؤ سے لے کر چلے، جن کے برتن میں پانی اور کھانا بھی ہے، لو اور دھوپ سے بچنے کے سامان بھی ہیں اور تپتی ہوئی ریت سے حفاظت کی چیزیں بھی اور کیا حال ہوگا ان بے پروا نادانوں کے سفر کا، جو خالی ہاتھ پڑاؤ سے چل پڑے۔ نہ ان کے پاس کھانا پانی ہے، نہ گرمی اور دھوپ سے مقابلہ کرنے کا کوئی سامان اور نہ اپنے جسم کے آرام اور سہولت کی کوئی چیز۔

زندگی کا یہ سفر جو آپ چاروناچار طے کر رہے ہیں، عجیب وغریب سفر ہے۔ قافلے برابر چل رہے ہیں، عمر کے دشوار گزار راستے پر ان قافلوں کے ساتھ آپ بھی چل رہے ہیں۔ آپ چاہیں یا نہ چاہیں، برابر آپ کا سفر جاری ہے۔ راہ میں شیطانی ہواؤں کے جھلسا دینے والے جھکڑ بھی ہیں۔ نفس کی بے تاب کر دینے والی خواہشات بھی ہیں، آرزوؤں اور تمناؤں کے الجھا دینے والے جال بھی ہیں، گناہوں کے تباہ کر دینے والے حملے بھی ہیں اور آدمی کو غیر سنجیدہ، لاپروا اور نادان بنا دینے والی فضا بھی۔

ان تباہ کن صعوبتوں سے بچنے، ان ہلاک کر دینے والی قوتوں سے مقابلہ کرنے اور ان کے شر سے محفوظ رہتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھنے کے لیے اللہ نے شب و روز کی اس گردش میں جگہ جگہ ایسے پڑاؤ مہیا کیے ہیں، کہ آپ ان پر پہنچ کر اگلے سفر کے لیے خود کو تازہ دم بنا لیں، آنے والی سفر کی صعوبتوں اور تکلیفوں سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر لیں، ہلاکت خیز قوتوں سے مقابلہ کرنے کے لیے مدافعت کا ہر سامان فراہم کر لیں اور ہر طرح مسلح اور تیار ہو کر پھر اگلے مرحلے کی طرف سفر شروع کر دیں۔

عمرِ عزیز کی راہ میں ہر سال گیارہ مہینے گزرنے کے بعد ایک مہینہ آتا ہے جو اپنے ساتھ فیوض و برکات اور خیرات و حسنات کے بے پایاں ذخیرے لے کر آتا ہے اور راہ حیات پر رواں دواں قافلوں کے ہر فرد کو یہ موقع میسر آتا ہے کہ وہ ایک بار پھر تازہ دم ہو جائے، سفر حیات میں آنے والی صعوبتوں اور قلب و روح پر حملہ کرنے والے قزاقوں سے مقابلے کی قوتیں فراہم کر لے اور نئے حوصلوں، تازہ ولولوں اور اٹل ارادوں کے ساتھ نشاط و اطمینان کی فضا اور شعور و بصیرت کی روشنی میں اپنا نیا سفر شروع کر دے۔

رمضان کی یہ مبارک ساعتیں ابھی ابھی گزری ہیں۔ ان کی یاد ابھی تازہ ہے۔ یہ تو آپ ہی جان سکتے ہیں کہ آپ نے اس مبارک مہینے کے شب و روز سے کیا حاصل کیا۔ پچھلے سفر کے اثرات، اضمحلال اور تکان کو دور کرنے کے لیے آپ نے کیا کچھ کیا۔ آنے والے مہینوں میں نفس اور شیطان کی قوتوں سے مقابلہ کرنے کے لیے کتنی قوت فراہم کی اور درپیش سفر کو کیف و سرور کے ساتھ طے کرنے کے لیے آپ نے کتنی تیاری کی۔ یا یہ مبارک دن آئے اور یوں ہی گزر گئے۔ آپ کی لاپروائی، نادانی، بے فکری اور بچگانہ پن نے آپ کو اس سے کچھ فائدہ نہ اٹھانے دیا۔

اللہ نے اپنے فضل و کرم سے آپ کے لیے یہ موقع فراہم کیا تھا کہ آپ اپنی دانش مندی، دور اندیشی حسن تدبیر اور

محنت و ریاضت سے اس مہینے میں اپنے کو اس لائق بنالیں کہ سال بھر تک آپ نفس اور شیطان سے نبٹنے میں جواں مردی دکھا سکیں، خواہشات کو زیر کرنے میں حوصلہ اور ہمت سے کام لے سکیں اور رمضان کے شب و روز کی عبادتوں اور ریاضتوں سے اپنے اندر اتنی توانائی پیدا کرلیں کہ نہایت سبک رفتاری کے ساتھ درپیش سفر کو طے کریں۔ آپ ہی جان سکتے ہیں کہ اللہ کے اس انعام اور احسان کے ساتھ آپ نے کیا سلوک کیا۔ خدانخواستہ یہ زریں موقع اگر یونہی ضائع ہوگیا اور آپ کچھ حاصل نہ کرسکے، تو اپنی بے بسی، بے چارگی اور بے پناہ مشکلات کا اندازہ کیجیے۔ آنے والے گیارہ ماہ کے طویل عرصے میں۔ شیطان اور اس کی بے پایاں ذریت، نفس جیسے مکار دشمن کے تباہ کن حملوں کا خیال کیجیے۔ اپنی بے بسی، بے چارگی اور بے سروسامانی پر نظر کیجیے اور سوچیے کیسے طے کریں گے آپ اس دشوار گزار سفر کو۔ کیسے برداشت کرسکیں گے سفر کی لرزہ خیز تکلیفوں کو۔ کیسے بچاسکیں گے خود کو شیطان اور اس کی ذریت کی یلغار سے۔ پھر یہ موقع گیارہ ماہ کی طویل گردش کے بعد ہی آپ کو میسر آسکے گا اور کون دوران سفر میں ہمیشہ کے لیے اس سے محروم ہوجائیں گے ــــ سمجھدار، دانشمند، دور اندیش اور مبارک ہیں وہ لوگ جنھوں نے اس مبارک موقع سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا، جنھوں نے اللہ سے تعلق مضبوط کرکے قلب و روح میں تازگی پیدا کی، روزے رکھ کر تقویٰ کی ناقابل تسخیر قوت فراہم کی، قرآن پاک کی تلاوت سے اپنے دلوں کو جلا بخشی، راہ حیات کے نشانات کو پہچاننے سمجھنے کی بصیرت حاصل کی، اللہ کی راہ میں اپنا دل پسند مال خیرات کرکے اپنے نفس کو دنیا پرستی کی کدورتوں اور گندگیوں سے صاف کیا۔ مسجد کے گوشوں میں اللہ سے لو لگا کر اللہ کا قرب حاصل کیا اور ایک موقع شناس تاجر کی طرح انہوں نے موقع سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔

آپ کو رمضان المبارک کی ساعتوں سے کیا ملا۔ اس کا صحیح صحیح احساس آپ ہی کو ہوسکتا ہے، دوسرے اندازہ ہی لگا سکتے ہیں۔ مگر دوسروں کے اندازے سے آپ کو کیا فائدہ اور کیا مطلب؟ آپ خود ہی اپنا احتساب کیجیے، اپنا بے لاگ جائزہ لیجیے اور اپنے کیے کے نتائج دیکھنے کا انتظار کیجیے۔

رمضان کی راتوں میں اللہ کے حضور کھڑے ہوکر آپ نے قرآن کی تلاوت کی جو حضور ﷺ پر نازل ہوا تھا اور جس کے مطابق حضور ﷺ نے زندگی گزاری تھی۔ یہ قرآن ٹھیک انہی الفاظ میں محفوظ ہے اور ٹھیک انہی الفاظ میں آپ رمضان بھر اس کی تلاوت کرتے رہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس کو ماننے والے، اس پر چلنے والے اور اس کو عملی زندگی میں اپنا دستور بنانے والے ہمیشہ کامیاب رہے ہیں۔ کیا اسی تصور، اسی یقین اور اسی ارادے کے ساتھ آپ نے اس کی تلاوت کی۔ اور اب اسی یقین اور اسی ارادے کے ساتھ آئندہ زندگی گزارنے کا سنجیدہ فیصلہ آپ کرچکے ہیں؟ اللہ کی راہ میں اپنا مال لٹا کر، اللہ کے لیے بھوکے پیاسے رہ کر واقعی آپ فیصلہ کرچکے ہیں کہ اب آپ جان و مال کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں اللہ کی مرضی کے مطابق اسی کے لیے صرف کریں گے۔ کیا آپ کی عملی

زندگی اس کی گواہی دے رہی ہے۔کیا واقعی آپ نے اپنے دل سے ہر ناجائز محبت کو کھرچ پھینکا ہے؟ اور دل میں صرف ایک اللہ کی محبت ہی کا نور ہے۔

دن بھر بھوکے پیاسے رہے' جب کہ ٹھنڈا پانی بھی میسر تھا اور لذیز کھانا بھی۔لیکن آپ محض اس لیے اس سے بچے رہے کہ اللہ نے اس کو روزے میں آپ کے لیے حرام کر دیا ہے۔مہینہ بھر کی اس مشق نے واقعی آپ کو یہ توانائی اور شعور بخشا ہے کہ اب آپ رزق کے ان تمام وسائل و ذرائع کو یکسر ختم کر دیں گے جو ناجائز یا کم از کم مشکوک و مشتبہ ہیں' اس لیے کہ حرام کی کمائی سے پلے ہوئے جسم کی کوئی نیکی اور عبادت اللہ قبول نہیں کرتا۔

اگر اللہ نے آپ کو اعتکاف کی توفیق بخشی' تو گویا آپ نے دس دن تک اپنی زندگی سے یہ ثبوت دینا چاہا اور یہ عادت ڈالنی چاہی کہ آپ' آپ کی ہر چیز اور آپ کی ساری دوڑ دھوپ صرف اللہ کے لیے ہے۔اس دنیا میں آپ کو جو کچھ کرنا ہے صرف اسی لیے کرنا ہے کہ آپ کا اللہ آپ سے راضی ہو اور آپ اس لائق بن سکیں کہ کل اللہ کے حضور جب پیش ہوں تو وہ آپ سے خوش ہو۔

اگر رمضان کی مبارک ساعتوں سے اسی شعور' اسی تصور اور اسی عزم کے ساتھ آپ نے فائدہ اٹھایا ہے اور اس موقع کو آپ نے اپنے لیے واقعی اللہ کی نعمت اور اللہ کا احسان سمجھا ہے' تو یقین کیجیے کہ آپ انہی خوش نصیبوں میں سے ہیں جن کی عید واقعی عید ہے۔واقعی آپ اس کے مستحق ہیں کہ آپ عید منائیں اور آپ کو عید کی مبارکباد دی جائے—لیکن اس مبارک موقع کو اگر آپ نے یوں ہی ضائع کر دیا ہے تو پھر آپ ہی بتایئے کہ کیا آپ عید منانے کے مستحق ہیں' کیا عید کی خوشی میں واقعی آپ کا بھی کوئی حصہ ہے اور کیا واقعی آپ اس لائق ہیں کہ آپ کو عید کی مبارکباد دی جائے۔



# ہجوم مصائب میں مؤمن کا سہارا

کس قدر بھیانک رات ہے۔ پوری بستی پُر ہول اندھیرے میں ڈوبی ہوئی ہے۔ زبردست موسلا دھار بارش ہورہی ہے۔ سخت طوفانی ہوا کے ہیبت ناک جھکڑ چل رہے ہیں۔ شائیں شائیں کی وحشت ناک آوازوں سے دل دہل رہے ہیں۔ سفید اولے تڑاتڑ گر رہے ہیں۔ بادلوں کی گڑ گڑاہٹ سے روح کانپ رہی ہے۔ دھماکہ خیز کڑک سے کان کے پردے پھٹے جارہے ہیں۔ زلزلے کی وحشت انگیز آوازیں اور پیہم جھٹکے برابر آرہے ہیں۔ درودیوار اور مکانوں کی چھتیں اس طرح ڈانواڈول ہورہی ہیں جیسے بیچ سمندر میں طوفانی موجوں کی زد میں آئی ہوئی کشتی ہچکولے کھارہی ہو۔ عمارتوں اور دیواروں کے گرنے کی سنسنی خیز آوازیں مسلسل آرہی ہیں۔ ہر طرف چیخ و پکار ہے۔ بچے سہم سہم کر اپنی ماؤں سے لپٹ رہے ہیں۔ عورتوں اور مردوں کے دل لرز رہے ہیں۔ ماں باپ بچوں کے سامنے انہیں روتا بلکتا چھوڑ کر آخری ہچکیاں لے رہے ہیں۔ پیارے بچے شفیق ماں باپ کی نظروں کے سامنے دم توڑ رہے ہیں اور ملبوں کے نیچے دب رہے ہیں۔ ہر طرف قیامت کا عبرتناک منظر ہے۔ اللہ کے بندے بے بس' خوف زدہ اور حیران و پریشان ہیں۔

کچھ لوگ ان آفات و مصائب سے بچنے کی اپنی سی تدبیریں بھی کررہے ہیں۔ یہ دیکھئے کچھ لوگ آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں' کہ بجلی کی چمک انہیں نظر ہی نہ آئے۔ کچھ لوگوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس رکھی ہیں' کہ خوفناک کڑک کی آواز سے محفوظ رہیں۔ کچھ لوگ چھتریاں لگائے کھڑے ہیں' کہ موسلا دھار بارش اور اولوں کی ضربوں سے بچے رہیں۔ کچھ لوگ چھتوں میں اڑانے اور بلیاں لگارہے ہیں' کہ چھتیں گرنے سے محفوظ رہیں۔ کچھ لوگ گھروں سے نکل نکل کر کھلے میدانوں اور کھلی شاہراہوں کی طرف بھاگ رہے ہیں' کہ گرتی عمارتوں میں دب نہ جائیں۔ کچھ لوگ گھبرا کر پھر اپنے گھروں میں پناہ لے رہے ہیں' کہ اولوں کی ہلاکت خیز بارش سے بچ جائیں۔

یہ زلزلہ کیوں آیا۔ طوفان کی کیا وجہ ہے۔ بجلیاں کیوں کڑک رہی ہیں؟ اور زمین و آسمان یہ قیامت کا منظر کیوں پیش کررہے ہیں؟ لوگوں کا خیال ہے کہ کچھ طبعی اسباب ایسے فراہم ہوئے جن سے یہ سارے حادثات رونما ہوگئے۔ طبیعات کے ماہرین ان حادثات کی طبعی اور مادی توجیہیں کررہے ہیں۔ بڑی اکثریت کا انداز فکر یہ ہے

کہ لیل و نہار کی گردش اور طبعی تغیرات کے تحت یہ حادثے اور آفتیں خود بخود رونما ہوگئیں' ان سے بچنے اور اپنی حفاظت کرنے کی جو مادی تدبیریں ہم کر سکتے تھے ان میں کوتاہی نہ کرنی چاہئے — لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ آفتیں اور یہ حادثے خود بخود طبعی کیفیات کے تحت رونما ہوتے ہیں یا سوچے سمجھے منصوبے کے ساتھ یہ سب کچھ ہوتا ہے؟ یہی وہ دوراہہ ہے جہاں سے مؤمن کی راہ دوسروں سے الگ ہو جاتی ہے۔ اور وہ ان آفات و حادثات پر کسی اور انداز سے سوچتا ہے اور دوسرے کسی اور انداز سے سوچتے ہیں۔

یہ کائنات ایک دانا بینا اللہ کی بنائی ہوئی ہے۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے' نہایت حکمت کے ساتھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کسی خاص مصلحت سے ہو رہا ہے۔ یونہی الل ٹپ یہاں کوئی تغیر رونما نہیں ہوتا۔ مصائب' آلام' حادثات' پریشانیاں' سختیاں محض اتفاقی طور پر سامنے نہیں آتیں بلکہ اللہ کے حکم اور ارادے کے تحت یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ اللہ کی ذات و صفات پر ایمان نہ رکھنے والے جب سوچتے ہیں تو ان کی نگاہ صرف ظاہری اسباب تک جاتی ہے۔ وہ ان کی مادی توجیہوں سے ہی اپنے ذہن و دماغ کو مطمئن کرتے ہیں اور صرف مادی تدبیروں سے ہی اپنی حفاظت اور بچاؤ کا سامان کرتے ہیں۔ لیکن مؤمن یہ یقین رکھتا ہے کہ کسی بڑی مصلحت کے تحت مدبر کائنات کے حکم اور اشارے ہی سے یہ سب کچھ ہوا ہے۔ اس کا ایمان ہے کہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔

كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ

''سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔''

اور وہ یہ بھی یقین رکھتا ہے کہ یہ مصائب اور سختیاں انسانوں کے اعمال اور کرتوتوں ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں' چاہے یہ کرتوت اور کوتاہیاں انفرادی ہوں یا اجتماعی۔

اللہ کا ارشاد ہے:

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (الشوریٰ ۴۲:۳۰)

''اور تم پر جو مصائب بھی آتے ہیں وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آتے ہیں۔''

اور پھر مؤمن کا یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ ان آلام و مصائب اور تنگیوں اور پریشانیوں کو دور کرنے والا صرف وہ اللہ ہے جس کے حکم سے پریشانیاں آئی ہیں۔ یہ پریشانی اور یہ جان لیوا آفات نہ اپنی تدبیروں سے دور ہو سکتی ہیں اور نہ اللہ کے سوا کوئی اور طاقت ہے جو ان سے ہمیں نجات دلا سکے۔

آپ ہی بتایئے' کیا خوفناک زلزلے سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ آپ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں' کیا اولوں کی زد سے بچنے کی سبیل یہ ہے کہ آپ چھتریاں لگا کر کھڑے ہو جائیں۔ کیا دھڑام دھڑام گرنے والی عمارتوں میں دب کر مرنے سے بچنے کی یہ تدبیر کارگر ہے کہ آپ میدانوں کی طرف بھاگ جائیں۔ کیا اولوں کی

ہلاکت خیز بوچھاڑ سے بچنے کے لیے لرزتے مکانوں میں پناہ لینے سے آپ کی جان بچ سکتی ہے۔ کیا طبیعیات کے ماہرین سے داد فریاد کرنے سے آپ کی مصیبت ٹل سکتی ہے۔

جی نہیں! یہ سب تدبیریں نہایت بودی' کمزور' سطحی اور بے اثر ہیں۔ زمین اور آسمان کی ساری طاقتیں مل کر بھی ان مصائب اور آفات کو دور نہیں کر سکتیں۔ بے شک آپ اپنی حفاظت اور بچاؤ کے لیے ضرور دوڑ دھوپ کریں' لیکن آپ کی ان تدبیروں کو کارگر بنانا بھی اللہ ہی کا کام ہے۔

مصائب و مشکلات سے نجات کی یقینی صورت صرف یہ ہے کہ سب سے مایوس اور بے پروا ہو کر آپ صرف اللہ کے حضور گڑگڑائیں جو طوفان و بارش' رعد و برق اور اولوں اور زلزلوں کا خالق ہے۔ مشکلات سے نجات دینے والا صرف وہی ہے۔ نفع و نقصان صرف اسی کے قبضے میں ہے۔ وہ خیر و شر کا مالک ہے۔ حالات کو سازگار بنانا صرف اسی کا کام ہے۔ مصائب اور مشکلات صرف اسی کے حکم سے دور ہو سکتی ہیں جس کے حکم سے یہ آئی ہیں۔

وَ اِنۡ یَّمۡسَسۡكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ؕ (الانعام۶:۱۷)

''اگر اللہ تمہیں کسی دکھ اور نقصان میں مبتلا کر دے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اس دکھ اور نقصان سے بچا سکے۔''

یہی نقصان مؤمن کے فکر و عمل کو صحیح رخ دیتا ہے اور وہ اس لازوال سہارے کی بدولت مصائب و آلام کے ہجوم میں بھی' ایسا مطمئن و شاداں و فرحاں اور حوصلہ مند نظر آتا ہے کہ اس راز سے ناآشنا لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔

زندگی کا دریا ہمیشہ اور ہر حال میں سکون کے ساتھ نہیں بہتا ہے' اس میں موجیں اور لہریں اٹھتی ہی رہتی ہیں۔ زلزلے' طوفان' بیماریاں' مشکلات' پریشانیاں آتی ہی رہتی ہیں۔ مگر یاد رکھیے زندگی کے پرسکون ایام کے مقابلے میں ان کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔ ایسے حالات عارضی ہوتے ہیں۔ مشکلات کیسی ہی سنگین ہوں' بہرحال ایک دن ان کو ختم ہونا ہے اور بہت جلد ان کو ختم ہونا ہے۔ بے شک بعض اوقات یہ مصیبتیں اتنی گمبھیر اور حالات اس قدر سنگین ہو جاتے ہیں کہ آدمی یوں سوچنے لگتا ہے کہ شاید یہ مصائب اب کبھی ختم نہ ہوں گے۔ مگر ایسا نہیں ہے ؎

طولِ غمِ حیات سے گھبرا نہ اے جگر
ایسی بھی کوئی رات ہے جس کی سحر نہ ہو

اللہ غیب سے ایسی تدبیریں مہیا فرماتا ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے مصائب کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور سکون و راحت کی وہ مسرت انگیز صبح نمودار ہوتی ہے جس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ پھر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کس شر میں کیا خیر پوشیدہ ہے۔ بہت سی چیزوں کو انسان اپنے حق میں نہایت مضر اور برا سمجھتا ہے' لیکن وہی اس کے لیے خیر اور

بھلائی کا سبب ہوتی ہیں۔ مؤمن کے لیے کیا گنجائش کہ وہ مایوسی اور حوصلہ شکنی کا شکار ہو اور شکستہ خاطر ہو کر ہمت توڑ بیٹھے۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (الفاتحہ ۱: ۷)

''ہمیں ان کی راہ پر چلا جن پر تو نے انعام کیا ہے۔''

یہ دعا مانگنے والوں کی راہ تو بہت صاف اور جانی پہچانی ہے۔ اس راہ میں تو مایوسی، ہمت شکنی اور ناکامی کا سوال ہی نہیں ہے۔ جس شاہراہ پر آپ چل رہے ہیں اور چلتے رہنے کی دعائیں کر رہے ہیں یہ وہ راہ ہے جس پر انبیاء صدیقین، شہداء اور صالحین چلے ہیں اور ان کی سیرت و تاریخ کے ہر ہر باب میں آپ کے لیے عبرت و نصیحت اور بصیرت و روشنی کے ایسے سامان ہیں جن سے صرف آپ کی ڈھارس ہی نہیں بندھتی، بلکہ اس راہ پر حوصلے اور نشاط کے ساتھ چلتے رہنے اور مشکلات کو انگیز کرنے کا ناقابلِ شکست حوصلہ بھی پیدا ہوتا ہے اور قدم قدم پر یہ یقین مضبوط ہوتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ ان پر مختلف مصیبتیں اور آزمائشیں آتی ہیں مگر یہ ان کے عروج و کامرانی اور درجات کی بلندی کا ذریعہ ہوتی ہیں۔

چند ناعاقبت اندیش جوانوں نے ایک نوعمر بچے کو شفیق باپ سے جدا کر کے جنگل کے ایک کنویں میں ڈال دیا اور اپنی دانست میں وہ یہ سمجھے کہ ہم نے اس کا کام تمام کر دیا۔ نوعمر بچہ بھی کیا سوچ سکتا تھا، کہ اس اندھیرے کنویں کی تہ سے کبھی نکل کر وہ سکون و راحت کی فضا میں سانس لے سکے گا۔ مگر مدبر کائنات اپنے منصوبے کو پورا کرنے کے لیے ایسی لطیف، نتیجہ خیز اور مخفی تدبیریں کرتا ہے کہ کوتاہ بین انسان کی نظریں وہاں تک نہیں پہنچ پاتیں۔ یہ آپ ہی کی تاریخ ہے، یاد کیجیے اسی اندھیرے کنویں کی تہ سے مصر کا تخت جنم لیتا ہے، اسی مصیبت کی تاریکی سے راحت و سکون کی دلنواز روشنی پھیلتی ہے اور پورے مصر کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔

پھر اسی مصر میں نفس کے ہاتھوں مغلوب ایک عورت اس نوخیز اور پاکباز نوجوان پر گھناؤنا الزام لگا کر اس کو ذلت و رسوائی کی سزا دینے کا موقع پیدا کرتی ہے۔ مگر کسی کو کیا معلوم کہ اسی مصیبت کی بدولت اسی فرشتہ صفت جوان کی عفت و پاکبازی کی وہ شہرت اور سند عطا ہونے والی ہے جس کا تصور بھی کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ جب تک یہ دنیا باقی رہے اس مقدس جوان کی پاکبازی اور عفت مآبی کی داستان اللہ کے بندے پڑھتے رہیں گے اور اللہ کے الفاظ میں ان کی پاکیزگی اور پرہیزگاری کی گواہی اتنے افراد دیتے رہیں گے، جن کا شمار صرف اللہ ہی لگا سکتا ہے۔ بندوں کے بس میں نہیں کہ وہ اس کا حساب لگا سکیں۔

قیامت تک قرآن میں یوسف علیہ السلام کی کامیابی، سربلندی اور پاکبازی کا قصہ تلاوت کیا جاتا رہے گا۔ اور اللہ کے نیک بندے ان کو درود و سلام کے تحفے پیش کرتے رہیں گے۔ ایک مظلوم صاحبِ سجن کا یہ تابناک

مستقبل ہوگا' کون دیکھ سکتا تھا اور کس کی نگاہ یہاں تک پہنچ سکتی تھی۔

پھر آپ ذرا ذہن پر زور ڈالیے۔ سورۂ یوسف اس وقت نازل ہوئی جب یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی طرح مکے میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریشی بھائی اپنے بھائی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسی طرح ظلم و زیادتی کر رہے تھے اور مکے کی سرزمین اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کے لیے اپنی تمام تر وسعت کے باوجود تنگ ہوگئی تھی۔ مگر بار باران سے یہی کہا جا رہا تھا کہ کامیابی تمہارا ہی حق ہے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ چند نہتے حق پرست ان ظالموں کے چنگل سے نجات پا سکیں گے اور ان کو راحت و سکون کے ماحول میں سانس لینے کا موقع مل سکے گا۔ مگر یہی انتہا سے گزری ہوئی جسمانی اور روحانی اذیتیں راہ ہموار کر رہی تھیں اور پھر انہی مصائب و آلام کی اندھیری راتوں سے عیش و سکون اور عزت و کامرانی کی صبح نمودار ہوئی اور اسی گردش لیل و نہار سے ایک دن فتح مکہ کی نورانی صبح طلوع ہوئی جس کی روشنی میں صرف عرب ہی نہیں پوری دنیا جگمگا اٹھی اور ان شاء اللہ قیامت تک جگمگاتی رہے گی۔

آپ کی تاریخ کے یہ واقعات آپ کے سامنے بار بار اسی لیے دہرائے گئے ہیں کہ آپ کو یقین کی لذت حاصل ہو اور کسی مرحلے پر بھی آپ ڈانواں ڈول نہ ہوسکیں۔ زمینی آفات ہوں یا آسمانی حادثات' وہ ثابت قدم رہے اور ان کا یہ یقین نکھرتا چلا گیا کہ اللہ کی پکڑ سے نجات اللہ ہی کے دامن رحمت میں مل سکتی ہے۔

وَظَنُّوٓا اَنۡ لَّا مَلۡجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيۡهِ ؕ (التوبۃ۹:۱۱۸)

''اور انہیں یقین ہوگیا کہ اللہ کی گرفت سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ اگر ہے تو خود اللہ ہی کا دامن رحمت ہے۔''

اس یقین و عمل نے انہیں کیا بخشا۔ خود قرآن کے الفاظ میں سنئے اور ایمان تازہ کیجیے:

ثُمَّ تَابَ عَلَيۡهِمۡ لِيَتُوۡبُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ۝ (التوبۃ۹:۱۱۸)

''پھر اللہ خود اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔''

یعنی ان کی اس کیفیت پر اللہ کی رحمت کو جوش آ گیا۔ اور اللہ کو ان پر ایسا پیار آیا' کہ وہ خود ان کی طرف پلٹا' اس نے اپنی رحمت ان پر انڈیل دی' انہیں سچی توبہ کی توفیق بخشی اور بے پایاں رحمتوں سے اس قدر نوازا کہ رہتی دنیا تک راہ حق کے قافلوں کے لیے ان کی زندگیاں مشعل راہ بن گئیں۔ عبرت و نصیحت کے کیسے کیسے آبدار موتی بکھرے ہوئے ہیں تاریخ کے ان پارینہ اوراق میں اور کس قدر خوش نصیب ہیں وہ بندے جو انہیں رولنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔

# قربانی کرتے وقت

ایک بوڑھے غریب الوطن نے خواب میں اللہ کا یہ اشارہ پایا کہ اپنے اکلوتے لختِ جگر کو ہماری محبت پر قربان کردو۔ یہ کسی عام انسان کا خواب نہ تھا۔ اللہ کے پیغمبر کا خواب جھوٹا نہیں ہوتا اور پھر ایک صبح مکے کی سرزمین نے یہ رقت انگیز منظر دیکھا' کہ ایک بوڑھا باپ اپنے اکلوتے جگر گوشے کی گردن پر تیز چھری چلانا چاہتا ہے۔ اپنے محبوب بچے کو ذبح کرنا چاہتا ہے۔ بڑھاپے کے سہارے کو قربان کرنا چاہتا ہے۔ دل پر کیا گزری ہوگی' باپ تو باپ ہی ہوتا ہے۔ ہر باپ اپنے بارے میں ذرا تصور کرے مگر ابراہیم علیہ السلام کیسے تیار نہ ہوتے' اللہ کا حکم تھا۔ ابراہیم علیہ السلام سچے تھے' وفادار تھے' مخلص اور حنیف تھے۔ وہ اللہ سے کہہ چکے تھے' اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ (میں رب العالمین کے حضور سپر انداز ہو چکا ہوں) اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر چکا ہوں۔ آزمائش بڑی سخت تھی۔ زمین و آسمان لرز گئے ہوں گے۔ مگر ابراہیم علیہ السلام استقلال کے پیکر تھے' صبر و رضا کی مثال تھے۔ بے شک بیٹا پیارا تھا' مگر اللہ اس سے زیادہ پیارا ہے۔ شفیق اور نرم دل باپ جان سے زیادہ عزیز بیٹے کی گردن پر تیز چھری پھیرنا ہی چاہتے تھے کہ ندا آئی' ابراہیم! تم نے اپنا خواب سچا کر دکھایا۔ اللہ نے تمہاری قربانی قبول کر لی۔ مینڈھے کے گلے پر چھری پھیر کر اپنے جذبات کی تسکین کرو۔

قربانی' جاں نثاری' سپردگی' فداکاری' سرفروشی اور وفاداری کے کیسے بے مثال جذبات تھے اس امام انسانیت کے سینے میں' سوچیے تو ایسی رقت طاری ہوتی ہے کہ تصور کی قوتیں جواب دینے لگتی ہیں اور اپنی بے بسی کا احساس ستانے لگتا ہے کہ ہم تو ان جذبات کی نقل بھی نہیں کر سکتے' ہماری زبان میں یہ طاقت نہیں کہ ان جذبات کے لیے اپنے لفظوں میں اپنے رب سے دعا کر سکیں' کتنا عظیم احسان ہے محسنِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا' کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری بے بسی کا احساس فرمایا اور ہمیں قربانی کی دعا سکھائی۔ جانور ذبح کرتے وقت ہمارے سینوں میں قربانی اور جاں نثاری کے کیا جذبات ہونے چاہئیں۔ دعا کے الفاظ سے ہمیں یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ دعا کے الفاظ دہرا کر گویا ہم اپنے رب سے بھیک مانگتے ہیں کہ پروردگار! ہم تیرے خلیل کی نقل کر رہے ہیں۔ عمل سے بھی اور زبان سے بھی۔ پروردگار! تو اپنے کرم سے ہمارے سینوں میں یہ جذبات پیدا فرما دے اور سنت ابراہیم علیہ السلام کو زندہ رکھنے والوں

میں ہمارا شمار فرما دے۔

قربانی کرتے وقت ہم جو دعا پڑھتے ہیں اس کا لفظ لفظ اس لائق ہے کہ ہم اس پر غور کریں اور پھر جانور ذبح کرتے وقت توجہ اور شعور کے ساتھ یہ دعا پڑھیں:

إِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ عَلٰی مِلَّةِ اِبْرَاهِیْمَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ' لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ' اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ۔

''میں نے پوری یکسوئی کے ساتھ اپنا رخ اس اللہ کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا' میں ٹھیک اس طریقے کا پیروکار ہوں جو ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ تھا اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں' بلاشبہ میری نماز' میری قربانی' میری زندگی اور میری موت سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا اور میں فرماں بردار بندوں میں سے ہوں' اے اللہ یہ تیرا ہی مال ہے اور تیرے ہی حضور پیش ہے۔ بِسْمِ اللّٰهِ ' اَللّٰهُ اَكْبَرُ۔



# موت کے دروازے پر

کچے دھاگے میں بندھی ہوئی موت کی تلوار ہر وقت آپ کے سر پر لٹک رہی ہے' کچھ نہیں معلوم کہ زندگی کا یہ کچا دھاگا کب ٹوٹ جائے اور موت کی تلوار آپ کا کام تمام کردے۔ اس نازک ترین صورت حال میں آپ زندگی کی گھڑیاں گزار رہے ہیں اور کسی وقت یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ کی زندگی کے کتنے لمحے باقی ہیں۔ کسی بھی وقت آپ دوسری دنیا کی طرف منتقل ہو سکتے ہیں۔ آپ چاہیں' جب بھی منتقل ہونا ہے' نہ چاہیں' جب بھی منتقل ہونا ہے۔ آپ کو دوسری دنیا کا یقین ہو' جب بھی منتقل ہونا ہے اور آپ دوسری دنیا پر یقین نہ رکھتے ہوں۔ تب بھی منتقل ہونا ہے۔ یہ انتقال بہر حال ایک دن ہونا ہے۔ ہر متنفس جس نے زندگی پائی ہے ایک دن اسے موت کا مزہ چکھنا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ (آل عمران ۳:۱۸۵)

''ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔''

موت سے بچنے کے لیے کوئی پناہ گاہ نہیں' آدمی کہیں ہو' کسی حال میں موت سے بچ نہیں سکتا۔ موت سے بچنا ممکن نہیں۔

اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ ؕ (النساء ۴:۷۸)

''تم جہاں کہیں بھی ہو موت بہر حال آ کر رہے گی۔ تم خواہ کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو۔''

موت کے وقت کو کوئی طاقت نہیں ٹال سکتی۔ اللہ نے ہر متنفس کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔ یہ مقرر وقت پورا ہونے کے بعد کسی کو مہلت نہیں دی جائے گی۔

وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ؕ (المنافقون ۶۳:۱۱)

''اللہ ہر گز کسی شخص کو مہلت نہیں دیتا' جب اس کی مہلت عمل پوری ہونے کا وقت آ جاتا ہے۔''

موت ایک ایسی یقینی حقیقت ہے' جس کے لیے دلیل و حجت کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ لاتعداد انسان اس کا مزہ چکھ چکے۔ جو موجود ہیں انہیں یقیناً ایک روز اس کا مزہ چکھنا ہے اور جو آئندہ دنیا میں آئیں گے وہ بھی یقیناً ایک

روز موت کا منہ دیکھیں گے۔

سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ موت کا استقبال آپ کن جذبات اور کیفیات کے ساتھ کرتے ہیں۔ زندگی کے یہ آخری لمحات ہی انسان کا اصل مقام متعین کرتے ہیں کہ بندہ عظمت یا ذلت کے کس درجے پر ہے۔ ایک مغربی شاعر نے کتنی سچی بات کہی ہے:

> اگر تم کسی انسان کو اس کے تمام اوصاف و خصائل کے ساتھ اصل صورت میں دیکھنا چاہتے ہو تو انتظار کرو — اس وقت تک انتظار کرو' جب موت کا دروازہ اس پر کھل جائے۔ اس وقت وہ سارے بناوٹی پردے ہٹ جائیں گے جو انسان اپنی حقیقی صورت پر ڈال لیتا ہے۔ اس کی روح موت کی دستک سنتے ہی سارے نقاب پھاڑ ڈالتی ہے اور بے حجاب ہو کر دنیا کے سامنے آ جاتی ہے۔

واقعہ یہی ہے کہ آدمی کی بے نقاب شخصیت زندگی کے آخری لمحات ہی میں سامنے آتی ہے اور یہی لمحات بتاتے ہیں کہ آدمی دنیا سے کامیاب جا رہا ہے یا ناکام — اسی لیے ہر مؤمن زندگی بھر یہ دعا کرتا ہے کہ یا اللہ میرا خاتمہ ایمان پر ہو۔ یہی اس کی سب سے بڑی تمنا ہوتی ہے اور اسلام نے اسے یہی تعلیم دی ہے۔ جنازے کی نماز پڑھتے ہوئے جب موت کے شکار انسان کا لاشہ اس کے سامنے ہوتا ہے' وہ سوز و غم میں ڈوبی ہوئی دل گیر آواز میں اپنے پروردگار سے یہی کہتا ہے:

وَمَنْ تَوَفَّيْتَهٗ مِنَّا فَتَوَفَّهٗ عَلَى الْاِيْمَانِ.

"پروردگار ہم میں سے جس کو بھی تو موت دے اس حال میں موت دے کہ وہ ایمان پر قائم ہو۔"

جنازے کی نماز میں پڑھی جانے والی دعا کے یہ الفاظ اس لائق ہیں کہ آدمی کبھی ان کو ذہن سے اوجھل نہ ہونے دے اور یاد رکھے کہ آخر کار ایک دن اسے بھی اسی طرح دنیا سے رخصت ہونا ہے — فکر کی بات یہ نہیں ہے کہ رخصت ہونا ہے' رخصت تو ایک دن ہونا ہی ہے' فکر کی بات اگر کچھ ہے تو صرف یہ ہے کہ پروردگار اس حال میں اس دنیا سے اٹھائے کہ سینہ ایمان کے نور سے منور ہو۔

زندگی کا کچا دھاگا کب ٹوٹے گا۔ موت کا دروازہ کب کھلے گا اور کس چپہ زمین پر کھلے گا اور کب آپ اس میں چار و ناچار داخل ہو جائیں گے' یہ کسی کو معلوم نہیں۔ یہ راز صرف عالم الغیب ہی کو معلوم ہے۔

وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّا ذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝ (لقمان ۳۱:۳۴)

"کوئی متنفس نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کمائی کرنے والا ہے اور نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ کس سرزمین پر اس کو موت آنی ہے۔ اللہ ہی سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔"

ہر لمحہ آپ اس اندیشے کے ساتھ گزار رہے ہیں کہ ممکن ہے یہی زندگی کا آخری لمحہ ہو' ہر دوسرا لمحہ موت کا لمحہ ہو سکتا ہے اور آپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دوسری دنیا میں منتقل ہو سکتے ہیں۔

جب واقعہ یہ ہے ـــــ اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ واقعہ نہیں ہے ـــــ تو پھر خود ہی اپنے ضمیر سے پوچھئے کہ خاتمہ بالخیر کی تمنا میں آپ کس قدر صادق ہیں' ایمان پر خاتمے کی دعا آپ کتنے اخلاص کے ساتھ کر رہے ہیں۔ ہر دوسرا لمحہ جو یکایک آپ کو دوسری دنیا میں منتقل کر سکتا ہے' کیا واقعی آپ اس کیفیت' شعور' احساس اور بیداری کے ساتھ گزار رہے ہیں کہ اگر یہی لمحہ زندگی کا آخری لمحہ ہو ـــــ تو یہ ایمان کا لمحہ ثابت ہو' اللہ کی اطاعت کا لمحہ ثابت ہو' معصیت اور نافرمانی کا لمحہ نہ ہو۔

یہ خالص آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔ آپ کی اور صرف آپ کی کامیابی اور ناکامی کا مسئلہ ہے۔ کوئی دوسرا اس مسئلہ میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا' نہ یہ دوسروں کو مطمئن کرنے کا مسئلہ ہے' یہ صرف اپنی ذات کو مطمئن کرنے کا مسئلہ ہے' اپنے ضمیر سے جواب لینے اور اسے مطمئن کرنے کا مسئلہ ہے۔ سامنے آنے والے نتائج صرف آپ ہی کو بھگتنے ہیں' کوئی دوسرا قطعاً آپ کا شریک حال نہ ہوگا ـــــ کس قدر قابل رشک ہے وہ موت جو اس حال میں آئے کہ آدمی کو ایمان کی دولت حاصل ہو اور وہ ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو ـــــ موت کے اس پار کیا ہے اور انسان کو کن حالات سے دوچار ہونا ہے ـــــ کچھ نہیں معلوم۔ حیرت انگیز دریافت اور ایجاد کے باوجود انسانی معلومات کے ذرائع اس معاملے میں ذرا کام نہیں دے سکتے۔ البتہ وہ لمحات' جب آدمی موت کے دروازے پر ہوتا ہے' ضرور کچھ کچھ پتا دیتے ہیں کہ رخصت ہونے والا کیسا ہے اور اس کا کیا انجام ہونے کی توقع ہے۔

تاریخ کے صفحات میں کتنے ہی خوش نصیبوں کے وہ لمحات محفوظ ہیں جب وہ موت کے دروازے پر تھے۔ اس وقت اسلامی تاریخ کے تین بزرگوں کے آخری لمحات کی ایمان افروز کیفیات سے ایمان کو تازہ کیجیے اور دعا کیجیے کہ دم واپسیں اللہ رحمٰن و رحیم ہمیں بھی ان کیفیات میں سے کچھ حصہ عطا فرمائے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے ''میرے والد محترم مرض موت کے آخری ایام میں بے ہوش ہو گئے تو میری زبان سے بے اختیار نکل گیا' افسوس میرے باپ کو سخت بیماری ہو گئی ہے۔ اتنے میں والد محترم کی آنکھ کھل گئی۔ تو فرمایا' عائشہ! یہ بیماری نہیں ہے' یہ وہ چیز ہے جس کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے:

وَ جَآءَتۡ سَكۡرَةُ الۡمَوۡتِ بِالۡحَقِّ ؕ ذٰلِكَ مَا كُنۡتَ مِنۡهُ تَحِيۡدُ ○ (ق۵۰:۱۹)

''اور موت کی جاں کنی حق لے کر آ پہنچی۔ یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا۔''

پھر پوچھا ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنے کپڑوں میں کفنایا گیا تھا؟''

میں نے عرض کیا ''تین کپڑوں میں۔''

پھر پوچھا ''آپ ﷺ نے کس دن وفات پائی تھی؟''

میں نے عرض کیا ''پیر کے دن۔''

''میں اپنے رب سے امید کرتا ہوں کہ آج رات اور دن کے درمیان میری موت واقع ہو جائے۔ پھر اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا ''دو کپڑے مزید ملا کر مجھے انہی کپڑوں میں دفنا دینا۔''

میں نے کہا کہ ''یہ کپڑے تو پرانے ہیں۔''

الحی احرج الی الجدید من المیت انما للریم۔

''زندہ انسان مردہ کے مقابلے میں نئے کپڑوں کا زیادہ ضرورت مند ہے اور یہ کفن تو ریم اور خون کے لیے ہے۔''

اور جب آپ کی سانس اکھڑنے لگی تو دعائے یوسفی آپ کی زبان پر تھی: ''تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ'' یا اللہ تو مجھے اس حال میں اٹھا کہ میں مسلم اور تیرا فرمانبردار ہوں اور مجھے صالح بندوں میں شامل فرما۔''

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا جب بالکل آخری وقت آ گیا' تو آپ نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیئے۔ مٹھیاں کس لیں اور زبان پر یہ کلمات تھے: الٰہی! تو نے حکم دیا اور ہم نے حکم عدولی کی۔ پروردگار! تو نے منع فرمایا اور ہم نے نافرمانی کی۔ یا اللہ! میں بے قصور نہیں ہوں کہ معذرت کروں۔ طاقتور نہیں ہوں کہ غالب آ سکوں۔ پروردگار! اگر تیری رحمت شامل حال نہ ہوگی' تو میں ہلاک و برباد ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد تین بار کہا' لا الٰہ الا اللہ اور روح جسم سے پرواز کر گئی۔

شہید کربلا نواسہ رسول رضی اللہ عنہ پر ہر طرف سے دشمنوں کا نرغہ تھا' آپ بھی برابر تلوار چلا رہے تھے۔ پیدل فوج پر آپ ٹوٹ پڑے تن تنہا اس کے قدم اکھاڑ دیئے۔ عبداللہ بن عمار کہتا ہے' میں نے نیزے سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا اور ان کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ میں چاہتا تو ان کو قتل کر سکتا تھا' لیکن میں نے خیال کیا' میں یہ گناہ اپنے سر کیوں لوں۔ دائیں بائیں ہر طرف ان پر حملے ہو رہے تھے' لیکن وہ جس طرف مڑ جاتے تھے' دشمن بھاگ کھڑا ہوتا تھا۔ وہ اس وقت کرتہ پہنے ہوئے تھے اور سر پر عمامہ تھا۔ اللہ کی قسم' میں نے کبھی کسی شکستہ دل کو جس کا سارا گھر خود اس کی آنکھوں کے سامنے تہ تیغ ہو گیا ہو' ایسا بہادر' ثابت قدم' مطمئن اور جری نہیں دیکھا۔ حالت یہ تھی کہ دائیں بائیں سے دشمن اس طرح بھاگ کھڑے ہوتے تھے' جس طرح شیر کو دیکھ کر بکریاں بھاگ جاتی ہیں۔ دیر تک یہی حالت رہی۔ اسی دوران آپ کی بہن حضرت زینب بنت فاطمہ رضی اللہ عنہا خیمے سے باہر نکلیں۔ ان کے کانوں میں بالیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ چلاتی تھیں' کاش آسمان زمین پر ٹوٹ پڑے۔

پیاس کی شدت سے آپ رضی اللہ عنہ کا برا حال تھا۔ پانی پینے کے لیے آپ رضی اللہ عنہ فرات کی طرف بڑھے' اچانک دشمن کی طرف سے ایک تیر آیا اور آپ رضی اللہ عنہ کے مبارک حلق میں پیوست ہوگیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے تیر کھینچ لیا۔ پھر آپ رضی اللہ عنہ نے ہاتھ منہ کی طرف اٹھائے تو دونوں چلو خون سے بھر گئے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے خون آسمان کی طرف اچھالا اور اللہ کا شکر ادا کیا اور فرمایا ''الٰہی! میرا شکوہ تجھی سے ہے۔ دیکھ! تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے کے ساتھ کیا ہو رہا ہے'' زرعہ بن شریک نے اسی دوران پہلے بائیں ہاتھ کو زخمی کیا۔ پھر شانے پر تلوار ماری۔ آپ رضی اللہ عنہ کمزوری سے لڑکھڑائے۔ سنان بن انس نے بڑھ کر نیزہ مارا۔ اور آپ رضی اللہ عنہ زمین پر گر پڑے اور پھر اسی ظالم نے نواسہ رسول کو ذبح کیا اور سر تن سے جدا کر دیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔



# رحمت الٰہی کے امیدوار

آپ اللہ سے رحمت کے امیدوار ہیں' ہونا ہی چاہیے۔ مؤمن کی یہی شان ہے' رحمت سے مایوسی تو کفر ہے۔ کافر ہی رحمت الٰہی سے مایوس ہوتا ہے' مؤمن کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ پرامید رہتا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ (یوسف ۱۲:۸۷)

''بلاشبہ اللہ کی رحمت سے تو وہی لوگ مایوس ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔''

رحمت کی امید اس حقیقت کی یقینی دلیل ہے کہ آپ کے دل میں ایمان ہے' ایمان آپ کا سب سے بڑا سرمایہ ہے' جو دونوں جہاں میں آپ کی فلاح و کامرانی کی ضمانت ہے — سوچنے اور مطمئن ہونے کی بات صرف یہ ہے کہ آپ واقعی امیدوارِ رحمت ہیں یا کسی دھوکے میں مبتلا ہیں' آپ صرف اپنی نظر میں اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں یا اللہ کی نظر میں بھی واقعی امیدوار ہیں' حقیقت میں رحمت کا امیدوار تو وہی ہے' جس کو اللہ بھی اپنی رحمت کا امیدوار قرار دے۔

آیئے عقل و بصیرت اور کتاب و سنت کی روشنی میں یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ فی الواقع رحمت الٰہی کا امیدوار کہلانے کا مستحق کون ہے۔ امیدوارِ رحمت کی کیا شان ہوتی ہے اور اس کی عملی زندگی پر اس حقیقت کے کیا اثرات پڑتے ہیں۔ رحمت کی امید رکھنے کا دعویٰ تو ہر ایک کرسکتا ہے لیکن یہ بہرحال اطمینان کر لینے کی بات ہے کہ کس کا یہ دعویٰ سچا ہے اور کون محض حماقت اور فریب میں مبتلا ہے۔

آپ اپنی کھیتی سے امید رکھتے ہیں کہ اس سے آپ کو اچھی پیداوار حاصل ہوگی۔ کون کاشتکار ایسا ہوگا جو اپنی کھیتی سے یہ امید نہ رکھے۔ مگر یہ امیدوار اپنی امید میں اسی وقت تو حق بجانب ہوتا ہے' جب انتہائی محنت اور سخت کوشی سے زمین جوتتا ہے' نرم کرتا ہے اور پسینہ بہا بہا کر جب زمین تیار کر لیتا ہے تو پھر اس میں اچھے قسم کے بیج بوتا ہے۔ پھر نلائی اور گڑائی کرتا ہے۔ پھر بجا طور پر اپنے کھیت سے اچھی پیداوار کی آس لگاتا ہے۔ اگر کوئی کاشتکار زمین جوتنے' بونے اور سینچنے کی زحمت ہی نہ اٹھائے' کسی سخت کوشی اور محنت کے لیے تیار ہی نہ ہو' مگر کھیت سے اچھی پیداوار کا امیدوار ہو' تو یہ امید نہیں' حماقت اور نادانی ہے۔

آپ کاروبار کرتے ہیں اور اپنے کاروبار سے نفع کی امید رکھتے ہیں۔ کاروبار سے نفع کی امید پر ہی کاروبار کیا جاتا ہے۔ مگر ہر کاروبار کرنے والا اپنے کاروبار کے لیے ضرورت کے مطابق سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ اپنا وقت لگاتا ہے۔ جسم و جان اور دل و دماغ کی قوتیں لگاتا ہے۔ دلچسپی اور تن دہی سے دوڑ دھوپ کرتا ہے۔ کاروبار کے سارے تقاضے پورے کرتا ہے اور جب خود اسے اطمینان ہو جاتا ہے کہ کاروبار کو کامیاب بنانے کے لیے جو کچھ وہ کر سکتا ہے اس میں اس نے کوتاہی نہیں کی بلکہ محنت اور سوجھ بوجھ کا حق ادا کر دیا تو پھر بجا طور پر وہ اس سے امید لگاتا ہے کہ اسے اللہ کے فضل سے خاطر خواہ نفع حاصل ہوگا۔ اگر کوئی تاجر اپنے کاروبار کے لیے سرے سے کچھ کرے ہی نہیں اور یہ امید رکھے کہ خاطر خواہ نفع حاصل ہوگا تو عقل کی دنیا میں اس کو امید نہیں حماقت اور فریب نفس کہیں گے۔

آپ اعلیٰ امتحانوں میں شریک ہوتے ہیں' امتیازی نمبروں سے کامیابی کی امید رکھتے ہیں۔ اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کے امیدوار ہوتے ہیں۔ بے شک امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیابی کی امید رکھنا ہی چاہیے۔ مگر آپ کی محنت اور عرق ریزی' اللہ اللہ نہ دن کو آرام نہ رات کو سکون' اپنی پیاری نیند اور آرام و راحت کو تج کر ہر وقت آپ تیاری میں غرق رہتے ہیں۔ دنیا اور مافیہا سے بے خبر آپ کو صرف ایک ہی دھن ہوتی ہے۔ کسی طرح اپنا کورس ہضم کر لیں اور پھر بجا طور پر آپ نمایاں کامیابی کے امیدوار ہوتے ہیں۔ اللہ کامیابی سے نوازتا بھی ہے۔ آپ ہی بتائیے اگر آپ کورس کی تیاری میں کوئی محنت نہ کریں' آرام و راحت ہی میں اپنے شب و روز بتاتے رہیں اور نمایاں کامیابی کی امید رکھیں تو یہ امید ہے یا جہالت' یقیناً یہ امید نہیں انتہا درجے کی بے وقوفی ہے۔ دنیا کے معاملات میں جب آپ یا کوئی امیدوار ہوتا ہے تو اس کی امیدواری اسی وقت تسلیم کرتے ہیں' جب وہ اپنے کو امیدوار ثابت کرنے کے سارے تقاضے پورے کرتے ہوئے امیدواری کا دعویٰ کرتا ہے۔ عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ رحمت الٰہی کے امیدوار کو بھی اسی کسوٹی پر پرکھا جائے اور اسی وقت وہ رحمت الٰہی کا امیدوار قرار دیا جائے جب وہ اس امیدواری کے تقاضے بھی پورے کرتا ہو۔

کتاب و سنت کے نزدیک بھی اللہ کی رحمت کا سچا امیدوار وہی ہے جو ایک حقیقت پسند کاشتکار کی طرح ایمان خالص کا بیج اپنے قلب کی سرزمین میں بوئے۔ قلب کو برے خیالات اور گندے جذبات اور مکر و ریا کے جھاڑ جھنکاڑ سے صاف رکھے اور عبادت و ریاضت اور نیکی و حسن سلوک کے پانی سے برابر سینچتا رہے اور مرتے دم تک اپنے قلب کی کھیتی کی حفاظت و نگرانی کرتا رہے۔ ایسے سچے امیدوار کی پہچان یہ ہے کہ ہر نئی صبح وہ دین کی راہ میں کچھ اور آگے ہوگا۔ اس کے دینی جذبات میں کچھ اور نکھار آئے گا خدا ترسی کے کاموں میں وہ پیش پیش ہوگا اور ہر وقت اپنے ایمانی جذبات کی دیکھ بھال اور نگرانی میں چاق و چوبند رہے گا۔ کسی وقت اس پر ایسی غفلت طاری نہ ہوگی کہ

وہ ایمان کی خبر گیری سے بے پروا ہو جائے۔ اس لیے کہ کھیت کی نگرانی چھوڑ دینا اور کھیت سے بے پرواہ ہو جانا مایوسی اور دنیا پرستی کی علامت ہے۔

جو شخص اللہ سے مغفرت کی امید رکھتا ہے اور اس بات کی امید رکھتا ہے کہ اس کا رب اسے جنت کی لازوال نعمتوں سے نوازے گا وہ برابر کوشاں رہے گا کہ اپنے رب کی نظر میں وہ خود کو مغفرت و رضوان اور جنت کی بے مثال نعمتوں کا مستحق بنائے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اللہ سے رحمت و عنایت کی امید بھی کرے اور اس کی اطاعت و عبادت میں سستی بھی دکھائے۔ نافرمانی کی روش اور پھر رحمت کی امید! امید نہیں حماقت اور ڈھٹائی ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ (الاعراف ۷:۱۶۹)

''پھر اگلی نسلوں کے بعد ان کے جانشین وہ لوگ ہوئے جو کتاب الٰہی کے وارث ہو کر اس دنیائے ادنیٰ کے فائدے سمیٹتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں امید ہے کہ ہمیں معاف کر دیا جائے گا۔''

یہ اللہ سے رحمت کی امیدواری نہیں بلکہ جہالت اور ڈھٹائی ہے' رحمت الٰہی تو انہی بندوں پر سایہ فگن ہوتی ہے جو اپنی زندگیوں کو سنوارتے ہیں اور نیک اخلاق و کردار کے مالک ہوتے ہیں۔

اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ

''بے شک اللہ کی رحمت انہی لوگوں سے قریب ہے جو نیکوکار ہیں۔''

اللہ کے رسول ﷺ نے اس شخص کو عقل کا دیوالیہ اور عاجز و درماندہ بتایا ہے' جو خواہشات نفس کے پیچھے پڑا رہے اور اللہ سے طرح طرح کی امیدیں باندھتا رہے۔

وَالْعَاجِزُ مَنِ اتَّبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ. (کتاب الزہد باب ۲۱' ذکر الموت' ص ۴۳۵ ۲۷)

''اور عاجز و درماندہ شخص وہ ہے جو نفس کی خواہشات کے پیچھے لگا ہوا ہے اور اللہ سے طرح طرح کی تمنائیں کرتا ہے۔''

دو لفظوں میں رحمت الٰہی کی امید کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی کے بس میں جو کچھ ہو' اس کے کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کرے اور پھر بھروسہ اللہ پر رکھے اور حالات بظاہر کیسے ہی مایوس کن ہوں' کبھی آس نہ توڑے۔ یعقوب علیہ السلام نے اپنے محبوب بیٹے کو کھو دیا۔ پھر گومگو کی کیفیت کے ساتھ دوسرے بیٹے کو بھی' جو یوسف علیہ السلام کی نشانی تھا' بھائیوں کے ساتھ روانہ کر دیا۔ پھر یہ دل دہلا دینے والی خبر سنی کہ شاہ مصر نے اس کو بھی روک لیا ہے اور بھائی خالی ہاتھ واپس آ گئے ہیں۔ یہ ایسا وقت تھا کہ چاروں طرف مایوسی کی گھٹائیں تھیں۔ بظاہر دور دور تک امید کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن یعقوب علیہ السلام پیغمبر تھے۔ پیغمبرانہ بصیرت رکھتے تھے۔ انہوں نے انہی حالات میں بیٹوں سے کہا:

لَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ ؕ اِنَّهٗ لَا یَایْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکٰفِرُوْنَ۝

(یوسف ۱۲:۸۷)

''دیکھو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا' واقعہ یہ ہے کہ اللہ کی رحمت سے تو وہی لوگ مایوس ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔''

مؤمن کی شان یہی ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ سے رحمت کی امید رکھے اور کسی وقت اور کسی حال میں بھی اس کی رحمت سے مایوس نہ ہو — اس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کی نظر میں خود کو سچا امیدوار رحمت ثابت کرنے کی کوشش کرے اور بس — جو شخص اللہ سے رحمت کی امید رکھتا ہے اللہ اسے کبھی مایوس نہیں کرتا۔ البتہ امیدواروں کی زندگی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۝ (البقرۃ ۲:۲۱۸)

''بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی اور مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔ یہی لوگ حقیقت میں اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ اور اللہ بے پناہ درگزر کرنے والا اور بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے۔''

یہ آیت صاف صاف بتاتی ہے کہ اللہ کی نظر میں کون لوگ واقعی رحمت کے امیدوار ہیں: جو ایمان لائیں' جو اللہ کی راہ میں ہجرت کریں' یعنی اللہ کے دین کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اپنے کاروبار' اپنے خاندان' اپنے وطن اور اپنے وسائل و ذرائع سب قربان کر دیں اور جو اللہ کے دین کی اشاعت کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے ہیں۔

حضرت یحییٰ بن معاذ کہتے ہیں' اس سے بڑی نادانی اور حماقت اور کیا ہوگی کہ آدمی دوزخ کا بیج بوتا رہے اور جنت پانے کی امید رکھے۔ نیکیوں کا مقام پانا چاہے اور بدکاروں کے سے کام کرے۔ نیکی اور بھلائی نہ کرے اور اجر و ثواب کا طالب ہو۔



# مؤمن کا فکر و عمل

دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اپنے رب کا شکر ادا کیجیے کہ اس نے آپ کو ایمان و اسلام کی دولت سے مالا مال فرمایا ہے اور یہ اس کا مزید فضل و احسان ہے کہ اس نے آپ کو ایمان و اسلام کا شعور بخشا ہے۔ آپ محض روایتی مؤمن اور مسلم نہیں ہیں بلکہ شعوری مؤمن و مسلم ہیں اور ایمان و اسلام کو اپنا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے ہیں۔

آپ کا پختہ یقین ہے کہ آپ کا اور سارے انسانوں کا حقیقی معبود ایک اللہ ہے، جس نے ساری کائنات کو پیدا کیا ہے۔ آپ صرف اسی کی عبادت کرتے ہیں۔ اور عملی زندگی میں صرف اسی کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں، آپ کا ایمان ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت و اطاعت کے لائق نہیں۔

آپ صرف اللہ ہی کو اپنا کارساز، حاجت روا، مشکل کشا، فریاد رس اور حامی و ناصر سمجھتے ہیں۔ اسی کو آپ نفع نقصان کا مالک سمجھتے ہیں۔ صرف اسی سے ڈرتے ہیں۔ اسی پر بھروسا کرتے ہیں۔ اسی سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں۔ اسی سے دعائیں مانگتے ہیں۔ مشکل میں صرف اسی کو پکارتے ہیں۔ صرف اسی کی پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ اسی سے فریاد کرتے ہیں اور دل کی گہرائی سے یہ یقین رکھتے ہیں کہ حکم دینے اور منع کرنے کا اختیار صرف اسی کو حاصل ہے۔ اس کے سوا نہ کسی کے پاس کوئی اختیار ہے نہ اقتدار۔ کائنات اسی کی پیدا کی ہوئی ہے اور وہی اس کا مالک و حاکم ہے۔ کسی اور کو قطعاً کوئی حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کے خلاف کسی پر حکم چلانے یا اللہ کے ملک کا مالک بننے کا دعویٰ کرے۔

اسی پختہ اعتقاد کی برکت ہے کہ آپ اپنے نفس کی غلامی سے بھی آزاد ہیں، خاندانی رسم و رواج کی غلامی سے بھی آزاد ہیں، جماعتی اور گروہی تعصبات کے بندھنوں سے بھی آزاد ہیں، برادری کی اونچ نیچ اور رنگ و نسل کے جھگڑوں سے بھی محفوظ ہیں —— انسانوں کی غلامی سے بھی آزاد ہیں اور دوسروں کو اپنا غلام بنانے کی ذہنیت سے بھی آپ کا سینہ پاک ہے۔ آپ کی کوششوں، کاوشوں اور تمناؤں کا مرکز و محور صرف اللہ کی خوشنودی ہے۔ اسی کی پسند آپ کی پسند ہے۔ اسی کی خوشی آپ کی خوشی ہے۔ انفرادی زندگی کی تگ و دو ہو یا اجتماعی زندگی کے معاملات، آپ صرف اسی کی مرضی کو پیش نظر رکھ کر ترک و اختیار کا فیصلہ کرتے ہیں۔ کچھ چھوڑتے ہیں تو صرف اسی کی رضا

کے لیے' کچھ اختیار کرتے ہیں تو صرف اسی کی رضا کے لیے' کسی سے جڑتے ہیں تو صرف اسی کو خوش کرنے کے لیے اور کسی سے کٹتے ہیں تو صرف اسی کو خوش کرنے کے لیے۔

آپ کا یقین ہے کہ آپ کے پاس جو کچھ ہے اسی کا عطا کیا ہوا ہے۔ آپ کو جو کچھ ملا ہے' اسی سے ملا ہے اور ایک دن ضرور وہ اپنی دی ہوئی نعمتوں کا آپ سے حساب لے گا۔ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ دنیا کی کوئی چیز اس سے مخفی نہیں۔ وہ دل کی گہرائیوں میں پیدا ہونے والے وسوسوں سے بھی واقف ہے۔ سب کچھ اسی کے قبضے میں ہے۔ کوئی چیز اس کے قبضے اور اختیار سے باہر نہیں' ہر ایک کو چار و ناچار ایک دن اس کے حضور پہنچنا ہے اور زندگی کا حساب دینا ہے۔ وہ حقیقی منصف ہے' وہ بے لاگ فیصلہ کرے گا اور جو فیصلہ کر دے گا' پھر کوئی نہیں جو اس کے فیصلے کو چیلنج کر سکے' نہ کوئی ایسا زور آور ہے جو اس کے فیصلے کو ٹال سکے اور نہ کوئی اس کا چہیتا اور لاڈلا ہے کہ اس کی سفارش بہر حال اس کو ماننا ہی پڑے۔ سفارش کے لیے اس کے حضور وہی زبان کھول سکے گا جس کو بولنے کی وہ اجازت دے گا۔ وہی کچھ کہہ سکے گا' جو کچھ کہنے کی اجازت دے گا —— اور اسی کے حق میں کہہ سکے گا جس کے حق میں کہنے کی اس کو اجازت مل سکے گی۔ ہر ایک کا وہ ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرے گا۔ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ کرے گا۔ اسی روز حساب سے آپ لرزتے رہتے ہیں اور حتی الامکان کوشش کرتے ہیں' کہ ہر معاملہ میں' ہر قدم پر آپ اللہ کی مرضی کو ہی پیش نظر رکھیں۔ آخرت کی فلاح و کامرانی ہی کو زندگی کا اصل مقصود بنائیں اور کوئی ایسا کام نہ کریں جس کی پاداش میں کل روز حساب رسوائی ہو اور رحم و کرم کرنے والا غضب ناک ہو جائے۔ یہی خوف آپ کو ہر وقت چوکنا رکھتا ہے۔ نفس کی اکساہٹوں کو لگام لگائے رکھتا ہے اور کسی ایسی راہ پر بڑھنے نہیں دیتا جو اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت و قانون کے خلاف ہو۔

پھر آپ کو یہ ایمان و یقین کی دولت بھی حاصل ہے کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں' انسانوں کی ہدایت کے لیے آخری رسول ہیں' آپ ﷺ پر نبوت ختم ہو چکی ہے' آپ ﷺ کے بعد کوئی رسول نہیں آئے گا۔ اب رہتی زندگی تک انسانوں کی ہدایت اور نجات صرف اس میں ہے کہ وہ آپ ﷺ پر سچے دل سے ایمان لائیں۔ خلوص دل سے آپ ﷺ کی پیروی کریں اور زندگی کے ہر معاملہ میں آپ ﷺ کی حیات طیبہ کو اسوۂ حسنہ بنائیں۔ آپ کو یقین ہے' کہ حضرت محمد ﷺ کی اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت ہے اور آپ ﷺ نے قرآن پاک کی شکل میں انسانوں کے سامنے جو ضابطہ حیات پیش کیا ہے وہ مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اس کی کامل پیروی ہی مؤمن کا اصل فریضہ ہے اور اس کے لیے قطعاً گنجائش نہیں ہے کہ وہ زندگی کے کسی انفرادی یا اجتماعی معاملے میں اس کے خلاف کسی اصول یا ضابطے کو برضا و رغبت قبول کرے۔

اسی یقین و ایمان کی برکت ہے کہ آپ اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ اسوۂ رسول ﷺ کے مطابق ڈھالنے کی

کوشش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ کی زندگی میں کوئی کام سنت رسول ﷺ کے خلاف نہ ہو۔ کسی کام کو کرنے اور کسی کام سے رکنے کے لیے آپ صرف یہ دیکھتے ہیں' کہ رسول ﷺ کا حکم و عمل اس سلسلے میں کیا ہے۔ رسول ﷺ سے جو ہدایت آپ کو ملتی ہے' آپ بے چون و چرا اسے تسلیم کرتے ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ اسی حکم کی تعمیل میں دونوں جہاں کی فلاح و کامرانی ہے۔ زندگی کا کوئی معاملہ ہو' عبادات سے لے کر ملک کے اجتماعی مسائل تک' ہر چیز میں آپ کتاب وسنت ہی کو اصل حجت اور سند مانتے ہیں۔ اسوۂ رسول ﷺ ہی کو اصل معیارِ حق تسلیم کرتے ہیں اور جس سے بھی جو معاملہ کرتے ہیں اسی بنیاد پر کرتے ہیں' نہ کسی کی ایسی محبت میں گرفتار ہیں جو حق کی محبت پر غالب ہو اور نہ کسی گروہ یا فرقے کے تعصب میں مبتلا ہیں۔ ہر ایک کو قرآن وسنت کی کسوٹی پر جانچ کر اسی لحاظ سے اس کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔

اللہ کا شکر ادا کیجیے' کہ آپ اللہ اور رسول ﷺ پر شعوری ایمان رکھتے ہیں اور حتی الامکان زندگی کے ہر مرحلے میں ایمان کے تقاضے پورے کرنے کی اپنی سی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ کے دین کا علم حاصل کرنے اور حدود اللہ سے واقف ہونے کی مسلسل سعی کرتے ہیں۔ آداب و شرائط کے ساتھ عبادت کا اہتمام کرتے ہیں۔ گھریلو اور خاندانی زندگی میں اللہ کے احکام پر دلی رغبت کے ساتھ عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بے جا رسوم و رواج اور غیر دینی مشغلوں اور دلچسپیوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ ہر قسم کے جاہلی تعصبات اور جھگڑوں سے دور رہتے ہیں اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ آپ کی زندگی اسلام کا سچا نمونہ ہے۔

پھر اللہ نے آپ کو یہ شعور بھی بخشا ہے کہ مؤمن اور مسلم ہونے کے ناطے آپ اسلام کے نمائندے اور ترجمان بھی ہیں اور آپ برابر کوشش کرتے رہتے ہیں کہ اللہ کے غافل بندوں تک اللہ کا دین پہنچائیں۔ دین کے تقاضے ان پر واضح کریں۔ آپ اپنا دینی اور منصبی فرض سمجھتے ہیں کہ اللہ نے ایمان واسلام کی جو نعمت آپ کو عطا فرمائی ہے وہ آپ اس کے بندوں کے سامنے پیش کریں اور انہیں دعوت دیں کہ اسی کو قبول کرنے اور اسی کے مطابق زندگی گزارنے میں دونوں جہان کی بھلائی ہے۔ بندوں کا حق بھی ہے' اللہ کا عائد کیا ہوا فرض بھی اور آپ کے ایمان واسلام کا تقاضا بھی اور یہ اللہ کا احسان وکرم ہے کہ اس نے آپ کو اس فریضے کے ادا کرنے کی بھی توفیق دے رکھی ہے۔ آپ نہ صرف اپنے قول سے حق کو سمجھانے اور واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں' بلکہ اپنے عمل سے بھی حق کو پیش کرنے کے حریص ہیں۔ آپ کی خواہش ہی نہیں بلکہ کوشش ہوتی ہے کہ آپ کی عملی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے لوگ دینِ حق کو سمجھیں اور اس کی طرف کھنچیں۔

بے شک قول و عمل کی زندگی میں آپ سے کوتاہیاں بھی ہوتی ہیں' خطائیں بھی ہوتی ہیں۔ کمزوریوں کا صدور بھی ہوتا ہے۔ سستی' غفلت اور لاپروائی میں بھی آپ مبتلا ہو جاتے ہیں' لیکن اللہ کا شکر ادا کیجیے' آپ گر گر کر پھر اٹھتے

ہیں اور کبھی منزل کی طرف سے منہ نہیں موڑتے ہمیشہ آپ کا رخ سیدھا منزل کی جانب رہتا ہے۔ آپ کو اطمینان و یقین کی یہ ٹھنڈک حاصل ہے کہ میری راہ بہر حال یہی ہے۔ ایمان و اسلام اور دین کی اشاعت و دعوت ایسی چیز نہیں ہے کہ جب چاہیں اسے اختیار کر لیں اور جب چاہیں اسے چھوڑ بیٹھیں۔ جب لوگ استقبال کریں' داد دیں اور اس کے ذریعہ عزت و منصب ملنے کی توقعات ہوں تو مؤمن و مسلم اور داعیِ دین بن کر پیش پیش رہیں اور جب مصائب و آلام راستہ روکیں' حالات ناساز گار ہو جائیں اور لوگ استقبال کرنے کے بجائے کترانے لگیں تو سب کچھ چھوڑ کر اللہ سے غافل لوگوں کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں۔ جی نہیں' مؤمن کا یہ مقام اور شان نہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ آپ کو اپنے مقام اور اپنی شان کا احساس ہے اور آپ نے یہ اٹل فیصلہ کر رکھا ہے کہ جئیں گے تو اسلام پر اور مریں گے تو ایمان پر ــــ اسلام پر عمل کرنے اور اسلام کی اشاعت کا فرض وقتی' ہنگامی و عارضی نہیں ہے۔ مؤمن کو زندگی بھر یہی کرنا ہے۔ دل کی پوری رغبت کے ساتھ کرنا ہے اور ہر حال میں کرنا ہے۔

اپنے فرائض کا زندہ احساس رکھنے اور دین حق کی ترجمانی کا فریضہ انجام دینے کے باوجود اگر کچھ لوگ آپ سے مایوسی کا اظہار کرتے ہیں تو ہرگز فکر نہ کیجیے۔ شاید ان کے دلوں کو مایوسی کا روگ ہے۔ تشویش کی بات یہ نہیں ہے کہ کچھ لوگ آپ سے مایوس ہیں۔ تشویش کی بات یہ ہوگی کہ آپ اپنی ذات سے مایوس ہو جائیں ــــ اگر آپ اپنی ذات سے مایوس نہیں ہیں تو یقین کیجیے کہ اللہ کو ایک ایک خیال اور ایک ایک لمحہ کی خبر ہے اور وہ اپنے بندوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ ان بندوں کو بھی اپنی طرف سے خوش گمان رہنے کی تلقین کرتا ہے جو کبھی جذبات سے مغلوب ہو کر اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھتے ہیں۔ آپ کا معاملہ بندوں سے نہیں اللہ سے ہے' اجر دینے والا اللہ ہے اور وہ کسی کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ وہ انتہائی کشادہ دل' نہایت عالی ظرف' سب کچھ معاف کر دینے والا اور بے پناہ نوازنے والا ہے۔ پس اللہ پر بھروسا کیجیے اور صرف اسی کی خوشنودی کی فکر کیجیے۔



# عزت وذلت کے فیصلے اللہ کرتا ہے



حالات اللہ کی چٹکی میں ہیں۔ وہی شب وروز کا الٹ پھیر کر رہا ہے۔ حالات کی تبدیلیاں' انقلابات وتغیرات سب اسی کی قدرت وحکمت کے کرشمے ہیں۔ اور اس میں زبردست سامان عبرت ہے' مگر صرف اس کے لیے جس کے پاس دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔

يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ؀ (النور۲۴:۴۴)

''رات دن کا الٹ پھیر اللہ ہی کرتا ہے' اس میں سامانِ عبرت ہے' ان کے لیے جو آنکھوں سے کام لیں۔''

کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے' اللہ ہی کی مشیت' حکمت اور ارادے سے ہو رہا ہے۔ یہاں صرف اسی کا حکم چل رہا ہے' اس کے حضور سب بے بس اور بے اختیار ہیں' عزت وذلت' اقتدار اور محکومی' قوت وبے بسی' رفعت و پستی سب کچھ اسی کے قبضے میں ہے۔ وہ ہر آن اپنی مخلوق کے بارے میں فیصلے کرتا رہتا ہے' ہر لمحہ اس کی ایک نئی شان ہے اور کوئی نیا منصوبہ زیر تجویز ہے۔

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ؀ (الرحمٰن۵۵:۲۹)

''ہر روز اس کی ایک نئی شان ہے۔''

یہاں جو کچھ ہوتا ہے' اسی کے منصوبے کے تحت ہوتا ہے' حالات کی باگ ڈور اسی کے قبضے میں ہے۔ دنیا میں صرف اسی کے منصوبے نافذ ہوتے ہیں اور کسی کی مجال نہیں کہ کوئی اس کے فیصلوں میں دم مار سکے۔ جس کسی کو کچھ ملتا ہے اسی کے حکم سے ملتا ہے' جس کسی سے کچھ چھنتا ہے اسی کے حکم سے چھنتا ہے۔ جس کو وہ دے اس سے کوئی چھین نہیں سکتا اور جس سے وہ چھینے اس کو کوئی دے نہیں سکتا۔ قوت واقتدار کا مالک صرف وہی ہے۔ کسی اور کو ذرّہ برابر کوئی اختیار نہیں۔ اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو جس دعا کی تلقین فرمائی ہے وہ بار بار دہرانے کے قابل ہے:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ

وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (آل عمران ۳:۲۶)

''کہیے! یا اللہ! اقتدار کے مالک' تو جسے چاہے حکومت دے' جس سے چاہے حکومت چھین لے' جسے چاہے عزت بخشے' جسے چاہے ذلیل کر دے' بھلائی تیرے ہی اختیار میں ہے' بلاشبہ تو ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔''

یہ عقیدہ اگر کسی دل میں مضبوط جما ہوا ہے' تو وہ صبر وثبات کا پیکر ہوتا ہے۔ اس کی بصیرت اسے کبھی مضمحل نہیں ہونے دیتی' وہ زمین پر ہونے والے تغیرات اور حادثات سے خیر کی توقع رکھتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ زمین کے سینے پر جو کچھ ہو رہا ہے اس کا منصوبہ بظاہر انسان بناتے نظر آتے ہیں' لیکن درحقیقت اصل منصوبہ ساز وہ اللہ ہے جو تنہا اس کائنات پر حکومت کر رہا ہے۔

کنعان کے ویرانے میں ایک نوعمر لڑکے کو اس کے بھائی ایک اندھیرے کنوئیں میں ڈال دیتے ہیں اور اپنی دانست میں یہ سمجھتے ہیں' کہ ہم نے اس کا کام تمام کر دیا' یہ کانٹا ہمارے دلوں سے ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔ پھر وہ اس کی ہلاکت اور موت کی داستان خون سے تصنیف کر کے باپ کو سناتے ہیں اور رو پیٹ کر اپنے بوڑھے باپ کو ہر طرح اپنی سچائی کا یقین دلانا چاہتے ہیں۔

وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ○ قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ○ وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ

(یوسف ۱۲:۱۶۔۱۸)

''شام کو وہ روتے پیٹتے اپنے باپ کے پاس آئے اور کہا' ابا جان! ہم دوڑ کر مقابلہ کرنے میں لگ گئے تھے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا' کہ اتنے میں بھیڑیا آ کر اسے کھا گیا۔ آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے چاہے ہم سچے ہی ہوں اور وہ اس کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لے آئے تھے۔''

بوڑھے یعقوب علیہ السلام اللہ کے پیغمبر تھے' انہیں اللہ نے پیغمبرانہ بصیرت سے نوازا تھا' انہیں یہ پختہ یقین حاصل تھا' کہ اصل منصوبہ ساز اللہ ہے۔ وہی شر میں خیر پیدا کرتا ہے۔ جو کچھ پیدا ہوتا ہے اسی کے اشارے سے ہوتا ہے۔ بندہ مومن کو کبھی اپنے اللہ سے مایوس نہ ہونا چاہیے' لہٰذا انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا:

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ○

(یوسف ۱۲:۱۸)

''بلکہ تمہارے نفس نے تمہارے ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا۔ اچھا صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا۔
جو بات تم بتا رہے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جاسکتی ہے۔''

اللہ اپنے منصوبوں کو پورا کرنے کے لیے نہایت باریک تدبیریں اختیار فرماتا ہے۔ عام حالات میں ان تدبیروں تک انسان کی نگاہیں نہیں پہنچ پاتیں اور انسان نہیں سوچ پاتا کہ حالات میں ایسا حیرت انگیز تغیر بھی ہوسکتا ہے' انسانی عقل باور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی کہ کوئی غیر معمولی نتیجہ بھی سامنے آسکتا ہے۔

کون کہہ سکتا تھا کہ کنعان کے کنوئیں کی تہہ سے مصر کا تخت ابھرے گا اور کنوئیں کی تہہ میں پڑا ہوا بے بس' مظلوم' نوعمر لڑکا کل مصر کے اقتدار کا مالک بنے گا۔ کون یقین کرسکتا تھا کہ کنوئیں میں ڈالا جانا' مصر کے بازار میں فروخت ہونا' عزیز مصر کے گھر میں الزام لگنا' مصر کی جیل میں چند سال قیدی بن کر رہنا' یہ سب مصر کی بادشاہت تک پہنچنے کے مرحلے تھے۔

اللہ کا منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچا اور یوسف کو مصر کی خلافت سے نوازا گیا۔

اس طرح ہم نے اس زمین میں یوسف کے اقتدار کی راہ ہموار کی' وہ مختار تھا کہ جہاں بھی چاہے اس میں اپنی جگہ بنائے۔ ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں' نیک لوگوں کا اجر ہمارے یہاں مارا نہیں جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ منصوبہ بھی اللہ ہی بناتا ہے' اس کے لیے بہترین اور کامیاب تدبیریں بھی وہی سوچتا ہے اور کامیابی کے سارے اسباب بھی وہی فراہم کرتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ بندہ صحیح سمت سفر اختیار کیے رہے' اللہ کی بتائی ہوئی راہ پر یکسوئی کے ساتھ جما رہے اور ہر حال میں اللہ پر بھروسا رکھے — اگر وہ کمزور اور بے سہارا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ خود اس کے لیے وسائل فراہم فرماتا ہے' خود حالات کو سازگار بناتا ہے اور اس کے استحقاق سے زیادہ اس پر نوازش وکرم کی بارش فرماتا ہے۔

انسان کی نگاہ بہت کوتاہ ہے۔ اس کا ظرف بہت چھوٹا ہے۔ وہ چند روز عیش وعشرت اور عارضی اقتدار وعزت میں بدمست ہوکر اپنی حیثیت کو بھول جاتا ہے۔ وہ اس غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ حالات کو بنانے بگاڑنے کا اختیار اس کو حاصل ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ مالک کائنات کے آگے وہ بے بس اور بے اختیار ہے۔ یہ حقیقت اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے کہ اس کا تخت اقتدار قدرت کی ایک معمولی ٹھوکر سے الٹ سکتا ہے۔ اقتدار کا مالک انسان نہیں بلکہ اللہ ہے۔

اللہ کے بندوں پر ظلم وستم توڑنے والے' اللہ کے بندوں کے ساتھ ناانصافی کرنے والے اور اپنے

اقتدار کے نشہ میں بدمست ہوکر اللہ کے بندوں کی عزت وآبرو سے کھیلنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ کی پکڑ نہایت سخت ہے۔ وہ ضرور ڈھیل دیتا ہے' مگر اس کی بھی ایک حد ہے' وہ یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کے بندے ظلم وستم کی چکی میں بس پستے ہی رہیں' ظلم وناانصافی کرنے والے دنیا ہی میں اپنے کئے کا عبرتناک انجام دیکھ لیتے ہیں اور اللہ کے مظلوم اور بے گناہ بندوں پر اللہ ایسی عنایتیں فرماتا ہے' جن کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے' حالات کو اس طرح ان کے لیے سازگار کر دیتا ہے کہ وہ بھی حیران ہوکر بے اختیار سجدہ شکر بجالاتے ہیں۔



# آپ کی تین مطلوب نعمتیں

قوت و بہادری' دولت وتونگری اور عزت و وقعت وہ بے بہا نعمتیں ہیں جو ہر انسان کی مطلوب ومحبوب ہیں۔ ہر دل میں ان کی آرزو ہے اور ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کی شخصیت ان نعمتوں سے آراستہ ہو۔ اس خواہش اور آرزو میں کم وبیش سارے انسان برابر کے شریک ہیں' بلکہ ہر ایک نعمتوں کو حاصل کرنے کے لیے اپنی سی کوشش بھی کر رہا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ آرزو یا کوشش ناپسندیدہ ہے۔

یہ ایک فطری جذبہ اور قدرتی داعیہ ہے کہ ہر انسان قوت وطاقت اور ہمت و بہادری میں دوسروں سے آگے بڑھنا چاہتا ہے' وہ چاہتا ہے کہ کوئی مخالف طاقت اس سے ٹکر لینے کی ہمت نہ کرے اور اگر ٹکرائے تو وہ پاش پاش ہو جائے اور اس کے پائے استقامت میں کوئی لغزش نہ آئے۔ ہر شخص اپنی شخصیت کو اس گراں قدر جوہر سے مالا مال دیکھنا چاہتا ہے اور قوت وشجاعت' ہمت وعزیمت کا پیکر بن کر زندگی گزارنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ کوئی شخص بھی یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ کمزور' تھڑ دلا' بے ہمت' ڈرپوک اور بزدل کہلائے اور کوئی اسے کمزور سمجھ کر اس پر اپنا دباؤ جتائے یا اس کی طرف کسی کمزوری اور بے ہمتی کی نسبت کی جائے۔

اگر آپ کی یہ خواہش ہے کہ آپ طاقتور اور توانا ہوں' کڑی سے کڑی آزمائشوں میں پامردی دکھائیں —— اور اپنے اصولوں کی راہ میں آنے والی ہر مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کریں اور کبھی کسی کا ناجائز دباؤ قبول کر کے شکست نہ کھائیں' تو بے شک یہ بڑی خوبی کی بات ہے' مگر تعجب کی بات نہیں' اس لیے کہ اس خواہش میں آپ منفرد نہیں ہیں۔ ہر ہوش منداسی طرح سوچتا ہے اور یہی خواہش رکھتا ہے۔

پھر اس آرزو میں بھی سارے انسان برابر کے شریک ہیں کہ وہ دولت وثروت حاصل کریں۔ غنی اور دولت مند بنیں' کسی وقت بھی کسی کے دست نگر نہ ہوں' کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائیں' حرص ولالچ سے ان کا دامن پاک ہو اور قناعت' استغنا سے ان کی شخصیت بھاری بھرکم رہے' کسی سے کچھ چاہنے کے بجائے دوسروں کو دے کر وہ مسرت واطمینان محسوس کریں —— یقیناً آپ بھی اسی طرح سوچتے ہوں گے اور یہی خواہش آپ کے دل میں بھی کروٹ لیتی رہتی ہوگی' بے شک آپ کی یہ آرزو ہے۔ کوئی بھی ہوش منداس کو غلط اور بے جا نہیں کہہ سکتا اور اس

خواہش و آرزو میں بھی آپ اکیلے نہیں ہیں۔ بلکہ کم و بیش ہر صاحب بصیرت کا انداز فکر یہی ہوتا ہے اور یہی ہونا چاہیے۔

تیسری چیز عزت و وقعت ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے عزت و وقعت حاصل ہو آپ عمر کے کسی مرحلے میں ہوں، سماج میں آپ کسی رتبے کے مالک ہوں، منصب و علم کے لحاظ سے آپ کا کچھ ہی مقام ہو، خاندانی اعتبار سے آپ کوئی مرتبہ رکھتے ہوں، یہ خواہش بجا طور پر آپ کے دل میں ہوگی اور ہونی چاہیے کہ لوگوں میں آپ کی عزت ہو کوئی آپ کو حقارت و ذلت کی نظر سے نہ دیکھے، ہر دل میں آپ کا احترام ہو اور کوئی بھی آپ کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرے جس سے آپ کی شخصیت مجروح ہو یا آپ کی عزتِ نفس کو ٹھیس لگے۔

خاندان میں آپ وقعت کی نظر سے دیکھے جائیں، سماج میں آپ کو عزت حاصل ہو، دوستوں میں آپ کا احترام کیا جائے، چھوٹے آپ کا ادب کریں، بڑے آپ کو وقعت و اہمیت دیں اور جس شعبے میں بھی ہوں، وہاں آپ کو عزت و احترام کی دولت حاصل رہے۔ یقیناً یہ ایک پسندیدہ خواہش ہے۔ مطلوب اور محبوب تمنا ہے اور کوئی صاحب دانش نہیں کہہ سکتا کہ آپ ایسا سوچنے اور جاننے میں حق بجانب نہیں ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ آپ یہ تینوں بیش بہا نعمتیں کیسے حاصل کریں۔ آپ قوت و بہادری کا پیکر کیسے بنیں اور کیا کریں کہ کوئی مخالف قوت آپ کو زیر نہ کر سکے — اور آپ کی جواں مردی اور شجاعت کا لوہا مان سکے — پھر آپ کیا کریں کہ آپ واقعی سب سے بڑے غنی اور دولت مند بن جائیں، آپ کے دل کو استغنا اور قناعت کی دولت حاصل ہو اور لالچ و حرص کا سایہ بھی آپ کی اخلاقی زندگی پر نہ پڑ سکے۔

اسی طرح آپ کیا تدابیر اختیار کریں کہ ہر دل میں آپ کے لیے عزت و وقعت کا مقام ہو، کوئی نظر آپ کو ذلت و حقارت سے نہ دیکھے اور سماج میں ہر جگہ آپ معزز و محترم سمجھے جائیں۔

اس سوال کو حل کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ اپنی عقل و بصیرت پر اعتماد کریں — سوچیں اور تجربات کریں۔ دوسرا حل یہ ہے کہ دوسرے اصحاب علم و بصیرت کی رایوں، مشوروں اور تجربوں سے فائدہ اٹھائیں اور ان کی روشنی میں اپنے لیے لائحہ عمل طے کریں۔

ان میں سے ہر طریقہ عمل میں غلطی کا امکان ہے — اور یہ ہو سکتا ہے کہ کوشش یا کاوش کے باوجود آپ اپنے مقصود کے حصول میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس لیے کہ انسان کی فکر ہو یا تجربہ، دونوں میں غلط فہمی اور غلطی کا امکان ہے اور آپ کی کوششیں رائیگاں جا سکتی ہیں۔

اس سوال کا ایک ہی حل ہے جو یقینی طور پر صحیح ہے، جس پر آپ کامل اطمینان کر سکتے ہیں اور لازمی طور پر اپنی منزل مقصود کو پا سکتے ہیں۔

اللہ کا شکر ہے آپ مسلمان ہیں۔ زندگی کے ہر معاملہ میں آپ نے حضرت محمد ﷺ کو اپنا رہنما تسلیم کرلیا ہے۔ آپ کو ان کی رہنمائی پر مکمل یقین واعتماد ہے اور آپ کا ایمان ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے جو کچھ بتایا ہے اللہ کی طرف سے بتایا ہے۔ جو ہدایت دی ہے اللہ کی روشنی میں دی ہے ــــ اور آپ ﷺ کی تعلیمات میں شک اور تذبذب کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

پھر یہ بھی آپ کا ایمان ہے کہ حضرت محمد ﷺ اخلاق کے سب سے بڑے معلم اور انسانی فطرت کے سب سے بڑے نباض ہیں۔ وہ انسان کے جذبات اور آرزوؤں سے بھی کامل واقفیت رکھتے ہیں اور علم الٰہی کی روشنی میں ان کی تکمیل کی یقینی تدبیر سے بھی واقف ہیں۔

اس ایمان وتعلق کا کھلا ثبوت ہے کہ آپ ادھر ادھر بھٹکنے اور پریشان ہونے کے بجائے ایک سچے اور وفادار مؤمن کی حیثیت سے اپنے رسول ﷺ ہی کی طرف رجوع کریں اور آپ ﷺ ہی سے اپنے سوال کا حل طلب کریں۔ پھر اللہ کے رسول ﷺ جو کچھ آپ کو تعلیم دیں اس پر سچے دل سے پختہ یقین کے ساتھ عمل کریں اور یہ اطمینان رکھیں کہ آپ ﷺ کی ہدایت پر عمل کرکے اپنے مطلوب کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔

اس خاص مسئلہ میں رسول پاک ﷺ کی ہدایت پر عمل کرکے آپ سب سے بڑے طاقتور بھی بن سکتے ہیں۔ سب سے بڑے خوش حال اور غنی بھی بن سکتے ہیں اور سب سے بڑے عزت واکرام کے مالک بھی بن سکتے ہیں۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

مَنْ اَحَبَّ اَنْ یَّکُوْنَ اَقْوَی النَّاسِ فَلْیَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ وَمَنْ اَحَبَّ اَنْ یَّکُوْنَ اَغْنَی النَّاسِ فَلْیَکُنْ بِمَا فِیْ یَدِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ اَوْثَقَ مِنْہُ بِمَا فِیْ یَدَیْہِ وَمَنْ اَحَبَّ اَنْ یَّکُوْنَ اَکْرَمَ النَّاسِ فَلْیَتَّقِ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ۔

''جو شخص چاہتا ہو کہ سارے لوگوں سے زیادہ طاقت ور ہو جائے اسے چاہیے کہ اللہ پر توکل کرے اور جو شخص چاہتا ہو کہ سب سے بڑھ کر غنی ہو جائے اسے چاہیے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے اس پر زیادہ بھروسا کرے بہ نسبت اس چیز کے جو اس کے قبضہ میں ہے اور جو شخص چاہتا ہو کہ سب سے زیادہ عزت واکرام والا ہو جائے تو اسے چاہیے کہ اللہ بلند وبرتر سے ڈرے۔''

اللہ پر توکل، جو اللہ کے پاس ہے اس پر کامل اعتماد اور اللہ کا خوف یہ تین باتیں جس خوش نصیب نے حاصل کرلیں، وہ ایسا طاقتور ہے جسے کوئی زیر نہیں کرسکتا، وہ ایسا غنی ہے جسے کسی لالچ سے مرعوب نہیں کیا جاسکتا، وہ ایسا معزز ومکرم ہے جس پر کوئی حقارت کی نظر ڈالنے کی گستاخی نہیں کرسکتا۔

# زندگی کا حاصل

آپ مصنف ہوں یا محقق‘ طالب علم ہوں یا استاذ‘ ادیب ہوں یا شاعر‘ مقرر ہوں یا مفکر‘ سائنس داں ہوں یا صنعت کار‘ عالم ہوں یا صوفی‘ جج ہوں یا وکیل‘ کچھ بھی ہوں‘ یہ یقین کر لیجئے کہ اگر آپ نے قرآن حکیم نہیں پڑھا ہے تو آپ علم سے محروم ہیں۔ آپ علم کی چاشنی سے نابلد ہیں اور آپ کو ابھی علم کا سرا بھی نہیں ملا ہے۔ علم کا سرچشمہ قرآن ہے۔ علم کی شاہ کلید قرآن ہے اور وہ شخص یقیناً علم سے محروم ہے جو قرآن سے محروم ہے۔ قرآن ہی سے آپ کو حقیقت کا سراغ مل سکتا ہے۔ قرآن ہی آپ کی علمی پیاس بجھا سکتا ہے۔ قرآن ہی آپ کے ذوق علم کی تسکین کر سکتا ہے اور اگر آپ کلام کے جوہر شناس ہیں تو قرآن ہی آپ پر کلام کے جوہر آشکارا کر سکتا ہے۔

قرآن سے شغف زندگی کا حاصل ہے۔ اس میں غور وفکر انسانیت کی معراج ہے اور اس کی روشنی میں اپنی شخصیت کی تعمیر سعادت وخوش بختی کا راز ہے۔ اس سے ہدایت حاصل کرنا دانشمندی اور اس کی ہدایت پر چلنا کامیابی کی ضمانت ہے۔

اس خوش نصیب کی قسمت پر جتنا رشک کیا جائے کم ہے‘ جسے اللہ نے قرآن پاک کا شغف بخشا ہے‘ اسے پڑھنے‘ سننے اور اس میں غور وفکر کا موقع عنایت فرمایا ہے اور یہ توفیق عطا فرمائی ہے کہ وہ اس کی روشنی میں اپنی شخصی‘ خاندانی‘ سماجی اور ملکی زندگی کی تعمیر کرے اور اسی طرح اس محروم کی زندگی پر جتنا افسوس کریں کم ہے‘ جسے اللہ نے سوجھ بوجھ عطا فرمائی‘ پڑھنے لکھنے کا موقع عنایت فرمایا لیکن پھر بھی وہ قرآن کے علم سے محروم ہے اور اگر اسے اپنی محرومی کا احساس بھی نہیں ہے تو خون کے آنسوؤں سے بھی اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

قرآن عجیب وغریب کتاب ہے اور روئے زمین پر یہی ایک کتاب ہے جسے حقیقت میں کتاب کہا جا سکتا ہے۔ ہر حیثیت سے یہ کامل اور مکمل ہے اور اپنے موضوع پر جامع‘ مستند اور حرف آخر ہے۔ آپ دنیا کی کوئی کتاب پڑھیں‘ کسی فن کا مطالعہ کریں۔ بے شک آپ کی معلومات میں کچھ اضافہ ہوگا۔ کچھ دماغی اور ذہنی صلاحیتوں میں اضافہ ہوگا۔ کچھ فنی اصول وضوابط معلوم ہوں گے۔ کسی قدر سوجھ بوجھ سے کام لینے کے آپ عادی ہو جائیں گے۔ لیکن آپ کا دل بدل جائے‘ آپ کی شخصیت بدل جائے‘ آپ کے اندرون میں منظم اور کامل انقلاب آ جائے‘

آپ کی زندگی کی قدریں بدل جائیں' آپ کے فکر ونظر کے زاویے بدل جائیں' ترک واختیار کے معیار بدل جائیں' آپ کی زندگی کا رخ بدل جائے' تو یہ کام دنیا کی کوئی کتاب نہیں کرسکتی۔ یہ کمال قرآن کو حاصل ہے اور صرف قرآن کو۔

دراصل زندگی کے بگاڑ یا بناؤ کا دارومدار دل پر ہے۔ شخصیت کی تعمیر ہو یا تخریب' اس معاملہ میں دل کا عمل ہی فیصلہ کن ہوتا ہے۔ دل اگر صحت مند ہے تو پوری زندگی صحت مند ہے۔ دل اگر مریض ہے تو پوری زندگی مرض کا شکار ہے —— دل کا رخ صحیح ہے تو زندگی کا رخ صحیح ہے اور اگر دل کا رخ غلط ہے تو پوری زندگی کا رخ غلط ہے۔ دل ہی جذبات کی آماجگاہ ہے۔ وہی ارادوں کا مخزن ہے اور ہر اقدام کا فیصلہ دل ہی کی دنیا میں ہوتا ہے۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''سنو! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے' جب وہ سدھر جاتا ہے تو پوری شخصیت سدھر جاتی ہے اور جب یہ بگڑ جاتا ہے تو پوری شخصیت بگڑ جاتی ہے —— سن لو! کہ یہ ٹکڑا دل ہے۔''

(بخاری' کتاب الایمان' باب ۳۹' فضل من استبرأ لدینہ' ص ۶)

دل کی یہ اہمیت نگاہ میں رکھیے اور یہ بات بھی ذہن میں تازہ کرلیجئے کہ روئے زمین پر دل سے خطاب کرنے والی اور دل کو موضوع بنانے والی اور دل کی اصلاح کو نشانہ بنانے والی کتاب صرف قرآن ہے۔

قرآن براہ راست دل کو چھوتا ہے' دل پر اثر انداز ہوتا ہے' دل کی گرہیں کھولتا ہے' دل کی آنکھیں روشن کرتا ہے اور دل کی دنیا میں انقلاب لاتا ہے۔ انسان کے اندرون کو بدلتا ہے اور دھیرے دھیرے اس کتاب کی عظمت و ہیبت کا دل پر ایسا سکہ جمتا ہے کہ تلاوت کے وقت دل لرزنے لگتا ہے' آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے آدمی خود کو کسی دوسری دنیا میں محسوس کرتا ہے۔

پھر جس قدر آپ کا شغف اس کتاب سے بڑھتا جائے گا' آپ کا رواں رواں اس یقین کی حلاوت محسوس کرے گا کہ شغف کے لائق اگر کوئی کتاب ہے تو وہ صرف قرآن ہے اور جسے اللہ نے علم وہدایت کا ذوق بخشا ہے اس کا دل پکارے گا کہ مطالعہ کے لائق اگر روئے زمین پر کوئی کتاب ہے تو وہ صرف یہی کتاب ہے۔ کس قدر عبرتناک ہے اس شخص کی نادانی جسے اللہ نے سوجھ بوجھ اور علم وفن کا ذوق بخشا ہے اور پھر بھی اس کا محبوب مشغلہ تلاوت قرآن کے سوا کچھ اور ہے۔

دنیا کی یہ زندگی چند لمحوں کی زندگی ہے' جو صرف ایک ہی بار ملتی ہے۔ چھن جانے کے بعد پھر کبھی نہیں ملتی۔ جو شخص اس مختصر وقفہ کو سچے موتی حاصل کرنے کے بجائے بے قیمت سنگریزوں کے بٹورنے اور ان سے کھیلنے میں ضائع کرتا ہے' اس کی نادانی کا کوئی ٹھکانا ہے؟

اگر اب تک آپ نے یہ عجیب و غریب انقلابی کتاب نہیں پڑھی ہے تو اس سانحہ پر خون کے آنسو بہانے سے بھی افسوس کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ دیر نہ کیجیے اگلے لمحے کی کچھ خبر نہیں۔ طے کر لیجیے کہ یہ کتاب آپ کو پڑھنا ہے۔ پڑھنے کی طرح پڑھنا ہے۔ پڑھنے کا حق ادا کرنا ہے اور پھر یکسوئی کے ساتھ اس کی تلاوت میں لگ جائیے۔ یہ آپ کی روح کو گرمائے گی۔ آپ کے ضمیر کو جھنجھوڑے گی۔ آپ کے دل سے خطاب کرے گی اور خاموشی سے آپ کے دل میں بات اتارے گی کہ آپ کیا ہیں؟ آپ کا آغاز کیا ہے' آپ کا انجام کیا ہے' آپ دنیا میں کیوں آئے ہیں' یہ دنیا کیا ہے؟ اس کا بنانے والا کون ہے۔ اس سے آپ کا تعلق کیا ہے۔ اس مختصر زندگی میں آپ کو کیا حاصل کرنا ہے' کیوں حاصل کرنا ہے۔ آپ کی حقیقی منزل کیا ہے— آپ اپنی منزل پر کامیابی کے ساتھ کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ آپ کی شخصیت کے چہرے پر کہاں کہاں داغ ہیں۔ یہ داغ کیوں ہیں اور ان کو صاف کرنے کی تدبیریں کیا ہیں۔ آپ زندگی کی تعمیر کن بنیادوں پر کریں' اپنی شخصیت کی تکمیل کے لیے کس طرح زندگی گزاریں اور ایک کامیاب انسان بننے کے لیے آپ کیا رویہ اختیار کریں۔ پھر قرآن پاک صرف رہنمائی اور تعلیم کا فریضہ ہی انجام نہیں دیتا بلکہ وہ اپنی تعلیم اور رہنمائی پر کاربند ہونے کی داخلی قوت بھی فراہم کرتا ہے۔ اپنی حقیقتوں کو جذب کرنے کی توانائی بھی بخشتا ہے— اپنی تعلیمات پر جمنے' ان تعلیمات کے مطابق عملی زندگی بنانے کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔ عزم و حوصلہ بھی دیتا ہے اور برابر آگے بڑھتے رہنے کے لیے مسلسل آمادہ بھی کرتا رہتا ہے— قرآن منزل بھی دکھاتا ہے— منزل تک پہنچانے کے لیے رہنمائی بھی کرتا رہتا ہے— اپنی رہبری میں منزل تک پہنچاتا بھی ہے— اور منزل تک پہنچنے کے لیے داخلی قوت اور توانائی بھی بخشتا ہے— یہ خوبی قرآن کے علاوہ دنیا کی کسی کتاب کو حاصل نہیں ہے۔

مگر یاد رکھیے کہ قرآن سے کچھ لینے کے لیے اپنے آپ کو مستحق بنائے بغیر آپ کچھ نہیں لے سکتے— اور اس کی تلاوت کا حق ادا کیے بغیر آپ اس سے کچھ نہیں پا سکتے۔ کچھ پانا تو درکنار اگر آپ اس کی تلاوت لاپروائی اور جذبہ اطاعت کے بغیر کسی اور مقصد کے لیے کرتے رہے تو یقین کر لیجیے کہ آپ عبرتناک گھاٹے کی طرف رواں دواں ہیں۔ آپ ہدایت کی راہ پر نہیں ہیں بلکہ ہدایت سے برابر دور ہو رہے ہیں۔ آپ کے دل کی آنکھیں برابر بے نور ہو رہی ہیں اور آپ ایک عظیم دولت کو ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے بڑے دیوانے بن گئے ہیں— کتنی عبرتناک ہے اس بدنصیب کی موت جو چشمہ شیریں کے کنارے کھڑے کھڑے پیاس کی شدت سے تڑپ تڑپ کر جان دے دے۔

اگر اللہ نے آپ کے ہاتھ میں قرآن دے دیا ہے تو یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ اللہ آپ پر بہت مہربان ہے' اس نے اپنی سب سے بڑی نعمت' جس کا بوجھ کائنات کی کوئی بڑی سے بڑی مخلوق بھی برداشت نہیں کر سکتی آپ کو عطا کر دی ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ

''اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جا رہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے۔'' (الحشر ۵۹:۲۱)

اپنی عظمت کا احساس کیجیے کہ اللہ نے آپ کو کتنی عظیم نعمت سے نوازا ہے۔ آپ کو قرآن دے کر رحمت' ہدایت' شفا' نجات' فلاح' کامرانی' فوزِ عظیم سب کچھ حاصل کرنے کا یقینی ذریعہ اس نے آپ کے ہاتھوں میں دے دیا ہے۔ اب یہ آپ کے ظرف' طلب اور کوشش کی بات ہے کہ آپ اس سے کیا حاصل کرتے ہیں —— اور کیا حاصل نہیں کرتے۔

قرآن پاک سے جن لوگوں نے واقعی اپنی زندگی کو سنوارا ہے اور قرآن کی تلاوت اور اس سے شغف کا حق ادا کیا ہے' قرآن میں جگہ جگہ ان کے دلکش کردار کی ایمان افروز جھلکیاں پیش کی گئی ہیں۔ قرآن پاک کے یہ حصے بار بار پڑھنے اور ان سے اپنی روح کو گرمانے کی ضرورت ہے اور جب آپ اس کردار کا کوئی پرتو اپنی زندگی میں پائیں تو اللہ کا شکر ادا کریں اور اپنی کوشش و کاوش کو اور تیز کر دیں۔ نمونے کے طور پر ان چند آیات پر غور کریں۔

سورۂ زمر آیت ۲۳ میں ہے:

''اللہ نے نہایت ہی اچھی تعلیمات والی کتاب نازل فرمائی ہے جس کی آیتیں باہم ملتی جلتی ہیں (ان میں کوئی اختلاف نہیں) اور جس میں مضامین بار بار دہرائے گئے ہیں (کہ دل میں بیٹھ جائیں)۔ اپنے پروردگار سے ڈرنے والے اسے پڑھتے ہیں تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ان کے بدن اور ان کے دل اس (کی گرمی سے پگھل کر اللہ) کی یاد کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔''

سورۂ انفال آیت ۲ میں ہے:

''سچے اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب ہی پر اعتماد رکھتے ہیں۔''

سورہ بنی اسرائیل آیت ۱۰۷' ۱۰۸' ۱۰۹ میں ہے:

''جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے انہیں جب یہ پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو وہ منہ کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں' پاک ہے ہمارا رب۔ اس کا وعدہ تو پورا ہونا ہی تھا اور وہ روتے ہوئے منہ کے بل گر جاتے ہیں اور اس کو سن کر ان کا خشوع اور بڑھ جاتا ہے۔''

دورِ رسالت کے ایک مشہور شاعر لبید ابن ربیعہ عامری ہیں' جو عرب شعراء میں انتہائی اونچے مقام کے مالک ہیں' عربی زبان میں اپنی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے سات قصیدے مشہور اور مقبول ہیں۔ ان سات قصیدہ گو شعراء میں ایک لبید رضی اللہ عنہ ابن ربیعہ عامری بھی ہیں۔

ایک مرتبہ لبید ابن ربیعہ عامری رضی اللہ عنہ دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قرآن پاک سنایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اللہ کا کلام سنا تو آنکھیں بھیگ گئیں۔ قرآن کے پرجوش، سحر انگیز اور انقلابی انداز بیان نے اس قدر متاثر کیا، کہ بے اختیار پکار اٹھے، یہ اللہ ہی کا کلام ہے — کلام کے جوہر شناس تھے۔ مسحور ہو گئے۔ کلام الٰہی نے ان کا دل جیت لیا اور اسی وقت اسلام قبول کر کے دولت ایمان سے مالا مال ہو گئے۔

اَلَا كُلُّ شَیْءٍ مَّا خَلَا اللّٰهُ بَاطِلٌ وَكُلُّ نَعِيْمٍ لَا مَحَالَةَ زَائِلٌ

''گوش و ہوش سے سنو! اللہ کے سوا ہر چیز مٹ جانے والی ہے اور ہر نعمت ایک دن لازماً ختم ہو کر رہے گی۔''

صاحبِ جوامع الکلم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شعر سنا تو فرمایا:

اَصْدَقُ بَيْتٍ بَيْتُ لَبِيْدٍ. (بخاری، کتاب الرقاق، باب ۲۹، ص ۵۴۴)

''نہایت ہی سچا شعر ہے لبید کا یہ شعر۔''

لبید دولت ایمان سے مالا مال دربارِ رسالت سے رخصت ہو گئے اور ہمیشہ کے لیے یمن کے ایک گوشے میں قیام پذیر ہو گئے۔ اس کے بعد قرآن پاک کی تلاوت ہی ان کا سب سے محبوب مشغلہ تھا۔ اکثر دل بستگی کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہو گئے۔ خلافت کی گراں قدر ذمہ داری حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سنبھالی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد یہ عظیم ذمہ داری حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سر آ گئی۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں شعرائے اسلام کی طرف بھی توجہ دی۔ ان کے کلام کی نقلیں منگوائیں — اور یہ جائزہ لینا چاہا کہ شعرائے عرب اسلامی تعلیمات سے کس حد تک متاثر ہوئے ہیں۔ دوسرے شاعروں کے ساتھ ساتھ خلیفہ وقت کا پیغام لبید رضی اللہ عنہ کے پاس بھی پہنچا۔ لبید رضی اللہ عنہ نے پہلے تو عذر کیا لیکن دربار خلافت سے دوبارہ مطالبہ کیا گیا تو مجبور ہو گئے اور سورۃ البقرہ کی آخری آیتیں آمن الرسول سے ختم سورہ تک لکھ کر بھیج دیں اور آخر میں لکھا:

''امیر المؤمنین جب سے اللہ کا کلام یاد کیا ہے اپنا کلام بھول گیا ہوں''۔



# سونے سے پہلے

دن کی گہما گہمی ختم ہوگئی۔ سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔ کاروباری ادارے' دفتر' کارخانے اور دکانیں بند ہوگئیں۔ منڈیاں سونی پڑ گئیں۔ لوگ اپنے اپنے گھروں اور ٹھکانوں کو واپس ہوگئے۔ شور وغوغا ختم ہوگیا۔ کرۂ ارض پر اندھیرا پھیل گیا اور سکون وخاموشی کی فضا چھا گئی۔ دن بھر آپ اپنے کاموں میں جتے رہے' کسی پر حکم چلاتے رہے اور کسی کے حکم کی تعمیل کرتے رہے اور زندگی کی گوناگوں مصروفیات میں مختلف لوگوں سے طرح طرح کے معاملات اور برتاؤ کرتے رہے۔

یہ آپ کے والد بزرگوار اور والدہ محترمہ ہیں' ان کے ساتھ آپ نے اپنا بہت سا وقت گزارا اور مختلف معاملات اور برتاؤ کرتے رہے۔ یہ آپ کے بال بچے ہیں' ان کے درمیان بھی آپؐ نے کتنی ہی گھڑیاں گزاریں۔ یہ آپ کا ادارہ اور کارخانہ ہے' یہاں بھی بہت سے افراد سے آپ کا ساتھ رہا۔ یہ آپ کی دکان ہے' سینکڑوں مردوں اور عورتوں سے آپ لین دین کرتے رہے۔ یہ آپ کا دفتر ہے' کتنے ہی لوگوں پر آپ حکم نافذ کرتے رہے' کتنے ہی لوگوں کے بارے میں فیصلے کرتے رہے اور کتنے ہی لوگ آپ کے فیصلوں کے مطابق اچھا یا برا انجام بھگتتے رہے اور اپنے بڑوں کے احکام اور فیصلوں کا آپ پالن کرتے رہے۔

یہ آپ کے عزیز واقارب ہیں' کچھ آپ سے عمر اور مرتبے میں بڑے اور کچھ چھوٹے۔ یہ اپنے مرتبے اور حیثیت کے مطابق آپ سے کچھ توقعات رکھتے ہیں اور آپ نے اپنا دن اس طرح گزارا کہ کسی سے کچھ معاملہ رہا اور کسی سے کچھ۔ یہ آپ کے پڑوسی اور محلّہ دار ہیں' ان کے ساتھ بھی آپ کے کچھ قدرتی روابط ہیں اور آپ نے زندگی کی بہت سی گھڑیاں ان کے ساتھ مشغول رہ کر بھی بتائیں۔ مختلف انسانی تعلقات میں کچھ لوگ آپ کے ماتحت ہیں' ان سے بھی آپ کو معاملہ کرنا پڑا اور کچھ لوگوں کے ماتحت آپ خود ہیں' ان سے بھی آپ کو کچھ معاملات چاروناچار کرنے ہی ہوتے ہیں۔

غرض زندگی کا ایک روشن دن گزر گیا۔ یہ دن پھر کبھی نہیں آئے گا۔ آپ کی زندگی کے چند گنے چنے دنوں میں سے ایک کم ہوگیا اور یہ کم ہونے والا دن کسی قیمت پر اب نہیں بڑھ سکتا۔ یہ گزرنے والا دن ہی تو آپ کی زندگی

ہے۔ یہ گزرنے ہی کے لیے ہے۔ آپ کسی طاقت سے اسے روک نہیں سکتے۔ آپ چاہیں یا نہ چاہیں یہ روشن دن آخرکار تاریک شب میں بدل کر رہے گا۔ ہر صبح کے لیے شام مقدر ہے۔ شام ہوگئی' دن کی ہل چل ختم ہوگئی' ہر طرف اندھیرے کا راج ہوگیا اور لوگ سکون کی تلاش میں اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس ہوگئے۔

دن کی مشغول زندگی میں اللہ کے حقوق ادا کرنے کے اوقات بھی آتے رہے۔ بلکہ ہر قدم پر یہ فریضہ سامنے آتا رہا اور آپ اپنے اللہ کے ساتھ کوئی نہ کوئی معاملہ کرتے رہے۔ بندوں کے حقوق ادا کرنے اور اپنے فرائض انجام دینے کے لیے لمحات بھی آتے رہے اور آپ کوئی نہ کوئی طرزِ عمل اختیار کرتے رہے' غرض دن بھر دوسروں سے طرح طرح کے معاملات کرتے رہے اور دوسروں کے ساتھ دن کی روشن گھڑیاں گزارتے رہے۔

دن ختم ہوگیا' رات چھاگئی اور آپ نیند کی آغوش میں سکون حاصل کرنے کے لیے جانے ہی والے ہیں۔ مگر ذرا ٹھہریئے' جلدی نہ کیجیے۔ دن بھر آپ دوسروں کے ساتھ معاملہ کرتے رہے۔ اب سونے سے پہلے چند لمحوں کے لیے خود کو لے کر بیٹھیے۔ اپنے آپ سے معاملہ کیجیے۔ کسی جانبداری اور رعایت کے بغیر اپنی ذات سے کچھ سوالات کیجیے۔ اپنے نفس سے کسی لاگ لپیٹ کے بغیر کھرا معاملہ کیجیے اور اس احساس کو تازہ رکھتے ہوئے معاملہ کیجیے کہ آپ کا پروردگار آپ کے نفس سے آپ کے مقابلہ میں زیادہ قریب ہے' آپ کے دل میں پیدا ہونے والے خیالات و جذبات سے آپ کے مقابلے میں پہلے اور زیادہ واقف ہے۔

دن کے بیش بہا لمحات میں اللہ سے تعلق جوڑنے اور اپنی شخصیت کو بنانے سنوارنے سدھارنے کے زریں مواقع بھی آتے رہے۔ ان لمحات میں آپ کا کردار کیا رہا؟ ایک وفادار بندے کا سا کردار رہا' یا ایک سرکش باغی جیسا کردار۔ زندگی کے مختلف موڑوں پر یہ فیصلہ کن' خاموش سوال پیدا ہوتا رہا کہ اللہ کی مرضی پر عمل کیا جائے یا اپنی سماج کی مرضی پر؟ دنیا کا فائدہ یا آخرت کا فائدہ؟ اللہ کی مرضی یا رسم و رواج اور وقت کا قانون؟ آپ اپنے آپ سے صاف صاف پوچھیے کہ آپ کیا طے کرتے رہے اور کیا فیصلے کرتے رہے؟

مختلف لوگوں سے معاملات کرتے ہوئے آپ نے ایک باشعور' حق شناس' انصاف پسند اور خیرخواہ بندے کا کردار پیش کیا' یا حق ناشناس' غیر منصف اور بے درد ظالم کا کردار اپنایا۔ دن کی مصروف زندگی میں آپ دوسروں سے معاملہ کرتے رہے اور بہت کم کسی کے ساتھ رعایت کی' اب کچھ دیر اپنی ذات سے معاملہ کیجیے۔ ذرا جانبداری سے کام نہ لیجیے اور بالکل رعایت نہ دیجیے۔ بے لاگ اور کھرا معاملہ کیجیے۔ رات کی ان احتسابی گھڑیوں میں اگر آپ نے اپنے کو ذرا ڈھیل دی اور رعایت سے کام لیا تو یاد رکھیے آپ اپنے ساتھ یہ خیرخواہی نہیں بلکہ سنگین ظلم کریں گے۔ اگر آج اپنے ساتھ آپ نے انصاف نہ کیا اور ذرا بھی جانبداری سے کام لیا تو پھر یہ تاریکی بڑھتی ہی جائے گی۔ اور آپ حشر کے میدان میں روشنی سے محروم رہ جائیں گے۔ اگر آپ واقعی اپنے خیرخواہ ہیں تو شعور کے

ساتھ اپنی ذات سے معاملہ کیجیے۔ دن کی شفاف روشنی میں آپ نے اللہ اور رسول ﷺ اور ان کی ہدایات کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ بندوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ بڑوں کے ساتھ کس طرح پیش آئے اور چھوٹوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟ احتساب کی یہ گھڑیاں آپ کی زندگی کا حاصل ہیں۔ اگر دن کی روشنی میں آپ اللہ کی ہدایات نہ دیکھ سکے' لوگوں کے حقوق نہ پہچان سکے اور صحیح اور غلط میں تمیز نہ کر سکے اور آنکھیں ہوتے ہوئے بھی نابینا رہے' تو اندیشہ ہے کہ حشر میں بھی آپ آنکھوں سے محروم رہیں گے — یہ آغازِ شب کی گھڑیاں بڑی قیمتی ہیں' اپنی ذات کے ساتھ صاف معاملہ کیے بغیر اسے ہرگز سونے نہ دیجیے۔ پشیمانی' ندامت اور اعتراف خطا کے آنسوؤں سے دن بھر کی خطاؤں اور گناہوں کے داغ دھبے دھوڈالیے۔ اپنے رحم فرمانے والے رب کے حضور گڑگڑائیے اور اپنے علیم وخبیر اللہ سے عہد کیجیے کہ آنے والا دن آپ ایک وفا شعار' حق شناس اور شکر گزار بندے کی طرح گزاریں گے۔

اور اگر احتساب کی ان گھڑیوں میں آپ کو احساس ہو کہ آپ کا دن اللہ کے نیک بندوں کی طرح گزرا ہے تو اللہ کی اس بہترین توفیق پر خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے تہ دل سے شکر ادا کیجیے' استقامت کی دعا کیجیے' مزید توفیق کی درخواست کیجیے اور برابر آگے بڑھتے رہنے کے لیے پیہم جدوجہد کیجیے۔ یہ احتساب آپ کی کامیابی کی ضمانت ہے' بشرطیکہ آپ کا احتساب ہو اور آپ نے اپنی مسلسل غفلت' لاپروائی اور باغیانہ روش سے اپنے ضمیر اور احساس کا گلا نہ گھونٹ دیا ہو' پھر جب آپ دن بھر کا احتساب کرتے ہوئے اور اپنے آپ سے معاملہ کرتے ہوئے یہ محسوس کریں کہ نہ آپ نے کسی کا حق دبایا' نہ کسی کے ساتھ زیادتی کی' نہ کسی کا دل دکھایا' نہ کسی فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کی' نہ کسی معاملے میں اللہ کی نافرمانی کی' نہ کوئی قدم اللہ اور رسول ﷺ کی ہدایت کے خلاف اٹھایا' تو یقین کر لیجیے کہ یہ دن آپ کے لیے عید کا دن ہے اور یہ دن آپ کی زندگی کا حاصل ہے۔ چاہے آپ فاقہ مست مفلس ہوں یا عیش وآرام میں رہنے والے خوشحال' کسی ملک کے سیاہ سفید کے مالک ہوں یا ماتحتوں کے ماتحت' عالمی شہرت کی کمپنی کے مالک ہوں یا کسی دفتر کے چپراسی' آسمان سیاست کے مہر عالم تاب ہوں یا گوشہ گمنامی کے مکین۔ عید کا دن نہ چاند دیکھنے پر موقوف ہے نہ شہرت و دولت پر۔ عید کا دن حقیقت میں وہ دن ہے جس میں آپ نے اللہ کی نافرمانی نہ کی ہو اور پورا دن آپ نے اللہ کی فرماں برداری میں گزارا ہو۔ ایک دانا سے کسی نے پوچھا' آپ کی عید کب ہوئی؟

دانا نے جواب دیا ''جس دن میں اللہ کی نافرمانی نہیں کرتا وہی دن میری عید کا دن ہوتا ہے۔''

کس قدر جچا تلا شعوری جواب ہے' مگر شعور کے پیدا کرنے کے لیے مسلسل کوشش و کاوش کرنی ہوتی ہے اور بہت کچھ قربان کرنے کے بعد ہی یہ دولت حاصل ہوتی ہے۔

# انقلاب کا نقطۂ آغاز

سماج میں اپنے نقطہ نظر کے مطابق خوشگوار انقلاب لانے کی راہ یہ نہیں ہے کہ آپ سماج کے لوگوں کو بدل ڈالنے کی مہم سے اپنے کام کا آغاز کریں۔ اصلاح اور انقلاب کا آغاز دوسروں کو بدل ڈالنے کی مہم سے کرنا حماقت و نادانی ہے' فکری فریب بھی اور وقت کا ضیاع بھی۔ خوب سمجھ لیجئے آپ کے مطلوب انقلاب کا نقطہ آغاز آپ کی ذات ہے نہ کہ دوسروں کی ذات۔ اگر آپ اپنی آرزوؤں' تمناؤں اور نصب العین میں واقعی سنجیدہ اور مخلص ہیں تو اپنی مہم کا آغاز اپنی ذات سے کیجیے۔ اصلاح ہمیشہ اپنی ذات سے شروع ہوتی ہے۔ آپ جو توقعات دوسروں سے کرتے ہیں۔ وہ توقعات خود پوری کر کے دکھایئے۔ جو حسن سلوک آپ دوسروں سے چاہتے ہیں' اس حسن سلوک کا خود مظاہرہ کیجیے۔ جو اچھائیاں آپ دوسروں کی زندگیوں میں دیکھنا چاہتے ہیں' وہ خوبیاں آپ اپنی زندگی میں پیدا کیجیے۔ آپ اپنے معاشرے کے دوسرے لوگوں کے عمل و کردار میں جن خوشگوار تبدیلیوں کے خواہاں ہیں' وہ خوشگوار تبدیلیاں اپنی زندگی میں پیدا کر کے دکھایئے اور کسی وقت بھی اس حقیقت کو ذہن سے اوجھل نہ ہونے دیجیے کہ انقلاب کا نقطہ آغاز فی الواقع اپنی ذات ہے۔ دوسروں کی ذات سے اس مہم کا آغاز کرنے والے دوسروں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ خود کو دھوکا دے رہے ہیں اور سمجھتے نہیں۔

آپ جانتے ہی ہیں کہ فکر و عمل کا حقیقی محرک انسان کے جذبات ہوتے ہیں اور جذبات دل میں جنم لیتے ہیں اور یہ واضح حقیقت ہے کہ دوسروں کے سینوں میں دھڑکنے والے دل پر آپ کا کوئی اختیار نہیں۔ پھر آپ کے بس میں یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ لوگوں کی زندگیاں بدل ڈالیں اور ان کی زندگی میں وہ انقلاب پیدا کر دیں جو آپ کو مطلوب ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو آپ کر سکتے ہیں وہ یہی تو ہے کہ اچھائی برائی کا تعارف کرا دیں' اچھائی کو ذہن نشین کرانے کے لیے اپنے ذہن و زبان کی قوت استعمال کریں' لیکن حق کو دوسروں کے دل میں اتار دینا اور نیکی کو دوسروں کے دل کا فیصلہ اور جذبہ بنا دینا نہ آپ کے بس میں ہے اور نہ اللہ نے آپ کی یہ ذمہ داری قرار دی ہے —— البتہ آپ کی یہ ذمہ داری ضرور قرار دی گئی ہے کہ آپ اپنے آپ کو بدل ڈالیں۔ آپ کے سینے میں جو دل دھڑک رہا ہے وہ آپ کا اپنا دل ہے' آپ کے اپنے وجود کا ایک حصہ ہے۔ اس پر اللہ نے اختیار دے رکھا ہے اور

آپ کی یہ ذمہ داری بتائی گئی ہے کہ آپ اس کو اپنے زاویہ فکر کے مطابق بدل ڈالیں۔ اللہ کا ارشاد ہے:

يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ (المائدہ ۵:۱۰۵)

''اے ایمان والو! تم پر تمہاری اپنی ذات کی ذمہ داری ہے۔ اگر تم راستی اور ہدایت پر قائم رہو تو دوسروں کی گمراہی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔''

یہ حقیقت سورج سے زیادہ روشن ہے کہ آپ پر دوسروں کو بدل ڈالنے اور ہدایت پر لے آنے کی ذمہ داری ہرگز نہیں ڈالی گئی ہے۔ اور آپ پر تو خیر یہ ذمہ داری کیا ڈالی جاتی خود پیغمبروں پر بھی یہ ذمہ داری نہیں ڈالی گئی ہے کہ وہ لوگوں کی زندگیاں بدل دیں اور چار و نا چار ان کو راہ ہدایت پر ڈال دیں۔ قرآن نے رسول ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے بہت واضح انداز میں کہا ہے:

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ (القصص ۲۸:۵۶)

''آپ جسے چاہیں اس کو ہدایت نہیں دے سکتے' بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔''

جب پیغمبر اور رسول کی ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو راہ ہدایت پر لگا دیں اور نہ یہ اختیار حاصل ہے کہ کسی کا دل بدل ڈالیں تو پھر عام انسانوں کی یہ ذمہ داری بھلا کیسے ہو سکتی ہے اور یہ اختیار انہیں کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے۔ پیغمبروں سے کہا گیا ہے' ان علیک البلاغ' آپ کے ذمہ تو صرف پہنچا دینا ہے۔ یعنی دوسروں کے سلسلے میں ذمہ داری صرف اسی قدر ہے کہ آپ حق کو واضح انداز میں پہنچا دیں۔ حق کو قبول کرا دینے کی نہ پیغمبر پر ذمہ داری ڈالی گئی ہے اور نہ اسے اس کا اختیار ہی حاصل ہے۔ پھر بھلا عام انسانوں کی یہ ذمہ داری کیسے قرار دی جا سکتی ہے۔

اس تفصیل سے نفس کو یہ غذا ہرگز حاصل نہ کرنے دیجیے کہ ہم پر صرف اپنی ذمہ داری ہے۔ دعوت و تبلیغ میں کیوں وقت صرف کریں۔ جی نہیں' اس وضاحت سے یہ مطلوب اخذ کرنے کا موقع نفس کو ہرگز نہ دیجیے۔ بات یہ نہیں کہی جا رہی ہے کہ آپ دعوت و تبلیغ کی مہم نہ چلائیں' خوشگوار انقلاب لانے کی کوشش نہ کریں' اصلاح کی جدوجہد سے باز رہیں۔ یہ تو آپ کی منصبی ذمہ داری ہے۔ دعوت و تبلیغ کا کام تو آپ کو کرنا ہی ہے۔ بات دراصل یہ کہی جا رہی ہے کہ اصلاح و انقلاب کے کام کا آغاز دوسروں کی ذات سے نہ کیجیے' اپنی ذات سے کیجیے۔ یہی صحیح طرز فکر ہے اور اسی طرح اس مہم میں کامیابی بھی ممکن ہے۔ خود فراموشی کے جرم میں مبتلا لوگ ہرگز دعوت و تذکیر کا فریضہ انجام نہیں دے سکتے اور ان کی کوششوں سے ہرگز مطلوبہ انقلاب رونما نہیں ہو سکتا اور اگر بالفرض کچھ سعید روحوں نے ان کی آواز پر کان دھرا اور اس مہم میں لگ کر کچھ تبدیلی لے بھی آئے تو ان لوگوں کا اس انقلاب میں کوئی حصہ نہیں ہے جن کی اپنی زندگیاں اس خوشگوار انقلاب سے محروم ہیں ـــ بلکہ اس طرح تو آپ کا جرم دہرا ہو

جاتا ہے کہ دوسروں کو خوبیاں اپنانے اور زندگیاں سنوارنے کی تلقین کریں اور اپنی زندگی بدستور غلط طرز پر گزرتی رہے۔

آپ جب یہ رونا روتے ہیں کہ ماحول بہت خراب ہے' رشتہ داروں نے آپ کو بہت دکھ پہنچائے' متعلقین نے آپ کو بہت اذیتیں دیں' پڑوسیوں نے آپ کو بہت تکلیفیں پہنچائیں' احباب اور شرکائے کار نے آپ کے ساتھ وہ کچھ کیا جس کی آپ کو ان سے توقع نہ تھی۔ بزرگوں اور رہنماؤں نے سرد مہری کا وہ رویہ اختیار کیا جس کا آپ کو تصور نہ تھا' چھوٹوں نے آپ کے ساتھ بدسلوکی اور نافرمانی کا رویہ ایسا اختیار کیا جس کی آپ کو امید نہ تھی۔ آپ جب اپنے اس دکھ کا اظہار کرتے ہیں' تو ہم آپ کو معذور تصور کرتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ آپ کا غم بجا ہے' دل جب دکھتا ہے تو خواہی نخواہی زبان سے اظہار ہو ہی جاتا ہے۔

لیکن کبھی آپ نے یوں بھی سوچنے کی زحمت گوارا فرمائی کہ جب رشتے داروں نے آپ کو دکھ پہنچائے تو کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ کی ذات سے بھی انہیں دکھ پہنچے ہوں۔ متعلقین نے اگر آپ کو اذیتیں دی ہیں تو کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ نے بھی انہیں اسی طرح اذیت دی ہو۔ پڑوسیوں سے اگر آپ کو تکلیفیں پہنچی ہیں تو کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ نے بھی ان کی توقعات پوری نہ کی ہوں۔ بزرگوں اور رہنماؤں نے اگر آپ کے ساتھ سرد مہری اور ناانصافی کا سلوک کیا ہے تو کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ بھی اپنے چھوٹوں کے ساتھ اسی طرح سرد مہری اور ناانصافی کا سلوک کر رہے ہوں۔ چھوٹوں نے آپ کے ساتھ بدسلوکی اور نافرمانی کا رویہ اختیار کیا ہے تو کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ نے بھی اپنے بڑوں کے ساتھ کچھ اسی طرح کی نافرمانی اور تکلیف دہ رویہ اختیار کیا ہو۔

اب آپ چاہتے ہیں کہ سماج سے یہ تکلیف دہ مناظر ختم ہوں' حسن عمل اور حسن اخلاق کا چرچا ہو' ہر ایک دوسرے کا حق ادا کرنے میں پیش پیش ہو اور ہر ایک اپنا فرض بجا لانے میں چاق و چوبند ہو جائے اور کوئی کسی کو تکلیف نہ پہنچائے' بلکہ سماج میں ہر ایک حسن سلوک کا پیکر بن جائے اور سماج میں ایسا خوشگوار انقلاب آئے جس میں ناانصافی' زیادتی' فساد' نافرمانی اور حق تلفی کا نام و نشان نہ رہے' تو بے شک آپ کی یہ آرزو بڑی پاک ہے' آپ کی زندگی میں اگر یہ آرزو نہ ہو' تو آپ کی زندگی سے آپ کی موت اچھی ہے' لیکن اس پاکیزہ آرزو کی تکمیل کے لیے صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ آپ اصلاح و انقلاب کے لیے دوسروں کی زندگیوں پر محنت سے اپنا کام شروع کر دیں' اس مہم کا آغاز اپنی ذات سے کیجیے اور پوری قوت کے ساتھ ہر ایک کے ذہن میں یہ بات جمائیے کہ اس مہم کا آغاز اپنی ذات سے ہی ہوتا ہے نہ کہ دوسروں کی ذات سے۔ انقلاب کا نقطۂ آغاز اپنی زندگی ہے دوسروں کی زندگی نہیں۔

پھر آپ ذرا تصور تو کیجیے اس سماج کا جس کا ہر فرد اپنی اصلاح کا حریص ہو۔ دوسروں کو بدل ڈالنے کی فکر میں

نہ ہو' بلکہ خود کو بدل ڈالنے میں جتا ہوا ہو اور پھر ایسے افراد جن کا اصل مرکز فکر اپنی ذات کی اصلاح و تربیت ہو اور جو شب و روز اسی فکر میں لگے ہوئے ہوں' خواہ وہ گھریلو زندگی میں ہوں یا معاشی میدان میں' عبادت و ریاضت کا معاملہ ہو یا خاندان اور برادری کا' کاروباری شریکوں کے مسائل ہوں یا محلے پڑوس کے' مال و دولت کا کوئی معاملہ ہو یا جاگیرداری اور زمین کا' غرض زندگی کا کوئی میدان ہو اور کوئی مسئلہ اور معاملہ ہو' انہیں دوسروں کی اصلاح سے زیادہ اپنی اصلاح کی فکر ہو۔ آپ غور کیجیے' جب دوسروں کو بدل ڈالنے کا جذبہ اپنے کو بدل دینے کے جذبہ میں تبدیل ہو جائے۔ ہر فرد کے دل میں یہ نکتہ گھر کر جائے کہ آغاز اپنی ذات سے ہوتا ہے اور پورے سماج میں یہ انداز فکر عام ہو جائے تو اس سماج میں کیسا خوشگوار انقلاب آئے گا۔ پورے سماج کا نقشہ کس قدر دلآویز اور مسرت انگیز ہو گا اور انقلاب کی یہ مہم کس قدر آسان ہو جائے گی۔ دراصل کوئی بھی مقصد ہو وہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے' جب اس کے لیے صحیح رخ سے کوشش کی جائے اور اس تک پہنچنے کے لیے کسی غلط راہ کا انتخاب نہ کیا جائے۔

خوشگوار انقلاب لانے کی خواہش کرنے والے اگر ناکام رہ کر مایوسی کا شکار ہوتے ہیں تو اس کی یہ وجہ ہرگز نہیں کہ اللہ کے بندوں میں قبول حق کی صلاحیت ختم ہوگئی ہے۔ انسان کی فطرت خیر پسند ہے۔ خیر کو قبول کرنے والی سعید روحیں ہر دور میں' ہر سماج میں ہوتی ہیں۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ سارے انسانوں کے سینے نیکی کی آرزو اور محبت سے یکسر خالی ہو جائیں۔

ناکامی اور مایوسی کی وجہ دراصل یہ ہوتی ہے کہ انقلاب کی پاکیزہ خواہش رکھنے والے اپنی مہم کا آغاز غلط نقطے سے کرتے ہیں۔ انقلاب کی مہم اپنے وجود میں سرک جاتی ہے اور وہ دوسروں کے وجود سے اس کا آغاز کرتے ہیں۔ انقلاب کے خوشگوار اثرات پہلے اپنی زندگیوں میں پیدا کرنے ہوتے ہیں اور وہ ان اثرات کو دوسروں کی زندگیوں میں پیدا کرنے کی غیر فطری کوشش کرتے ہیں۔ صفائی کے محاسن بیان کرنے والے اگر خود گندے ہوں تو یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی باتوں پر کوئی کان نہ دھرے اور اس سے زیادہ بھیانک بات یہ ہے کہ جس صفائی کی آرزو میں وہ تڑپ رہے ہیں اس سے ان کی اپنی زندگی محروم ہے۔ ایسے خدا فراموش لوگوں کو انسانی تاریخ میں نہ کبھی کوئی کارنامہ رہا ہے اور نہ آئندہ کبھی اس کی توقع کی جا سکتی ہے۔



# اصل سہارا

آپ ایک آرٹسٹ کو دیکھتے ہیں کہ وہ قلم کی نوک اور انگلیوں کی جنبش سے کیسے کیسے دلکش اور حیرت انگیز نقش و نگار بناتا ہے۔ اس کی نازک انگلیاں کس قدر سرعت کے ساتھ ایسے ایسے ڈیزائن تیار کرتی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے اور بے اختیار آرٹسٹ کی انگلیاں چوم لینے کو جی چاہتا ہے — بے شک انگلیوں کے حیرت انگیز کرشموں کا کچھ ایسا ہی تقاضا ہے۔ مگر آپ نے کبھی یہ غور بھی کیا ہے کہ یہ حیرت میں ڈال دینے والے کارنامے دراصل کس کے ہیں؟ ان حرکت کرنے والی انگلیوں کے یا اس داخلی قوت وطاقت کے جو ان انگلیوں کو حرکت دے رہی ہے؟ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا کارنامہ انگلیوں کا ہے اور ستائش کے لائق یہی ہیں۔ لیکن یہ سطحی نگاہ کا فیصلہ ہے — جب آپ ذرا غور کریں گے تو آپ کا فیصلہ ہوگا کہ یہ سارا کارنامہ دراصل انسان کی اندرونی قوت وطاقت کا ہے' جو ان انگلیوں کو حرکت دیتی اور سرگرم رکھتی ہے — یہ داخلی قوت اگر سلب ہو جائے اور انگلیوں کو جنبش دینے والا موت کی نیند سو جائے تو کیا پھر بھی یہ انگلیاں نقش و نگار بنا سکیں گی؟ انگلیاں موجود ہوں گی لیکن نہ وہ جنبش کر سکیں گی اور نہ کوئی کارنامہ انجام دینے کے لائق ہوں گی۔

اس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے' وسائل اور ذرائع کی مدد سے ہو رہا ہے اور یقیناً وسائل و ذرائع کی بڑی اہمیت ہے — اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وسائل و ذرائع سے نہ صَرفِ نظر کیا جا سکتا ہے اور نہ ایسا کرنا دانشمندی ہے — البتہ بے عقلی اور گمراہی کی سرحد وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے آدمی ان وسائل و ذرائع اور ان سہاروں ہی کو اصل فیصلہ کن طاقت سمجھنے لگتا ہے۔ بے شک اسباب کی ضرورت بھی ہے اور اہمیت بھی' لیکن اسباب پیدا کرنے والے سے غفلت گمراہ کن نادانی ہے۔ اصل چیز اسباب نہیں مسبب الاسباب ہے۔ اس کی مرضی اور اشارہ نہ ہو تو سارے اسباب بیکار ہو جاتے ہیں۔

ایک مؤمن اور غیر مؤمن کی فکر اور راہ عمل میں اس نقطہ سے فرق اور امتیاز شروع ہوتا ہے' اسی نقطہ سے فکر و عمل کے الگ الگ راستے پھوٹتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے بالکل مختلف سمت میں جاتے ہیں' ایک اس دنیا اور اس کے اسباب و وسائل ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے اور اس کی کوتاہ نظری اس سے آگے کچھ نہیں دیکھ پاتی' دوسرا بھی اسی

دنیا میں رہتا ہے' یہاں کے وسائل و ذرائع سے پوری طرح مستفیض ہوتا ہے' لیکن وہ یہ سب کچھ اس فکر و نظر کے ساتھ کرتا ہے کہ اصل چیز اسباب نہیں مسبّب الاسباب ہے۔

یہ حیاتِ مستعار بہرحال کچھ سہارے چاہتی ہے' دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے سہاروں کی ضرورت قطعی ہے — دنیا پرست مادی وسائل و ذرائع کے سہارے زندگی گزارتا ہے اور انہی کو اپنا اصل سہارا سمجھتا ہے — اور جب یہ سہارے ٹوٹتے اور ناکام ہوتے ہیں تو وہ مایوس ہونے لگتا ہے — مایوسی کا شکار ایک دنیا پرست فرد بھی ہوتا ہے اور ایک دنیا پرست قوم بھی۔ فرد مایوسی کا شکار ہوتا ہے تو وہ خودکشی کر ڈالتا ہے۔ قوم مایوسی کا شکار ہوتی ہے تو اس کی قوتِ عمل مفلوج ہو جاتی ہے۔ قومی اعتبار سے اس پر موت طاری ہو جاتی ہے اور اس کے شب و روز اپنے شب و روز نہیں ہوتے' وہ دوسروں کے لیے جیتی ہے اور دوسرے جس طرح چاہتے ہیں اس طرح جیتی ہے۔ بااختیار مخلوق ہو جانے کے باوجود وہ بے اختیاری کی زندگی گزارتی ہے اور قومی اعتبار سے دھرتی کے سینے پر اس کا کوئی رول نہیں ہوتا۔

اس کے برخلاف ایک مؤمن' فرد ہو یا قوم' دنیا کے سارے وسائل و ذرائع سے فائدہ اٹھانے اور کام میں لانے کے باوجود ایک لمحے کے لیے بھی ان وسائل و ذرائع پر بھروسا نہیں کرتا' وہ اللہ کی ذات کو اصل سہارا مان کر حیاتِ مستعار کی اس مہلت سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اللہ کی زمین پر اللہ کے پیدا کئے ہوئے تمام وسائل و ذرائع کو کام میں لاتا ہے۔ یہ سہارے اور وسائل اگر کسی وقت ٹوٹتے اور ناکام محسوس ہوتے ہیں تو اس کی زندگی میں کوئی بھونچال نہیں آتا' وہ یہ سوچ کر مطمئن ہوتا ہے کہ اللہ کی یہی مرضی ہوگی۔ اس کی یہی مصلحت ہوگی — یا یہ میری کسی غلطی کی سزا ہوگی — وہ پھر اپنی روش پر غور کرتا ہے' خود کو سنبھالتا ہے' اپنے اصل سہارے سے اپنے تعلق کے بارے میں سوچتا ہے اور یہ یقین اس میں زندگی کی لہر دوڑا دیتا ہے کہ ان سہاروں کو توڑنے والا' ان اسباب کو ناکام بنانے والا ان سے بہتر وسائل و ذرائع بھی مہیا کر سکتا ہے اور اس کے ایک اشارے سے حالات کچھ سے کچھ ہو سکتے ہیں — بھروسا کے قابل یہ ٹوٹنے اور فنا ہونے والے سہارے نہیں ہیں بلکہ وہ زندہ جاوید ہستی ہے جو نہ کبھی فنا ہوتی ہے اور نہ کبھی اپنے بندوں سے غافل ہوتی ہے۔ جس کو نہ کبھی نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور نہ کبھی اس پر غنودگی طاری ہوتی ہے۔ بے شک مؤمن ذرائع و وسائل فراہم کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرتا ہے' جدوجہد کرتا ہے اور اللہ کی راہ میں جب کوششیں کرتا ہے' تو اسی دنیا میں اور انہی مادی وسائل سے کام لے کر کوشش اور جدوجہد کا حق ادا کر دیتا ہے۔ لیکن کسی ایک لمحے کے لیے بھی وہ اسباب و وسائل یا اپنی جدوجہد پر بھروسا نہیں کرتا۔ اس کا اصل سہارا اللہ ہوتا ہے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهِ وَكَفَىٰ بِهِ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا ۝ (الفرقان ۲۵:۵۸)

''اور تم اس زندہ جاوید ہستی پر بھروسا کرو جس کو موت نہیں ہے اور مؤمنوں کو اللہ ہی پر بھروسا کرنا

چاہیے۔''

ایک مؤمن کامل اپنے جاں نثاروں کو جمع کرتا ہے۔ ان میں بہادری اور جاں فروشی کے جذبات ابھارتا ہے۔ جو مادی وسائل و ذرائع مہیا کرنا ممکن ہوتے ہیں' مہیا کرتا ہے اور پھر سجدہ ریز ہو کر اللہ سے دعا کرتا ہے کہ پروردگار میں جو کچھ کر سکتا تھا میں نے کیا' اب کامیابی تیرا ہی کام ہے — سب کچھ تیرے ہی قبضے میں ہے — بھروسا ان وسائل پر نہیں تیری ذات پر ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ پیغام رحمت لے کر طائف پہنچتے ہیں۔ طائف والوں کو اللہ کا پیغام سناتے ہیں۔ پیغام رحمت کے جواب میں سنگدلوں کی طرف سے طنز و تشنیع اور پتھروں کی بارش ہوتی ہے — آپ ﷺ لہولہان ہو جاتے ہیں' مضمحل اور افسردہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایک اللہ کا بھروسا ایسا زبردست سہارا ہے کہ ایسے وقت میں بھی ایسا نہیں ہوتا کہ آپ دل چھوڑ بیٹھیں۔ اپنے کام سے مایوس ہو جائیں — اس وقت آپ ﷺ نے جو دعا فرمائی ہے اس کا لفظ لفظ یقین' ایمان' توکل' نشاط اور عزم و حوصلہ کا آئینہ دار ہے۔ مؤمن فرد اور مؤمن قوم کو نازک مرحلے پر اس دعا کا اہتمام کرنا چاہیے اور اپنے فکر و عمل سے اس کا ثبوت فراہم کرنا چاہیے کہ یہ دعا دل کی گہرائی سے نکلنے والی گرم آہیں ہیں' مشق کی ہوئی دینداری کا خوشنما مظاہرہ نہیں ہے — اللہ کے رسول ﷺ اپنے رب سے فریاد کرتے ہیں:

''اے اللہ! میں تجھی سے اپنی بے بسی اور بے چارگی اور لوگوں کی نگاہ میں اپنی بے قدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو سارے ہی کمزوروں کا رب ہے اور تو ہی میرا بھی رب ہے' تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے' کیا کسی بیگانے کے حوالے جو مجھ پر قابو پا لے۔ اگر تو مجھ سے خفا نہیں ہے تو مجھے کسی مصیبت کی پرواہ نہیں ہے' مگر تیری طرف سے مجھے عافیت مل جائے تو میرے لیے اس میں زیادہ کشادگی ہے۔ میں پناہ چاہتا ہوں تیری ذات کے نور کی' جس سے تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں اور جس سے دنیا و آخرت کے سارے معاملات سدھر جاتے ہیں' اس سے مجھے بچا لے کہ تیرا غضب مجھ پر نازل ہو یا میں تیرے عذاب کا مستحق ہوں۔ میں تیری ناراضی دور کرنے میں لگا رہوں' یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے۔ اے اللہ' تیرے سوا کسی کے پاس طاقت و قوت نہیں۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اکثر یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

''اے اللہ میں نے اپنے آپ کو تیرے سپرد کیا اور تجھ پر ایمان لایا اور میں نے تجھ ہی پر بھروسا کیا اور تیری ہی طرف رجوع کیا اور میں نے تیرے سہارے پر جھگڑا کیا۔ اے اللہ میں تری عزت کی پناہ چاہتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں' اس سے کہ تو مجھے بھٹکنے دے۔ تو زندہ ہے کبھی نہ مرے گا' جن اور انسان سب فنا ہونے والے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ مؤمن کو اس عقیدے اور یقین کی تلقین کرتے ہیں کہ اس زندگی میں مؤمن کا اصل سہارا صرف اللہ ہے۔ مؤمن کو صرف اللہ ہی کے سہارے زندگی بسر کرنی چاہیے۔ یہ ایک ایسا زندۂ جاوید سہارا ہے جسے موت کبھی چھو نہیں سکتی۔

دنیا پرست کے نزدیک اصل زندگی یہی دنیا کی زندگی ہے۔ وہ صرف اسی زندگی کے لیے جیتا ہے اور اسی کو لذتوں کا گہوارہ بنانے کے لیے ہزار جتن کرتا ہے۔ اس کی نگاہ کوتاہ اس سے آگے کچھ نہیں دیکھتی۔ وہ اسی زندگی کی رنگینیوں اور دلفریبیوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور اسی کو انسانیت کی معراج تصور کرتا ہے۔ وہ یا تو سرے سے کسی بالاتر ہستی کا قائل ہی نہیں ہوتا یا قائل ہوتا ہے تو اسے اپنی نظر و فکر میں دخل دینے کا مستحق ہی نہیں سمجھتا —— فرد ہو یا قوم' اس کی زندگی کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ 'بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست' وہ اسی زندگی کو کسی قید و بند کے بغیر جنت بنانے کی کوشش میں شب و روز سرگرداں رہتا ہے۔ قرآن میں ہے:

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ٥ وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ٥ (الشعراء ۲۶: ۱۲۸-۱۲۹)

''کیا تم ہر اونچی جگہ پر ایک یادگار تعمیر کرتے ہو اور بڑے بڑے محل بناتے ہو جیسے کہ شاید تمھیں یہاں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے۔''

یہ دو مختلف اندازِ فکر اور شاہراہِ عمل دراصل اسی بنیادی نقطے سے پیدا ہوتے ہیں کہ ایک زندگی گزارنے کے لیے اصل سہارا اس ذات کو بناتا ہے جو زندۂ جاوید ہے جو سب سے زیادہ قوت و طاقت والا ہے اور جو سب پر غالب ہے اور دوسرا زندگی گزارنے کے لیے زندگی کے مادی وسائل و اسباب کو سہارا بناتا ہے اور انھی کو سب کچھ سمجھتا ہے اور یہ ہر دانشمند کے اپنے سوچنے کی بات ہے کہ دلکش نقش و نگار' کرشمہ انگلیوں کا ہے یا اس داخلی قوت و طاقت کا جو انگلیوں سے کام لیتی ہے اور انھیں سرگرم کار رکھتی ہے —— ایک کی کوتاہ نگاہ اسباب و وسائل میں پھنس جاتی ہے اور ایک کی حقیقت بیں نگاہ مسبّب الاسباب کو سہارا قرار دیتی ہے۔ ایک قدم قدم پر مایوسی کا شکار ہوتا ہے اور ایک کی پوری زندگی پر کبھی مایوسی کا سایہ تک نہیں پڑنے پاتا۔

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

هذه الدنيا مرتحله ذاهبه وهذه الاخرة مرتحله قادمه وكل واحد منها بنون فأن استطعتم ان لا تكونوا من بني الدنيا فافعلوا' فانكم اليوم في دارالعمل ولا حساب' وانتم غدا في دار الاخرة ولا عمل (مشکوٰۃ' کتاب الرقاق' ص ۴۴۴)

''یہ دنیا کوچ کر چکی ہے' جا رہی ہے اور آخرت بھی روانہ ہو چکی ہے' قریب آ رہی ہے اور ان دونوں میں سے ہر ایک کے پرستار ہیں۔ تم سے جہاں تک ہو سکے دنیا پرست نہ بنو۔ تم اس وقت عمل کے گھر

میں ہو اور حساب کا وقت نہیں آیا ہے اور کل تم حساب کے گھر آخرت میں ہو گے اور وہاں عمل کا موقع نہ ہو گا۔"

البتہ اللہ پر بھروسا اور توکل کا کوئی خودساختہ مفہوم اپنا کر زندگی کو نمونہ عبرت بنانے سے ضرور پرہیز کیجیے — اللہ پر بھروسا اور توکل کا بس وہی ایک مفہوم صحیح ہے' جو اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی امت کو سکھایا ہے۔

جامع ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے پوچھا' یارسول اللہ! میں اپنی اونٹنی کو باندھ کر اللہ پر بھروسا کروں یا اسے کھلا چھوڑوں اور بھروسا کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا" پہلے تم اسے باندھو پھر توکل کرو۔"



# نیکیوں کا موسمِ بہار

''نیکیوں کا موسمِ بہار'' قریب آ رہا ہے اور جلد ہی اس کے مبارک شب و روز آپ پر سایہ فگن ہونے والے ہیں۔ آپ دن میں روزہ رکھیں گے' شب میں اللہ کے حضور قیام کریں گے اور شب و روز کی مختلف ساعتوں میں کتاب الٰہی کی تلاوت کریں گے۔ صدقہ و خیرات کریں گے اور نیکیوں کے اس موسمِ بہار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ پھر مہینے بھر کی عبادت و ریاضت کے بعد عید کی مبارک صبح کو عید گاہ پہنچ کر دوگانہ شکر ادا کریں گے اور اس حال میں اپنے گھر کو واپس آئیں گے کہ اللہ فرشتوں میں اعلان کرے گا — کہ ''میں نے اپنے ان بندوں کو بخش دیا' اور آپ بخشے بخشائے اپنے گھروں کو واپس آئیں گے۔ مگر اس اجر و انعام کا مستحق بننے کے لیے ایک شرط ہے۔ اس شرط کو پورا کرنا ناگزیر ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ آپ کی یہ ساری عبادت و ریاضت شعور کے ساتھ ہو' آپ شعور کے ساتھ اللہ کی کتاب کی تلاوت کریں' شعور کے ساتھ دن میں روزہ رکھیں' شعور کے ساتھ شب میں اللہ کے حضور قیام کریں اور شعور کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کریں۔

شعور کے ساتھ جب آپ کتاب الٰہی کی تلاوت کریں گے تو اس سے شعوری عمل پیدا ہوگا اور جب شعور کے ساتھ آپ نیک اعمال میں سرگرم ہوں گے تو آپ اعمال صالحہ کی برکتیں اپنی زندگی میں عملاً محسوس کریں گے۔ پھر اعمال صالحہ کی برکتیں اور اچھے اثرات آپ کے قلب میں مزید اچھے جذبات پیدا کرنے میں معاون ہوں گے۔ اس طرح آپ کے لیے نیکی کی راہ آسان' کشادہ اور نہایت پرکشش بن جائے گی۔ اللہ آپ کی مدد فرمائے۔

اللہ کی کتاب پڑھتے ہوئے جب آپ اس آیت پر پہنچیں:

يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ.(البقرۃ:۲:۱۸۳)

''اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کر دیا گیا۔''

تو یوں سوچیے کہ آپ کا رب آپ سے مخاطب ہے۔ جب وہ کہتا ہے' اے ایمان والو! تو کان لگا کر سنئے' یہ آپ کے رب کی آواز ہے اور وہ کسی دوسرے کو نہیں آپ کو پکار رہا ہے۔ آپ کا نام لے کر پکار رہا ہے۔ آپ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں' مؤمن ہونے پر فخر کرتے ہیں' ایمان والوں میں یقیناً آپ بھی شامل ہیں اور آپ کا رب

آپ سے ہی بات کر رہا ہے۔ سوچنے کا یہ انداز آپ کو کسی اور ہی عالم میں پہنچا دے گا۔ آپ کی روح پر وجد کی ایک کیفیت طاری ہو گی۔ آپ سوچیں گے' اللہ اکبر! میری یہ عظمت و اہمیت' کہ میرا رب مجھے میرا نام لے کر پکار رہا ہے اور آپ ہمہ تن گوش ہو کر اگلے الفاظ دل کے کانوں سے سنیں گے۔ ''تم پر روزہ فرض کر دیا گیا ہے'' کے الفاظ پڑھتے ہوئے آپ یوں ہی سرسری انداز میں نہیں گزر جائیں گے۔ بلکہ یوں سوچیں گے کہ ''تم پر'' کا خطاب مجھ ہی سے ہے۔ گویا آپ کا رب آپ سے یہ کہہ رہا ہے' میرے بندے! یہ روزہ میں نے تجھ ہی پر فرض کیا ہے' دن بھر روزہ سے رہ کر تو میرے ہی حکم کی تعمیل کرتا ہے اور اس حکم کو بجا لانے کے لیے تیرے واسطے اتنی بات کافی ہے کہ یہ اس اللہ نے تجھ پر فرض کیا ہے' جس پر تو ایمان لایا ہے —— مؤمن کے لیے کسی حکم کی تعمیل کا یہ محرک بالکل کافی ہے کہ اس کے رب کا یہی حکم ہے اور اپنے رب کی اطاعت کے تصور کی لذت ایمان کا زبردست انعام ہے اور پھر جب آیت کا اگلا فقرہ آپ پڑھیں گے تو اپنے رب کی بے پایاں رحمت و رافت اور شفقت و عنایت کا احساس کر کے آپ کا رواں رواں احساس شکر سے سرشار ہو جائے گا۔ ارشاد ہے:

كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔ (البقرہ ۲: ۱۸۳)

''جس طرح ان لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔''

یعنی یہ روزہ کوئی بوجھ نہیں ہے' جو اللہ نے تم پر لاد دیا ہو بلکہ یہ تمہاری شخصیت کی تعمیر' تمہاری تربیت اور تزکیہ نفوس کے لیے اللہ کی ایک نعمت اور ناگزیر ذریعہ ہے —— اسی لیے تو اللہ نے اسے ہر دور میں' ہر نبی کی امت پر فرض رکھا ہے۔ یہ تربیت و تزکیہ کے نظام کا ایسا ضروری جز ہے' اس قدر زبردست مؤثر عامل ہے کہ اللہ کی کوئی شریعت کبھی اس سے خالی نہیں رہی ہے۔ تم پر روزہ فرض کر کے اللہ نے تم پر اپنی رحمت و عنایت کا اہتمام کیا ہے اور تمہیں اس نعمت سے نواز کر اپنی رضا اور اجر آخرت کا مستحق بننے کا تمہارے لیے موقع فراہم کیا ہے۔

''جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا'' —— یہ الفاظ محض تاریخ بیان کرنے کے لیے نہیں ہیں' قرآن کا موضوع محض تاریخی داستانیں بیان کرنا نہیں ہے —— دراصل ان الفاظ کے ذریعہ روزے کی عظمت و اہمیت اور تربیت و تزکیے کے نظام میں اس کی غیر معمولی اہمیت کو واضح کرنا ہے کہ ہر نظام تربیت اور شریعت میں ہمیشہ روزہ موجود رہا ہے اور پھر اگلے فقرے میں روزے کا اصل حاصل بتا کر بات پوری کر دی گئی ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۝ (البقرہ ۲: ۱۸۳)

''تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔''

یعنی اللہ نے روزے کا حکم خود تمہارے ہی فائدے کے لیے دیا ہے' تمہاری عبادتوں سے اللہ کا اپنا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اللہ تو بے نیاز ہے۔ ساری کائنات مل کر ہمہ وقت اس کی عبادت میں لگی رہے اور کائنات کے کسی چپے

میں کسی لمحے بھی اس کی نافرمانی نہ ہو تو بھی اس سے اس کی ذاتِ اقدس کو ذرّہ برابر فائدہ نہ ہوگا۔

روزہ اس لیے فرض کیا گیا ہے کہ بندہ تقویٰ کا پیکر بن جائے۔ اس کے دل میں وہ غیر معمولی قوت پیدا ہو جائے کہ نیکی کی راہ پر بڑھنا اور دوڑنا اس کے لیے آسان اور برائی کی راہ پر جانا اس کے لیے دشوار ہو جائے — تقویٰ ہی دراصل زندگی کی اصل رونق اور بہار ہے۔ تقویٰ دل کی وہ روشن کیفیت ہے جس کے ذریعے آدمی پر ہدایت کی راہ کھلتی ہے۔ جس کی بدولت آدمی اللہ کی کتاب سے فیض پانے کے لائق بنتا ہے۔ تقویٰ وہ پسندیدہ جوہر ہے جس کی بنیاد پر اللہ نیک اعمال کو تقویت بخشتا ہے۔ غیر متقی انسان کا عمل بھی اس کے یہاں مقبول نہیں ہوتا اور روزہ رکھنے کا حاصل یہی ہے کہ آدمی کو تقویٰ کی یہ دولت حاصل ہو۔ بے شک دوسری عبادات سے بھی تقویٰ حاصل ہوتا ہے' مگر روزے کو تقویٰ سے خصوصی مناسبت ہے اور اسی لیے اللہ نے تقویٰ کو روزے کا حاصل قرار دیا ہے۔

اب پوری آیت کو ایک بار پھر ذہن میں تازہ رکھیے اور اپنا جائزہ لیجیے کہ جب اے ایمان والو! کے الفاظ آپ پڑھتے اور سنتے ہیں تو آپ پر وجد کی کوئی کیفیت طاری ہوتی ہے یا نہیں' اللہ کی عظمت اور ہیبت سے آپ پر لرزہ طاری ہوتا ہے یا نہیں — اور آپ دل کی گہرائی سے یہ احساس کرتے ہیں یا نہیں کہ اللہ آپ سے مخاطب ہے اور آپ پر روزہ فرض کر رہا ہے اور پھر یہ کہ روزہ رکھنے کے لیے یہ بات آپ کے لیے کافی ہو جاتی ہے کہ یہ آپ کے اللہ کا حکم ہے یا آپ کسی اور محرک کے بھی منتظر رہتے ہیں۔ اگر اللہ کے حکم کے علاوہ آپ کسی اور محرک کے بھی منتظر رہتے ہیں اور کسی عمل پر آمادہ کرنے کے لیے آپ کو اللہ کا حکم کافی نہیں ہوتا' تو آپ ایک خطرناک اور تباہ کن بیماری کا شکار ہیں۔ آپ کا ایمان نزع کی کش مکش میں مبتلا ہے۔ جلد از جلد فکر کیجیے اور اپنے ایمان کو اس کش مکش سے بچائیے۔ اس معاملے میں سستی اور غفلت اور لاپروائی آپ کی عبرتناک موت کا باعث بن سکتی ہے — جسمانی موت نہیں کہ وہ تو ایک بار آتی ہے — اور وہ کوئی حادثہ نہیں' حادثہ تو ایمانی موت ہے۔ انسان کی ساری قدر و قیمت اور زندگی کی تمام تر رعنائی ایمان کی بدولت ہے۔ ایمان مردہ ہو گیا تو سب کچھ لٹ گیا۔ ایمان سے محروم زندگی' زندگی نہیں موت ہے۔ ایسا چلتا پھرتا انسان دراصل ایک زندہ لاشہ ہے جو زمین کی پیٹھ پر ایک گندہ بوجھ ہے۔

جس بندے کا ایمان شعوری ایمان ہے' اس کو اللہ کی اطاعت پر آمادہ کرنے کے لیے اتنی بات بالکل کافی ہے کہ اس کے اللہ نے اسے یہی عبادت کا حکم دیا ہے۔ یہ تو رب جلیل و کریم کی بے پایاں عنایت اور مزید فضل و کرم ہے کہ وہ حکم دینے کے ساتھ ساتھ اپنے حکم کے اسباب اور فرض کردہ عبادات کے فائدے بھی ذہن نشین کراتا ہے۔

روزے کے سلسلے میں فرمایا گیا ''تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔'' یہ فقرہ اس لیے بھی ہے' کہ بندۂ مومن اور زیادہ دل جمعی اور یکسوئی' اطمینانِ قلب اور نشاط کے ساتھ روزے کا اہتمام کرے اور خاص طور پر اس لیے بھی کہ بندہ بار

بار اپنا جائزہ لے اور دیکھے کہ اس کا روزہ واقعی اس کا روزہ بھی ہے یا نہیں۔ ''تا کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو'' یہ الفاظ ایک کسوٹی بھی ہیں، تا کہ ہر روزہ رکھنے والا شخص اپنی زندگی پر نگاہ رکھے اور جائزہ لیتا رہے کہ روزہ رکھ کر اس کی زندگی تقویٰ سے آراستہ ہو رہی ہے یا نہیں۔

اللہ نے تقویٰ کو روزے کا حاصل بتایا ہے اور اللہ کا یہ فرمان یقیناً ہر شک وشبہ سے پاک ہے۔ روزے سے یقیناً تقویٰ حاصل ہوتا ہے اور ہونا چاہیے ــــ لیکن اگر کوئی روزہ رکھنے کے باوجود تقویٰ سے محروم ہے تو یقین کر لینا چاہیے کہ اس کا روزہ وہ روزہ نہیں ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ اگر روزہ رکھ کر آپ کو تقویٰ کی دولت نہیں حاصل ہو رہی ہے تو اطمینان کر لیجئے کہ آپ روزہ سے نہیں ہیں، آپ فاقہ کی مشق کر رہے ہیں جس کا حاصل تقویٰ نہیں کمزوری ہے۔

بے چینی کے ساتھ فکر کیجیے ــــ رمضان کی مبارک گھڑیاں تیزی کے ساتھ گزر جائیں گی۔ انہیں اس طرح نہ گزر جانے دیجیے کہ آپ خالی ہاتھ رہیں ــــ معلوم نہیں آئندہ سال آپ کو پھر یہ مبارک گھڑیاں زندگی میں نصیب ہوتی ہیں یا نہیں؟



# دورِ حاضر کا فتنہ

مال و دولت، جائیداد اور وسائل عیش و عشرت اللہ کی نعمتیں ہیں۔ اللہ نے ان نعمتوں کو خیر، فضل اور قیام (زندگی گزارنے کی بنیاد) جیسے معنی خیز ناموں سے یاد کیا ہے۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ ہر دور میں انسان ان نعمتوں کو حاصل کرنے اور آسائش کی زندگی گزارنے کے لیے دوڑ دھوپ کرتا رہا ہے۔ تاریخ میں کسی ایسے دور کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی جس میں انسانوں نے ان نعمتوں سے نفرت کی ہو یا ان کے حصول میں سرد مہری دکھائی ہو۔

قرآن و سنت کا منشا بھی یہ ہرگز نہیں معلوم ہوتا کہ آدمی ان نعمتوں سے بیزاری کا اظہار کرے۔ انہیں پانے کے لیے کوئی دوڑ دھوپ نہ کرے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے۔ اپنی روزی اپنے ہاتھ سے کمانا عبادت ہے۔ اپنے اہل و عیال کی ضرورتوں کے لیے دوڑ دھوپ کرنا نیکی ہے۔ دوسروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا اور آسائش و ضرورت کے لیے ہاتھ پیر مارنا مطلوب ہے۔ دنیا کی نعمتوں کو حقیر سمجھنا، ان سے بیزاری دکھانا اور ان سے فائدہ اٹھانے کو دینداری کے خلاف سمجھنا غلط طرزِ فکر ہے، جس کی تائید قرآن و سنت سے نہیں ہوتی۔ بلکہ قرآن پاک تو تیکھے انداز میں اس نقطہ نظر کے لوگوں سے باز پرس کرتا ہے اور صاف صاف بتاتا ہے کہ یہ ساری نعمتیں دنیا میں مؤمنوں کے لیے ہیں اور آخرت میں تو یہ صرف انہی کا حصہ ہیں۔ اللہ کا ارشاد ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ (الاعراف ۷:۳۲)

”ان سے کہئے، کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے اللہ کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں؟ کہو یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان لانے والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے روز تو خالصتاً انہی کے لیے ہوں گی۔“

قرآن پاک کی آیت کا صاف منشاء ہے کہ مؤمن اللہ کے پیدا کردہ وسائل حیات اور آرائش زندگی کے ساز و سامان سے پورا پورا فائدہ اٹھائے اور ان نعمتوں سے محروم رہنے کو دینداری نہ سمجھے۔

اس معاملے میں مؤمن کو وہ بنیادی ہدایات دی گئی ہیں، ایک یہ کہ زندگی کے کسی مرحلے میں بھی اپنے اللہ کو نہ

بھولے۔ یہ بنیادی ہدایات دے کر دین مؤمن کو آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ وہ کارگاہِ حیات میں اپنی قوتوں کو کھپائے، جسم و دماغ کی توانائیوں کو کام میں لائے، دنیا میں پھیلے ہوئے وسائل اور سہولتوں سے خاطر خواہ کام لے اور دنیا میں پھیلی ہوئی اللہ کی نعمتوں سے خوب خوب فائدہ اٹھائے۔ مگر بڑا فرق ہے فائدہ اٹھانے کے اس دینی نقطہ نظر میں اور اس مادی نقطہ نظر میں جو آج کے دور کا سب سے بڑا فتنہ ہے — دورِ حاضر کا ہر فرد دولت مند بننے کے لیے بے تاب ہے اور یہ چاہتا ہے کہ راتوں رات میرے دن پھر جائیں، کسی تاخیر یا طبعی رفتار کو گوارا کرنے کے لیے بھی وہ تیار نہیں ہے۔ ہر فرد یہ چاہتا ہے کہ وسائل عیش و عشرت اور چمک دمک میں ہر ایک سے آگے نکل جائے۔ معیار زندگی اس قدر اونچا ہو کہ ہر ایک کو رشک آئے۔ مادی دولت و ثروت کے بل بوتے پر ہر ایک کو اپنی قدر و عظمت کا قائل کرے۔ ہر ایک پر اپنی شان و شوکت کا رعب جمائے۔ اس کا مسکن ترقی یافتہ دور کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہو اور اس میں آرام و آسائش کی ہر نعمت مہیا ہو۔ اسی فکر و آرزو کو لیے وہ اپنے بستر پر دراز ہوتا ہے اور اسی تمنا کے ساتھ وہ صبح کو بیدار ہوتا ہے۔ اس کی محفل میں شب و روز اسی کے چرچے ہیں۔ ہر وقت کاروبار کی رونق بڑھانے اور زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کے منصوبے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آدم کی یہ اولاد گویا اس کرۂ ارض پر اس لیے پیدا کی گئی ہے کہ وہ معاشی دوڑ کا تماشا دکھائے — دادِ عیش دینے اور زیادہ سے زیادہ وسائل عیش و عشرت اور نمود و نمائش حاصل کرنے کی دوڑ میں ایک دوسرے سے بازی لے جائے۔

پھر ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ حرص و آز کا یہ طوفان اور معیار زندگی کی بلندی کا یہ اتھاہ جذبہ اس زور اور قوت کے ساتھ سماج پر حملہ آور ہے کہ اس ریلے میں کسی کے قدم جمتے محسوس نہیں ہوتے۔ وہ افراد جو خود کو دیندار سمجھتے یا سمجھے جاتے ہیں اور جو فکر آخرت، ترجیح آخرت جیسے انقلابی الفاظ بولتے ہیں، ان کا رخ بھی اسی سمت ہے، جس سمت ان انقلابی الفاظ سے ناآشنا لوگوں کا رخ ہے اور وہ بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اس وبائی فتنہ کا شکار ہیں اور عملاً وہ بھی اس رو میں بہتے نظر آتے ہیں۔ ہاں اگر وہ بہت پیچھے ہوں تو تنقید و تبصرے سے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح اپنی دینداری اور احساس برتری جتا کر اپنے دل کا چور چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

سوسائٹی کا یہ انداز فکر و عمل دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ گویا انسان کی تخلیق کا مقصد دنیا کی دولت سمیٹنا، جائیداد بڑھانا، دادِ عیش دینا اور زیادہ سے زیادہ وسائل عیش و طرب فراہم کرنا ہے۔ یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ اللہ نے اس اشرف المخلوقات کا مقصد تخلیق عبادت قرار دیا ہے۔

مال و دولت کا حصول مؤمن کے لیے ممنوع ہرگز نہیں ہے اور دنیا کے وسائل و ذرائع سے فائدہ اٹھانا ہرگز ناپسندیدہ نہیں ہے۔ دنیا کی آسائشوں سے فائدہ اٹھانے اور دنیوی لذتوں سے لذت اندوز ہونے اور بلند معیار زندگی اختیار کرنے کو جو ذہن دینداری کے خلاف قرار دیتے ہیں اور اسی معیار سے دینداری کے طول و عرض کو

ناپتے ہیں' یقیناً وہ مریض ذہن ہیں اور ان کا انداز فکر کسی طرح پسندیدہ نہیں ہے— مگر یہ بات کہ آدمی کا نصب العین ہی دولت کا حصول بن جائے اور مادی ترقی ہی کو وہ اپنی معراج سمجھنے لگے' یقیناً یہ بھی غلط ہے۔ جس مؤمن کو اللہ کا یہ فرمان یاد ہو:

''میں نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔''

وہ ہرگز اپنی زندگی سے یہ مظاہرہ نہیں کر سکتا کہ گویا وہ دولت سمیٹنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ غربت و افلاس کی زندگی سے اللہ کے رسول ﷺ نے پناہ مانگی ہے اور واقعی یہ بڑی جان لیوا آزمائش ہے۔

اللہ ہم سب کو اس آزمائش سے محفوظ و مامون رکھے اور دین شریعت کا منشا بھی یہی ہے کہ ہر مسلمان اپنی روزی خود اپنے ہاتھوں سے کمائے۔ روزی کمانے کے لیے دوڑ دھوپ کرے اور دنیا میں اپ جسم و دماغ کی قوتیں کام میں لا کر ہر اعتبار سے اپنی زندگی کو آراستہ کرے' اپنی ضروریات کے لیے کسی پر بوجھ نہ بنے' نہ اپنے نا کارہ پن سے بیوی بچوں اور متعلقین کو تنگی میں مبتلا کرے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ ہر چیز سے آنکھیں بند کر کے محض اس ایک فکر کو اوڑھ لے کہ اپنے دور کا سب سے بڑا دولت مند بن جائے۔ اس تصور اور آرزو کو اپنا نصب العین بنا لے۔ اپنے جینے کا مقصد ہی عیش و عشرت کو قرار دے لے اور دینداری' اخلاق و کردار اور شرافت ہر چیز کو اسی دولت و ثروت کے معیار پر جانچنے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کے لیے قدر و عظمت کی چیز دین و ایمان ہے۔ اگر آپ کو یہ شعور حاصل ہے تو آپ خوش حال ہیں یا خستہ حال' آپ خوش نصیب ہیں' آپ کی زندگی قابل رشک ہے۔ حلال ذرائع سے زندگی کی نعمتیں حاصل کرنے کے لیے خوب دوڑ دھوپ کیجیے۔ دنیا کے وسائل اور سہولتوں سے بھرپور فائدہ اٹھائیے۔ آپ کا وجود کرہ ارض پر نہایت قیمتی ہے— آپ اپنی قیمت اور مقام بھی جانتے ہیں' اپنے اللہ کو بھی پہچانتے ہیں۔ اس لیے آپ کی دنیا بھی دین ہے۔

لیکن خدانخواستہ آپ دین کے شعور سے محروم ہیں۔ اپنا مقام بھی بھول چکے ہیں اور اپنے اللہ کو بھی فراموش کر چکے ہیں اور دنیا پرستی میں ایسے مگن ہو گئے ہیں کہ اللہ اور آخرت کا بھولے سے بھی کوئی خیال نہیں آتا تو پھر چاہے دنیا جہان کی نعمتیں آپ کو حاصل ہوں' ہر طرح کا عیش و راحت کا سامان آپ کو حاصل ہو اور دورِ حاضر کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ انسان آپ کہلاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ محروم ہیں' ناکام ہیں۔ آپ کا وجود اللہ کی زمین پر بدترین وجود ہے۔

دولت' راحت' آسائش اور دنیوی ترقی ہرگز قابل نفرت نہیں ہے۔ ان کے لیے دوڑ دھوپ اور فکر و کوشش بھی ناپسندیدہ نہیں' بلکہ محبوب اور مطلوب ہے۔ اللہ کے دین کا منشاء یہی ہے کہ آپ اس دنیا کو دوسروں سے زیادہ

سنواریں۔ تمدنی ترقیوں میں دوسروں سے آگے بڑھیں، سائنس اور ٹیکنالوجی کی نعمتوں میں نہ صرف یہ کہ کسی سے پیچھے نہ رہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی مثال اور نمونہ بنیں ـــــ لیکن یہ بات کسی مرحلے میں بھی ذہن سے اوجھل نہ ہونے دیں کہ آپ کے نزدیک قدر و عظمت کی اصل چیز دین و ایمان ہے۔ اگر خدا فراموشی میں آپ مبتلا نہیں ہیں تو یہ ساری نعمتیں واقعتاً نعمتیں ہیں اور آپ کے نصب العین کی راہ میں آپ کی بہترین معاون ہیں۔



# شخصیت کو جانچنے کی کسوٹی

انسانیت اور دین کے لحاظ سے آپ کا کیا مقام ہے؟ اگر آپ کی نظر میں اس سوال کی کوئی اہمیت ہے تو یہ حقیقت بھی سامنے رکھیئے کہ اس کا فیصلہ کرنا آپ کا کام نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں بڑی حد تک فیصلہ کن ان لوگوں کی رائے ہے' جو آپ سے قریب رہتے ہیں اور کسی نہ کسی حیثیت سے آپ سے متعلق ہیں' اس میں کوئی شک نہیں کہ آدمی خود کو بہت اچھی طرح جانتا ہے لیکن جب بھی وہ اپنی شخصیت اور مقام کے بارے میں فیصلہ کرتا ہے تو اکثر و بیشتر خود کو دھوکا دینے کی غلطی کرتا ہے ـــــ شخصیت کے اچھے پہلوؤں پر ہی نگاہ رکھ کر اپنی بہترین تصویر نگاہ میں جمالیتا ہے۔ اور کمزور پہلوؤں سے یکسر صرف نظر کر جاتا ہے ـــــ اس طرح عام طور پر وہ اپنی شخصیت اور مقام کے بارے میں صحیح فیصلہ نہیں کر پاتا' وہ اپنی وہ تصویر ذہن میں جماتا ہے جو اسے پسند ہوتی ہے۔ خود کو بھی مطمئن کرتا رہتا ہے کہ یہی اس کی حقیقی تصویر ہے ـــــ اور مخلوق اللہ کو بھی اسی میں مبتلا کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہتا ہے اور پھر نہایت سادہ لوحی اور کوتاہ نظری سے خود کو اس دھوکے میں مبتلا بھی رکھتا ہے کہ اللہ کی نظر میں بھی اس کی اصل تصویر وہ ہی ہے جو اس نے اپنے ذہن میں بنا رکھی ہے۔

انسانیت اور دین کے لحاظ سے آپ کا کیا مقام ہے؟ یہ نہایت اہم سوال ہے۔ اگر واقعی آپ کو اپنی ذات سے دلچسپی ہے اور آپ حقیقتاً اپنے خیر خواہ ہیں تو آپ یوں سر جھکائے اس سوال کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہ سوال آپ کے حال سے بھی متعلق ہے اور آپ کے مستقبل سے بھی' اگر آپ اپنے حال و مستقبل کے بارے میں سنجیدہ ہیں تو آپ کو سنجیدگی سے اس سوال پر غور کرنا پڑے گا۔

اس سوال پر غور کرنے اور صحیح نتیجہ تک پہنچنے کا ایک نہایت ہی آسان اور قابل اعتماد طریقہ ہے۔ بشرطیکہ آپ سنجیدگی اور انصاف کے ساتھ اپنا مقام جاننے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ آپ یہ دیکھیں کہ جو شخص آپ کے قریب آیا' آپ کے ساتھ رہا' وہ آپ کی عظمت اور نیکی کا معترف ہوا اور آپ کا کچھ اور زیادہ گرویدہ ہو گیا یا قریب آنے کے بعد آپ سے دور ہوا اور آپ کی عظمت کا طلسم ٹوٹ گیا۔ اگر ایسا ہے کہ آپ سے قریب ہونے اور قریب رہنے والے آپ کے اور زیادہ گرویدہ ہوتے چلے گئے اور آپ کی عظمت اور نیکی کے اور زیادہ قائل ہوتے چلے جاتے ہیں تو

اطمینان کیجیے کہ انسانیت اور دین کے لحاظ سے آپ کا مقام بہت اونچا ہے—— اور اگر لوگ قریب آنے کے بعد آپ کے بارے میں اچھی رائے کا اظہار نہیں کرتے اور آپ سے تعلق اور گرویدگی کے بجائے بے تعلقی اور بے رخی کا اظہار کرتے ہیں' تو چاہے آپ کچھ تاویل کریں' حقیقت یہی ہے کہ دین وانسانیت کے لحاظ سے آپ بہت نچلے مقام پر ہیں۔ دراصل خود کو جانچنے اور پرکھنے کی یہ ایک اطمینان بخش کسوٹی ہے—— آپ سے جو لوگ قریب ہیں' آپ کی شخصیت جن کے سامنے زیادہ سے زیادہ بے نقاب ہے۔ آپ کی جلوت وخلوت کے جو لوگ ہمہ وقتی شریک ہیں' جن کو شب و روز آپ سے واسطہ ہے اور جن سے آپ کے معاملات ہیں۔ دراصل ان کی نظر میں آپ کی شخصیت کا ہر پہلو ہے۔ ہر مرحلہ پر آپ کی دینی' انسانی شخصیت اور حیثیت ان کے سامنے کھل کر آ جاتی ہے اور وہ بڑی حد تک صحیح اندازہ کرتے ہیں کہ آپ کیا ہیں—— اگر یہی لوگ دور سے آپ کی عظمت' شرافت اور نیکی کے قائل اور معترف تھے' لیکن جب قریب آئے تو آپ کی عظمت اور نیکی کا سارا فسوں ٹوٹ گیا اور وہ آپ سے بدکنے لگے' آپ کی قد آور شخصیت انہیں بونی نظر آنے لگی۔ آپ کی نیکی' دینداری اور بھلائی انہیں مشتبہ محسوس ہونے لگی اور آپ کی ساری خوبیاں ان کے لیے بے وزن ہو گئیں تو یقین کر لیجیے کہ دین اور انسانیت کے لحاظ سے آپ کا مقام وہ نہیں ہے' جو آپ نے اپنے ذہن میں بنائے رکھا ہے یا دوسروں کو آپ باور کرانے کی بے جا کوشش کر رہے ہیں۔ تسلیم کر لیجیے کہ آپ کی شخصیت کے اسٹیچو کو گھن لگ چکا ہے۔ یہ ذرا سا اشارہ پا کر دھڑام سے نیچے آ گرے گا—— اور ہو سکتا ہے کہ گرنے کا یہ عمل شروع ہو چکا ہو' لیکن آپ کو احساس نہ رہا ہو۔

اپنی شخصیت پر ماتم کیجیے اور ساری مشغولیتوں کو چھوڑ کر' تمام اہم ترین کاموں کو ترک کر کے سب سے پہلے اپنی فکر کیجیے' اپنی ذات پر وقت لگائیے اور اپنی شخصیت کو ذلت اور رسوائی کے اس گڑھے سے نکالنے کے لیے کمربستہ ہو جائیے جس گڑھے کو آپ محسوس نہیں کر رہے ہیں اور آپ کو شعور ہی نہیں ہو رہا ہے کہ آپ ذلت کے ساتھ اس میں پڑے ہوئے ہیں۔

اور اگر بات اس کے خلاف ہے۔ آپ سے قریب ہونے والے آپ کی نیکی' شرافت اور عظمت وانسانیت کے معترف ہیں۔ قریب ترین لوگوں کے دلوں میں آپ کی عزت ووقعت ہے۔ جو جتنا قریب آتا ہے اتنا ہی آپ سے زیادہ وابستہ ہوتا چلا جاتا ہے اور آپ کی قربت میں ذہنی اور روحانی سکون محسوس کرتا ہے تو اللہ کا شکر ادا کیجیے اور اطمینان کیجیے کہ اللہ کی نظر میں آپ کا مقام بہت اونچا ہے۔ مگر ساتھ ہی ہر وقت چوکنا رہیے کہ آپ ہر وقت خطرے میں ہیں۔ دائیں بائیں آگے پیچھے' ہر طرف سے آپ پر حملہ ہو سکتا ہے۔ ہوشیار رہیے کہ آپ کا ازلی دشمن کسی مرحلے میں بھی آپ کو اس بلندی سے نیچے نہ کھسکا سکے۔

یہ ایک قابلِ اعتماد کسوٹی ہے۔ آپ جہاں تک سوچیں گے' آپ کی عقل اس کی اہمیت کو تسلیم کرے گی اور پھر

یہ خودساختہ بھی نہیں ہے بلکہ اللہ کے رسول ﷺ کی بتائی ہوئی کسوٹی ہے اوراس کو رسول ﷺ کی سند حاصل ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے پوچھا' یارسول اللہ! مجھے کیسے معلوم ہو کہ میں اچھے کام کرتا ہوں اور اچھا آدمی ہوں' یا برے کام کرتا ہوں اور برا آدمی ہوں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا' جب تم اپنے پڑوسیوں کو یہ کہتے سنو کہ تم اچھے کام کر رہے ہو' تو واقعی اچھے کام کر رہے ہو' اور جب تم ان کو یہ کہتے سنو کہ تم برے کام کر رہے ہو' تو واقعی تم برے کام کر رہے ہو۔

(ابن ماجہ' مشکوۃ' باب الشفقہ' فصل ثانی ص ۴۲۴' کارخانہ تجارت' کراچی)

پڑوسی سے مراد وہ شخص ہے جو کسی بھی حیثیت سے آپ کا ساتھی ہو' تھوڑی سی دیر کے لیے یا زیادہ وقت کے لیے۔ گھر کا پڑوسی ہو یا دکان کے کاروبار میں آپ کے ساتھ شریک ہو یا کسی ادارے میں آپ کا ساتھی ہو' مکتب اور اسکول میں آپ کے ساتھ رہا ہو یا کسی کارخانے میں' کسی دفتر میں آپ کے ساتھ کام کر رہا ہو یا آپ کا خدمت گزار ہو۔ غرض جس شخص کو بھی آپ کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ملا ہو' وہ آپ کے بارے میں جو رائے بناتا ہے' وہ بے وزن ہرگز نہیں ہے اور آپ کے لیے کسی طرح یہ مناسب نہیں ہے کہ اسے نظر انداز کر دیں' ایسے شخص کی شہادت اور رائے ہی دراصل آپ کے بارے میں قابل لحاظ ہے اور اسی شہادت اور رائے کی روشنی میں آپ اپنے بارے میں صحیح فیصلے تک پہنچ سکتے ہیں' پڑوسیوں اور ساتھیوں کی رائے کو بے وزن قرار دے کر اگر آپ اپنی رائے ہی پر اصرار کرتے ہیں' اپنے بارے میں اپنے ہی فیصلے کو آخری فیصلہ قرار دیتے ہیں اور اپنی رائے پر نظر ثانی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو پھر انتظار کیجیے۔ اللہ تعالیٰ جلد آپ پر حقیقت واشگاف کر دے گا اور اس وقت آپ کی آہ وزاری کسی کام نہ آئے گی۔ وہ صرف بھگتنے کا وقت ہوگا' سنبھلنے کا وقت ختم ہو چکا ہوگا۔



# اپنی تقدیر خود بنائیے

آپ کی تقدیر میں کیا ہے، آپ کامیاب ہیں یا ناکام۔ آپ کی آرزوئیں پوری ہوں گی، یا زندگی بھر آپ یوں ہی ہاتھ ملتے رہیں گے ــــ اس کا صحیح علم کسی کو نہیں۔ آپ کے پاس کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے جس سے آپ تقدیر کی اصل حقیقت معلوم کرسکیں، وہم وگمان اور قیاس اور اندازوں سے اگر کوئی اشارہ ملے بھی تو وہ ہرگز قابل اعتماد نہیں، اس لیے آپ یہ معلوم کرنے میں ہرگز اپنا وقت صرف نہ کریں کہ آپ کی تقدیر میں کیا ہے۔ یہ علم نہیں، جہالت ہے۔ دانائی نہیں، حماقت ہے۔

مسلمان کو جن حقیقتوں پر ایمان رکھنا چاہیے ان میں سے ایک ایمان بالقدر بھی ہے۔ تقدیر پر ایمان رکھنے کا مطلب یہی ہے کہ آپ دل سے یہ حقیقت تسلیم کریں کہ آپ کو صرف وہی کچھ حاصل ہوگا جو اللہ نے آپ کے مقدر میں لکھ دیا ہے۔ آپ کی تقدیر میں جو نہیں ہے وہ ہرگز آپ کو میسر نہیں آسکتا۔ لیکن آپ کی تقدیر میں کیا ہے اور کیا نہیں ہے، یہ نہ آپ کو معلوم ہے اور نہ کسی طرح معلوم ہوسکتا ہے، اس لیے زندگی کے کسی مرحلے میں بھی آپ کے سوچنے کی یہ بات نہیں ہے کہ آپ کی تقدیر میں کیا ہے؟ آپ کے سوچنے اور فکر کرنے کی بات اگر ہے تو صرف یہ ہے کہ آپ جو پاکیزہ اور پسندیدہ آرزو رکھتے ہیں، اسے پورا کرنے کے لیے آپ کیا کچھ کررہے ہیں۔ تقدیر بنانا اور فیصلہ کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ آپ کا کام صرف یہ ہے کہ جو کچھ چاہتے ہیں اس کے لیے انتھک محنت کریں اور کسی وقت بھی مایوسی اور کم ہمتی اور جی چھوڑ بیٹھنے کا شکار نہ ہوں۔

تقدیر پر آپ کی ایک گمراہ کن تعبیر اکثر زندگیوں کو برباد کرڈالتی ہے۔ اس تعبیر کے چکر سے اللہ کی پناہ مانگیے۔ اور اگر اس کا سایہ آپ پر پڑرہا ہو تو اس سے بھاگ نکلنے کی بے تابانہ کوشش کیجیے۔

بعض پست ہمت، کاہل، تھڑدلے اور آرام طلب لوگ اپنے ناکارہ پن کو ایمان بالقدر کا نام دے کر خود کو بھی دھوکا دیتے ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکا دینے کی گمراہ کن کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنی کاہلی، کم ہمتی اور آرام طلبی کے لیے اس یاس انگیز جملے کا سہارا لیتے ہیں کہ ''تقدیر ہی خراب ہے۔'' ان کی سستی، کاہلی، پست ہمتی اور ناکارہ پن پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس عمل کی دنیا میں جہاں شب وروز مسابقت اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی

مسلسل کوشش ہو رہی ہے، ان کاہلوں کے نزدیک ان کی بے عملی پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ ان کی ناکامی اور نامرادی کی ساری ذمہ داری ان کی تقدیر پر ہے۔ کس قدر دھوکے میں ہیں یہ لوگ اور کیسی عجیب وغریب ہے ان کی منطق! ان کی خستہ حالی اور پستی کی ذمہ داری خود انہیں بھی اچھی طرح معلوم ہے۔ کس قدر احمقانہ اور جاہلانہ ہے ان کا یہ اندازِ فکر۔

آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی زندگی کامیاب ہو، آپ تابناک زندگی کے مالک ہوں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک پسندیدہ اور پاکیزہ آرزو نہیں ہے۔ مگر اس حقیقت سے کون انکار کی جرأت کر سکتا ہے کہ محض آرزو رکھنے سے کوئی آرزو پوری نہیں ہوتی، آرزو کیسی ہی اعلیٰ اور پسندیدہ ہو، محض اس وجہ سے وہ کبھی پوری نہیں ہو جائے گی کہ آپ کے سینے میں پرورش پا رہی ہے۔ اسباب کی اس دنیا میں یہ قطعاً ممکن نہیں۔

اس کارگاہِ حیات میں آپ کے لیے یہ سوچنے کا نہ کوئی جواز ہے اور نہ ہی فائدہ کہ آپ کی تقدیر میں کیا ہے۔ آپ کے سوچنے اور فکر کرنے کی بات یہ ہے کہ آپ جو آرزو رکھتے ہیں، اس کے لیے آپ کی فکر وسعی، دوڑ دھوپ، جاں فشانی، لگن اور مسلسل کوشش وکاوش کا کیا حال ہے؟ ایمان بالقدر کی غلط تعبیر کر کے زندگی کو گنوانے والے کچھ کو تاہ اندیش وفکر وبصیرت کے مفلس، اگر ہاتھ پر ہاتھ رکھے اپنی قسمت کو رو رہے ہیں، تو آپ ان پر افسوس کرنے میں اپنے دو لمحے بھی ضائع نہ کیجیے۔ یہ اپاہج سماج پر بوجھ ہیں۔ ان کا وجود سماج کے لیے پھوڑے کے ورم سے زیادہ تکلیف دہ ہے اور یہ ہرگز اس لائق نہیں ہیں کہ ان کے گمراہ کن فکر وعمل پر کوئی ہوش وخرد رکھنے والا توجہ کرے۔ یہ زبردست نادانی اور جہالت ہوگی کہ کوئی ان کی عبرتناک زندگیوں سے تقدیر کے نازک مسئلہ کو سمجھنے کی حماقت کرے۔ اللہ کرے آپ ان حرماں نصیبوں سے ہرگز اثر نہ لیں اور اللہ کی بخشی ہوئی بے پناہ قوتوں اور صلاحیتوں کو مفلوج کر کے اپنی ناکامی کے لیے آپ تقدیر کی خرابی کا بہانہ ہرگز نہ کریں بلکہ خود کو ٹٹولنے کی ہمت کریں اور اپنا کڑا جائزہ لیں، اس جائزے میں آپ جو وقت بھی صرف کریں گے، کامیابی کی منزلیں طے کریں گے، آگے بڑھیں گے اور اپنے مقصود سے قریب ہوں گے۔ اس کے برخلاف اگر آپ تقدیر کا رونا ہی روتے رہے، تو یہ ایک ایک لمحہ آپ ضائع کریں گے اور اپنے کو کچھ اور زیادہ اپاہج بنانے میں زندگی کی قیمتی متاع کو ضائع کریں گے —— اور آپ جانتے ہیں کہ دنیا کی حماقتوں میں اس سے بڑی کوئی حماقت نہیں ہو سکتی کہ آدمی زندگی جیسی چیز کے لمحات ضائع کرے۔ زندگی وہ قیمتی سرمایہ ہے کہ اس سے زیادہ قیمتی سرمایہ تصور کی دنیا میں بھی آپ کے لیے نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی ہر نعمت کا نعمت ہونا زندگی پر موقوف ہے۔ زندگی ہے تو ہر نعمت واقعی نعمت ہے اور زندگی نہیں ہے تو ہر نعمت بے کار ہے۔ کیا یہ بات کسی طرح آپ کے لیے صحیح ہو سکتی ہے کہ ایسی قیمتی متاع کا کوئی لمحہ آپ ضائع کریں۔

پھر یہ حقیقت بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ اس زندگی کا جو لمحہ آپ نے ایک بار ضائع کر دیا وہ ضائع ہو ہی گیا

——اب وہ کسی قیمت پر آپ کو دوبارہ نہیں مل سکتا۔ گزرا ہوا وقت کبھی واپس نہیں آتا۔ جو گزر گیا گزر گیا۔ یہ حقیقت آپ کے ذہن میں تازہ ہو تو کبھی ممکن نہیں کہ آپ کبھی اس متاع عزیز کو ضائع کر دیں۔ دراصل زندگی کی قیمتی گھڑیوں کو وہی نادان ضائع کرنے کا زبردست جرم کرتے ہیں جو شعور سے محروم ہوتے ہیں۔

اور پھر یہ حقیقت بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ اپنی ناکامی اور نامرادی کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالنا بھی کوئی صحت مند انداز فکر نہیں ہے۔ یہ بھی کم ہمت، کم حوصلہ اور خود کو دھوکے میں رکھنے والوں کا انداز فکر ہے۔ صحت مند انداز فکر رکھنے والے اس طرح کبھی نہیں سوچتے۔ اپنی ناکامی کے آپ خود ذمہ دار ہیں۔ اور آپ کی کامیابی کا سہرا صرف آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ صرف اسی قدر پائیں گے جس قدر پانے کے لیے کوشش کریں گے۔ اپنا مستقبل آپ خود بنائیں گے۔ آپ بنائیں اور کوئی دوسرا بگاڑ دے یہ بھی ممکن نہیں اور آپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور مستقبل تابناک بن جائے یہ بھی ممکن نہیں اور آپ شب و روز انتھک محنت کریں اور صرف ناکامی آپ کے ہاتھ میں آئے یہ بھی ممکن نہیں۔

سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کو صرف وہی ملتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک روشن حقیقت ہے کہ جس پر اللہ کی کتاب گواہ ہے کہ اللہ کسی کی کوشش کو ضائع نہیں کرتا۔ وہ محنت کا بھرپور پھل دیتا ہے۔ بیشک یہ فیصلہ کرنا بھی اس کا کام ہے کہ کس محنت کا کیا پھل دے اور کس قدر دے، لیکن یہ بہر حال طے ہے کہ کیے کا پھل ضرور ملتا ہے۔ یہ بالکل ممکن نہیں کہ آدمی اچھی آرزو سے سینے کو آراستہ کرے، اس کے لیے کوشش و محنت کا حق ادا کرے اور پھر وہ ناکام رہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ (النجم۵۳:۳۹)

''انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے جدوجہد کی ہے''۔

اور یہ بھی اسی کا ارشاد ہے:

لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ (آل عمران۳:۱۹۵)

''میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں خواہ وہ مرد ہو یا عورت''۔

اور یہ فرمان برحق بھی اسی کا ہے:

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ (الزمر۳۹:۷۰)

''اور ہر شخص کو جو کچھ بھی اس نے کیا ہے اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا''۔

اپنی ناکامی پر کڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ نہ یہ صحیح ہے کہ شکایت کا پیکر بن کر آپ بار بار آسمان کی طرف گردن

اٹھائیں اور اس اللہ تعالیٰ کا شکوہ کریں جس کا شکر ہر حال میں آپ پر واجب ہے، نہ یہ صحیح ہے کہ آپ اپنی ناکامی کے ذمہ دار اپنے اردگرد ڈھونڈنے کی طفلانہ حرکتیں کریں، نہ یہ صحیح ہے کہ آپ اپنے مقدر پر برستے رہیں، جس کا کچھ حال آپ کو معلوم نہیں ہے اور جس کی واقعی حقیقت صرف اس کو معلوم ہے جس نے آپ کا مقدر بنایا بھی ہے، آپ کو سعی و کوشش کا حکم بھی دیا ہے اور آپ کو گوہر مقصود پا لینے کے وسائل و ذرائع اور قوتیں اور صلاحیتیں بھی دی ہیں جو چیز آپ کے احاطۂ علم سے باہر ہے، جس کے بارے میں آپ کے پاس قطعی علم کا کوئی ادنیٰ حصہ بھی نہیں ہے، اس کے بارے میں خود ساختہ اور موہوم تصور اور گمان کو اپنی فکر ونظر کی بنیاد بنا کر اپنی زندگی کو برباد کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ جھٹک دیجیے ان اندیشوں کو، ان بے بنیاد گمانوں کو، اس غلط طرز فکر کو اور جس قدر جلد ممکن ہو، وہم و گمان کی بھول بھلیوں سے باہر نکل آیئے —— آپ کی ناکامی یا کامیابی کے تنہا ذمہ دار آپ ہیں اور کوئی نہیں ہے۔ نصیب کو کوسنا، دوسروں کو ملزم ٹھہرانا، حالات کا شکوہ کرنا، آپ کا کام نہیں ہے۔ آپ کے لیے یہ ہرگز زیبا نہیں، یہ تو ان نادان بزدلوں کا کام ہے جو ناکامی، مایوسی اور ذلت و پستی کو خود اپنا مقدر بنا لیتے ہیں۔ وہ اپنی ذات سے بھی مایوس ہوتے ہیں، اپنی صلاحیتوں سے بھی مایوس ہوتے ہیں۔ دنیا سے بھی مایوس ہوتے ہیں اور اپنے اللہ سے بھی۔ ان کا ذہن بھی مریض ہے، ان کا دل بھی مریض ہے۔

کامیابی آپ کا حق ہے۔ یہ حق آپ سے کوئی چھین نہیں سکتا۔ یہ دنیا اسی لیے پیدا کی گئی ہے کہ یہاں ہر انسان کامیابی حاصل کرے۔ کامیابی کا یقین پیدا کیجیے۔ کامیابی کے کامل یقین کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھیے اور حوصلہ کے ساتھ بڑھتے رہیے۔ اپنے خیالات، افکار، جذبات، احساسات اور قوتِ عمل سے کسی وقت بھی خود کو مایوس نہ ہونے دیجیے۔ آپ اگر ناکام ہوتے ہیں تو صرف اس لیے کہ آپ کے دل میں کامیابی کا یقین نہیں ہوتا۔ آپ کا سب سے بڑا سہارا، آپ کا سب سے بڑا وسیلہ اور آپ کا سب سے بڑا محرک آپ کا یقین ہے۔ ہر چیز سے زیادہ اپنے یقین کی فکر کیجیے۔ اس کو کسی حال میں مردہ نہ ہونے دیجیے۔ یہی آپ کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ یہ سرمایہ آپ کو کہیں اور سے نہیں مل سکتا۔ اور اگر کسی دوسرے کے پاس ہو تو اس سے آپ کو قطعاً فیض نہیں پہنچ سکتا۔ آپ کو اگر فیض پہنچ سکتا ہے تو صرف آپ کے اپنے یقین سے۔ یہ وہ سرمایہ نہیں ہے، جسے آپ کسی سے مستعار لیں، یہ قرض بھی نہیں ملتا، یہ آپ کو کوئی ہبہ کرنا چاہے تو ہبہ بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سرمایہ آپ کے دل میں جنم لیتا ہے، آپ ہی اس کو جنم دینے والے ہیں، آپ ہی اس کو بڑھانے والے ہیں اور آپ ہی اس سے فیض اٹھانے والے۔ یقین محکم آپ کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اگر آپ خدانخواستہ اس سے محروم ہیں تو پھر محرومی آپ کا مقدر ہے اور اگر اس ہتھیار سے آپ مسلح ہیں تو پھر کوئی آپ کو شکست نہیں دے سکتا۔

اُٹھیے اللہ پر بھروسا کیجیے، اس کی دی ہوئی قوتوں پر بھروسہ کیجیے، اپنی شخصیت پر اعتماد کیجیے۔ آپ خود کو بھول

گئے، اسی لیے اللہ کو بھی بھول گئے اور اسی لیے اس نے بھی آپ کو بھلا دیا، پھر آپ کو کامیابی کیسے نصیب ہو۔

فکر و مایوسی کی شکنیں اپنی پیشانی سے دور کیجئے۔ چہرے پر یقین کی رونق پیدا کیجئے۔ آنکھوں میں کامیابی کی چمک پیدا کیجئے۔ اپنے زور بازو پر اعتماد کیجئے۔ مسلسل محنت یا انتھک جدو جہد اور منزل کو پا لینے کی تڑپ پیدا کیجئے۔ زندگی سے فیض اٹھایئے۔ اپنی زندگی سے لوگوں میں بھی زندگی پیدا کیجئے۔ اپنی زندگی کا احساس کرایئے۔ کیا وہ بھی زندہ کہلانے کا مستحق ہے، جو اپنی زندگی سے لوگوں کو موت کی یاد دلاتا ہو، جس کی زندگی کو دیکھ کر لوگ موت کی تمنا کرتے ہوں۔ یہ دنیا آپ کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہاں جو کچھ ہے آپ کے لیے۔ یہ رونق، یہ بہار، یہ زینتیں، یہ مال و دولت، یہ آرام و آسائش، یہ کامرانیاں، یہ مادی وسائل، یہ عزت و اقتدار سب کچھ آپ کے لیے ہے۔ کہاں سے آپ اس گمراہ کن فکر کا شکار ہوئے کہ یہ سب اللہ کے باغیوں کے لیے ہے اور آپ کا حصہ مایوسی کے گوشے میں بیٹھ رہنا ہے۔ کیا آپ نے اپنے رب کا یہ فرمان نہیں پڑھا ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ (الاعراف ۷:۳۲)

''کہو کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا ہے جس کو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے اللہ کی بخشی ہوئی پاک نعمتیں ممنوع کر دیں۔ کہو، یہ ساری نعمتیں دنیا کی زندگی میں بھی مومنوں کے لیے ہیں اور قیامت کے روز تو خالص انہی کے لیے ہوں گی۔''

پاک کیجئے اپنے ذہن کو اس غلط خیال سے، دور کیجئے اس گمراہ کن اندازِ فکر کو —— یہ ذہن ہرگز قرآنی ذہن نہیں ہے —— قرآن کی روشنی میں سوچئے۔ یہ دنیا میدان کارزار ہے۔ آپ کو بے پناہ قوتیں اور بے شمار وسائل اسی لیے دیئے گئے ہیں کہ آپ یہاں برابر کچھ کرتے رہیں اور اپنے ہاتھوں اپنا تابناک مستقبل تیار کریں۔

عزت و اقتدار، عظمت و سربلندی، سب کچھ اللہ کے قبضے میں ہے اور صرف اسی کے بس میں ہے۔ وہی دیتا ہے جس کو بھی دیتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے نافرمان بندوں کو تو ان نعمتوں سے نوازے اور آپ کو محروم کر دے۔ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہاں سب کچھ آپ کے لیے ہے، شرط صرف یہ ہے کہ آپ اس کامیابی کا یقین پیدا کریں۔ جو کچھ چاہیں اس کی لگن سے دل کو قوت پہنچائیں، محنت، جاں فشانی اور تن دہی کو اپنا شعار بنائیں۔ عزم و حوصلے کے ساتھ مسلسل سرگرم کار رہیں اور کسی بھی وقت ہمت نہ ہاریں۔ آپ محسوس کریں گے، کہ اپنی تقدیر آپ خود تعمیر کر رہے ہیں۔ اور اللہ آپ کو اس طرح نواز رہا ہے کہ آپ خود اپنی قسمت پر رشک کر رہے ہیں۔

### اسلام کی محفوظ شاہراہ:

اسلام کے نزدیک زندگی کے یہ دونوں فلسفے غلط ہیں۔ اور یہ دراصل فکر و نظر میں اعتدال و توازن سے محرومی کی

پیداوار ہیں۔ اسلام کی محفوظ شاہراہ ہلاکت کی ان دونوں انتہا پسندانہ گھاٹیوں کے بیچ بیچ خوف وامید کے متوازن نشیب وفراز سے ہو کر گزرتی ہے ——— مؤمن نہ تو اللہ کی گرفت اور قہر وغضب سے ایسا خائف ہوتا ہے کہ اس کی آس ٹوٹنے لگے اور مایوس ہو کر زندگی سے بیزار ہو جائے۔ اور نہ اللہ کی رحمت کا ایسا یک رخا امیدوار ہوتا ہے کہ مؤاخذہ سے بے پرواہو کر بالکل بیباک، سرکش اور معصیت کوش بن کر دنیا کا پرستار بن جائے۔

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَ يَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ط قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ط (الزمر۳۹:۹)

''بھلا وہ جو اللہ کے حضور جھکنے والا ہے، رات کی گھڑیوں میں سجدہ کرنے والا اور قیام کرنے والا ہے، جو آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہے، اس کی طرح ہو سکتا ہے جو ان صفات سے محروم ہے۔''

مؤمن کے دل کی یہ عجیب وغریب کیفیت ہے، وہ اپنے گناہوں کو دیکھ کر میدان حشر کی باز پرس کا تصور کر کے کانپنے لگتا ہے کہ کہیں اس کا انجام خراب نہ ہو جائے اور اللہ کی بے پایاں رحمت وعنایت اور اتھاہ عفو وکرم کا خیال کر کے خوشی سے جھوم اٹھتا ہے اور اس کا دل توقعات سے لبریز ہو جاتا ہے۔ مؤمن بہترین اعمال انجام دینے کے بعد بھی بے خوف نہیں ہوتا بلکہ لرزتا رہتا ہے کہ اللہ کے حضور پیشی کے وقت نہ جانے کیا صورت پیش آئے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ O (المؤمنون۲۳:۶۰)

''اور ان کا حال یہ ہے کہ دیتے ہیں جو بھی دیتے ہیں اور دل ان کے اس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔''

## امت وسط کے خطاب کی حکمت:

قرآن نے مسلمانوں کو ''امت وسط'' کا خطاب دیا ہے۔ وسط بیچ کی چیز کو کہتے ہیں۔ اور ہر چیز میں اعتدال، توسط اور درمیانی حالت ہی بہتر حالت ہوتی ہے۔ بلکہ اخلاقیات کا تو سارا فلسفہ ہی یہ ہے کہ انسانی قوتوں میں اعتدال وتوازن سے ہی اخلاقی فضائل وجود میں آتے ہیں۔ امت کو اس خطاب سے نوازنے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ امت تمام امتوں میں افضل اور بہترین امت ہے۔ امت کو اس خطاب سے یاد کرنے' اس کی فضیلت کو اس خطاب سے تعبیر کرنے میں ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ یہ امت زندگی کے ہر معاملہ میں اعتدال وتوسط پر قائم رہنے والی اور فکر وعمل کے ہر میدان میں میانہ روی اختیار کرنے والی ہے۔

ایک موقع پر نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''دین آسان ہے۔ جس نے بھی اس کے ساتھ زور آزمائی کی، دین نے اس کو ہرا دیا۔ پس میانہ روی اختیار کرو۔ اعتدال سے کام لو، پرامید رہو اور صبح وشام کی نمازوں اور کچھ

اندھیرے کی نماز سے قوت حاصل کرو۔"

## خوف و امید کے مؤمنانہ جذبات:

مؤمن کی صفات بیان کرتے ہوئے قرآن حکیم میں کہا گیا ہے:

وَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْءَ الْحِسَابِ ۝ (الرعد ۱۳:۲۱)

"اور وہ اپنے رب سے ڈرتے اور انجام کی خرابی سے ڈرتے ہیں۔"

یعنی یہ خوف انہیں ہر وقت لرزاں اور ترساں رکھتا ہے کہ دیکھئے اس وقت کیا حال ہوتا ہے جب اللہ کے حضور ذرّے ذرّے کا حساب ہوگا۔ پھر یہ کہ انسان کی زباں سے جو بات بھی نکلتی ہے اللہ تعالیٰ کا فرشتہ اسے فوراً ہی ریکارڈ کرنے کے لیے مستعد رہتا ہے۔

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝ (سورہ ق ۵۰:۱۸)

"کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگراں موجود نہ ہو۔"

یہ عقیدہ مؤمن پر ایسی ہیبت طاری کیے رہتا ہے کہ ہر لحہ اس کا دل لرزتا ہے اور آنکھیں بہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا وہ برگزیدہ بندہ جو حضور ﷺ کی زبان سے صدیق اکبر کا لقب پا چکا ہے اور جو خود اپنے کانوں سے حضور ﷺ کی زبانی جنت کی بشارت سن چکا ہے۔ آخرت کے مؤاخذہ کا جب تذکرہ کرتا ہے تو یہ کہتا ہوا سنا جاتا ہے:

"پرندو! تمہیں مبارک ہو کہ مزے سے چگتے پھرتے ہو، اڑتے پھدکتے ہو، درختوں کی شاخوں پر بیٹھتے ہو اور قیامت میں تمہارا کوئی حساب نہیں، کاش ابوبکر بھی تمہاری طرح ہوتا۔"

ایک بار حضرت فاطمہ کی روتے روتے گھگھی بندھ گئی۔ ان کے بھائی اور عزیز گھبرائے ہوئے آئے۔ وجہ معلوم کی تو بولیں، میں نے ایک منظر دیکھا ہے جس کو اگر تم بھی دیکھتے تو تمہارا بھی یہی حال ہوتا۔ میں نے رات اپنے شوہر کو دیکھا۔ نماز میں مشغول ہیں۔ انتہائی دل بستگی کے ساتھ کلام اللہ کی تلاوت کر رہے ہیں۔ جب ان آیات پر پہنچے:

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝ وَ تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝

(القارعہ ۱۰۱:۴،۵)

تو بیتاب ہو کر چیخ ماری اور دھڑام سے زمین پر گرے، پھر اٹھے اور اٹھ کر اس طرح گرے کہ میں سمجھی شاید دم نکل گیا۔ تھوڑی دیر میں ہوش آیا تو پھر چیخنے اور بے قرار ہو کر صحن میں چکر لگانے لگے اور یہ آیات پڑھتے جاتے:

"اس دن کیا گزرے گی جس دن لوگ پروانوں کی طرح پریشان حال بکھرے ہوں گے اور پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہوں گے"۔

یہ آیات پڑھتے پڑھتے عمر بن عبدالعزیز ایک بار پھر گرے اور اس بار مجھے یقین ہو گیا کہ جان نکل گئی۔ پھر آپ کو ہوش نہیں آیا، یہاں تک کہ فجر کے مؤذن نے صدائے تکبیر سے انہیں جگایا۔

ایمان خوف اللہ کے بعد رقت انگیز جذبات بھی پیدا کرتا ہے اور ہر وقت اللہ سے پر امید بھی بنائے رکھتا ہے۔ سخت سے سخت حالات میں بڑی سے بڑی کوتاہی کرنے کے بعد بھی مؤمن کبھی اللہ سے مایوس نہیں ہوتا۔ وہ سینکڑوں بار توبہ توڑنے کے بعد بھی اس کے دامن میں پناہ کی توقع رکھتا ہے۔ اور اس کا سینہ کبھی توقعات سے خالی نہیں ہوتا۔

برادران یوسف علیہ السلام جب باپ کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر مایوس ہونے لگتے ہیں اور یوسف کے ملنے کی آس ٹوٹنے لگتی ہے تو حضرت یعقوب علیہ السلام پیغمبرانہ بصیرت کے ساتھ بیٹوں کو نصیحت فرماتے ہیں:

لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (یوسف ۱۲:۸۷)

''اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو اللہ کی رحمت سے تو وہی لوگ مایوس ہوتے ہیں جو اس پر یقین نہیں رکھتے۔''

خود پروردگار اپنے گنہگار بندوں کو انتہائی پیار کے ساتھ اس طرح خطاب کرتا ہے۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (الزمر ۳۹:۵۳)

''اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو بے شک وہ بڑا ہی بخشنے والا اور بڑا ہی مہربان ہے۔''

نبی کریم ﷺ نے مؤمنوں کو ہمیشہ پر امید رہنے اور اللہ سے خوش گمان رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''میں اپنے بندوں کے بارے میں ویسا ہوں جیسا وہ میرے بارے میں گمان رکھتا ہے۔''

توبہ کی ترغیب دیتے ہوئے حضور ﷺ نے ایک عجیب و غریب اور انتہائی اثر انگیز تمثیل پیش فرمائی ہے:

ایک شخص بے آب و گیاہ لق و دق صحرا میں سفر کر رہا ہے، ایک اونٹ پر وہ خود بھی سوار ہے اور اس کے کھانے پینے کی چیزیں اور ضروریات کا سامان بھی لدا ہوا ہے۔ ایک جگہ ستانے کے لیے وہ ٹھہرتا ہے اور سو جاتا ہے۔ اٹھتا ہے تو اونٹ غائب ہے۔ چاروں طرف دوڑتا ہے مگر کہیں اونٹ کا نشان نہیں ملتا، لق و دق صحرا، بے آب و گیاہ ریگستان، سفر کا سہارا ایک اونٹ تھا وہ بھی غائب۔ کھانے پینے کے لیے بھی نہ کچھ موجود اور نہ ملنے کی توقع ——

موت اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتی ہے اور وہ مایوس ہو کر وہیں رہ پڑتا ہے کہ اب زندگی کی کیا امید۔ اس کی آنکھ لگ جاتی ہے۔ بیدار ہوتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اونٹ بھی موجود ہے اور کھانے پینے کا سامان بھی۔ وہ خوشی سے ایسا بدحواس ہوتا ہے کہ مدہوشی میں کہتا ہے ''اے اللہ تو میرا بندہ اور میں تیرا اللہ ہوں'' (نعوذ باللہ)۔ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں، اللہ کو اس وقت اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے، جب کوئی بھٹکا ہوا گنہگار بندہ اپنے گناہوں پر نادم ہو کر اللہ کی طرف پلٹتا ہے۔

## فکر و نظر میں اعتدال سے محرومی کے نتائج:

خوف اور امید کا یہ توازن ہی مؤمن کو ایمان کی صحیح روش پر جماتا اور اس کے قول و عمل کو ہر بگاڑ سے بچائے رکھتا ہے جو لوگ اس توازن اور اعتدال سے محروم ہو کر کسی ایک رخ پر فکر و نظر کا سارا زور ڈال دیتے ہیں، ان کا انجام انتہائی عبرتناک ہوتا ہے۔

ذرا اس شخص کا تصور کیجئے جو شخص اچھی امیدوں اور بے بنیاد تمناؤں کے سہارے زندگی گزارتا ہے۔ اللہ کے قہر اور غضب سے یکسر غافل ہو کر اسے آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ ایسا شخص حرام و حلال کی فکر سے بے پروا ہوگا اور کوئی کڑھن محسوس نہ کرے گا، انتہائی بے باک، سرکش اور بے شرم ہوگا، بڑی سے بڑی بغاوت کرتے ہوئے بھی خود کو رحمت اور مغفرت کا فریب دے گا۔ وہ اپنی اصطلاح سے غافل، ہر گناہ کے لیے اللہ کی رحمت کے غلط تصور میں پناہ لینے کی کوشش کرے گا۔

اسی طرح اس شخص کا تصور کیجئے جس پر محض خوف اور قہر کا تصور غالب آ گیا ہے۔ وہ اللہ کی رحمت اور عفو و کرم سے ناامید ہو کر محض اپنے کوتاہ اعمال پر نگاہ جمانے کا عادی ہو گیا ہے۔ وہ صرف یہ سوچتا ہے کہ ہماری کوتاہیاں اور بے عملیاں بے پناہ ہیں۔ جنت ہوش ربا بلندیوں پر ہے اور ہمارے جسم و جان کی توانائیاں بہت محدود ہیں۔ جنت کی بلندی اور اپنی بے بسی اور کوتاہ کاری کو دیکھ کر اس کا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ وہ پیہم مایوسیوں کا شکار ہو کر ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھتا ہے۔

اس کو دین کے مطالبات اپنی قوتوں سے کہیں زیادہ معلوم ہوتے ہیں وہ سوچتا ہے، ہم دنیا کی آزمائش گاہ میں ایسے خطرات میں گھرے ہوئے جن سے بچ نکلنا محال ہے، اپنی شخصیت کی تعمیر و تزکیہ اور سماج کا سدھار اسے ان ہونے کام معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اس کے فکر و عمل کی ساری قوتیں مفلوج ہو جاتی ہیں اور وہ مایوسی، ناامیدی، احساسِ شکست اور غم و اندوہ کے خود ساختہ جال میں پھنسا ہوا کراہتا رہتا ہے۔

## فکر و نظر میں اعتدال کے ثمرات:

اسلام کی راہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے۔ وہ ایسے خوف کو بھی غلط سمجھتا ہے جو انسان کو دنیا سے بیزار

اور مایوس کر کے مفلوج بنا دے اور اللہ کی رحمت کی ایسی امید کو بھی قطعاً غلط قرار دیتا ہے جو انسان کو بے باک، سرکش، باغی اور خودفریب بنا دے۔

مؤمن دنیا کی نعمتوں سے استفادہ کو اپنا حق سمجھتا ہے اور اللہ کی اس دنیا کو سنوارنے اور سدھارنے سے پوری پوری دلچسپی رکھتا ہے۔ یہاں کی تعمیر و ترقی اور ایجاد و اکتشافات میں پورا پورا حصہ لیتا ہے اور جدوجہد کے ہر میدان میں دلی لگاؤ اور نشاط کے ساتھ فکر و عمل کی توانائیاں صرف کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ البتہ یہ سب کچھ وہ اس نقطہ نظر کے ساتھ کرتا ہے کہ ایک دن میری کوششوں کا بے لاگ جائزہ لیا جائے گا۔ اور زندگی کے انجام کو وہی کوششیں خوش گوار بنائیں گی جو اللہ کی مرضی کے عین مطابق ہوں اور اس کے مؤاخذہ سے ڈرتے ہوئے انجام دی گئی ہوں۔

مؤمن دنیا کو آخرت کی کھیتی تصور کرتا ہے اور یہاں اللہ نے اسے جو مواقع بخشے ہیں وہ ان میں جسم و جان کی قوتیں اس نقطہ نظر کے ساتھ کھپاتا ہے کہ یہ اس کی آزمائش کے ذرائع اور اس کی شخصیت کی تکمیل کے وسائل ہیں۔ معاشی دوڑ دھوپ ہو یا سیاسی سرگرمیاں، خانگی مسائل ہوں یا بچوں کی پرورش و پرداخت، کاروباری لین دین ہو یا معاملات وسلوک، اصلاح و تبلیغ کے پروگرام ہوں یا تعلیم و تعلم، حرفت و زراعت ہو یا حکومت اور اقتدار، ایجادات واکتشافات ہوں یا تعمیر و ترقی کے منصوبے۔ مؤمن ان سارے شعبوں میں سنجیدگی اور شغف کے ساتھ بھرپور حصہ لیتا ہے اور دنیوی زندگی کے ان تمام معاملات و وسائل میں اللہ کی مرضی پانے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ وہ دنیا اور اس کے مسائل سے بیزار ہو کر نہ غاروں اور گوشوں میں عافیت ڈھونڈتا ہے اور نہ دنیا کی رنگینیوں میں پھنس کر اس کا کیڑا بنتا ہے۔ بلکہ وہ اسلام کے متوازن نقطہ نظر کے ساتھ عملی زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے حصہ کا کام انتہائی فرض شناسی کے ساتھ انجام دیتا ہے اور جو کرتا ہے صرف اپنے رب کو راضی کرنے اور آخرت میں سرخرو ہونے کے لیے کرتا ہے۔ اس طرح اس کی یہ زندگی بھی کامیاب بنتی ہے اور آخرت میں بھی سعادت و کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔

## دینداری کے تصور میں اعتدال:

دینداری کے تصور میں بھی اگر اعتدال نہ ہو تو آدمی صحیح راستے سے بہت دور جا پڑتا ہے۔ عبادات بلاشبہ دین کا ستون ہیں۔ عبادات سے شغف اللہ سے محبت کی دلیل ہے۔ اذکار و نوافل سے دلچسپی مؤمن کا امتیازی جمال ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مؤمن کی زندگی میں کشش اور حسن دین کی عظمت کا احساس اور اللہ سے والہانہ تعلق عبادت و ریاضت ہی سے پیدا ہوتا ہے اور مؤمن کی زندگی کا یہی حسن و جمال ہے جس کی طرف بندوں کے دل بے اختیار کھنچتے ہیں اور سر عقیدت سے جھکتے ہیں۔

لیکن دینداری کا یہ تصور کہ ذکر و تسبیح، عبادات و ریاضت، صدقہ و خیرات، نوافل و شب بیداری، تلاوت و

وظائف ہی سارا دین ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے سب دنیا داری ہے، سراسر غلط تصور ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوری قوت کے ساتھ اس غلط تصور کی اصطلاح فرمائی ہے اور مختلف طریقوں سے یہ بات ذہن نشین کرائی ہے۔

اللہ اور بندوں کے حقوق میں توازن رکھنا، عبادت و تبلیغ اور معاشی دوڑ دھوپ میں اعتدال پر قائم رہنا، اذکار و نوافل کے ساتھ ساتھ اللہ کے بندوں کی خدمت بجالانا، انسانی رشتوں کا پاس و لحاظ رکھنا، دنیا کے نظم و نسق کو سنبھالنا اور اس کو دین کی تعلیم اور مزاج کے مطابق ڈھالنا اور سنوانا، یہ سب دین ہی کے کام ہیں اور ان کاموں میں لگنے والا بھی دیندار ہی ہے دنیا دار نہیں۔ دنیا کے مسائل و معاملات اور انسانی حقوق و تعلقات سے بیزار ہو کر عبادت و ریاضت کے گوشے آباد کرنا اعتدال و توازن سے ہٹا ہوا دینداری کا وہ تصور ہے جس کو اسلام ہرگز پسند نہیں کرتا۔

## رسول مکرم ﷺ کا طریق عمل:

ایک بار چند صحابی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے پاس رسول ﷺ کی عبادت و ریاضت کا حال معلوم کرنے کے لیے پہنچے۔ جب ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے انہیں بتایا تو ان کو رسول ﷺ کی عبادت بہت کم معلوم ہوئی اور آپس میں کہنے لگے، بھئی حضور ﷺ کی تو بات ہی اور ہے اللہ نے اگلی پچھلی سب لغزشیں معاف فرما دی ہیں ـــــ ایک صاحب بولے، میں تو اب رات بھر عبادت کیا کروں گا۔ دوسرے بولے، میں تو ہمیشہ روزے رکھوں گا اور کبھی بغیر روزے کے نہ رہوں گا۔ تیسرے بولے، میں عورتوں سے دور رہوں گا اور کبھی کسی عورت سے رشتہ نہ جوڑوں گا۔ رسول اللہ کو معلوم ہوا تو ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا، کیا تم لوگوں نے ایسی ایسی بات کہی ہے، تو کان کھول کر سن لو:

وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَخْشَاکُمْ لِلّٰهِ وَاَتْقَاکُمْ وَلٰـكِنِّیْ اَصُوْمُ وَاَفْطِرُ وَاُصَلِّیْ وَاَرْقُدُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ (بخاری' کتاب النکاح' باب ا: الترغیب فی النکاح ص ۴۳۸)

"اللہ کی قسم میں تم سب میں زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور تم سب میں زیادہ اس کی نافرمانی سے بچنے والا ہوں، لیکن میں کبھی روزہ رکھتا ہوں اور کبھی نہیں رکھتا، شب میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے بھی رشتہ جوڑتا ہوں۔ تو جو لوگ میرے اس طریقے سے دلچسپی نہ لیں ان کا مجھ سے کیا تعلق؟"

## حقوق میں توازن:

ایک بار حضرت سلمان رضی اللہ عنہ اپنے دینی بھائی ابو درداء رضی اللہ عنہ کے یہاں گئے۔ دیکھا کہ بیگم ابو درداء رضی اللہ عنہ نے بڑے سادہ کپڑے پہن رکھے ہیں۔ ان کی شکستہ حالی دیکھ کر پوچھا، بہن یہ تم نے اپنا کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ بیگم ابو درداء رضی اللہ عنہ نے کہا، بھیا! کیا بتاؤں، تمہارے بھائی کو تو اب دنیا داری سے کوئی مطلب ہی نہیں ہے تو کیا کروں کپڑے پہن کر۔ اتنے میں ابو درداء رضی اللہ عنہ بھی تشریف لے آئے۔ کھانا تیار ہوا۔ ابو درداء رضی اللہ عنہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ

سے بولے، بھائی تم کھاؤ، میں روزے سے ہوں۔ سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا، جب تک تم نہیں کھاؤ گے میں بھی نہیں کھاؤں گا اوراڑ گئے۔ ابو درداء رضی اللہ عنہ کو کھانا پڑا۔ شب ہوئی تو حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نماز کی نیت باندھنے کے لیے کھڑے ہونے لگے۔ سلمان رضی اللہ عنہ نے ہاتھ پکڑ کر بٹھایا اور کہا، سو جاؤ۔ ابو درداء رضی اللہ عنہ سو گئے۔ کچھ رات گزرنے پر پھر کھڑے ہو گئے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے پھر کہا ابھی سو رہو۔ جب رات آخر ہوگئی تو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا، تم پر تمہارے ربّ کا حق ہے، تمہاری اپنی ذات کا حق ہے، تمہاری بیوی کا حق ہے۔ پس ہر ایک کا حق ٹھیک ادا کرو۔ صبح کو ابو درداء رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رات کا پورا واقعہ سنایا تو نبی صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سلمان نے جو کچھ کہا، بالکل سچ کہا۔

## دین داری کا متوازن تصور

دین و دنیا کی تفریق کے ہولناک نتائج اور اللہ اور بندوں کے حقوق میں توازن نہ ہونے کے عبرتناک انجام سے آگاہ کرتے ہوئے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا:

اتدرون من المفلس ؟ قالوا المفلس فینا من لادرهم له ولا متاع فقال ان المفلس من امتي من یاتي یوم القیمة بصلاة وصیام و زکوٰة و یاتي وقد شتم هذا وقذف هذا اوا کل مال هذا وسفك دم هذا وضرب هذا فیعطی هذا من حسناته وهذا من حسناته فان فنیت حسناته قبل ان یقضي ما علیه اخذ من خطا یاهم فطرحت علیه ثم طرح في النار۔ (مسلم، کتاب البر حدیث نمبر ۷ تحریم الظلم ص ۲۱۲۹)

''کیا تم جانتے ہو کہ غریب اور نادار کون ہے؟ لوگوں نے کہا: غریب ہم میں وہ شخص ہے جس کے پاس نہ روپیہ پیسہ ہو نہ ساز و سامان۔ فرمایا: میری امت کا غریب شخص دراصل وہ ہے جو قیامت کے روز نماز، روزہ اور زکوٰۃ کے ساتھ حاضر ہوگا مگر اس حال میں آئے گا کہ کسی کو اس نے گالیاں دی ہوں گی، کسی پر تہمت لگائی ہوگی، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا ناحق خون بہایا ہوگا، کسی کو مارا ہوگا۔ پس اس کی نیکیاں اس کو دی جائیں گی کچھ اس کو۔ پھر اگر اس کی نیکیاں اس سے پہلے ختم ہو جائیں کہ لوگوں کے مطالبے پورے ہوں تو لوگوں کے گناہ اس کے سر کر دیئے جائیں گے اور پھر اس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔''

یہ حدیث دین داری کا نہایت متوازن اور جامع تصور دیتی ہے اور صاف بتاتی ہے کہ آدمی کی نجات اسی وقت ممکن ہے جب وہ توازن اور اعتدال کے ساتھ اللہ اور بندے کے حقوق ادا کرے اور دین داری کے محدود اور یک رُخے تصور سے ذہن کو پاک صاف رکھے۔

## حسین زندگی کا اصل جوہر:

مؤمن کی پوری زندگی جس جوہر سے نکھرتی، سنورتی اور حسن و جمال کا دلکش مرقع بنتی ہے وہ یہی اعتدال و توازن ہے۔ عبادت و ریاضت، اخلاق و معاشرت، رفتار و گفتار، خرچ و انفاق، کاروبار و معاملات، تعلقات و

سلوک، غرض زندگی کے ایک ایک گوشے کو اسلام اس ہمہ گیر خوبی سے آراستہ رکھنے کی تاکید کرتا ہے اور درحقیقت کسی خوبی ہونے کا مدار ہی اس پر ہے کہ اس میں اعتدال و توازن موجود ہو۔

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَ ابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا ۝ (بنی اسرائیل ۱۷:۱۱۰)

''اور اپنی نماز نہ بہت بلند آواز سے پڑھو اور نہ زیادہ پست آواز سے، بلکہ درمیان کی راہ اختیار کرو۔''

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ (بنی اسرائیل ۱۷:۲۹)

''نہ تو اپنے ہاتھ گردن سے باندھ رکھو (کہ کسی کو کچھ دو ہی نہیں) اور نہ اسے بالکل کھلا چھوڑ دو کہ سبھی کچھ دے کر پچھتاؤ۔''

وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ (لقمان ۳۱-۱۹)

''اور رفتار میں اعتدال رکھو۔''

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ (الفرقان ۲۵:۶۷)

''اور (اللہ کے پیارے بندے) جب خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے اور نہ تنگی اور بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ ان کے درمیان اعتدال کی روش رکھتے ہیں۔''

اعتدال اور میانہ روی دراصل اخلاقی زندگی کا اصل قوام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام کی پاک سیرتوں میں اس خوبی کو نہایت اہم اور نمایاں مقام حاصل ہے —— انبیاء کرام کی زندگی کی رعنائی او دلکشی کا ممتاز ترین عنصر یہی اعتدال اور میانہ روی ہے، اسی لیے نبی کریم ﷺ نے ایک حدیث میں تین خوبیوں کو نبوت کا چوبیسواں حصہ قرار دیا ہے۔ ان خوبیوں میں ایک نمایاں خوبی اعتدال اور میانہ روی ہے۔

حضرت عبداللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

السمت الحسن والتوودة، والاقتصاد جزء من اربع و عشرين جزء من النبوة

(ترمذی، ابواب البر، باب ۶۶، ما جاء فی التأنی والعجلہ ص ۱۸۵۳)

''نیک چال چلن، بردباری اور میانہ روی نبوت کے اجزا میں سے چوبیسواں حصہ ہے۔''

دراصل اعتدال ہی وہ اخلاقی جوہر ہے جس کی بدولت مؤمن کی پوری زندگی میں دلوں کو موہ لینے والا حسن و جمال پیدا ہوتا ہے۔ اور ایسا غازہ ہے جس سے مؤمن کی دلکش تصویر کے وہ حسین خد و خال نکھرتے ہیں جن کو دیکھ کر ہر ایک بے اختیار کھنچتا ہے اور متاعِ قلب و جاں نذر کرنے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔



# حاسد کی شرانگیزی سے بچنے کی تدابیر

حسد، ایک بدترین اخلاقی برائی ہے، ہر دور میں اور ہر سوسائٹی میں اس تباہ کن برائی کے مریض پائے جاتے رہے ہیں۔ حسد کا مطلب یہ ہے کہ ایک مرد یا عورت دوسرے مرد یا عورت کو اچھی حالت میں دیکھے کہ میرے ہی طبقے سے تعلق رکھنے والا یہ شخص، مال و دولت، نعمت و ثروت، اثر و رسوخ اور شہرت و عزت سے نوازا گیا ہے اور اس سے جلنے لگتا ہے اس کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس محسود سے یہ نعمتیں چھن جائیں اور مجھے مل جائیں اور اگر مجھے نہ ملیں تو کم از کم اس شخص سے ضرور چھن جائیں۔ اس طرح کے جذبات اگر کوئی شخص مرد یا عورت دل میں پال رہا ہے تو بلاشبہ یہ بہت برے جذبات ہیں اور یہ جذبات پالنے والا یقیناً زبردست کڑھن اور ضیق میں وقت گزار رہا ہے اور اپنی شخصیت اور عاقبت کو تباہ کر رہا ہے لیکن جس سے جل رہا ہے وہ بہر حال اس کے شر سے محفوظ ہے، ہاں جب یہ حسد کا مریض اپنے حسد اور جلن کے ابال کو برداشت نہیں کر پاتا اور حسد کی آگ سے بیتاب ہو کر اپنے محسود کے خلاف اپنے جذبات کا عملاً اظہار کرنے لگتا ہے، طرح طرح کی سازشیں کرتا ہے اور محسود کو اذیتیں دینے، نقصان پہنچانے، اس کی شخصیت کو مجروح کرنے اور سوسائٹی میں اس کو رسوا کرنے کی گھناؤنی اور گھٹیا تدبیریں اور اقدامات کرنے لگتا ہے تو اس کے نتائج و اثرات محسود کے حق میں اور خود سوسائٹی کے حق میں انتہائی تباہ کن، لرزہ خیز اور عبرتناک ہوتے ہیں، اس صورتحال میں اللہ تعالیٰ نے بندے کو یہ دعا سکھائی اللہ کی پناہ چاہو، حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرنے لگے۔ فرمایا:

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ۝ (الفلق:۱۱۳:۵)

''اور میں پناہ مانگتا ہوں، حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرنے لگے۔''

قرآن پاک کے یہ الفاظ بلاغت و اعجاز کا شاہکار ہیں یہ نہیں کہا گیا کہ حاسد کے شر سے پناہ مانگو بلکہ کہا گیا پناہ مانگو حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرنے لگے۔ یعنی جب حاسد اپنی جلن نکالنے کے لیے محسود کے خلاف سازشی اقدامات کرنے لگے۔

حاسد اگر حسد کے جذبات میں جل رہا ہے اور محسود کو اچھی کیفیت میں دیکھ کر پیچ و تاب کھا رہا ہے تو بجائے خود

یہ کیفیت بھی انتہائی تباہ کن اور قابل مذمت ہے لیکن محسود کے لیے یہ وہ شر نہیں ہے جس سے پناہ مانگی جائے، یہ شر پناہ مانگنے کے لائق اس وقت ہوتا ہے جب حاسد اپنی جلن سے بے تاب اور مشتعل ہو کر محسود کے خلاف اقدامات کرنے لگتا ہے، اس کو نقصان پہنچانے اور اذیت دینے کے لیے سازشیں کرنے لگتا ہے۔ درندگی اور ظلم و زیادتی کے مظاہرے کرنے لگتا ہے اور اس سطح پر آ جاتا ہے کہ حسد کی آگ میں وہ جو بھی کر گزرے کم ہے۔ ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے یہ تعلیم دی کہ اس تباہ کن مصیبت سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ کی پناہ چاہو، اللہ کی پناہ ہی میں انسان بچ سکتا ہے ورنہ یہ اخلاقی مرض اس قدر سنگین و پرزور اور اشتعال انگیز ہوتا ہے کہ ایک حاسد وہ بدتر سے بدتر اور لرزہ خیز اقدام کر سکتا ہے، جس کا شرافت، انسانیت اور دین و ایمان سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔

ایک حاسد شخص خواہ وہ مرد ہو یا عورت دشمنی تو دوسرے سے کرتا ہے اور اس کو رسوائی اور اذیت میں مبتلا کرنے کے درپے ہوتا ہے، مگر حقیقت میں وہ سب سے بڑا دشمن اپنی ذات کا ہوتا ہے۔

وہ مستقل اذیت، اشتعال اور جذبہ انتقام میں پیچ و تاب کھاتا رہتا ہے اور اس کے شب و روز انتہائی کڑھن اور ضیق میں گزرتے ہیں، ہمہ وقت حسد کی آگ اور جلن میں جھلستا رہتا ہے۔ ذہن و قلب مستقل طور پر خلجان اور اضطراب میں مبتلا رہتے ہیں، صحت بھی برباد ہوتی، ایمان بھی مجروح ہوتا ہے اور نتیجتاً اس کی شخصیت بے وزن و بے وقعت ہو کر رہ جاتی ہے۔

حسد کا سب سے بڑا نقصان جس کو سن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ حاسد انسان اپنے اللہ سے بدگمان ہو جاتا ہے، اس کی سوچ غلط رخ پر کام کرنے لگتی ہے اور اس کے قول و عمل اور شب و روز کی سرگرمیوں سے اللہ کے بارے میں بدگمانی اور ناانصافی کا اظہار ہونے لگتا ہے، وہ اپنے محسود کو دیکھ کر اپنے قول و عمل سے یہ اظہار کرتا ہے کہ اللہ نے کیسی ناانصافی کی ہے، اپنی نوازشوں کے لیے کس قدر غلط انتخاب کیا ہے، ان نعمتوں اور نوازشوں کا مستحق میں تھا اور اللہ نے فلاں شخص کو نواز دیا جو قطعاً اللہ کی ان نعمتوں کا مستحق نہیں تھا اور اگر بالفرض میں مستحق نہیں بھی ہوں تو کم از کم وہ شخص تو ہرگز مستحق نہیں ہے، جس کو اللہ نے نواز کر مجھ پر فضیلت بخشی ہے۔ اللہ کے بارے میں اس شخص کے یہ تصورات، خیالات وہ ہیں جو اس کے ایمان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اللہ کی صفات حسنہ پر ایسے شخص کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے۔ جو خدائے علیم و حکیم اور خبیر و عادل کے بارے میں وہ باتیں سوچنے لگے جو ایک انسان کسی شریف انسان کے بارے میں بھی نہیں سوچ سکتا، بھلا اس کا ایمان کیسے محفوظ رہ سکتا ہے، حاسد دراصل خود کو اللہ رب العالمین کے مقابلے میں لا کھڑا کر دیتا ہے اور اللہ کے بارے میں وہ بدترین رویہ اپناتا ہے جو دنیا کے سب سے پہلے حاسد نے اپنایا تھا اور اللہ رب العالمین نے اس کو اپنے دربار سے مردود بنا کر دھتکار دیا تھا، حاسدوں کے اس اولین پیشوا نے اللہ کے حکم سے سرتابی کرتے ہوئے کہا تھا، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا، آدم

علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا اور پھر مجھے یہ حکم دے رہا ہے کہ میں اس کو سجدہ بجالاؤں، فضیلت کا مستحق تو میں ہوں اور (نعوذ باللہ) تو یہ غلط فیصلہ کر رہا ہے کہ فضیلت کا مستحق آدم علیہ السلام ہے آخر میں اس ناانصافی اور زیادتی کو کیسے برداشت کرلوں؟ بعینہٖ یہی روش اس اولین حاسد کا پیرو ہر حاسد اپناتا ہے وہ بھی اللہ سے یہی شکایت کرتا ہے کہ نوازے جانے کا مستحق میں تھا اور تو نے دوسرے کو نواز کر مجھ پر فضیلت دی؟

دراصل اللہ کے فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کرنا اس پر راضی نہ رہنا اور اللہ کے علم وحکمت اور انتخاب و فیصلے کو چیلنج کرنا ابلیسی کردار ومزاج ہے ہر حاسد دانستہ یا نادانستہ اسی کردار ومزاج کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ایمان کے جوہر سے محرومی اور ابلیس لعین کے کردار ومزاج میں ڈھل جانا ایک انسان کا وہ بدترین حال وانجام ہے جس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

حسد کا ایک بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ ایسا شخص تعمیری ذہن وفکر اور صلاح وفلاح کی سعی وکاوش سے محروم ہو جاتا ہے وہ اپنی زندگی کو بنانے، مستقبل کو سنوارنے اور صلاح وسدھار کے کام کرنے کی بجائے ہر وقت اس اضطراب اور بے چینی میں مبتلا رہتا ہے کہ جن کو اللہ نے اپنی نعمتوں سے نوازا ہے ان کی شخصیتوں کو مجروح کرے، ان کو نقصان پہنچائے ان کی تذلیل کرے اور ان کی اذیت اور تکلیف رسانی کا سامان کرے، حسد کی آگ کسی وقت اس کو سکون سے نہیں بیٹھنے دیتی وہ اپنے محسود پر ہی نگاہ رکھتا ہے، اندر ہی اندر سلگتا ہے اور پیہم پیچ وتاب کھاتا رہتا ہے، اس کا اپنا ذہن بھی انتشار وخلفشار کا شکار رہتا ہے اور گھر کے لوگ بھی اس کے اثرات بد کے نتیجے میں غلط رخ پر سوچنے لگتے ہیں اور زندگی سکون وسلامتی اور راحت وعافیت سے محروم ہو جاتی ہے۔ خسر الدنیا والآخرہ کے اس پیکر سے کسی خیر کی توقع نہیں رہتی۔ اس لیے اس کے شر کا دائرہ بہت ہی وسیع ہو جاتا ہے، وہ اپنے محسود کو اذیت اور نقصان پہنچانے، اس کو ذلیل ورسوا کرنے اور ہلاک وبرباد کرنے کے لیے وہ رذیل ترین حرکتیں کرنے پر اتر آتا ہے، جن کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی انسان ایسی حرکات بھی کر سکتا ہے۔ ایسے موقع پر اللہ نے قرآن عظیم میں مؤمن کو یہ تلقین فرمائی کہ وہ حسد کے اقدام پر اتر آنے والے حاسد کے شر سے اللہ رب العالمین کی پناہ چاہے اور اس ایمانی شعور کے ساتھ اللہ کی پناہ کے یہ الفاظ ادا کرے کہ میں جس کی پناہ میں مانگ رہا ہوں وہ سب پر غالب ہے، اس کی قدرت واقتدار سب پر حاوی ہے۔ اس شر کا بھی وہی خالق ہے اور کوئی چیز اس کی قدرت اور علم کے دائرے سے باہر نہیں ہے۔

حاسد کے شر سے ایمان کے لیے اللہ کی شعوری پناہ مانگنے کے ساتھ ساتھ چند اور تدبیریں بھی ہیں جو اس سلسلے میں معاون وکارگر ہو سکتی ہیں ان کا بھی ہو سکے تو اہتمام کرے یہ تدبیریں یہ ہو سکتی ہیں۔

۱- یہ کہ جس بندے سے حسد کیا جا رہا ہے وہ اللہ پر پورا پورا بھروسا رکھے۔ ہرگز گھبراہٹ کا مظاہرہ نہ کرے یہ

یقین رکھے کہ جب تک اللہ نہ چاہے کوئی بندہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ نفع و نقصان پہنچانے کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔ کوئی کچھ بھی کرے اگر اللہ نہ چاہے تو کوئی ذرّہ بھر تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔ اگر اس کی طرف سے راحت اور بھلائی کا فیصلہ ہے تو کوئی طاقت اس فیصلے کو ٹال نہیں سکتی اور اگر اس کی طرف سے ہی کسی تکلیف اور نقصان کا فیصلہ ہے تو کوئی اس سے بچا نہیں سکتا، اگر کوئی طاقت بچا سکتی ہے تو وہ اسی کی طاقت ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر یہاں ذرہ حرکت نہیں کر سکتا۔

۲- یہ کہ محسود کی خیر خواہی کے سوا کچھ نہ سوچے۔ ہر حال میں بھلائی کا رویہ رکھے اور یہ یقین و اطمینان رکھے کہ بہترین انتقام لینے والا اللہ رب العالمین ہی ہے۔ اس کے علم سے نہ کوئی چیز پوشیدہ ہے نہ اس کے احاطہ قدرت سے کوئی چیز باہر ہے، اس کی پکڑ بہت سخت ہے، جب وہ انتقام لینے پر آتا ہے تو اس کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝ (الطلاق: ۶۵:۱۲)

''یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور یہ اس کا علم ہر چیز کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔''

۳- یہ کہ جس سے حسد کیا جا رہا ہے وہ حاسد کی ذلیل حرکتوں اور بیہودہ باتوں سے اشتعال میں نہ آئے۔ انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کر ایسی کارروائیاں یا ایسی تدبیریں نہ سوچنے لگے کہ وہ خود حاسد کی سطح پر آنے کی حماقت کرنے لگے۔ ہر حال میں صبر و تحمل سے کام لے، صبر کو اپنی ڈھال بنائے۔ اور یہ اعتماد و یقین رکھے کہ صبر کا صلہ دینے والا وہ اللہ ہے جو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

۴- یہ کہ جب حاسد اللہ اور بندوں کی شرم سے بے نیاز ہو کر اور اخلاق اور انسانیت سے عاری ہو کر بیہودہ اور ذلیل حرکتیں کرنے لگے اور کمینہ پن اور رذالت کے مظاہرے کرنے پر اتر آئے اور اللہ کے خوف سے بالکل ہی لا پرواہو جائے تو محسود اس وقت بھی تقویٰ کی روش پر جما رہے اور تقویٰ کے خلاف ہرگز کچھ نہ کرے، کسی نادان کی غیر متقیانہ اور ظالمانہ روش کے انتقام میں تقویٰ اور خدا ترسی کی روش کو چھوڑ دینا سب سے بڑا نقصان اور سب سے بڑی شکست ہے۔

۵- یہ کہ وہ اپنے ذہن و قلب کو حاسد کی ذلیل سازشوں اور بیہودہ حرکتوں سے بے فکر رکھے۔ یوں سمجھے کہ گویا کچھ ہے ہی نہیں۔ حاسد کی باتوں پر ہرگز دھیان نہ دے، حاسد اور اس کی تکلیف دہ حرکتوں اور بیہودگیوں کو مستقل طور پر اور مسلسل نظر انداز کرے۔ حاسد متوجہ کرنے کی ہزار کوششیں کرے مگر محسود قطعاً توجہ نہ دے اور ذہن کو جھٹک کر بالکل بے نیاز رہے گویا کہ کچھ فضا میں ہے ہی نہیں حاسد کی بدترین سزا یہ ہے کہ اس کا نوٹس ہی نہ لیا جائے۔ ہاں اگر وہ سماج میں ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش میں سارے حدود و قیود پھاند جائے تو پھر اس کو مناسب

انداز میں یہ وارننگ ضرور دی جائے کہ ہم اللہ کی ہدایت اور شرافت کے تحت خاموش ہیں یہ یاد رکھو کہ شریف انسان کا غصہ انتہائی ہولناک اور فیصلہ کن ہوتا ہے اس وارننگ کا نتیجہ ان شاء اللہ یہ ہوگا کہ وہ کھلم کھلا زبانِ طعن دراز نہ کرے گا، اس کی زبان ضرور خاموش ہو جائے گی۔ اس لیے کہ رذیل انسان ہمیشہ بزدل ہوتا ہے۔ ہاں اس کے اندر جو آگ لگی ہوئی ہے اس سے مجبور ہو کر وہ اپنی آگ بجھانے کی تدبیریں ضرور کرے گا۔

۶- یہ کہ حاسد خواہ کیسی ہی ایذا پہنچائے اور کیسا ہی برا سلوک کرے جواب میں محسود اس کے ساتھ کوئی برا سلوک ہرگز نہ کرے اگر زندگی کے کسی مرحلے میں کوئی ایسا موقع آئے کہ وہ حاسد کے ساتھ کوئی نیک سلوک کر سکتا ہو تو وہ ضرور کرے اور حسن سلوک کرتے ہوئے اس بات سے بے نیاز رہے کہ اس حسنِ عمل اور نیک سلوک کے جواب میں حاسد کے دل کی جلن ختم ہوتی ہے یا نہیں اور اس کی روش میں کوئی تبدیلی آتی ہے یا نہیں۔

۷- آخری بات یہ کہ محسود اپنے دل کو حاسد کے خوف سے قطعی پاک رکھے اور یہ یقین رکھے کہ حاسد اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، حاسد کے خوف سے دل کو پاک رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ عقیدۂ توحید کو تفصیل کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرے اللہ کی صفات کا استحضار رکھے۔ ہر حال میں عقیدۂ توحید پر مضبوطی کے ساتھ جما رہے اور کسی سے قطعاً خوف نہ کرے۔ جس دل میں اللہ کی توحید بسی ہوئی ہو اس دل میں اللہ کے خوف کے ساتھ کسی دوسرے کا خوف ہرگز جمع نہیں ہو سکتا۔

شیاطین اور ارواحِ خبیثہ جو ہر وقت انسان کے تعاقب میں ہیں ان کے شر سے بچنے کے لیے اگر رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق آدمی اپنا معمول بنا لے تو وثوق ہے کہ ان شاء اللہ وہ ہر شر اور فتنے سے اللہ کے حکم سے محفوظ رہے گا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب بستر پر تشریف لے جاتے تو دونوں ہاتھ دعا مانگنے کی طرح ملاتے اور قل هو الله احد اور قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس کی سورتیں تلاوت فرما کر ہاتھوں پر دم فرماتے اور پھر جہاں تک آپ ﷺ کا ہاتھ مبارک پہنچتا اپنے جسم پر پھیر لیتے، سر، چہرے اور جسم کے اگلے حصے سے شروع فرماتے ـــــ آپ ﷺ یہ عمل تین مرتبہ فرماتے۔



# کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

امتِ مسلمہ کی عبرتناک پستی، کوتاہ عملی، دین سے غفلت اور زبردست افتراق وانتشار ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کو بیان کرنے کے لیے خوامخواہ الفاظ کو زحمت دی جائے۔ جس بھیانک منظر کو مسلسل آنکھیں دیکھ رہی ہوں اور جن حالات وحقائق کی تلخی برابر قلب وذہن محسوس کررہے ہوں، ان کی تصویر کشی کے لیے الفاظ کی مدد لے کر تکدر میں اضافہ کیوں کیا جائے؟ یہ ایک حقیقت واقعہ ہے کہ امت اس وقت انتہائی ذلت اور پستی میں ہے۔ البتہ اس انتہائی پستی اور زوال کی حالت میں بھی امت میں ایک جوہر ایسا ضرور موجود ہے جس کی بنیاد پر امید بندھتی ہے کہ ان شاء اللہ یہ امت زوال کی آخری حدوں پر پہنچنے کے بعد بھی فنا نہیں ہوگی۔ بلکہ پھر ابھرے گی، اٹھے گی اور شانِ عظمت کو پائے گی۔ شرط صرف یہ ہے کہ امت کے دانشور، امت کے اس جوہر گراں مایہ کو جلا بخشنے کے لیے اپنی بصیرت سے کام لیں اور امت کو صحیح رخ پر لگائیں۔

غفلت، بے راہ روی اور بے دینی کے اس طوفان میں بھی امت کے ہر فرد کے سینے میں اپنے رسول ﷺ سے تعلق ومحبت کا شرارہ ضرور چمک رہا ہے۔ امت کا نوجوان کیسا ہی بے عمل یا بدعمل ہو، دین سے قطعاً ناواقف ہو، وہ اپنے خلاف بہت سی زیادتیاں برداشت کرلے گا مگر یہی بے عمل نوجوان اپنے رسول ﷺ کے تعلق سے کوئی گستاخی قطعاً برداشت نہیں کرے گا۔ رسول ﷺ کی شان میں معمولی سی گستاخی بھی اس کی غیرتِ ایمانی کو جھنجھوڑ دیتی ہے، اس کی دینی حمیت جھرجھری لیتی ہے اور وہ آناً فاناً بدلا ہوا انسان معلوم ہوتا ہے۔ امت کا یہ جوہر انتہائی قیمتی ہے اور بجا طور پر اس سے امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ امت کے دانشور حکمت و بصیرت سے کام لے کر اس جوہر کی قدر و قیمت کا احساس کریں اور کرائیں اور گہری بصیرت سے اس جوہر کی بنیاد پر امت کی تعمیر وعظمت کا کوئی کامیاب اور ٹھوس منصوبہ بنائیں۔

اس امت کو اپنے رسول ﷺ سے جو والہانہ عقیدت، محبت اور تعلق ہے، دنیا کی کوئی دوسری قوم اس کی مثال کیا، نقل بھی نہیں پیش کرسکتی۔ وہ اس کو دیکھ کر اور محسوس کر کے حیرت کا اظہار ضرور کرسکتی ہے، لیکن اپنے یہاں اس کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ اور یہی وہ جوہر ہے جس کی بنیاد پر ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ امت کا تعلق دین

سے کمزور ضرور ہوا ہے مگر ٹوٹا نہیں ہے۔ قرآن نے امت کو یہ واضح ہدایت دی تھی کہ دیکھو رسول ﷺ کی ذات کو دنیا کی ہر چیز پر حتیٰ کہ اپنی جانوں پر بھی مقدم رکھو۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (الاحزاب : ۶:۳۳)

''یہ نبی مؤمنین کے لیے ان کی اپنی جانوں سے بھی اولیٰ اور مقدم ہیں۔''

مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب نے اس آیت کے ذیل میں شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اہم نکتہ نقل فرمایا ہے۔

''اگر کوئی شخص آگ میں کود کر اپنے کو جلانا چاہے تو یہ ناجائز اور حرام ہے، مگر رسول ﷺ کسی کو اگر آگ میں کود جانے کا حکم دیں، تو اس حکم کی تعمیل واجب ہو جائے گی۔''

اللہ کے رسول ﷺ نے خود واضح انداز میں بتایا کہ میری محبت مدارِ ایمان اور معیارِ ایمان ہے۔ کسی انسان کے دل میں اگر میری محبت اس کے تمام متعلقین، یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی زیادہ نہیں ہے تو وہ حقیقی معنی میں صاحب ایمان نہیں ہے۔ ارشاد ہے:

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ

(بخاری : کتاب الایمان)

''تم میں سے کوئی صاحب ایمان نہیں ہے جب تک کہ میں اس کے نزدیک زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں اس کے والد سے، اس کی اولاد سے اور تمام ہی انسانوں سے۔''

سچے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس ہدایت و تعلیم کو اس طرح جذب کیا تھا کہ رسول ﷺ کی محبت ان کے ریشے ریشے میں پیوست ہو گئی تھی۔ اور ان ہی بزرگوں کے اسوہ کی برکات و فیوض ہیں کہ آج اس گئی گزری حالت میں بھی اس کے کچھ باقیات الصالحات اور نیک اثرات پائے جاتے ہیں۔

سیرت و تاریخ کی کتابوں میں حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کا ایمان افروز واقعہ بار بار پڑھنے کے قابل ہے۔ جب بھی پڑھیے روح کو بالیدگی، ایمان کو تازگی اور قلب کو گرمی ملتی ہے۔ غزوۂ احد میں شکست کھانے کے بعد کفار قریش نے مسلمانوں کو طرح طرح سے زک پہنچانے کی تدبیریں کیں، قبیلہ عضل اور قارہ کے سات افراد سے ساز باز کر کے ان سات افراد پر مشتمل ایک وفد، کفار قریش نے مدینے نبی ﷺ کی خدمت میں ارسال کیا کہ ہمارے ہاں قبیلے اسلام میں داخل ہونے کے لیے تیار ہیں، دس قراء اور معلمین ہمارے ساتھ کر دیجیے جو ان قبیلوں کو اسلام کی تعلیم دیں۔ نبی ﷺ نے دس اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کو ان کے ہمراہ روانہ کر دیا۔ ان دس صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے آٹھ کو ان بدبختوں نے شہید کر دیا اور دو صحابہ حضرت خبیب بن عدی رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن وثنہ رضی اللہ عنہ کو ان بدنصیبوں نے

گرفتار کرلیا اور مکے لے جا کر قریش کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ چند یوم قید میں رکھنے کے بعد ان سنگدلوں نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو پھانسی پر لٹکانے کا فیصلہ کیا اور ایک پھانسی کے تختے کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا اور پوچھا دیکھو! اب بھی موقع ہے، اگر اسلام کو چھوڑ دو تو جان بخشی ہو سکتی ہے۔ خبیب رضی اللہ عنہ نے نہایت جرأت اور بے باکی سے کہا، جب جان میں اسلام نہ رہا تو پھر جان کو بچانے کا کیا فائدہ —— آخر ان تیرہ بختوں نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو سولی پر لٹکا دیا اور یہ سنگدل جسم کے ایک ایک حصے کو نیزوں سے چھیدتے رہے۔ ایک ظالم نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے جسم میں ایسا نیزہ مارا کہ جگر کو چھید دیا۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ درد سے بے قرار ہو گئے۔ ظالم نے پوچھا کہو اب تو تم چاہو گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری جگہ پھنس جائیں اور تم کسی طرح اس عذاب سے بچ جاؤ؟ مگر حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے اس درد کو برداشت کرتے ہوئے جوش اور جذبے سے جواب دیا —— ''میرا اللہ عالم الغیب ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم میں ایک کانٹا بھی چبھ کر میری جان بچ جائے تو مجھے یہ بھی گوارہ نہیں۔ اللہ اکبر! اس محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیضان ہے کہ امت آج بھی اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و آبرو پر آنچ نہیں آنے دیتی۔

اس سرفروش مجاہد کے وہ اشعار کس قدر ایمان افروز اور ولولہ انگیز ہیں جو سولی پر چڑھتے وقت تماشائیوں اور دشمنوں کے ہجوم میں آپ رضی اللہ عنہ نے فی البدیہ کہے تھے۔ یہ اشعار بتاتے ہیں کہ یہ جوانمرد کس اطمینان قلب اور کس سکون کے ساتھ دین کی راہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں دی جانے والی ایذاؤں کو برداشت کر رہا ہے بلکہ ان میں لذت محسوس کر رہا ہے۔ ذیل میں ہم ان اشعار کا اردو ترجمہ دے رہے ہیں۔ ترجمہ سے ہی مؤمن جانباز اور فدائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبات کا اندازہ ہو جائے گا۔

''میرے اردگرد چاروں طرف لوگوں کی زبردست بھیڑ ہے۔ انہوں نے اپنے قبیلوں کو بلا کر جمع کرلیا ہے۔

یہ سب اپنے دلوں کی دشمنی نکال رہے ہیں اور میرے خلاف جوش غضب دکھا رہے ہیں کہ میں اس وقت ہلاکت گاہ میں مجبور و مقید ہوں۔ ان قبیلوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو بھی (میرا تماشا دیکھنے کے لیے) بلا لیا ہے اور مجھے ایک بہت اونچی اور مضبوط لکڑی کے پاس لا کھڑا کیا ہے۔ وہ مجھے ترغیب دے رہے ہیں کہ میں کفر اپنا لوں تو موت سے رہائی مل سکتی ہے۔ مگر اس رہائی سے میرے لیے موت زیادہ اچھی ہے۔ میری دونوں آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ مگر میں کسی بے صبری اور جزع فزع کا مظاہرہ نہ کروں گا۔ نہ میں دشمن کے سامنے عاجزی کا اظہار کروں گا، نہ آنسو بہاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں اپنے اللہ کی طرف جا رہا ہوں مجھے موت کا ڈر نہیں ہے کہ میری جان جاتی رہے گی۔ مجھے اس آگ کا ڈر ہے جو لپٹ کر خون چوسنے والی ہے۔

عرش کے مالک نے میری خدمت کو پذیرائی بخشی ہے اور مجھے ثابت قدمی کی تلقین فرمائی ہے۔ ان لوگوں نے میرے گوشت کی بوٹی بوٹی کوٹ ڈالی ہے اور اب مجھے زندہ رہنے کی امید نہیں رہی ہے۔

میں اپنی بے کسی، غریب الوطنی اور بے بسی اور میری جان لینے کے بعد یہ لوگ جو برے ارادے رکھتے ہیں ان کی فریاد اپنے اللہ سے کرتا ہوں۔ اللہ کی قسم جب میں اسلام کے لیے جان دے رہا ہوں تو مجھے کیا پروا کہ میں اللہ کی راہ میں کس پہلو پر گر کر جان دیتا ہوں۔ اللہ کی ذات سے امید ہے کہ اگر وہ چاہے تو میرے گوشت کی بوٹی بوٹی کو برکت عطا فرمادے۔"

اور پھر آخر میں آپ ﷺ نے یہ دعا پڑھتے ہوئے دم توڑ دیا:

اللھم بلغنا رسالہ رسول فبلغہ ما یصنع بنا

"اے اللہ ہم نے تیرے رسول ﷺ کے احکام ان لوگوں کو پہنچا دیئے اب تو اپنے رسول ﷺ کو اس کی خبر پہنچا دے جو یہ ظالم ہمارے ساتھ کر رہے ہیں۔"

یوں تو یہ سارے ہی اشعار جذبہ صبر و ایمان، دینی غیرت اور حبِ رسول ﷺ کے آئینہ دار ہیں لیکن ایک شعر تو بڑا ہی قلب کو گرما دینے والا ہے اس شعر کو اس زبان میں بھی پڑھئے جس زبان میں حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے فی البدیہہ کہا تھا۔

نو اللہ ما ارجوا اذا مت مسلما
علی ای جنب کان فی اللہ مصرعی

رسول اللہ ﷺ کے ایک فداکار صحابی سعید بن عامر رضی اللہ عنہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور میں حکومت کی کسی ذمہ داری پر فائز تھے۔ کبھی کبھی یکایک بے ہوش ہو کر گر پڑتے تھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو تشویش ہوئی کہ کوئی سنگین بیماری ہے۔ تحقیق کی تو سعید بن عامر رضی اللہ عنہ نے بتایا: نہ مجھے کوئی بیماری ہے نہ کسی قسم کی کوئی شکایت، جس وقت رسول اللہ ﷺ کے جانباز سرفروش حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو سولی پر چڑھایا گیا تھا اور آپ رضی اللہ عنہ کے بدن کے حصوں کو نیزوں سے چھیدا جا رہا تھا اور آپ رضی اللہ عنہ صبر و ثبات کا پیکر بنے ہوئے تھے، میں بھی اس مجمع میں موجود یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ منظر جب مجھے یاد آتا ہے تو قوت برداشت جواب دے جاتی ہے اور مجھ پر ایسا لرزہ طاری ہوتا ہے کہ میں بے ہوش ہو جاتا ہوں۔

رسول اللہ ﷺ کا واسطہ دے کر آج بھی آپ مسلمانوں کو بلائیں، تو ان شاء اللہ امت میں ان جاں فروشوں کی پیروی کرنے والے ضرور نکلیں گے۔ قائدین امت مسلمانوں کے ان جوہری جذبات کو جگائیں اور منصوبے کے تحت امت کو تعمیر کی راہ پر لگائیں۔

# دین کا صحیح تصور آپ کی اہم ضرورت

دینداری کا جذبہ، دینی اعمال کا شوق اور دینی ترقی کی فکر و تڑپ بلاشبہ وہ جوہر ہیں جن سے مؤمن کی زندگی میں زبردست رعنائی پیدا ہوتی ہے۔ بے اختیار دل کھنچتے ہیں —— اور پوری زندگی، سکون، اطمینان، نشاط اور رحمت و برکت کا مظہر ہوتی ہے۔ یہ پرسکون بابرکت اور پاکیزہ زندگی نہ صرف اپنے لیے بلکہ پورے ماحول کے لیے رحمت ہوتی ہے —— لیکن بہت سے لوگ سماج میں دیندار کہے جاتے ہیں۔ وہ خود بھی اپنے کو دیندار سمجھتے ہیں۔ اور وہ اپنی دینداری پر مطمئن ہی نہیں بلکہ فخر کرتے ہیں۔ سماج بھی دیندار ہی کہتا اور سمجھتا ہے لیکن ان کی دینداری سے لوگ مطمئن نہیں ہوتے۔ ذہن الجھتے ہیں دراصل دینداری کی خیر و برکت اور فیض و رحمت کے وہ اثرات ان کی زندگیوں میں نہیں پائے جاتے جو دینداری کے لازمی ثمرات ہیں۔ ان کی دینداری کے بارے میں خوش گمانی نہیں پیدا ہو پاتی۔ نہ ان کی زندگیوں میں کوئی کشش اور رعنائی نظر آتی ہے نہ وہ خود اپنی زندگی میں کوئی سکون و نشاط محسوس کرتے ہیں۔ اور نہ دوسروں کو ان کی زندگی میں کوئی رحمت و برکت نظر آتی ہے۔ ذہن میں ایک خاموش سوال ابھرتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ وجہ دراصل یہ ہے کہ یہ لوگ دین کے صحیح تصور سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ حقیقی دینداری سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اور چند اعمال یا چند دینی مظاہر کو وہ اصل دین سمجھتے ہیں یا پھر زیادہ سے زیادہ ان چند چیزوں پر ان کے فکر و عمل کی پوری قوت صرف ہوتی ہے جو ان کی نظر میں دین کا حاصل اور اعلیٰ دینداری کا مظہر ہوتے ہیں۔ حالانکہ اس میں دین کے مزاج، دین کی فکر اور دین کی رہنمائی اور فیصلہ کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ وہ خالص ان کے اپنے ذہن کا مزعومہ اور اپنی فکر کا خود ساختہ دینی عمل ہوتا ہے۔ اور قلوب میں اس کے لیے کوئی کشش، کوئی قدر و قیمت اور کوئی عظمت و منزلت نہیں ابھرتی۔ بلکہ بعض اوقات وہ عمل دینداری سے بیزاری کا سبب بنتا ہے۔ اور دین کے بارے میں ناگواری کا تصور پیدا ہونے لگتا ہے۔ حالانکہ اس بیزاری اور ناگواری کا حقیقی سبب دین ہرگز نہیں ہوتا۔ بلکہ دین کا مظاہرہ کرنے والے دینداروں کا وہ غلط عمل ہوتا ہے جس کو انہوں نے اپنے زعم میں دینداری کا کارنامہ سمجھ کر اختیار کر رکھا ہے اور اس طرح وہ دین کے دروازے پر بیٹھ کر دین کے نمائندے بن کر اور دینداری کا مظاہرہ کر کے دین سے دور کرنے اور دین کی راہ روکنے کا سبب بن جاتے ہیں۔ یہ

صحیح ہے کہ اس میں ان کے کسی برے ارادہ کو دخل نہیں ہوتا۔ لیکن ان کی سادہ لوحی بلکہ فہم دین سے محرومی کو ضرور دخل ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے اس میں علم کی کمی بھی ایک سبب ہو۔ لیکن حقیقی سبب دین کے فہم، دین کی بصیرت، دین کے مزاج اور دین کے صحیح اور کامل تصور اور دین کی روح اور منشا کو نہ سمجھنے کی نادانی ہوتی ہے۔ دین میں اصل چیز معتقدات ہیں۔ پھر فرائض و ارکان ہیں اور اس کے بعد مستحبات و مندوبات ہیں۔ کچھ چیزیں مقدم ہیں اور کچھ چیزیں ان کے بعد۔ کچھ چیزیں بہت ضروری ہیں اور کچھ پسندیدہ اور مباح ہیں۔ اور دینداری یہی ہے کہ اس ترتیب کو کبھی بھی نہ فکری طور پر نظر انداز کیا جائے اور نہ عملی طور پر۔

بعض اوقات لوگ فرائض و واجبات سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں اور کبائر و منکرات سے اجتناب کی اہمیت محسوس نہیں کرتے۔ مگر کسی ایک پسندیدہ اور مندوب عمل یا دین کے کسی ایک حکم کو اپنے تصور کے مطابق اتنی اہمیت دے دیتے ہیں کہ وہی ان کے نزدیک دینداری اور بے دینی کا معیار بن جاتا ہے۔ ایسے لوگ خود کو بھی مطمئن کرنا اور رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ دیندار ہیں اور دین کے تقاضے پورے کر رہے ہیں اور دوسروں پر بھی یہ اثر ڈالنا چاہتے ہیں کہ سبحان اللہ فلاں صاحب نے تو دین کا حق ادا کر دیا۔

ایک شخص نے معصوم بچی کا روزہ رکھوایا۔ سخت گرمی کا موسم ہے۔ لو چل رہی ہے۔ گرمی کی شدت سے گودا پگھل رہا ہے۔ دماغ کھول رہا ہے۔ بچی پیاس سے نڈھال ہے۔ حلق خشک ہو رہا ہے۔ بچی کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ مگر وہ اپنی دینداری کے زعم میں یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم بچی کو دین پر قربان کر رہے ہیں۔ بچی کی جان چلی جائے لیکن روزہ نہیں کھلوائیں گے۔ اور اگر اس حالت میں بچی کی جان چلی گئی تو ان کے زعم میں یہ راہ حق میں شہادت ہوگی۔

سوچیے؟ کیا یہ دین کا مزاج اور دین کا تقاضا ہوسکتا ہے —— اپنی نادانی کو دینداری سمجھنا اور سمجھانا زبردست خود فریبی اور گمراہی ہے۔ نابالغ بچی پر تو روزہ فرض نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ تو معصوم بچی ہے۔ اگر بالغ آدمی کی بھی جان کو خطرہ ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ روزہ کھول لے اور اپنی جان نہ کھوئے۔

فرض کیجیے کسی بستی میں آگ لگ گئی مکان جل رہے ہیں، شعلے بھڑک رہے ہیں بچوں اور عورتوں کی چیخیں نکل رہی ہیں۔ قیامت کا منظر ہے اور آپ نفل نماز نہیں بلکہ فرض نماز پڑھ رہے ہیں تو دین یہ نہیں ہے کہ آپ اپنی نماز پوری کرنے میں لگے رہیں اور بے گناہ بچوں اور عورتوں کو یونہی جلنے دیں۔ بلکہ دین یہ ہے کہ آپ فوراً ہی نیت توڑ دیں۔ اور مقامِ حادثہ پر پہنچ کر ان آفت رسیدہ عورتوں اور بچوں کو آگ سے بچائیں اگر کوئی شخص اس کے برخلاف بستی اور آگ سے صرفِ نظر کر کے نماز پڑھتے رہنے ہی کو اعلیٰ دینداری قرار دیتا ہے تو وہ فکری گمراہی میں مبتلا ہے۔

یقیناً پردہ کا حکم قرآن نے دیا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کے قول و عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے لیکن اگر پردے

کے اہتمام کی شکل یہ ہے کہ اگر ایک بچے کا سر پھٹ گیا ہے۔ خون برابر بہہ رہا ہے اور خدانخواستہ بچہ کی جان جاسکتی ہے لیکن گھر میں کوئی مرد نہیں ہے خواتین ہی خواتین ہیں اور خواتین کو یہ حکم ہے کہ کسی غیر مرد سے بات نہیں کرسکتیں، بازار نہیں جاسکتیں۔ مرد ڈاکٹر سے مریض کا معائنہ نہیں کراسکتیں جبکہ بچہ سسک رہا ہے۔ خون کافی بہہ چکا ہے اور کچھ دیر اگر ڈاکٹر کی امداد نہ ملی تو جان پر بن سکتی ہے۔ لیکن گھر میں پردہ نشین خواتین ہی خواتین ہیں کون لے جائے۔ کوئی پڑوسی بھی کیسے دخل دے۔ اس لیے کہ پڑوس سے بھی کوئی جائے گا تو وہ مرد ہی ہوگا غیر مرد گھر میں کیسے داخل ہو۔ اس عمل کا جو بھیانک نتیجہ ہوسکتا ہے۔ اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ پردہ کا یہ تصور اور مفہوم جسے دینداری کا اعلیٰ مظہر سمجھتے ہوئے اختیار کیا گیا ہے۔ یہ وہ پردہ نہیں ہے جس کا اسلام نے حکم دیا ہے اور جو اسلام کو مطلوب ہے۔ اسلام اس درجہ بے بسی اور مفلوج ہوجانے کی تعلیم نہیں دیتا۔ وہ سماج میں عورتوں کا بھی مؤثر رول دیکھنا چاہتا ہے اور حالات کے لحاظ سے غضِ بصر، پردہ اور تحفظ کا حکم دیتا ہے۔ مگر ایسا ہرگز نہیں کہ عورتیں مرد سے بات بھی نہ کر سکیں۔ کسی مرد ڈاکٹر کو اپنے مریض کا حال بھی نہ بتاسکیں۔

مریض پر جان کنی کی کیفیت ہو اور وہ اسے ڈاکٹر کے پاس نہ لے جاسکیں۔ یہ اسلام کے پردے کا غلط مفہوم لیا گیا ہے۔ یہ خود ساختہ مفہوم ہے۔ یہ دینداری اسلام کی مطلوبہ دینداری نہیں ہے بلکہ اپنی مزعومہ دینداری ہے۔ اس سے اپنی ذات اور اپنے متعلقین کو جو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ وہ تو اپنی جگہ ہے۔ خود اسلام کی بھی غلط نمائندگی اور غلط ترجمانی جو اس عمل کے ذریعے ہورہی ہے۔ اس کا تدارک کیا ہے۔ آپ کے اس طرزِ عمل کو دیکھ کر آدمی اسلام کے بارے میں بدگمانی قائم کرسکتا ہے اور آپ کے اس عمل سے اسلام کے بارے میں جو غلط تصور پیدا ہوگا اس کی پوری ذمہ داری آپ کی ذات پر عائد ہوگی اور یقیناً ایسے لوگ اپنے غلط طرزِ عمل سے اسلام کے بارے میں غلط تصور دینے کے مجرم قرار پائیں گے۔

دین کا صحیح تصور ہر مسلمان کی بنیادی ضرورت اور اہم ترین فریضہ ہے اور اسی پر دار و مدار ہے آپ کی پوری زندگی کی گردش اور فکر و روش کی صحت کا، اللہ کے یہاں مقبولیت کا۔ ورنہ اپنے زعم میں انسان کیا کچھ کرتا رہے گا۔ وہ دین کے خلاف چلتا رہے گا اور سمجھتا یہ رہے گا کہ وہ دیندار ہے اور دین پر عمل کررہا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی قرآن پاک سمجھ کر پڑھنے کی عادت ڈالے اور حدیث کا بھی مسلسل مطالعہ کرتا رہے۔ اور اللہ سے صحت دین اور حق شناسی کی دعائیں کرتا رہے۔ اور اپنی روش کا قرآن کی روشنی میں برابر جائزہ لیتا رہے۔ قرآن و حدیث کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ سیرت و حدیثِ رسول ﷺ، سیرتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے مطالعہ کا بھی ضرور اہتمام رکھے۔ دین کے صحیح تصور کا سرچشمہ قرآن و حدیث ہے۔ اور قرآن و حدیث کے مطابق رسولِ پاک ﷺ کی مبارک زندگی ہی ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیاں ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ ایک دعا کا بڑا اہتمام فرماتے تھے۔ اس دعا کا ضرور اہتمام رکھنا چاہیے۔

اَللّٰھُمَّ اَصْلِحْ لِیْ دِیْنِیِ الَّذِیْ ھُوَ عِصْمَةُ اَمْرِیْ وَاَصْلِحْ لِیْ دُنْیَایَ الَّتِیْ فِیْھَا مَعَاشِیْ وَاَصْلِحْ لِیْ آخِرَتِیَ الَّتِیْ فِیْھَا مَعَادِیْ وَاجْعَلِ الْحَیٰوةَ زِیَادَةً لِیْ فِیْ کُلِّ خَیْرٍ وَاجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَةً لِیْ مِنْ کُلِّ شَرٍّ (نسائی باب ۸۹' نوع آخر صفحہ ۲۱۷۵)

''اے اللہ! میرے دین کی اصلاح فرما۔ جو میرے ہر کام کی حفاظت کرنے والی چیز ہے اور میری دنیاوی زندگی کی اصلاح فرما۔ جس سے میری معاش متعلق ہے۔ اور میری آخرت کو ٹھیک فرما دے۔ جہاں مجھے لوٹ کر جانا ہے اور میری زندگی کو میری ہر ایک بھلائی میں اضافہ کا سبب بنا دے اور میری موت کو راحت کا سبب بنا دے ہر ایک برائی سے۔''

ایک اور دعا بھی نبی کریم ﷺ سے منقول ہے اس کا اہتمام بھی کرنا چاہیے:

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اِتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اِجْتِنَابَهٗ

''اے اللہ مجھے حق کو حق کر کے دکھا اور اس کی اتباع کی توفیق عطا فرما اور باطل کو باطل ہی کر کے دکھا اور اس سے بچنے کی توفیق ارزانی فرما۔''



# وقت پڑا ہے کرلوں گا



اپنے سیکرٹری کو بلا کر میں نے سارا کام سمجھایا اور تاکید کی کہ جلد سے جلد یہ ساری فائلیں تیار کر کے مکمل کر لیں تاکہ وقت پر پروگرام نافذ کیا جا سکے۔ سیکرٹری کام سمجھ کر چلے گئے اور اپنے کام میں لگ گئے۔ دوسرے روز صبح سویرے کچھ کاغذات لیے ہوئے آئے، کچھ اصولی ہدایات حاصل کیں اور میرے منشا کو پورا کرنے کے لیے کچھ اشارات نوٹ کیے اور یہ کام کر کے فوراً چلے گئے۔ ان کا انہاک، سرگرمی اور مستعدی دیکھ کر مجھے بڑا اطمینان ہوا کہ ان شاء اللہ کل پرسوں تک یہ سارا کام مکمل کر کے آ جائیں گے۔ اور میں نے تاکید کر دی کہ پرسوں تک لازماً یہ سب کچھ مکمل کر کے لے آئیں اور وہ بہت اچھا کہہ کر اور مجھے یہ تاثر دے کر چلے گئے کہ کل پرسوں لازماً وہ سب کاغذات لا کر پیش کر دیں گے۔

اتفاق کی بات تھوڑی دیر بعد ہی میرا سفر پر جانے کا پروگرام بن گیا۔ اور میں نے یہ سوچ کر کہ کل پرسوں سیکرٹری صاحب آئیں گے اور میں نہیں ملوں گا تو انہیں خواہ مخواہ پریشانی ہوگی۔ میں نے ان کے یہاں کہلوا دیا کہ میں دو روز کے لیے باہر سفر پر جا رہا ہوں آنے کے بعد آپ کے کاغذات دیکھوں گا —— سیکرٹری صاحب کے یہاں خبر کرانے کے بعد پھر کچھ ایسے مسائل سامنے آ گئے کہ مجھے اپنا سفر ملتوی کرنا پڑا اور دن گزر گیا، دوسرے دن راستے میں سیکرٹری صاحب سے ملاقات ہوگئی اور میں نے انہیں بتا دیا کہ میں سفر پر نہ جا سکا۔ بعض اہم کاموں کی وجہ سے سفر ملتوی کرنا پڑا۔ آپ حسب پروگرام کاغذات مکمل کر کے لے آئیں۔

ایک دن گزرا، دوسرا دن گزرا، لیکن سیکرٹری صاحب نہیں آئے۔ شدید انتظار کیا اور کوفت بھی ہوئی، تیسرے دن وہ کاغذات اور فائل لیے ہوئے آئے۔ میں نے ذرا ناگواری کے انداز میں سخت لہجے میں ان سے کہا۔ آپ دو روز غائب رہے، میں نے تو آپ کو بتا دیا تھا کہ میرا سفر ملتوی ہوگیا ہے۔ آپ کام پورا کر کے وقت پر آ جائیں۔ آپ نے میری بات سنی نہیں یا سن کر سمجھے نہیں؟ کہنے لگے میں نے آپ کی پوری بات سن لی تھی اور سمجھ بھی گیا تھا لیکن۔

لیکن کیا، میں نے حیرت اور ناگواری سے پوچھا۔

کہنے لگے میں تو نہایت توجہ انہماک اور دھن کے ساتھ کام پورا کرنے میں لگ گیا تھا۔ مگر جب آپ نے دوسرے روز یہ کہلوایا کہ آپ سفر پر جا رہے ہیں تو میری ساری قوتیں قدرتی طور پر ڈھیلی پڑ گئیں اور میں نے سوچا، جلدی کیا ہے، معلوم نہیں سفر میں آپ کو کتنے دن لگتے ہیں۔ دوروز کی بات تو آپ سوچ کر جا رہے ہیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کتنے دن میں آپ کا لوٹنا ہو۔ اطمینان سے کرلوں گا۔ اور میری مستعدی سستی میں بدل گئی۔ میں نے سارا کام یوں ہی رکھ دیا۔ کہ آپ آئیں گے تو اس وقت دیکھ لوں گا۔

دوسرے روز جب راستے میں آپ سے ملاقات ہوئی تو مجھے حیرت بھی ہوئی اور گھبراہٹ بھی۔ آپ نے بتایا کہ کچھ اہم کاموں کی وجہ سے آپ کا سفر ملتوی ہو گیا ہے تو میں نے پھر کاغذات اٹھائے اور کام کرنے بیٹھ گیا مگر ایک باری قوئ ڈھیلے پڑنے کے بعد وہ مستعدی پیدا نہ ہو سکی۔ میں نے کاغذات مکمل کرنے کی کوشش تو شروع کر دی لیکن پہلی سی توجہ، انہماک اور سرگرمی نہ تھی، انداز کچھ ڈھیلا ڈھالا سا تھا اور وقت پر کام پورا نہ ہو سکا۔ آج تیسرے روز کام پورا ہوا تو میں لے کر حاضر ہوا ہوں، سیکرٹری صاحب نے بڑی سادگی کے ساتھ اپنی ذہنی سرگزشت سنائی۔

میں نے سیکرٹری صاحب کی بات کسی قدر افسوس اور ناراضی کے ساتھ سنی اور یہ سوچنے لگا: میں نے خوامخواہ ان کو اپنے سفر پر جانے کی اطلاع دی سفر پر جانے کی اطلاع ان سے چھپائے رکھتا، تو یہ اسی انہماک اور تن دہی کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہتے اور کام وقت پر مکمل ملتا۔ یہ سوچتے ہوئے مجھے غم بھی ہو رہا تھا کہ میں نے سفر پر جانے کی خبر ان کو کیوں بتائی، یہ خبر ان سے چھپائی کیوں نہیں۔ لیکن اس کے نتیجے میں جو کچھ سامنے آیا اس سے ذہن ایک اور حقیقت کی طرف مبذول ہوا۔ اور میرے حافظے میں قرآن پاک کی ایک آیت ابھرنے لگی۔ اللہ کا ارشاد ہے۔

إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ ۝ (طٰہٰ ۲۰:۱۵)

''قیامت کی گھڑی لازماً آنی ہے، میں اس کا وقت مخفی رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر متنفس اپنی سعی کا بھرپور بدلہ پائے۔''

قیامت کب آئے گی، یہ بات اللہ تعالیٰ نے کسی کو نہیں بتائی، قیامت کا وقت مخفی رکھنے میں اللہ کی عظیم مصلحت یہ ہے کہ آدمی سستی اور غفلت کا شکار نہ ہو۔ اور اس خیال میں نہ رہے کہ وقت پڑا ہے، جلدی کیا ہے کرلوں گا۔ بلکہ اس کو ہر دم قیامت کا کھٹکا لگا رہے، کہ کسی وقت بھی یوم الحساب کی یہ گھڑی آ سکتی —— اور وہ اپنا حساب چکانے کے لیے اور محشر میں اللہ کے حضور کھڑا کیا جا سکتا ہے، یہ اندیشہ ہر وقت آدمی کو چوکنا، مستعد اور ڈیوٹی پر موجود سپاہی کی طرح الرٹ رکھے اور وہ اس فکر کے ساتھ زندہ رہے کہ کسی وقت بھی قیامت برپا ہو سکتی ہے یا میری موت کی گھڑی آ سکتی ہے اور آنکھ بند ہوتے ہی میری قیامت شروع ہو جائے گی۔ یہ فکر اللہ کی ایک رحمت اور انسان پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ وہ مسلسل تیاری اور کوشش و کاوش میں لگا رہے کہ اپنے کیے کا پورا پورا بدلہ اور صلہ پا سکے اور کسی وقت بھی یہ

خیال اسے غفلت سستی اور اضمحلال کا شکار نہ ہونے دے کہ زندگی پڑی ہے کرلوں گا۔ اس اخفائے وقت سے آدمی پر یہ فکر غالب رہے گی کہ جو لمحہ بھی حاصل ہے بس یہی مہلت عمل ہے۔ اگلا لمحہ عمل کا ہے یا نہیں کچھ پتہ نہیں۔

سیکرٹری صاحب کو اگر میں سفر کی اطلاع نہ دیتا اور اس خبر کو مخفی رکھتا تو وہ بہ دستور اپنے کام میں لگے رہتے اور یکسوئی، انہماک اور سرگرمی کے ساتھ وقت پر اپنا کام پورا کر کے لے آتے، لیکن ان کو سفر کی خبر دے کر میں نے ان کی قوتوں میں اضمحلال اور سستی پیدا کر دی اور ان کو اس خیال نے ڈھیلا کر دیا کہ وقت پڑا ہے اطمینان سے پورا کرلوں گا اگر میں یہ بات پوشیدہ رکھتا تو وہ بدستور اپنے کام میں انہماک اور توجہ سے لگے رہتے اور کام بروقت مکمل ملتا۔ کام میں یہ تاخیر اور یہ ڈھیل اسی لیے پیدا ہوئی کہ میں نے سیکرٹری صاحب کو اپنے سفر پر جانے کی اطلاع دے دی۔ اس پہلو سے اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے قیامت کا وقت پوشیدہ رکھ کر اپنے بندوں پر زبردست کرم فرمایا ہے، وقت موعود کو مخفی رکھ کر اس نے بندوں کے اندرون میں یہ فکر رکھ دی ہے کہ وہ اپنی عاقبت کو سنوارنے اور آخرت کی جواب دہی کے لیے تیاری کرنے میں مسلسل لگے رہیں۔ اور کسی وقت بھی اپنی عاقبت سے غافل نہ ہوں اس کو اخفا میں رکھ کر اللہ نے انسان کو اس مقام پر کھڑا کیا ہے کہ ہمہ وقت اس پر یہ فکر طاری رہے کہ آنے والی ہر گھڑی قیامت کی گھڑی ہوسکتی ہے، لہٰذا مجھے کوئی ایک گھڑی بھی ضائع نہیں کرنی ہے۔ اسی طرح اگر باشعور ہے تو وہاں کا اجر وصلہ پانے کے لیے مسلسل سعی و جہد اور تیاری میں لگا رہے گا اور ذرا بھی غفلت اور سستی کا شکار نہ ہوگا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میری بعثت اور قیامت کی گھڑی دونوں ان دو انگلیوں کی طرح ہیں''۔ (بخاری، مسلم)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو انگلیاں اٹھا کر دکھائیں اور فرمایا جس طرح ان دو انگلیوں کے درمیان تیسری نہیں ہے اسی طرح میرے اور قیامت کے درمیان اب کوئی تیسری چیز نہیں ہے۔ میرے بعد ہی قیامت آنے والی ہے۔ مجھ پر جو ایمان لایا ہے اسے اب ہر دم یہ کھٹکا لگا رہنا چاہیے کہ میری نبوت کے بعد اب بس قیامت ہی کا انتظار ہے، کسی لمحے بھی وہ آسکتی ہے اور ہر وقت چوکنا رہ کر وہاں کی تیاری میں لگا رہنا چاہیے۔ اس کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ آدمی کو برائی کر لینے کے بعد لازماً نیکی کرنے کی مہلت میسر آجائے گی۔ ہر آنے والا لمحہ قیامت کا لمحہ ہوسکتا ہے اور جس کی موت آگئی اس کی تو قیامت آ ہی گئی اس لیے کہ اس کی مہلت عمل ختم ہوگئی اور عذاب یا ثواب پانے کا وقت شروع ہوگیا۔ قیامت ہی کی طرح موت کا وقت بھی نہیں بتایا گیا ہے اور یقیناً اس اخفا میں بھی اللہ کی یہی حکمت و مصلحت اور بندوں پر رحمت و کرم پیش نظر ہے کہ وہ غفلت، سستی اور ڈھیل کا شکار نہ ہوں اور کبھی یہ نہ سوچیں کہ وقت پڑا ہے کرلوں گا۔

# حج بیت اللہ سے غفلت کا انجام

اللہ نے اپنے فضلِ خاص سے اپنے جس بندے کو حج کی استطاعت سے نوازا ہے اس بندے کی شانِ بندگی یہی ہے کہ وہ اولین فرصت میں حج کی سعادت حاصل کرے اور حجِ بیت اللہ میں ہرگز سستی، غفلت، لاپروائی اور ٹال مٹول نہ کرے۔ جس قدر جلد ممکن ہو بے تابانہ اللہ کے گھر کی زیارت کے لیے پہنچے۔ اس بندے سے زیادہ محروم اور بدنصیب اور کون ہوگا جس کو اللہ ہر طرح کی سہولت فراہم کر کے اپنے گھر بلائے اور وہ بدنصیب اللہ کے گھر جانے میں سستی اور کوتاہی کرے اور جانے کا ارادہ ہی نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے بندے کے اس غیر مؤمنانہ رویے کو کفر سے تعبیر کیا ہے ——— اور سخت ترین وعید سناتے ہوئے کہا ہے کہ اللہ سارے جہان والوں سے بے نیاز ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (آل عمران ۹۷:۳)

''اور لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو شخص استطاعت رکھتا ہو وہ اس کے گھر کا حج کرے اور جو ناشکری کرے گا تو وہ جان لے کہ اللہ سارے جہاں والوں سے بے نیاز ہے۔''

کفر کے معنی ہیں ناشکری کرنا۔ ناشکری وہ بدترین اخلاقی بیماری ہے جو انسان کو انسانیت کے مرتبے سے گرا دیتی ہے اور اللہ کے عذابِ شدید کا مستحق بناتی ہے۔ اس کے مقابلے میں شکر گزاری، ایمان کی راہ ہموار کرتی ہے۔ اللہ کی نعمتوں کے احساس سے سرشار ہو کر جس زبان پر حمد و شکر کے الفاظ بے اختیار جاری ہوتے ہیں، اس زبان سے ہی اھدنا الصراط المستقیم کی درخواست اٹھتی ہے اور جواب میں اس کو کتابِ الٰہی سے ہدایت کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔ جب بندہ اللہ کی نعمتوں پر شکر کے جذبات سے سرشار ہو کر زبان و عمل سے شکر کا اظہار کرتا ہے، تو فیضانِ رحمت کی بارش اور تیز ہو جاتی ہے۔ اور جب بندہ سب کچھ پا کر بے حسی اور ناشکری کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکتا ہے اور اسے عذابِ شدید کی وعید سنائی جاتی ہے۔

بندۂ مؤمن کے لیے اس سے بڑی خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ رب رحیم اپنے فضل و کرم سے اسے صحت

سے نوازے اور ہر طرح کی آسائش اور سہولت مہیا کر کے اس کو اپنے گھر کی زیارت کے لیے بلائے لیکن جو بندہ یہ سب کچھ پانے کے باوجود ناشکری کی روش اختیار کرے اور اپنے رب کے بلاوے کو نظر انداز کر دینے کا جرم کرے اس سے زیادہ محروم القسمت اور کون ہوگا۔ ایسے شخص کو اللہ نے اپنی بے نیازی کی وارننگ دی ہے اور اس سے زیادہ لرزہ خیز وارننگ اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ بندے کا رب اس سے بے نیازی کا اظہار فرمائے۔ جس سے اللہ بے نیاز ہو جائے اس کا کہیں کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے اس آیت کی بنیاد پر تارکینِ حج کو ایسے انجام بد سے ڈرایا ہے کہ اگر روح میں ذرا بھی بیداری ہو اور ایمان میں کوئی بھی رمق باقی ہو، تو آدمی پر لرزہ طاری ہو جائے۔

عن علي رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم من ملك زاد وراحلة تبلغه الى بيت الله ولم يحج فلا عليه ان يموت يهوديا او نصرانيا و ذالك ان الله تبارك وتعالى يقول وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۔

''حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو سفر حج کا ضروری سامان اور سواری میسر ہو، جو اس کو بیت اللہ تک پہنچا سکے اور وہ پھر بھی حج نہ کرے تو کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا'' اور لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو بھی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کے گھر کا حج کرے۔''

راوی نے پوری آیت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے آیت کا پہلا حصہ پڑھا ہے۔ اس لیے کہ وہ وعید جس سے رسول پاک ﷺ نے استدلال کیا ہے۔ وہ تو آیت کا یہ آخری حصہ ہے۔

وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (آل عمران ۳:۹۷)

''اور جس نے ناشکری کی تو اللہ سارے جہان والوں سے بے نیاز ہے۔''

یعنی اللہ اس سے بے نیاز ہے کہ وہ کس حال میں مرتے ہیں اور کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ اس نے تو اپنے کرم سے سب کچھ مہیا کر دیا پھر بھی اگر کوئی بندہ شقی بدترین انجام ہی کا خواہاں ہے تو اللہ سارے عالم سے بے نیاز ہے، ساری دنیا کے انسان مل کر اس کی بندگی میں ڈوب جائیں تب بھی اس کی ذات کو شمہ بھر نفع نہیں پہنچ سکتا اور سارے انسان مل کر نافرمانی اور برائیوں میں لت پت ہو جائیں تب بھی اس کی ذات کو ذرہ بھر نقصان نہیں پہنچ سکتا وہ مستغنی اور بے نیاز ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی وعید کا مفہوم یہ ہے کہ ایک تارکِ حج اگر حج کیے بغیر مر جاتا ہے تو حج کیے بغیر مر جانے میں اور یہودی اور نصرانی ہو کر مر جانے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

قرآن میں تارکینِ صلوٰۃ کو مشرکین سے تشبیہ دی ہے اور اس حدیث میں تارکینِ حج کے عمل کو اللہ کے رسول ﷺ نے یہود و نصاریٰ سے تشبیہ دی ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ حج تو ادا کرتے تھے لیکن نماز کے تارک تھے اور یہود و نصاریٰ نماز تو پڑھتے تھے لیکن حج کے تارک تھے۔ اس لیے ترکِ صلوٰۃ کے رویے کو مشرکین کا رویہ بتایا گیا ہے اور ترکِ حج کے رویے کو یہود و نصاریٰ کا رویہ قرار دیا گیا ہے اور ایک باشعور بندے کو لرزہ دینے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ترکِ صلوٰۃ اور ترکِ حج کو ان لوگوں کا رویہ قرار دیا ہے جن کا جرم ناقابل معافی ہے جن کی گمراہی پر اللہ کی کتاب شاہد ہے اور جن کو اللہ نے اپنے غضب میں گرفتار قرار دیا ہے۔



# گنہگار سے نفرت نہیں اصلاح کی فکر کیجیے

آپ نے سنا کہ ایک شخص گناہوں میں مبتلا ہے یا خود اپنی آنکھوں سے اس کو گناہ میں مبتلا دیکھا تو بے تعلق ہو کر گزر گئے کہ جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ دل میں نفرت اور بیزاری کی ہلکی سی خلش رہ گئی۔ مگر جلد ہی آپ نے ذہن جھٹک دیا اور اپنے کاموں میں لگ گئے۔ بے شک وہ گنہگار شخص اپنے کیے کی سزا پائے گا اور آپ جن اچھے کاموں میں اللہ کی رضا کے لیے لگے ہوئے ہیں ان کا بھرپور صلہ پائیں گے لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جس شخص کو آپ نے گناہوں کی دلدل میں پھنسا دیکھا ہے اور جس کی طرف سے بیزاری اور حقارت کا جذبہ دل میں محسوس کر رہے ہیں، کیا اس کے ساتھ آپ کا یہ رویہ صحیح ہے کہ دل میں ہلکی سی خلش لے کر اس سے بے تعلق ہو جائیں اور بغیر کسی حق کے یہ فیصلہ کرلیں کہ جو بوئے گا وہ کاٹے گا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس معاملے میں آپ کی بھی کچھ اخلاقی، معاشرتی اور دینی ذمہ داری ہو اور اس گنہگار کا آپ پر بھی کچھ حق ہو اور آپ کی یہ روش اللہ کو پسند نہ ہو۔

دین سرتاسر خیر خواہی کا نام ہے اس گنہگار کے ساتھ کیا آپ نے خیر خواہی کی؟ کیا اتنا کافی ہے کہ آپ اس سے بے تعلق رہیں؟ اپنا دامن بچائے رکھیں اور خود کو اس گناہ سے محفوظ رکھ کر یہ اطمینان کرلیں کہ کل اللہ کے حضور آپ کہہ دیں گے کہ پروردگار میں نے اس گنہگار سے تعلق نہیں رکھا اور خود کو اس کے شر سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ یا اس سے آگے بھی اس گنہگار کا آپ پر کچھ حق ہے وہ غافل ہے اور آپ باشعور ہیں۔ وہ آخرت سے بے پروا ہے اور آپ کو آخرت کی فکر ہے' وہ دین سے ناواقف ہے اور آپ دینی علم رکھتے ہیں' اس کو صالح ماحول نہیں مل سکا ہے اور آپ صالح ماحول میں زندگی گزار رہے ہیں۔ کیا آپ پر اس کا یہ حق نہیں ہے کہ آپ اس کو آخرت کی سخت پکڑ سے بچائیں اور گناہ کے بدترین اثرات اور ہولناک انجام سے ڈرائیں۔ کیا آپ کے نزدیک اس کا امکان نہیں ہے کہ وہ آپ کی نصیحت قبول کرلے اور توبہ کر کے اللہ کی طرف لوٹ آئے۔

وہ شخص جس گناہ میں مبتلا ہے اس سے اپنا دامن بچا کر آپ نے سمجھ لیا ہے کہ آپ اس سے محفوظ ہو گئے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اگر آپ اور آپ جیسے شعور رکھنے والے سارے لوگ یہی انداز فکر و عمل اپنا لیں گے تو گناہ بڑھتے

چلے جائیں گے اور پورا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ آپ بھی اس سے متاثر ہوں گے اور آپ کی نسلیں بھی، گناہ کی قباحت و شناخت دھیرے دھیرے کم ہونے لگے گی۔ گناہوں سے مصالحت اور برداشت کر لینے کی کیفیت بڑھتی چلی جائے گی اور نبی صادق وامین ﷺ کے الفاظ میں آپ گناہ بطور خود نہ کرنے کے باوجود گناہ کرنے والوں ہی میں شامل قرار دیے جائیں گے، بات کسی اور کی ہوتو آپ سنی اَن سنی بھی کر دیتے لیکن یہ بات تو ان کی ہے جن کی صداقت پر آپ کا ایمان ہے اور جن کے واسطے سے ہی آپ آخرت میں نجات کا یقین رکھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''جس مقام پر لوگ گناہوں میں مبتلا ہوں اور کچھ ایسے لوگ وہاں موجود ہوں جو اس گناہ کو برداشت نہ کر رہے ہوں تو وہ گویا وہاں موجود ہی نہیں ہیں اور جو لوگ ان گناہوں پر مطمئن ہوں اور ان کو برداشت کر رہے ہوں وہ اگر موقع پر موجود نہ بھی ہوں تو بھی وہ گویا ان لوگوں میں موجود ہیں۔''

حدیث کے اس صاف شفاف آئینے میں اپنے عمل و کردار کا چہرہ دیکھیے اور خود ہی فیصلہ کیجیے کہ آپ جو رویہ اختیار کر رہے ہیں وہ کس حد تک صحیح ہے اور حقیقت میں صحیح رویہ آپ کے لیے کیا ہے؟ صحیح رویہ صرف یہ ہے کہ آپ گنہگاروں کے گناہ پر کڑھیں اور اس کڑھن سے بے چین ہو کر ان بھٹکے ہوئے بندوں کو انجام بد سے ڈرائیں۔ گناہ کے اثراتِ بد سے بچائیں اور اپنے معاشرے کو گناہوں سے پاک رکھنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

گناہ آپ کی بستی میں ہو رہا ہو، یا محلے میں یا آپ کا کوئی پڑوسی اس میں مبتلا ہو، بہر حال آپ کی یہ اخلاقی اور دینی ذمہ داری ہے کہ آپ اسے روکیں اور گنہگار کے خیر خواہ بن کر اس کو گناہ سے بچانے کی فکر کریں اور ہرگز خود کو اس سے بے تعلق رکھ کر یہ نہ سمجھیں کہ آپ کل اللہ کے حضور پکڑے نہ جائیں گے آپ کا پڑوسی کل اللہ کے حضور حشر کے میدان میں آپ پر خیانت کا الزام لگائے گا۔ اور آپ کے اس رویے پر رب سے فریاد کرے گا۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت نقل کی ہے:

وقد جاء الحديث قال يجيء الرجل يوم القيامة متعلقا بجاره فيقول يا رب هذا خانني فيقول يا رب وعزتك ماخنته في اهل ولا مال فيقول صدق يا رب ولكنه رانى على معصية فلم ينهني عنها (کتاب الصلوٰۃ ومایلزم لھا)

''یعنی حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز ایک شخص اپنے پڑوسی کا دامن پکڑ کر یہ فریاد کرے گا، اے میرے رب! اس نے میرے ساتھ خیانت کی ہے۔ وہ جواب دے گا پروردگار میں تیری عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اس کے اہل وعیال اور مال میں کوئی خیانت نہیں کی ہے۔ فریادی کہے گا پروردگار یہ بات تو سچ کہتا ہے لیکن اس نے خیانت یہ کی کہ اس نے مجھے گناہ کرتے دیکھا لیکن کبھی مجھے

گناہ سے روکنے کی کوشش نہیں کی۔''

اللہ نے آپ کو دین کا شعور اور حلال وحرام کی تمیز دے کر اس ذمہ داری کے مقام پر کھڑا کیا ہے کہ آپ رب کی نافرمانی کو برداشت نہ کریں لوگوں کو معصیت اور منکرات سے روکیں اور بھلائیوں کی ترغیب دیں، دلسوزی کے ساتھ، شیریں گفتاری کے ساتھ اور حکمت کے ساتھ اور اس کوشش میں اپنے اثرات بھی استعمال کریں۔ اگر آپ نے اپنی یہ ذمہ داری ادا نہ کی تو گویا آپ نے خیانت کی اور آپ کا پڑوسی کل حشر کے میدان میں آپ پر اسی خیانت کا الزام لگائے گا چاہے وہ آپ کے محلے کا پڑوسی ہو یا آپ کی بستی کا۔

ایک پہلو اور بھی قابل غور ہے کہ جب عام لوگ گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور شعور رکھنے والے صرف اپنی ذات اور اپنے گھر کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور مبتلائے گناہ لوگوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتے، بلکہ اس سوچ سے خود کو مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں کہ جیسا کریں گے ویسا بھریں گے اور ان کے گناہوں کو برداشت کرنے لگتے ہیں تو یہ گناہ اور رب کی نافرمانیاں بڑھنے لگتی ہیں اور دھیرے دھیرے سماج اور بستی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں اور اب تو ذرائع ابلاغ کی مدد سے پورے پورے ملک اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو پھر اللہ کی جانب سے عذاب کا فیصلہ ہوتا ہے اور اس سے پہلے کہ ان لوگوں کو موت آئے یہ سب لوگ اللہ کے عذاب میں مبتلا کر دیئے جاتے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو گناہوں سے خود دور رہتے ہیں۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

ما من رجل يكون في قوم يعمل فيهم بالمعاصي يقدرون على ان يغيروا عليه ولا يغيرون الا اصابهم الله بعقاب قبل ان يموتوا (ابوداؤد' کتاب الملاحم' باب ۱۷ الامر والنھی ص ۱۵۳۹)

''جن لوگوں کے درمیان بھی کوئی شخص گناہ کے کام کر رہا ہو اور وہ لوگ اس کو روک سکتے ہوں پھر بھی نہ روکیں تو اس سے پہلے کہ یہ لوگ مریں سب کے سب اللہ کے عذاب میں گرفتار ہوں گے۔''

دراصل اللہ نے مؤمن کا وصف ہی یہ بتایا ہے کہ وہ منکرات کو گوارا نہیں کرتا بلکہ اس کو روکنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے رب سے وفاداری کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ زمین پر رب کی نافرمانی کو برداشت نہ کرے اور رب کی فرمانبرداری اور بھلائی کے پرچار پر لوگوں کو ہر ممکن ذریعے سے آمادہ کرے اپنی انفرادی زندگی میں بھی اور اپنی اجتماعی زندگی میں بھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دورِ سعادت اس کی بہترین اور قابلِ تقلید مثال ہے صحابہ کرام جو قرآن پاک میں قطعی طور پر خیر امت کے لقب سے یاد کیے گئے ہیں اسی بنیاد پر ان کو اس لقب سے نوازا گیا کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے تھے اور اللہ پر ایمانِ کامل رکھتے تھے۔

انفرادی طور پر بھی صحابہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے سے کبھی غافل نہیں ہوئے ہر موقع پر نیکی اور

اصلاح کے حریص رہتے تھے اور اس معاملے میں اپنا فرض اور دوسروں کا حق ادا کرنے کے لیے ہمہ دم مستعد رہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی کوششوں کو بار آور بھی کیا اور انہوں نے اپنی مخلصانہ کوششوں کے نیک نتائج سے اپنی آنکھیں بھی ٹھنڈی کیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس شام کا رہنے والا ایک شخص اکثر آجایا کرتا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ بہت دن گزر گئے اور وہ نہیں آیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی یاد آئی لوگوں سے اس کے بارے میں معلومات کیں تو معلوم ہوا کہ وہ کچھ برے کاموں میں پڑ گیا ہے۔ پینا پلانا شروع کر دیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے کاتب کو بلایا اور اس کو ایک خط لکھوایا:

یہ خط ہے عمر بن الخطاب کی طرف سے —— فلاں ابن فلاں شامی کے نام۔ تمہارے اس اللہ کی حمد و تعریف کرتا ہوں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو گناہوں کو بخشنے والا، توبہ قبول کرنے والا، سخت سزا دینے والا اور زبردست احسان کرنے والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب کو اسی کی طرف پلٹنا ہے۔

یہ خط لکھوا کر امیر المؤمنین نے اس شامی شخص کی طرف روانہ فرمایا۔ اور اپنے پاس کے ساتھیوں سے کہا کہ تم سب لوگ اس شخص کے لیے رب سے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کے دل کو پھیر دے اور اس کی توبہ کو قبول فرمالے۔

ادھر اس شامی خطا کار کو جب امیر المؤمنین کا خط ملا۔ تو اس نے صرف ایک بار نہیں بلکہ بار بار اس کو پڑھا اور یہ کہنا شروع کیا کہ میرے رب نے مجھے اپنی پکڑ اور اپنے عذاب سے ڈرایا بھی ہے اور اپنی رحمت کی امید دلا کر مجھ سے گناہوں کی بخشش کا وعدہ بھی کیا ہے۔ یہ خط اس نے کئی بار پڑھا، رویا اور اللہ سے توبہ کی اور ایسی سچی توبہ کی کہ اللہ نے اس کی زندگی بدل دی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب اس واقعے کی اطلاع ملی، تو آپ انتہائی خوش ہوئے اور لوگوں سے کہا کہ جب تم اپنے کسی مسلمان بھائی کو دیکھو کہ وہ بھٹک گیا ہے تو اس کو چھوڑ نہ دو بلکہ اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو۔ نیک اعمال میں توبہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند ہے اور آپ کے ذریعے کسی کو اگر توبہ کی توفیق مل جائے تو یہ آپ کی سب سے بڑی سعادت اور اللہ کی نظر میں سب سے بڑی نیکی ہے۔



# ظلم کا بھیانک انجام، تباہی

اللہ کے غضب کو بھڑکانے، اس کے ہولناک عذاب کو دعوت دینے اور اس کی غیرت کو چیلنج کرنے والی سب سے زیادہ شدید اور بدترین برائی یہ ہے کہ کوئی صاحبِ قوت واختیار فرد یا گروہ اللہ کے بندوں پر ظلم ڈھائے، ان کا ناحق خون بہائے، ان کے آباد گھروں اور بستیوں کو جلائے اور تباہ و برباد کرے۔ ان کے معصوم بچوں کو بھوک و پیاس کی مار دے کر اور ان کو تڑپا تڑپا کر ہلاک کرے، ان کی پاک دامن خواتین کی عصمتیں لوٹے، ان کے بوڑھوں کو ظلم وتشدد کا نشانہ بنائے، ان کے جوانوں کو ایذائیں دے کر ان کو مفلوج ومعذور بنائے اور ان کو جوانی کی لذتوں سے محروم کرنے کی کوشش کرے۔ جوشِ انتقام میں درندگی اور سفاکی کا بدترین مظاہرہ کرے، ان کی بستیوں میں وہ تباہی مچائے کہ مظلوموں کی چیخ وپکار اور آہ وفغاں سے عرشِ الٰہی لرزنے لگے۔

اللہ تعالیٰ بڑا وسیع الظرف، حلیم اور معاف کرنے والا ہے۔ وہ انسانوں کی نافرمانیوں، سرکشیوں اور بغاوتوں سے درگزر کرتا رہتا ہے۔ لیکن ظلم وزیادتی وہ بدترین جرم ہے جس کو وہ زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کرتا۔ ظلم وجبر کی مدت بہت مختصر ہوتی ہے اور اس کا بدترین انجام بہت جلد اسی دنیا میں سامنے آجاتا ہے۔ مظلوموں کی آہ وفغاں عرشِ الٰہی میں لرزہ پیدا کردیتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑک اٹھتا ہے۔

روئے زمین کے کسی حصے میں اللہ تعالیٰ جب کچھ لوگوں کو قوت واختیار اور طاقت واقتدار دیتا ہے تو اسی لیے دیتا ہے کہ امن وامان برقرار رکھیں۔ اللہ کے بندوں کو خوش اور مطمئن رکھیں، ان کے حقوق کی حفاظت کریں ان کے درمیان عدل وانصاف قائم کریں اور اللہ کے بندوں کو سکون وآرام کی زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کریں، اقتدار واختیار اللہ کا انعام ہے اور وہ اسی مقصد کی خاطر کسی گروہ کو عطا کیا جاتا ہے۔

لیکن اگر کوئی گروہ اقتدار واختیار پاکر اپنے فرائض بھول جائے اور اقتدار کے نشے میں بدمست ہوکر انہی پر مظالم ڈھانے لگے اور انہی بے بس بندوں کو اپنی درندگی اور سفاکی کا نشانہ بنانے لگے اور اس حد تک کمینے پن پر اتر آئے کہ معصوم بچوں کو نہایت درندگی کے ساتھ قتل کرنے اور ان کو ایذائیں دے کر لطف اندوز ہونے لگے، پاکدامن خواتین کو برسرِ عام برہنہ کرے اور ان کی عصمتوں سے کھیلنے کا مظاہرہ کرنے اور تماشا دیکھنے لگے تو پھر ایسے

ظالم گروہ کی عبرتناک تباہی میں زیادہ دیر نہیں لگتی، ظالم کو اللہ تعالیٰ ڈھیل ضرور دیتا ہے مگر یہ مدت بہت ہی مختصر ہوتی ہے، بہت جلد اس کا غضب بھڑک اٹھتا ہے اس کا عبرتناک عذاب ٹوٹ پڑنے کے لیے بے تاب ہوتا ہے اور بہت جلد ظالم کی دردناک تباہی کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔

ظالم ڈھیل پا کر نشہ اقتدار میں اور زیادہ بدمست ہو جاتا ہے۔ درندگی، سفاکی، ظلم وستم اور بے حیائی کے وہ وہ مظاہرے کرنے لگتا ہے کہ جنگل کے درندے بھی شرمانے لگتے ہیں، لیکن اس کی بے حیائی اور رذالت بڑھتی جاتی ہے —— اللہ کی طرف سے ظالم کو یہ ڈھیل اور دل کے ارمان نکال لینے کا یہ موقع دراصل اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ ظالم کی مہلت پوری ہو چکی ہے۔ اس کے دردناک انجام کا وقت قریب آ چکا ہے اور اللہ کے عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے —— اللہ کی پکڑ انتہائی شدید ہوتی ہے اس کی پکڑ میں آنے والے کا پھر کوئی حامی و ناصر نہیں ہوتا، یہ ڈھیل دراصل اس بات کا موقع ہوتا ہے کہ ظالم خوب کھل کھیل لے اور اپنے انجام بد کو اپنے ہاتھوں مکمل کر کے اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود لے، اپنے دفنانے اور اپنا نام ونشان مٹانے کے انتظامات مکمل کر لے اور اپنی متعفن لاش پر خود ہی ماتم اور فغاں کر لے۔ اس لیے کہ اس کی تباہی اور بربادی پر نہ کوئی رونے والا ہوتا ہے اور نہ کسی طرح اتنی مہلت ہی اسے دی جاتی ہے۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ (الدخان۴۴:۲۹)

’’پس ان پر نہ آسمان رویا اور نہ زمین اور نہ انہیں ذرا سی مہلت دی گئی۔‘‘

ہر ظالم و جابر کے لیے یہ انجام مقدر ہے مگر ظالم و جابر اپنے اقتدار اور طاقت کے نشے میں اس فریب کا شکار ہوتا ہے کہ وہ روئے زمین پر سب کچھ کر سکتا ہے، اللہ کے بندوں کی گردنیں اس کے قبضے میں ہیں۔ وہ اپنی طاقت کے بل پر جس کو چاہے کچل دے، جس کو چاہے نیست و نابود کر دے اور جس کی گردن چاہے اپنے سامنے جھکا لے، بھلا اس کے منصوبوں کو چیلنج کرنے والا کون ہے، کس کی ہمت ہے جو اس سے سرتابی کی جرأت کرے یا اس کے مقابلے میں آئے۔

دراصل بدمست ظالم کی فکر و نظر مفلوج ہو جاتی ہے نہ تو نوشتۂ دیوار پڑھنے کے لیے اس کی آنکھیں کام کرتی ہیں اور نہ تاریخ کے اوراق سے سبق لینے کے لیے شعور و بصیرت ہی اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ وہ اپنی شرمناک تباہی اور انجام بد تک پہنچنے کے لیے بے چین ہوتا ہے اور بے قرار ہوتا ہے کہ آخر یہ دیر کیوں ہو رہی ہے! اللہ کی پکڑ کا فیصلہ کب ہوگا؟ اسی بے تدبیری میں وہ اپنے مقابلے میں آنے والے کمزوروں، بے بسوں کو وارننگ دیتا ہے کہ خبردار جو میرے اقتدار اور اختیار کے خلاف کوئی قدم اٹھایا۔ میرے حکم کا انتظار کرو۔ ورنہ تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ دوں گا اور سولیوں پر چڑھا دوں گا۔ یہ وارننگ دیتے ہوئے اسے ذرا احساس نہیں ہوتا کہ میں اپنے اقتدار کے

تابوت میں آخری کیل ٹھونک رہا ہوں اور وارننگ کے جواب میں بے بس مظلوموں کی زبان سے وہ نہایت بے باکی اور جرأت کا جواب سن کر سکتے میں آجاتا ہے۔

فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ (طٰہٰ ۲۰: ۷۲)

''تو جو کچھ بھی کر سکے کر گزر (ہمیں پروانہیں)۔''

یہ موڑ دراصل بڑا ہی فیصلہ کن ہوتا ہے ــــ اس موڑ پر آکر مظلوم بے بس فاتح بن کر ابھرتا ہے اور ظالم دردناک تباہی کے گڑھے پر کھڑے ہوکر اپنے انجامِ بد کا منتظر ہوتا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ ظالم کو ایک وقت تک مہلت دیتا ہے، مگر جب اس کو پکڑتا ہے تو پھر نہیں چھوڑتا اور ترجمان وحی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی یہ آیت پڑھی:

وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ○ (ہود ۱۱: ۱۰۲)

''اور جب تمہارا رب کسی ظالم بستی کو پکڑتا ہے تو پھر اس کی پکڑ ایسی ہی ہوا کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی پکڑ بڑی شدید اور دردناک ہوتی ہے۔''

ظلم و بربریت اور مظلومی و بے کسی کی اس کشاکش کے پس منظر میں ایک زبردست حقیقت عام طور پر نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہے، ظالم اور سفاک کی نگاہ سے بھی اوجھل ہوتی ہے اور ان دانشوروں کی نگاہ سے بھی جن میں اظہارِ حق کی اخلاقی جرأت نہیں ہوتی اور وہ اپنی اس اخلاقی کمزوری، غفلت اور بدترین بزدلی کو سنجیدگی، حکمت اور سیاسی شعور کا نام دے کر اللہ کو بھی فریب دیتے ہیں، اہلِ حق کو بھی فریب دیتے ہیں اور خود کو بھی فریب دیتے ہیں۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ○ (البقرہ ۲: ۹)

''وہ فریب دیتے ہیں اللہ اور اہل ایمان کو اور حقیقت میں وہ اپنے آپ ہی کو فریب دیتے ہیں لیکن انہیں شعور نہیں ہے۔''

یہ بصیرت افروز حقیقت اللہ کی حمایت و نصرت ہے ــــ مظلوم اور بے کس کو اللہ بے سہارا ہرگز نہیں چھوڑتا، اللہ خود مظلوم کی حمایت کرتا ہے اور جس کی پشت پناہی اور حمایت اللہ تعالیٰ خود کر رہا ہو، اس کی فتح و کامیابی میں وہی شک کر سکتا ہے جو ایمان سے محروم ہو ــــ پھر جس کی فتح و کامرانی اس قدر واضح اور یقینی ہو، اس کی حمایت میں حق کا اظہار کرنے سے بھی کترانا اور رات کو رات کہنے کی بھی جرأت نہ کرنا حکمت و مصلحت نہیں، بزدلی ہے، اخلاقی جرأت سے محرومی ہے، ضعفِ فکر و نظر اور ضعفِ ایمان کی بیماری ہے۔ اقتدار کے نشے میں بدمست ظالم اور جابر کی

نگاہ سے اگر یہ حقیقت اوجھل ہے تو وہ معذور ہے۔ لیکن عام دانشورانِ ملک خواہ وہ کسی گروہ اور طبقے سے تعلق رکھتے ہوں ان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ روئے زمین کا کوئی حصہ ہو طاقت و اقتدار کا اصل مالک اللہ ہے۔ یہاں اصلاً اسی کی مرضی چلتی ہے، اسی کا حکم نافذ ہوتا ہے اور جو وہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جب وہ انتقام لینے پر آتا ہے تو انتقام صرف اس ظالم اور سفاک سے ہی نہیں لیتا جس کے ہاتھ مظلوم کے خون سے رنگے ہوئے ہیں اور جس کے دامن پر ظلم و بربریت کے داغ ہی داغ ہیں بلکہ وہ ان لوگوں کا بھی گریبان پکڑ لیتا ہے جو حق اور ناحق کو جانتے بوجھتے حق کا اظہار زبان سے نہیں کرتے اور یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتے کہ ظلم کا سلسلہ روک دو۔ اللہ کے بندوں پر ظلم کرنے اور ان کے خون سے ہولی کھیلنے کا موقع تمہیں ہرگز نہیں دیا جائے گا۔ یہ خاموشی، سنجیدگی نہیں ظلم پر یک گونہ رضا مندی ہے۔ یہ حکمت و مصلحت نہیں ظالم سے مرعوبیت ہے۔ سیاسی شعور نہیں بلکہ خوف، بزدلی ہے کہ کہیں اس کشاکش میں کوئی کانٹا ان کے پاؤں میں نہ چبھ جائے۔

مسند احمد میں ایک حدیث قدسی ہے جس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

''مجھے میری عزت اور میرے جلال کی قسم یقیناً میں ظالم سے انتقام لے کر رہوں گا اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور اس سے بھی ضرور انتقام لوں گا جس نے کسی مظلوم کو (بے بسی کی حالت میں دیکھا) اور قدرت رکھنے کے باوجود اس کی مدد نہیں کی۔''

ملک کے کسی حصے میں ظلم ہو رہا ہو، ظالم دندنا رہے ہوں تو دیس کے ہر باشندے کا یہ فرض ہے کہ وہ ملک وقوم کی بھلائی میں حق کا اظہار کرے اور کھل کر بتائے کہ فساد، ظلم و بربریت، بے انصافی اور زیادتی سے پوری قوم کی ساکھ گرتی ہے۔ قومی اور ملکی مفادات کا نقصان ہوتا ہے اور ملک وقوم ترقی کی بجائے انحطاط کا شکار ہوتی ہے۔ یہ ملک ہر اس شخص کا ہے جو یہاں بستا ہے اور یہاں کی نعمتوں سے مستفیض ہوتا ہے۔ اس ملک کا سنوارنا، بنانا اور اس کو ترقی کی راہ پر گامزن رکھنے میں اپنے حصہ کی ذمہ داریوں کو شعور کے ساتھ ادا کرنا صرف ملکی فریضہ ہی نہیں بلکہ دینی فریضہ بھی ہے۔ یہ ملک تباہی کی طرف جائے گا تو ہم بھی تباہ ہوں گے۔ ملک تباہ ہوگا تو ہمیں تباہی سے بچانے والی کوئی چیز نہ ہوگی۔ اللہ نے اپنے منصوبے کے تحت ہمیں اس ملک میں بسایا ہے اور فہم و شعور کی صلاحیتوں سے نوازا ہے تو اس لیے کہ جہاں ہم رہ رہے ہیں وہاں کے اچھے برے کو پہچانیں، اس سے تعلق رکھیں اور ملک کو اچھائیوں، بھلائیوں اور تعمیر و ترقی کی راہ پر لگائے رکھنے میں سنجیدگی اور اخلاص کے ساتھ اپنے حصے کے فرائض انجام دیں۔

یہ یقینی حقیقت ہر ایک کے سامنے ہمہ وقت رہنی چاہیے کہ ظلم کی عمر بہت قلیل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ظلم و بربریت کا ننگا ناچ انسانی بستی کے لیے معمول کی حالت نہیں ہے۔ حادثے کی حالت ہے اور حادثہ وقتی اور ہنگامی

ہوتا ہے۔ چاہے کتنا ہی بڑا ہو اور اس سے انسانی بستی میں کتنا ہی شور و ہنگامہ برپا ہو۔ معمول کے حالات کے خلاف ہنگامی حالات کی عمر برسات کی لہلہاتی گھاس سے بھی کم ہوتی ہے پھر یہ حقیقت بھی نظر انداز کر دینے کی نہیں ہے کہ مظلوموں پر جبر و تشدد کرنے والے اور انسانی خون بہانے والے سماج کے تھوڑے سے لوگ ہوتے ہیں۔ سارے انسان اس ظلم و بربریت کو نہ چاہتے ہیں نہ اس میں ملوث ہوتے ہیں۔ مگر چونکہ یہ انسانی بستی کی فطرت کے معمول کے خلاف واقعہ ہوتا ہے اس لیے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پوری بستی اس میں مبتلا ہے۔ ظلم و بربریت اور جبر و تشدد کا شور و غوغا اس لیے بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو نہ چاہنے والے بھی اس کے خلاف زبان کھولنے کی ہمت نہیں کرتے۔ لیکن جرأت و ہمت سے محروم اکثریت دل سے ظالم اور ظلم کی حامی ہرگز نہیں ہوتی۔ وہ بھی ظالموں کے ظلم سے بیزار ہوتے ہیں اور امن و سکون کے خواہشمند ہوتے ہیں۔

امن پسند اور ملک و قوم کے بہی خواہوں کا فرض یہ ہے کہ وہ اخلاقی جرأت سے کام لیں اور جب کسی طرف سے اللہ کے مظلوم بندوں کی آہ و کراہ کی آوازیں سنیں اس سے پہلے کہ وہ انہیں مدد کے لیے پکاریں اور اپنی آہ و بکا سے عرش الٰہی میں زلزلہ پیدا کریں سنجیدہ دانشور اور اخلاقی ہمت رکھنے والے ملک کے باشندوں کا کام یہ ہے کہ وہ بڑھ کر ظالم کا ہاتھ روک دیں مظلوم کی حمایت و نصرت میں آواز اٹھائیں۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ مظلوم کی آہ و فریاد اور ردو قبولیت کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا، اللہ تو بہر حال مظلوم کی پشت پر ہے، مظلوم کی کامرانی اور سرخروئی بہر حال مقدر ہے۔ اللہ کی تقدیر کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ مظلوموں اور بے کسوں کا حامی اور ناصر اللہ ہے اور اللہ جس کی حمایت اور نصرت پر ہو، اس کی فتح و کامرانی سورج سے زیادہ حقیقی ہے۔ مظلوم تو یقیناً فتح یاب ہو کر ابھرے گا، جو لوگ ان کی حمایت میں اظہار حق کی جرأت کریں گے یہ ان کے لیے باعثِ سعادت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فیصلوں کے نفاذ میں کسی کی مدد کا محتاج نہیں۔ جو لوگ مظلوموں اور مجبوروں کی حمایت میں اظہار حق کی سعادت سے محروم ہوں ان کی محرومی واقعی قابل افسوس ہے۔ ورنہ مظلوموں کی فتح و کامرانی کا جہاں تک تعلق ہے اس کے لیے تو اللہ تعالیٰ کافی ہے۔ اور جس کی پشت پر اللہ ہو اس کی ناکامی کا تصور بھی کفر ہے۔

اس اصولی گفتگو کو کسی خاص ملک، کسی خاص قوم، کسی خاص نسل اور مذہبی گروہ کے پس منظر میں پڑھنے اور سوچنے کی غلطی ہرگز نہ کیجیے۔ یہ تنگ نظری اور تعصب اپنے ساتھ بھی بدخواہی ہے اور انسانیت کے ساتھ بھی، انسانیت کے تقاضے اور اجتماعی اخلاقی قدریں انسانیت کی عام میراث ہیں۔ ان پر کسی قوم اور مذہب کی اجارہ داری نہیں ہوتی۔ انصاف کو کسی طبقے اور گروہ سے مخصوص کرنا اور کسی کو اس سے محروم رکھنا بدترین انسانی اور اخلاقی جرم بھی ہے اور اپنے ساتھ بدخواہی بھی۔ اخلاقی قدریں سب کے لیے یکساں ہیں۔ اور زمین کے سینے پر اسی وقت امن و امان اور عدل و قسط کا قیام ممکن ہے جب سارے انسانوں کو ایک ہی نظر سے دیکھنے والے عزت و اقتدار کے

مسند پر متمکن ہوں۔ اللہ کی نظر میں سارے انسان برابر ہیں، سارے انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں ـــــ کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں۔ سوائے اس کے کہ کون سب سے زیادہ اپنے خالق و مالک کی مرضی پوری کرنے والا ہے۔ اور خالق و مالک کی مرضی یہ ہے کہ روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کے ساتھ حسن سلوک ہو، ہر ایک کے ساتھ ہمدردی ہو، ہر ایک کے حق کی حفاظت ہو اور کوئی کسی پر زیادتی اور ظلم نہ کرنے پائے۔ ظلم اور ظالم انسانیت کے مشترکہ دشمن ہیں۔ ظلم کرنے والا ظالم کسی بھی نسل، کسی بھی طبقے اور کسی بھی مذہبی گروہ سے تعلق رکھتا ہو قابل مذمت، قابل نفرت ہے۔ اور اس کو ظلم سے باز رکھنا ہر باشعور دردمند فرد اور گروہ کا فرض ہے۔

مظلوم خواہ کسی طبقے سے ہو، کسی نسل سے ہو اور کوئی بھی مذہب رکھتا ہو، قابل رحم ہے۔ قابل ہمدردی ہے۔ اور اس لائق ہے کہ اس کو ظلم سے نجات دلانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے ظلم کے خلاف آواز اٹھانا تو اس فریضے کا ابتدائی تقاضا ہے۔ مطلوب یہ ہے کہ تمام تعصبات سے بالاتر ہو کر خالص انسانی تقاضے کے تحت اس کو ظلم سے نجات دلائی جائے اور ظالم کو ایسی سزا دی جائے کہ ہمیشہ کے لیے اس کے ہاتھ ٹوٹ جائیں ـــــ یہ انسانیت کا بھی تقاضا ہے، اخلاق کا بھی تقاضا ہے اور مذہب کا بھی۔ اس تقاضے سے غفلت انسانیت سے دشمنی ہے، وطن سے دشمنی ہے اور مذہب سے سرکشی ہے، خواہ آپ کوئی بھی مذہب رکھتے ہوں۔ اور آخر کار یہ روش اپنے ساتھ بھی بدترین دشمنی ہے۔



# مطالعہ قرآن کیوں اور کس طرح؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن اس لیے نازل کیا ہے کہ اس کو سمجھ کر پڑھا جائے اس میں غور کیا جائے اور اس سے نصیحت حاصل کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَ لِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○ (ص ۳۸:۲۹)

''یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے محمد ﷺ) ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل وفکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔''

بعض لوگ جو عربی زبان اور اس کی ادبی لطافتوں سے واقف ہیں وہ تو براہ راست اس میں غور کرتے ہیں اور بعض جو عربی زبان نہیں جانتے وہ ترجموں اور تفسیروں کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور بجا طور پر اپنے اس حسنِ عمل پر مسرور وشاداں ہوتے ہیں کہ ہم اللہ کی کتاب کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ بعض اوقات زبردست غلطی کرتے ہیں، شعوری طور پر کرتے ہیں یا غیر شعوری طور پر، یہ تو اللہ ہی جانتا ہے مگر اس غلطی کی وجہ سے وہ قرآن کے فیض سے محروم رہتے ہیں۔ اور ہدایت کی کتاب پڑھنے کے باوجود ہدایت سے تہی رہتے ہیں۔

دراصل قرآن سمجھ کر پڑھنے والے یہ معلومات ضرور رکھتے ہیں۔ یا حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن پاک جس وقت نازل ہورہا تھا۔ اس وقت قرآن کے بہت سے مخاطب گروہ تھے، مشرکین تھے، منافقین تھے، یہود و نصاریٰ تھے، اہل ایمان تھے اور کچھ وہ لوگ تھے جو اطاعت گزار تو بن گئے تھے لیکن ایمان سے خالی تھے۔ یہ معلومات بعض اوقات فائدہ بخش ہونے کی بجائے نقصان رساں ہوجاتی ہیں اور حق وہدایت سے فیضیاب ہونے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ ''اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی'' یہ معلومات رکھنے والا ان معلومات ہی کی وجہ سے ان ہدایات سے خود کو محروم کرلیتا ہے، جن کو قرآن میں پڑھتا اور سمجھتا ہے۔ لیکن یہ سوچ کر اپنی ذات کو ان ہدایات سے اوٹ میں کرلیتا ہے کہ یہ آیت تو فلاں گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ آیت تو فلاں گروہ کی شان میں ہے، اس آیت میں تو مشرکین کا تذکرہ ہے، اس آیت میں تو منافقین کا حال بیان کیا گیا ہے، اس آیت میں تو فلاں گروہ

کو تنبیہ کی گئی ہے۔ اس آیت میں فلاں گروہ کا انجام بیان کیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح وہ قرآن کے بہت بڑے حصے کو اپنی ذات سے غیر متعلق کر کے اپنے لیے بے فیض بنا لینے کا زبردست جرم کرتا ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ یہ جرم اور غلطی برابر کرتا رہتا ہے۔ مگر وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ قرآن کو سمجھ کر پڑھتا ہے۔ مختلف ترجموں اور تفسیروں کی روشنی میں غور و تدبر بھی کر رہا ہے اور بہر حال قرآن میں غور و تدبر مسلمان کے لیے زبردست سعادت ہے، مگر یہ خوش فہمی اور زعم اس کے حق میں قرآن کریم سے فیضیابی کی راہ میں حجابِ اکبر ثابت ہوتا ہے اور وہ پڑھنے سمجھنے کے باوجود ہدایت یابی سے محروم رہتا ہے۔

بلا شبہ ہم مؤمن ہیں، مسلم ہیں، کفر و شرک، نفاق و عصیان سے ہمیں نفرت ہے، مگر جب قرآن میں کافرین اور مشرکین کے مشرکانہ اور کافرانہ اعمال کا تذکرہ ہو رہا ہو، جب منافقین کی عہد شکنی اور منافقانہ اعمال کا تذکرہ ہو رہا ہو، جب کسی گروہ کی نافرمانی، عصیان اور سرکشی کا بیان ہو رہا ہو، جب منافقین کے انجام بد کا تذکرہ ہو رہا ہو، جب جہنم میں لے جانے والے معاصی کا تذکرہ ہو رہا ہو، جب ایسے گروہوں کو تنبیہ کی جا رہی ہو جو حق کو پا لینے کے بعد حق سے محروم ہو رہے ہوں، یا حق کا دعویٰ کرنے کے باوجود آگے بڑھ کر حق کو قبول کرنے کی بجائے حق کی مخالفت کر رہے ہوں، تو ان آیات کو مختلف گروہوں پر چسپاں کر کے آگے بڑھ جانے اور ذہن کو جھٹکا دے کر سوچنے اور جائزہ لینے کے بوجھ سے ہلکا کر لینے کی تباہ کن غلطی کرنے کی بجائے رک کر سنجیدگی سے ان برے اعمال اور برے کرداروں کے خدوخال پر غور کرنا چاہیے اور پھر اس آئینے میں بے لاگ انداز میں اپنے سراپا کا جائزہ لے کر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہمیں اپنے عیوب سے واقف ہونے اور اپنے کردار کو پاک و صاف کرنے کا موقع ملا۔ یہ بالکل ناممکن ہے کہ ایک مؤمن اور مسلم اپنی غفلت، لاپروائی یا جذبات کے دباؤ اور نفس کی ہوا پرستی کے نتیجے میں ان اعمال کا ارتکاب کر بیٹھے، جو کافرانہ، مشرکانہ، منافقانہ اعمال ہیں اور جن کا کوئی جوڑ ایمان و اسلام سے نہیں ہے۔

اس طرح سوچنے کی اگر ہم عادت ڈالیں اور قرآن پر سوچنے کا یہ انداز اختیار کریں تو قرآن پاک کا کوئی حصہ اور کوئی آیت ہم سے غیر متعلق نہ ہوگی۔ ہر حصہ ہمارے لیے ہوگا اور ہر آیت کو ہم اپنا مخاطب سمجھیں گے اور پورے قرآن کا خطاب ہی ہم سے ہوگا۔

یہ زبردست نادانی، افلاسِ فکر، بے بصیرتی اور اپنے نفس پر بدترین ظلم ہے کہ ہم قرآن کے بڑے حصے کو دوسروں پر منطبق کر کے خود کو اس کے فیض ہدایت سے محروم کر لیں اور جب پڑھنے اور سمجھنے بیٹھیں تو یہ کہتے چلے جائیں کہ یہ منافقین کے بارے میں ہے، یہ مشرکین کے بارے میں ہے' یہ منافقوں کا بیان ہے، یہ یہود سے متعلق ہے اور یہ نصاریٰ سے' یہ مدینے کے ان بدوؤں سے خطاب ہے —— جن کے دلوں میں ابھی ایمان داخل نہیں ہوا تھا۔

سوال یہ ہے کہ قرآن کا ایک بہت بڑا حصہ جب دوسروں کے لیے ہے تو ہمارا تذکرہ کہاں ہے، کن آیات کا تخاطب ہم سے ہے اور وہ کون سی آیات ہیں جو ہمارے لیے ہیں، کیا وہ آیات جہاں یہ ذکر ہے کہ اللہ کو ان مجاہدین پر پیار آتا ہے جو اس کی راہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں یا وہ آیات ہماری شان میں ہیں جہاں کہا گیا ہے کہ راہ حق میں شہید ہونے والے اللہ کے حضور اللہ کے انعام وفضل پر خوش وخرم ہیں اور وہاں رزق پا رہے ہیں، یا ان آیات میں ہمارا ذکر ہے جو راہِ حق میں جان و مال قربان کرنے کے بعد اللہ کی رضا کا پروانہ پا کر جنت کے سدا بہار باغوں میں مسندوں پر جلوہ افروز ہیں، آخر اللہ کی اس کتاب میں کہاں ہمارا تذکرہ ہے۔ یا ہمارا تذکرہ ان آیتوں میں ہے جہاں ہمارے رب نے ہمیں پکار کر کچھ احکام دیئے ہیں، کیا ہمارا رب وہ ہے جو صرف قانون اور احکام دینے والا ایک حکمران ہے اور اس سے ہمارے تعلق کی بس یہی نوعیت ہے۔

اگر ہمارا خیال یہ ہے کہ جن آیات میں اللہ نے تقویٰ کا حق ادا کرنے والوں، اس کی راہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح صف بستہ جہاد کرنے والوں اور جان و مال سب کچھ قربان کرنے والوں کی فدا کاری کا اعتراف اور تعریف ہے وہ ہمارا تذکرہ ہے تو ہم زبردست غرورِ نفس میں مبتلا ہیں اور یہ پندار تقویٰ انتہائی ہلاکت خیز ہے صحیح بات یہ ہے کہ قرآن کی ہر ہر آیت ہم ہی سے مخاطب ہے، پورا قرآن ہماری ہدایت کے لیے ہے۔ سارے قرآن میں ہمارا ہی تذکرہ ہے اور کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں جس کو ہم بس دوسروں پر منطبق کر کے مطمئن ہو جائیں کہ ہم نے قرآن کا حق ادا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ (سورۃ الانبیاء ۲۱:۱۰)

''لوگو! ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے، جس میں تمہارا ہی ذکر ہے، کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔''

یعنی اس میں تمہارا ہی حال بیان کیا گیا ہے، تمہارے ہی معاملاتِ حیات، تمہاری ہی فطرت، مزاج، ساخت اور آغاز وانجام پر گفتگو ہے، انسانی نفسیات، سیرت کردار اور اخلاق کے اچھے اور برے پہلو بیان کیے گئے ہیں اور ہر جگہ تمہیں مخاطب کر کے اچھے کردار اپنانے اور برے کردار اور بدانجامی سے بچنے کی تاکید و وصیت کی گئی ہے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کیا اچھی بات کہی ہے ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

دراصل ایمان و اسلام کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ ایک بار آدمی زبان سے کہہ دے کہ میں مؤمن اور مسلم ہوں اور بس پھر جو چاہے کرے وہ مؤمن و مسلم ہے، مؤمن اور مسلم دو نام نہیں ہیں کہ رکھ لیے جائیں بلکہ یہ کرنے کے

کام ہیں ایمان لانا پڑتا ہے، اسلام لانا ہوتا ہے اور بار بار ہر لمحہ یہ تقاضا سامنے آتا ہے کہ اسلام لاؤ۔ اسلام لانے والے کو قدم قدم پر فیصلہ کرنا ہوگا کہ میں کیا کروں کیا نہ کروں؟ کیا کروں کہ میں اسلام لانے والے مسلموں میں شمار کیا جاؤں۔ اور کیا کروں کہ میرا اسلام محفوظ رہے، ہر لمحہ یہ فکر، یہ اضطراب، یہ فیصلہ، یہ انتخاب، یہ اقدام، یہ اجتناب اور یہ ترک واختیار ناگریز ہے اسلام پر باقی رہنے اور غیر اسلام سے بچنے کے لیے اور ہر آنے والی گھڑی میں یا آپ اسلام کے رخ پر بڑھ رہے ہیں، یا کفر ونفاق کے رخ پر، اس لیے کہ زندگی نام ہے مسلسل حرکت کا یا اجتناب کا، ترک واختیار کا، رد یا قبول کا اور یہی عملی فیصلے طے کرتے ہیں کہ آپ اسلام لا رہے ہیں یا غیر اسلام کی طرف جا رہے ہیں۔

اور سوچیں کہ نفاق کا یہ روگ آپ کے ایمان واسلام کے خلاف خاموش یلغار تو نہیں کر رہا ہے۔ آپ کے فکر وعمل میں کوئی ایسی برائی تو پیدا نہیں ہوگئی ہے۔ اور پھر کوشش میں لگ جائیں کہ آپ کا ایمان نفاق کے روگ سے محفوظ رہے۔ نفاق ایمان کا بدترین دشمن ہے، دبے پاؤں آتا ہے اور نہایت عیاری سے وار کرتا ہے۔ آدمی کو احساس نہیں ہوتا مگر وہ اس ظالم کا شکار ہو چکا ہوتا ہے۔ فکر وعمل کے بہت سے پہلوؤں میں اسی کی نمائندگی کر رہا ہوتا ہے۔ لیکن زبان سے نفاق کی برائی کرتے نہیں تھکتا۔ اس چھپے دشمن کے حملوں کے اثرات کا بصیرت کی خوردبین سے جائزہ لینا چاہیے اور اپنے ساتھ خیر خواہی کرتے ہوئے اپنی ذات اور اپنے خاندان ومعاشرے پر فکر وتشویش کی نگاہ ڈالنی چاہیے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ بہت سی منافقانہ خصلتوں کو لا پروائی سے برداشت کر رہے ہوں، بہت سی برائیوں سے سمجھوتا کر رکھا ہو اور بہت سی برائیوں کو تاویلوں اور بہانوں سے ناخوب کی فہرست سے خارج کر کے بتدریج خوب بنالیا ہو، قول وعمل کا تضاد، نفاق کی ایک ابھری ہوئی بیماری ہے۔ برائیوں پر اکسانا، برائیوں کو رواج دینا اور بھلائیوں کی راہ مارنا منافقین کا محبوب مشغلہ ہے، ان کے معاشرے میں ایک دوسرے سے دل پھٹے ہوتے ہیں۔ یہ بغض وکدورت اور ایک دوسرے کے خلاف نفرت وتحقیر کے جذبات کے روگی ہوتے ہیں۔ بڑھ بڑھ کر دعوے کرتے ہیں مگر وقت آنے پر دین کی راہ میں کوئی حبہ خرچ کرتے ہوئے ان کا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ اور کوئی پھانس برداشت کرنے کی ہمت وحوصلہ نہیں ہوتا، یہ اللہ اور رسول کا نام تو لیتے ہیں لیکن تعلقات اور مالی معاملات میں خاص طور پر یہ اپنے نفس اور خواہشات کے بندے ہوتے ہیں، یہ دین کا نام تو لیتے ہیں لیکن دنیوی امور میں بدترین دنیا داروں سے بہت آگے ہوتے ہیں۔ بطورِ مثال یہ چند موٹی موٹی خرابیاں قرآن کی روشنی میں یہاں سامنے لائی گئی ہیں، بے لاگ جائزہ لیجئے اپنا بھی، اپنے خاندان کا بھی اور اپنے مسلمان معاشرے کا بھی، آپ کس مقام پر کھڑے ہیں اور پھر سوچیے کہ منافقین کے اعمال واخلاق پر تبصرہ کرنے والی آیات آپ سے خطاب کر رہی ہیں یا نہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ قرآن کے ہر ہر حصے کا خود کو مخاطب بنائے بغیر آپ قرآن پڑھیں

گے تو نہ قرآن کے ساتھ انصاف کر سکیں گے اور نہ اپنے ساتھ اور قرآن میں غور و تدبر کا یہ انداز آپ کو قرآن سے دور تو کر سکتا ہے، قریب نہیں کر سکتا اور ہرگز اس خوش فہمی میں نہ رہیں کہ آپ قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کا حق ادا کر رہے ہیں۔ آپ قرآن فہمی کی چاشنی ہرگز نہیں پا سکتے۔

قرآن کو پڑھنے سمجھنے اور اس سے ہدایت پانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ ہر ایک آیت کو اپنے سے متعلق سمجھیں، ہر آیت کا مخاطب اپنی ذات کو بنائیں اور یہ تصور کریں کہ اللہ نے یہ آیت میرے لیے ہی نازل کی ہے اور دوسروں پر منطبق کر کے سکون محسوس کرنے کی عادات چھوڑ کر اس کو اپنی ذات پر منطبق کرنے کی عادت ڈالیں، تو آپ دیکھیں گے کہ کہیں مؤمنین کا سراپا بیان کیا جا رہا ہے، اپنا جائزہ لیں اور قرآن کے دیئے ہوئے سانچے میں خود کو ڈھالنے کے لیے ذوق و شوق اور ولولے کے ساتھ لگ جائیں۔ کہیں رذائل اخلاق اور اہل جہنم کے کرتوت بیان کیے جا رہے ہوں گے، اللہ سے توبہ کریں اس کی پناہ ڈھونڈیں، باریک بینی سے اپنا بے لاگ جائزہ لیں اور اس قسم کا کوئی بھی داغ دھبا اپنے دامنِ ایمان و اسلام میں پائیں تو اس کو صاف کرنے میں لگ جائیں اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی عادت ڈالیں، دنیا والوں کو تو آدمی حیلوں اور تاویلوں سے بھی مطمئن کر دیتا ہے۔ کہیں اہل کفر و شرک کے انجامِ بد اور ان کے عذاب کا لرزہ خیز نقشہ کھینچا جا رہا ہوگا، ایسے موقع پر آپ کا دل لرزنے لگے، آنکھیں اشک بار ہو جائیں چہرے پر اللہ کی ہیبت و جلال کے آثار نمایاں ہوں اور آپ اپنے رب کے حضور گڑگڑائیں کہ پروردگار تو اس انجامِ بد سے مجھے محفوظ رکھ، کہیں مؤمنین صادقین کے نیک انجام اور آخرت کی ابدی اور بے مثال نعمتوں اور آسائشوں کا ذکر ہوگا۔ آپ رک کر اللہ سے دل کی گہرائیوں سے دعا مانگیں کہ پروردگار مجھے بھی ان میں شامل فرما۔ کہیں یَاۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کہہ کر پکارا جا رہا ہوگا، آپ یونہی آگے نہ بڑھ جائیں بلکہ رک کر سوچیں کہ کون پکار رہا ہے، میرا رب شہنشاہِ کائنات، مالکِ کل پکار رہا ہے، مجھے پکار رہا ہے اور مجھے ایمان والا کہہ کر پکار رہا ہے، خوشی سے جھوم اٹھیں اور دل کی زبان سے رب کو جواب دیں پروردگار تو مجھے ایمان والا کہہ کر پکار رہا ہے، تجھے میرے ایمان کا اعتراف ہے، تو اگر مجھے ایمان والا مان لے تو یہی تو میری معراج ہے یہی تو میری منتہائے تمنا ہے، مجھے تو سب کچھ حاصل ہو گیا۔ تو نے مجھے ایمان والا تسلیم کیا ہے تو اب میں دل و جان سے ایمان کا ہر تقاضا پورا کروں گا اور میں ہرگز ان لوگوں میں سے نہ ہوں گا جو بڑھ چڑھ کر دعوے تو کرتے ہیں لیکن عمل میں بودے ثابت ہوتے ہیں، کہیں منافقین کا کردار ان کے رذائلِ اخلاق کا بیان ہوگا، آپ سنجیدگی سے اپنے اخلاق و معاملات اور شب و روز کا جائزہ لیں اور ایک ایک روگ کو دشمن کی طرح پکڑ کر تہ تیغ کرنے کی کوشش کریں۔ منافقین کا لفظ پڑھ کر بے پروائی سے آگے نہ بڑھیں، بلکہ ایک ایک برائی کو رک رک کر پڑھیں۔ قرآن میں بار بار مختلف انداز اور مختلف پیکروں میں، حق و باطل، نیکی و بدی، کفر و اسلام، اخلاص و نفاق، توحید و شرک، اتباع و سرکشی، خود شناسی اور

خود فراموشی، احسان مندی اور ناشکری، خداشناسی اور خدا بیزاری، آخرت پسندی اور آخرت فراموشی، رذائلِ اخلاق اور فضائل اخلاق، حسنِ معاملہ اور بد معاملگی، حسنِ کردار اور بدکرداری، پاکیزگی اور گندگی، عالی ظرفی اور رذالت اور دیانت وخیانت انہی اعمال اور اقدار کا باہمی ٹکراؤ، کشاکش اور آویزش نظر آئے گی اور جب تک آپ کے سینوں میں دل دھڑک رہے ہیں، آنکھوں میں دم ہے، دماغ میں سوچنے سمجھنے کی توانائی ہے اور جسم میں ترک و اختیار کی قوت وقدرت ہے، ہر ہر قدم اور ہر ہر موڑ پر آپ کے ایمان واسلام کی آزمائش ہے اور اس ازلی جنگ میں تسلسل کے ساتھ جاری ہے اور رہتی دنیا تک جاری رہے گی۔ آپ برابر امتحان گاہ میں ہیں اور آپ کو شعور ہو یا نہ ہو، آپ اپنا رول ادا کر رہے ہیں اور عالم الغیب والشہادۃ برابر آپ کے بارے میں صادر فرما رہے ہیں اور آپ کی تگ ودو کو نگاہ میں رکھ کر مختار کل آپ کے دل کو اپنی چٹکی سے اپنے علم وحکمت کے تحت برابر ادھر ادھر پھیر رہا ہے اور قلب کے یہ انقلابات آپ کی زندگی اور آپ کی روح اور دماغ پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے:

يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ (ترمذی' کتاب القدر' باب ۷' ص ۱۸۶۶)

''اے دلوں کے پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر جما دے۔''

تو ہم لوگوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ہم آپ پر ایمان لائے اور جو دین آپ لے کر آئے اس پر ایمان لائے کیا آپ کو ہمارے بارے میں بھی خوف ہے۔ (کہ ہم پھر جائیں گے) ارشاد فرمایا:

نعم ان القلوب بين اصبعين من اصابع الرحمن يقلبها كيف يشاء (مسند احمد جلد ۳ ص ۱۷۳)

''جی ہاں! بلاشبہ انسانی قلوب رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں میں ہیں، وہ جدھر چاہتا ہے ان کو پھیرتا رہتا ہے۔''

یعنی ہر انسان اور ایمان واسلام کا دعویٰ کرنے والا ہر شخص اس نازک موڑ پر کھڑا ہے کہ اس کے افکار و جذبات، اعمال وحرکات اور شب وروز کی تگ ودو کے پیش نظر اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں اپنے فیصلے صادر فرماتا رہتا ہے اور یہ فیصلہ اس کے فکر وعمل کے لحاظ سے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس نازک ترین مقام پر ہونے کا احساس و شعور رکھنے والا کیا آسانی کے ساتھ مطالعہ قرآن کے دوران یہ کہتے ہوئے بیا کانہ آگے بڑھ سکتا ہے کہ فلاں آیت فلاں گروہ کے بارے میں ہے اور فلاں آیت فلاں گروہ کے بارے میں اور فلاں آیت فلاں گروہ کی شان میں ہے اور فلاں آیت میں فلاں گروہ کا انجام بد بیان کیا گیا ہے۔ فلاں آیت میں یہود ونصاریٰ کی بدعنوانیاں بیان کی گئی ہیں اور فلاں آیت میں نصاریٰ کی گمراہیاں —— یا اسے سب سے زیادہ اپنی فکر دامن گیر ہوگی۔

دراصل قرآن میں جس جس کردار کا بھی ذکر ہے اور کردار کی جس جس خامی اور برائی یا اچھائی اور بھلائی کا

تذکرہ ہے یہ کردار بھی اور کردار کی یہ برائی اور اچھائی بھی ہر دور میں پائی گئی ہے اور پائی جاتی رہے گی' کوئی کردار یا کردار کی کوئی برائی کسی دور کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، ہر کردار ہر دور میں پایا جاتا ہے اور کردار کی ہر برائی ہر دور میں پائی جاتی ہے اسی طرح کردار کی ہر بھلائی ہر دور میں پائی جاتی ہے اور آدمی تادمِ واپسیں برابر امتحان گاہ میں ہے۔ اس تصور اور یقین کے ساتھ قرآن کا مطالعہ اور قرآن میں غور وفکر ہی کے ذریعے انسان قرآن سے فیض ہدایت پا سکتا ہے اور ایسے مطالعہ ہی سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ آدمی قرآن سے وہ نورِ حق پا سکے گا جس کے لیے قرآن کا نزول ہوا ہے۔



# سلام کی اہمیت وافادیت

سلام کے سلسلے میں حضور اکرم ﷺ نے جو دوسرے فضائل ارشاد فرمائے ہیں۔ ان میں ایک بہت ہی اہم بات جو سلام میں پہل کرنے کی اہمیت کے بارے میں ہے۔ وہ یہ ہے کہ سلام میں پہل کرنا تکبر کا علاج ہے۔ اور تکبر نفس کی ایک ایسی خوفناک بیماری ہے کہ بھلائی اور اچھائی کا کوئی عمل بھی تکبر کے بعد اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت کے قابل نہیں رہتا۔ تکبر اپنے آپ کو بڑا سمجھنے اور دوسروں کو حقیر تصور کرنے کا نام ہے۔ تکبر کی یہ بیماری جب کسی کو لاحق ہوتی ہے تو وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا خیال کرنے لگتا ہے۔ اور اپنے رتبے اور مقام و منصب کی بنیاد پر اس زعم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ ہر کوئی اسے سلام کرے۔ کیونکہ وہ بڑا ہے اور یہ اس کی بڑائی کا حق اور خراج ہے کہ اسے سلام کیا جائے۔ تکبر کی اسی روحانی بیماری کو روکنے کے لیے حضور اکرم ﷺ نے سلام میں پہل کرنے کو تکبر کا علاج قرار دیا ہے۔

لہٰذا جو شخص بھی سلام کرنے میں پہل کرتا ہے وہ جہاں اجر و ثواب میں اعلیٰ و ارفع درجات حاصل کرتا ہے وہیں غرور و تکبر کی اس بیماری سے بھی اپنے آپ کو محفوظ کر لیتا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ برائی ہے۔ سلام میں پہل کرنا اجر و ثواب میں بھی زیادہ ہے۔ پھر سلام ایک تحفہ اور ہدیہ ہے کہ جو ایمان والے آپس میں ایک دوسرے کو دیتے ہیں۔



# قرآن کو سمجھ کر پڑھیے

دنیا میں قرآن ہی وہ واحد کتاب ہے جو سب سے زیادہ پڑھی پڑھائی جاتی ہے اور اسی مناسبت کا نام ''قرآن'' ہے، یعنی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب، قرآن دراصل مبالغہ کا مصدر اور مفعول کے معنی میں ہے، مراد یہ ہے کہ وہ کتاب ہے، جو دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی گئی اور پڑھی جاتی ہے اور پڑھی جائے گی۔ کروڑوں انسان صرف ناظرہ پڑھنے والے ہیں، جو لوگ دوسری زبان کے ہیں وہ بھی اس کو کلام الٰہی سمجھ کر عقیدت سے پڑھتے ہیں اور مشقت کے ساتھ اٹک اٹک کر پڑھتے ہیں، مگر اس عمل کو عبادت جان کر کرتے ہیں، لاکھوں ہیں جو اس کو یاد کرتے ہیں اور پڑھتے ہیں، رمضان کے مبارک مہینوں میں دنیا کے ہر خطے میں رات کی تراویح میں حفاظ اس کو دل بستگی اور خوش الحانی سے پڑھتے ہیں اور کروڑوں لوگ دل بستگی اور خوش عقیدگی کے ساتھ سنتے ہیں، جو اس کی مختلف تفسیریں پڑھتے ہیں' اس کے الفاظ کے معانی پر غور کرتے ہیں' اس کے مفہوم میں فکر و تدبر کرتے ہیں، لاکھوں ہیں جو اس کے علوم و معارف میں غرق رہتے ہیں کروڑوں ہیں جو اس کو خوش الحانی اور ترتیل و تجوید سے پڑھتے ہیں غرض دنیا کے گوشے گوشے میں قرآن حکیم کے پڑھنے کا جو اہتمام ہوتا ہے وہ دنیا کی کسی کتاب کا نہیں ہوتا۔

قرآن پڑھنے پڑھانے کی بات جب کی جاتی ہے تو اصلاً اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ سمجھ کر پڑھا پڑھایا۔ اس لیے کہ یہ محض وظیفے کی کتاب نہیں ہے بلکہ ہدایت اور احکام کی کتاب ہے اور یہ اسی لیے نازل ہوئی ہے کہ لوگ اس کی تعلیمات کو سمجھیں ان پر ایمان لائیں اور اس کے احکام کی تعمیل کر کے اس کی روشنی میں اپنی زندگی کی تعمیر کریں یہ بات ان تعلیمات اور احکام کو سمجھے بغیر ممکن نہیں۔

البتہ ایک بات نہایت وضاحت وصراحت کے ساتھ قطعی طور پر ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس کو یہ امتیازی مقام حاصل ہے کہ محض اس کے الفاظ کو دہرانا اور بغیر سمجھے پڑھنا بھی عبادت اور باعث ثواب ہے۔ یہ بات جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کو بغیر سمجھے پڑھنا لا حاصل ہے یا یہ کہتے ہیں کہ محض الفاظ دہرانے سے یہ بہتر ہے کہ آدمی کسی زبان میں ترجمہ ہی پڑھ لے۔ قطعاً غلط اور گمراہ کن طرز فکر ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ قرآن

کو بے سمجھے پڑھنا بھی عبادت اور باعث اجر وثواب ہے۔ اور یہ کوئی خود تراشیدہ دعویٰ نہیں ہے بلکہ اللہ کے رسولِ صادق وامین کا صاف صاف ارشاد ہے:

عن ابن مسعود رضي اللّٰه عنه قال قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وآله وسلم من قرء حرفا من كتاب اللّٰه فله حسنة والحسنة بعشر امثالها لا اقول الم حرف الف حرف ولام حرف وميم حرف (ترمذی' کتاب الفضائل القرآن باب ۱۶' ص ۱۹۴۴)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس نے اللہ کی کتاب میں سے ایک حرف پڑھا اس کے لیے ایک نیکی ہے اور نیکی کا اجر دس گنا ہوا کرتا ہے اور میں یہ نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔''

اس حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حقیقت سمجھانے کے لیے کہ بے سوچے سمجھے قرآن پڑھنے کا بھی اجر وثواب ہے، نہایت واضح اور قطعی مثال کا انتخاب فرمایا۔ آپ نے یہ حقیقت ذہن نشین کرانے کے لیے یعلمون تعلمون اور علیم وخبیر جیسے الفاظ منتخب نہیں فرمائے۔ اس لیے کہ ان کا مفہوم عام ہے۔ آپ نے حروف مقطعات کا انتخاب فرمایا جن کے بارے میں عام طور پر یہ مشہور ہے کہ ان کا مفہوم اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں اور پھر آپ نے الم کا انتخاب فرما کر اس کے بھی الگ الگ حرف کر کے بتایا کہ الف کا الگ اجر ہے اور لام کا الگ اجر ہے اور میم کا الگ اجر ہے کہ اگر حروف کا کوئی مفہوم متعین کرے، تو اس کے الگ الگ حرفوں کا مفہوم اور مطلب متعین کرنے اور اس کی طرف کسی کا ذہن بھی منتقل نہ ہوگا اور اس طرح آپ نے یہ حقیقت قطعی طور پر ذہن نشیں کرائی کہ بے سمجھے پڑھنا بھی اجر وثواب کا کام ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے بے پڑھے لوگ نماز میں سورۂ فاتحہ اور کوئی سورت پڑھتے ہیں اور اس کے مطلب سے ناواقف ہوتے ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی نماز نہیں ہوتی، یا ان کو نماز کا اجر وثواب نہیں ملتا۔ ان کی نماز بھی سب کے نزدیک درست ہے اور یقیناً یہ لوگ اجر وثواب کے بھی مستحق ہوں گے۔

اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ اپنے بچوں کو ناظرہ قرآن بڑی عقیدت، ذوق وشوق اور للّٰہیت کے ساتھ پڑھاتے ہیں۔ حفظ کراتے ہیں، پورا حفظ نہیں کرا پاتے تو چند سورتیں ضرور یاد کراتے ہیں۔ خود سنتے ہیں، دوسروں کو سنواتے ہیں، اس پر خوش ہوتے ہیں اور فخر کرتے ہیں اور بجا فخر کرتے ہیں، قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اور یہ امتیاز صرف اللہ کے کلام ہی کو حاصل ہوسکتا ہے۔ اللہ کے کلام میں جو جوش، ایمان کو گرمانے کی تاثیر اور تسخیر کی شان ہے وہ دنیا میں کسی کلام کو حاصل نہیں۔ اسی لیے اس کا پڑھنا بھی عبادت، سننا بھی عبادت اور حفظ کرنا بھی عبادت ہے

اور دنیا میں اسی تصور اور یقین کے ساتھ کروڑوں بچے ناظرہ قرآن پڑھتے یا حفظ کرتے ہیں اور رمضان کی روشن راتوں میں تراویح کی نماز میں قرآن سناتے ہیں اور سننے والے عقیدت و دل بستگی اور ذوق وشوق کے ساتھ سنتے ہیں اور اللہ سے اس عبادت کے اجر وثواب کی توقع رکھتے ہیں۔

اس گفتگو کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں بے سوچے سمجھے قرآن پڑھنے کی تلقین کررہا ہوں یا ان لوگوں کے غلط مقصد کو تقویت پہنچا رہا ہوں جو قرآن کو ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ پڑھنے کو عام مسلمانوں کے لیے غلط اور مضر بتاتے ہیں اور محض الفاظ دہرانے اور بے سوچے سمجھے تلاوت کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ میرا مقصد تو صرف اس غلط ذہن کی اصلاح ہے جو قرآن کے الفاظ دہرانے' بے سمجھے تلاوت کرنے اور قرآن حفظ کرنے اور قرآن سنانے کو دینی کام سمجھتے ہیں اور کلام اللہ کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں اور اس فکر کو عام کرنے کی کوشش کر کے خود کو دانشور ظاہر کرتے ہیں اور بعض نادان تو اس حد تک اپنی دانش وبینش کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر قرآن پاک کے الفاظ نہ پڑھ سکیں تو کوئی غم نہیں۔ اصل مقصد تو سمجھنا سمجھانا ہے۔ کسی بھی زبان میں قرآن کا ترجمہ پڑھ لینا اس سے کہیں بہتر ہے کہ آدمی بے سمجھے قرآن کی تلاوت کرے۔ یہ کلام اللہ کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اللہ کے کلام کو جو عظمت و تقدس حاصل ہے۔ اور اس میں تسخیر و تاثیر کی جو قوت ہے۔ ایمان کو گرمانے' روح کو بالیدگی بخشنے اور آنکھوں کو نمناک کرنے کی جو کیفیت ہے۔ وہ دنیا کی کسی کتاب کو حاصل نہیں۔ دنیا کی کوئی کتاب یہ دعویٰ نہیں کرتی کہ وہ اللہ کی نازل کردہ اور محفوظ کتاب ہے۔ قرآن کا آغاز ہی اس حقیقت سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے اس کے الفاظ بھی اللہ ہی کے الفاظ ہیں۔ کسی زبان میں اس کا ترجمہ ان الفاظ کا بدل نہیں ہو سکتا۔ ترجمہ اور تفسیر ان الفاظ کے مفہوم و معانی سمجھنے کی ایک کوشش ہے اور بس وہ کلام الٰہی کا بدل نہیں ہیں۔

اس تصور کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن کتابِ ہدایت ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے قوانین اور احکام نازل کیے ہیں اور یہ ہدایت فرمائی ہے کہ مسلمان اس کتابِ ہدایت کے مطابق اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی گزاریں یہ الٰہی قوانین اور تعلیمات کا مجموعہ ہے۔ یہ نازل ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کے احکام پر عمل کیا جائے اس کی ہدایات پر غور و تدبر کیا جائے اور اس کے مطابق ہر طرح کے حالات میں زندگی گزاری جائے۔ امت نہ صرف یہ کہ اس روشنی میں عزت و سربلندی کی زندگی گزارے بلکہ دنیا والوں کو اس سے روشناس کرانے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے آمادہ کرے۔ یہ امت کا منصبی فریضہ ہے کہ وہ قرآن کے پیغام کو عام کرے ہر دور کے انسانوں کو سمجھائے۔ ظاہر ہے امت یہ منصبی فریضہ اسی وقت انجام دے سکتی ہے اور اس ہدایت نامے کی روشنی میں زندگی گزارنے کا حق ادا کر سکتی ہے۔ جب وہ اس میں غور وفکر کی عادت ڈالے اس کے احکام کی روح کو سمجھے، ہر طرح کے سرد و گرم حالات پر اس کو منطبق کرے اور اس کی تعلیمات کے مطابق زندگی

گزارنے کا پختہ فیصلہ کرے۔ قرآن کے نازل کرنے والے نے اس کے نزول کا یہی مقصد بتایا ہے۔

كِتَابٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَ لِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○ (ص ۳۸)

''یہ کتاب مبارک ہم نے آپ کی طرف اس لیے نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں غور و تدبر کریں اور اہل عقل اس سے ہدایت و نصیحت حاصل کریں۔''

امت نے اس قرآن کے ساتھ یہ نہایت غلط سلوک اور انتہائی زیادتی کی ہے کہ اس کو سمجھنے سمجھانے میں غور و تدبر کرنے اور اس کے احکام اور تعلیمات پر عمل کرنے کی عادت بڑی حد تک ختم کر دی ہے۔ حالانکہ قرآن نے بار بار اس کی ہدایت فرمائی ہے، یہی اس کا مقصد نزول بتایا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے مختلف انداز سے اس کی ترغیب دی، اس کے مواقع پیدا فرمائے اور مجلسوں میں اس طرح کے سوالات ابھارے کہ لوگوں میں قرآن پاک پر غور و فکر کا جذبہ ابھرے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ما اجتمع قوم في بيت من بيوت الله يتلون كتاب الله ويتدارسونه بينهم الا نزلت عليهم السكينة وغشيتهم الرحمة وحفتهم الملائكة وذكرهم الله فيمن عنده

(ابوداؤد' کتاب الوتر' باب ۱۴ فی ثواب قراۃ القرآن ص ۱۴۳۱)

''جب بھی کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہوں، اللہ کی کتاب کی تلاوت کریں اور باہم اس کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کریں تو ان پر سکینت نازل ہوتی ہے۔ رحمتِ الٰہی ان کو ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں اور اللہ ان کا تذکرہ اپنے پاس کے لوگوں میں کرتا ہے۔''



# لوٹو دورِ سعادت کی طرف

تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھیے، آج سے صدیوں پہلے عرب کی سرزمین پر جہالت اور جاہلیت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی ۔ ہر طرف کفر وشرک کے اوہام ورسوم رائج تھے، گھر گھر خودساختہ بتوں اور بے جان پتھروں کو پوجا جا رہا تھا، اللہ کے بندے اللہ کی ذات وصفات اور اس کی توحید سے ناآشنا تھے۔ اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی مورتیوں کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر ان کے سامنے ڈنڈوت کرتے تھے اور وہم پرستی کے مریض انسان ان خودساختہ بتوں کے غضب اور عتاب سے بچنے کے لیے ان کے سامنے ماتھے رگڑتے اور نذرانے چڑھاتے تھے۔ ہر طرف مشرکانہ اوہام ورسوم کا بازار گرم تھا، انسان اپنے مقام کو بھول کر انتہائی پستی میں گر گیا تھا۔ بے حیائی، بے شرمی اور آوارگی عام تھی ۔ نہ صرف یہ کہ لوگ آوارگی میں مبتلا تھے بلکہ جہالت اور نادانی اس حد تک تھی کہ اخلاقی گندگیوں اور آوارگیوں پر محفلوں میں برملا فخر کیا جاتا تھا، باہمی حقوق اور احترام کی قدریں ناپید ہو چکی تھیں۔ ہر زور آور کمزور کو دبا رہا تھا، ہر طرف قتل وغارت گری، لوٹ مار اور فتنہ وفساد برپا تھا، خاندان، خاندان سے اور قبیلے، قبیلوں سے برسر پیکار تھے، باہمی دشمنی عادت بن چکی تھی، ذرا ذرا سی بات پر تلواریں نکل آتی تھیں اور پھر یہ جنگ سالہا سال تک چلتی تھی ۔ نہ کسی کی جان محفوظ تھی نہ مال اور نہ عزت وآبرو۔ اللہ کی زمین ظلم وفساد سے بھر گئی تھی ۔

عورت جو انسانیت کی ماں ہے اس کی حیثیت اسبابِ عیش وعشرت سے زیادہ نہ تھی ۔ عورت پر ظلم وزیادتی معاشرے کا معمول بن گیا تھا۔ ایک شخص شادیوں پر شادیاں کرتا چلا جاتا اور جب جس بیوی کو چاہتا نکال باہر کرتا، سوسائٹی کے ذہن سے یہ خیال ہی محو ہو گیا تھا کہ عورت بھی قابلِ احترام انسانیت کا حصہ ہے۔ اس کے بھی کچھ حقوق ہیں اور یہ بھی عزت واحترام کی مستحق ہے۔ میت کی میراث تقسیم ہوتی تو میت کی بیوائیں بھی مال واسباب کی طرح وارثوں میں تقسیم ہو جاتیں اور یہ وارث ان قابل احترام خواتین سے اسی طرح استفادہ کرتے تھے جس طرح میراث کی دوسری اشیا سے استفادہ کرتے تھے اور اپنے اس ذلیل ترین عمل میں انہیں ذرا برائی اور شناعت محسوس نہ ہوتی ۔

ان عبرتناک حالات اور انسانیت کی انتہائی پستی اور ذلت کے ماحول میں اللہ نے اپنے ایک نیک نفس اور

پاک سیرت بندے کو بھیجا اور اصلاح حال کے اپنے عظیم منصوبے کو پورا کرنے کے لیے ان کو منتخب فرمایا۔ درود و سلام ہو ان پر۔ رسول صادق و امین ﷺ یہ کچھ دیکھ کر برابر کڑھتے، ان کی حساس طبیعت اس تکدر سے برابر پریشان رہتی۔

اس رنج وغم اور فکر و پریشانی سے آپ ﷺ بے قرار اور بے چین رہتے اور ایسا محسوس ہوتا کہ یہ بوجھ آپ ﷺ کی کمر توڑ ڈالے گا۔ لیکن آپ ﷺ کی سمجھ میں کچھ نہ آتا کہ انسانیت کو اس پستی اور ذلت سے کیسے نکالیں اور انسانیت کو اس کے بھولے ہوئے مقام عزت و اکرام تک کیسے پہنچائیں؟

یہ نیک نفس ہستی اس فکر و تلاش میں سرگرداں تھی کہ اللہ نے ہدایت سے نوازا، نبوت کے مقامِ عظمت پر سرفراز فرمایا اور وہ روشنی آپ ﷺ کو عطا فرمائی جس سے ماحول اور سوسائٹی کی تاریکی کو دور کر سکیں اور آپ ﷺ کا وہ بوجھ ہلکا ہو سکے جو آپ ﷺ کی کمر توڑے جا رہا ہے۔ فرمایا:

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ (الم نشرح ۹۴:۱)

''کیا ہم نے آپ ﷺ کا سینہ آپ ﷺ کے لیے نہیں کھول دیا۔''

یعنی آپ ﷺ کو اس یقین کی دولت سے سرشار کیا کہ انسانیت کے بگاڑ کو دور کرنے اور انسان کو اللہ کا بندہ بنانے کے لیے جو کچھ آپ ﷺ پر نازل کیا گیا وہی سرتا سر حق ہے۔ نبوت کے ابتدائی ایام کی سورتوں میں جن تین حقیقتوں کی تعلیم دی گئی ہے اور جن کو بار بار مختلف پیرایوں اور مؤثر ترین بولوں میں دہرایا گیا وہ حقیقتیں اس طرح آپ ﷺ کے دل میں پیوست ہو گئیں کہ آپ ﷺ پر تردد اور خلجان سے پاک ہو کر پوری طرح مطمئن ہو گئے۔ کہ یہ تین حقیقتیں برحق ہیں اور اسلام کا جو راستہ اللہ نے آپ ﷺ پر کھولا ہے صرف وہی حق ہے۔ اس دور میں آخری پارے کی جو چھوٹی چھوٹی سورتیں نازل ہوتی رہیں ان میں پوری قوت اور پورے زور کے ساتھ انہی تین حقیقتوں کو ذہن وقلب میں بٹھایا گیا ہے یعنی:

اللہ کی توحید، آخرت کی فکر اور رسول ﷺ کی رسالت اور اللہ نے آپ کو یہ شرح صدر عطا فرمایا کہ انسانیت کو اس ہمہ گیر بگاڑ، عبرتناک ذلت اور جہالت و جاہلیت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سے نکالنے اور اصلاح حال کی راہ پر لگانے کا یہی واحد طریقہ ہے کہ انسانیت کو ان تین حصوں میں ایمان لانے کی دعوت دی اور ان کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے پر لگایا جائے۔ نبوت کے مشن پر لگا کر اور ہدایت کی اس روشنی سے سرفراز فرما کر اللہ نے آپ ﷺ کو انسانیت کے فساد اور بگاڑ کے گرانبار قفل کو کھولنے کے لیے آپ ﷺ کے ہاتھ میں شاہ کلید دے دی اور آپ ﷺ کا سارا بوجھ ہلکا کر دیا اور آپ ﷺ کامل اطمینان، یکسوئی اور شرح صدر کے ساتھ وحی کی روشنی میں کارِ نبوت میں مصروف ہو گئے اور وہ بوجھ آپ ﷺ کے دل سے ہلکا ہو گیا جو آپ ﷺ کی کمر توڑے ڈال رہا تھا۔ اللہ کا ارشاد

ہے:

وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِي أَنقَضَ ظَهْرَكَ ۝ (الم نشرح ۹۴: ۲-۳)

''اور ہم نے آپ پر سے وہ بوجھ اتار دیا جو آپ کی کمر توڑے ڈال رہا تھا۔''

آج کے حالات اور عبرتناک ماحول پر ایک نگاہ ڈالیے ہر طرف فتنہ وفساد برپا ہے، انسانیت ذلت کی انتہائی پستی میں جا گری ہے، اللہ تعالیٰ کا خوف دلوں سے رخصت ہو چکا ہے، ظلم وزیادتی، ناانصافی، سرکشی، بے ادبی عام ہے۔ جھوٹ، فریب، مکاری، بغض، کینہ، حرص، بددیانتی اور دوسروں کے حقوق پر دست درازی اب برائی نہیں رہی ہے۔ بے حیائی، عریانی، اخلاقی آوارگی اور گراوٹ کا یہ حال ہے کہ اس پر شرمانے کی بجائے اس کو ثقافت کا نام دے کر اس پر فخر کیا جا رہا ہے اور اللہ کی زمین فتنہ وفساد سے بھر گئی۔

ماحول کی یہ شرمناک برائیاں اور عبرتناک مناظر دیکھ کر اگر آپ کی حساس طبیعت کڑھن محسوس کرتی ہے اور آپ کی دینی غیرت وحمیت آپ کو جھنجھوڑتی ہے کہ آپ اٹھیں اور انسانیت کو اس پستی اور ذلت سے نکالیں تو یاد رکھئے کہ اس کے لیے آپ کو وہی طریقہ اختیار کرنا ہوگا جو رسول اللہ ﷺ نے اختیار فرمایا تھا اور انہی تین حقیقتوں کو ذہن نشین کرانے اور ان کے تقاضے پورے کرنے کی دعوت دینی ہوگی۔ جس طرح اللہ کے رسول ﷺ نے کیا تھا، اس ہمہ گیر بگاڑ اور انسانیت سوز فساد کو ختم کرنے کا یہی واحد راستہ ہے کہ انسانیت کو اللہ کی طرف بلایا جائے۔ اس کی توحید پر ایمان لانے کی دعوت دی جائے، دلوں میں آخرت کا خوف پیدا کیا جائے اور رسول کی اتباع اور اطاعت پر قلوب کو آمادہ کیا جائے۔

دعوت وتبلیغ اور اصلاحِ حال کا یہ کام اگر آپ نے رسول ﷺ اور ان کے پاکیزہ نفوس صحابہ کرام کے نقشِ قدم پر انجام دیا تو اللہ تعالیٰ آپ کو تین نعمتوں سے نوازے گا۔

ایک یہ کہ شرح صدر کی دولت آپ کو نصیب ہوگی۔ شرح صدر کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو یہ قلبی اطمینان اور یقین کی ٹھنڈک حاصل ہوگی کہ اسلام ہی سرتاسر حق ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے سرتاسر باطل اور بے بنیاد ہے اور شرح صدر کا مطلب یہ بھی ہے کہ اس حق کے ذریعے آپ کے اندر جرأت، حوصلہ اور بے باکی پیدا ہوگی اور حالات کی سنگینی یا باطل کی قوتوں سے آپ ذرا مرعوب نہ ہوں گے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت کے منصب پر سرفراز فرمانے کے بعد فرعون کی طرف روانہ ہونے کا حکم دیا تو موسیٰ علیہ السلام جھجک محسوس کر رہے تھے۔ ان کا سینہ تنگ ہو رہا تھا۔ اور وہ یہ خوف محسوس کر رہے تھے کہ فرعون اور اس کے درباری مجھے اپنے چھائے ہوئے اقتدار کے مقابلے میں بے وزن محسوس کر کے جھٹلا دیں گے اور انہوں نے اپنے رب سے شرح صدر کی دعا کی کہ اے پروردگار مجھے ہمت عطا کر اور حوصلہ دے کہ میں جرأت اور بے باکی کے ساتھ اعلانِ حق کا یہ فریضہ فرعون جیسے

ڈکٹیٹر کے دربار میں انجام دے سکوں۔ تو اللہ نے آپ کو اس دولت سے نواز کر روانہ فرمایا اور یہ اطمینان دلایا کہ تم برابر ہماری نگرانی اور حفاظت میں رہو گے۔

دوسری نعمت اللہ آپ کو یہ عطا فرمائے گا کہ حالات کی سنگینی اور برائیوں کے عظیم پھیلاؤ سے رنج وغم اور سخت پریشانی کا بوجھ آپ اپنے دل پر محسوس کریں گے۔ قرآن کی ہدایت کی روشنی میں جب آپ دعوت واصلاح کے کام میں لگ جائیں گے تو یہ بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا اور آپ کامل نشاط، یکسوئی، اطمینان ودلجمعی اور ہمت وجرأت کے ساتھ یہ فریضہ انجام دے سکیں گے۔

تیسری عظیم نعمت اللہ تعالیٰ کے فضل خاص سے آپ کو یہ عنایت ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور حکمت کے تحت آپ کی دعوت کی پذیرائی، احترام اور استقبال کے لیے لوگوں کے دلوں کے دروازے کھول دے گا۔ آپ کا آوازہ بلند ہوگا۔ آپ کی نیک نامی، اچھا تعارف لوگوں میں عام ہو جائے گا۔ باطل کی قوتیں آپ کو بے وزن کرنے' آپ کی راہ مارنے اور آپ کو زک پہنچانے کے لیے جو تدبیریں اختیار کریں گی وہی تدبیریں، آپ کی نام آوری مقبولیت اور اچھی شہرت کا سبب بنیں گی۔ اور جہاں جہاں آپ اپنی کوشش اور وسائل سے اپنی بات پہنچانے کے مواقع نہیں پا سکیں گے۔ آپ کے مخالفین خود ان مقامات تک آپ کا ذکر پہنچائیں گے اور اللہ اپنے فضل وحکمت سے آپ کے ذکر کو ذکرِ خیر میں تبدیل کرتا چلا جائے گا۔

دینِ حق کے دشمن آپ کے خلاف پروپیگنڈہ کریں گے۔ الزامات لگائیں گے آپ کو بدنام کرنے کی کوشش کریں گے اور آپ کی تصویر بگاڑنے کے لیے ہزار جتن کریں گے، لیکن ان کی انہی کوششوں کے ذریعے اللہ آپ کو نیک نامی بخشے گا، آپ کے حسنِ تعارف کا دائرہ وسیع کرے گا اور باطل کے ان ایوانوں اور اداروں میں آپ کی دعوت گونجے گی جہاں آپ اپنے ذرائع وسائل اور کوششوں سے کسی طرح اپنی دعوت نہیں پہنچا سکتے تھے، آپ کا کام صرف یہ ہے کہ اللہ نے جس کام پر آپ کو مامور فرمایا ہے اور جس کام کو انجام دینے کے لیے رسول اللہ ﷺ اور ان کے پاک نفس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جو طریقہ اختیار کیا تھا وہی طریقہ آپ بھی اختیار کریں، اپنی دعوت کی بنیاد انہی تین حقیقتوں پر رکھیں۔ اللہ کی توحید دلوں میں پختہ کریں۔ لوگوں میں آخرت کا یقین پیدا کریں اور رسول ﷺ پر ایمان لانے اور ان کی اتباع میں زندگی گزارنے کی اہمیت واضح کریں۔ آپ کامل یکسوئی، دلجمعی اور شرحِ صدر کے ساتھ اپنا کام انجام دیتے رہیں اور خوشگوار نتائج کے لیے اللہ پر کامل بھروسہ رکھیں وہ آپ کے رفعِ ذکر اور دعوت کی پذیرائی اور لوگوں کے دلوں میں قدر واحترام کے جذبات خود پیدا فرمائے گا۔ انسانوں کے قلوب اسی کی چٹکی میں ہیں۔ وہ جدھر چاہتا ہے انہیں پھیرتا رہتا ہے۔

اَلْقَلْبُ بَيْنَ اُصْبُعَيِ الرَّحْمٰنِ يَصْرِفُهٗ كَيْفَ يَشَاءُ (مسند احمد' جلد ۲' ص ۱۷۳)

”قلب اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہے۔ وہ جدھر چاہتا ہے اسے گردش دیتا رہتا ہے۔“

اللہ تعالیٰ اپنے جس منصوبے کو پورا کرنا چاہتا ہے وہ پورا کر کے رہتا ہے ”فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ“ وہ جو چاہتا ہے کر ڈالتا ہے اور اپنے مطلوب منصوبے کو پورا کرنے کے لیے وہ باریک ترین تدبیریں اور زمین دوز راہیں نکالتا ہے جہاں تک انسانوں کی فکر ونگاہ کی رسائی نہیں ہو پاتی۔

اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ

”بے شک میرا رب جو کرنا چاہتا ہے اس کے لیے انتہائی باریک بین ہے۔“



# آپ کے احباب آپ کا تعارف ہیں

ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے کوئی دوست یا ساتھی نہ ہوں اور یہ حقیقت میں محروم لوگ ہیں۔ عام طور پر ہر شخص کے کچھ ساتھی، رفیق یا دوست ہوتے ہیں، جو اس کے دکھ سکھ کے شریک، رنج و راحت میں ساتھ دینے والے اور زندگی کے مختلف موقعوں پر حامی اور مختلف معاملات میں شریک و معاون ہوتے ہیں۔

یقیناً آپ کے بھی کچھ دوست ساتھی اور رفیق ہوں گے، مگر یہ بہت سادہ سا معاملہ نہیں ہے کہ آپ سرسری سی نظر ڈال کر اور سر جھٹک کر یہ کہہ کر آگے بڑھ جائیں کہ جی ہاں! میرے بھی کچھ دوست اور ساتھی ہیں۔

آپ کو یہ معلوم ہے کہ سوسائٹی میں آپ کا مقام وہی ہے جو آپ کے دوستوں کا ہے۔ دین وملت کے تعلق سے آپ کا مرتبہ وہی ہے جو آپ کے دوستوں کا ہے، دین واخلاق اور معاشرت کے اعتبار سے آپ کی پوزیشن وہی ہے جو آپ کے رفیقوں اور دوستوں کی ہے۔

آپ جائزہ لیجیے کہ جن کے درمیان آپ اٹھتے بیٹھتے ہیں، جن سے ملتے جلتے ہیں، شب وروز کی زندگی میں جو آپ کے ساتھ رہتے ہیں، آپ کے ساتھ مل جل کر کسی مقصد کے لیے کوشش کرتے ہیں، آپ ان کے کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ آپ کے کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں اور دنیا کی بھی اس پر نظر ہے کہ وہ آپ کے دوست اور رفیق ہیں۔ آپ کے یہ رفیق کس قسم کے لوگ ہیں؟ دین وملت کے تعلق سے سماج میں ان کا کیا مقام ہے؟ امانت و دیانت کے لحاظ سے ان کی کیا حیثیت ہے؟ سوسائٹی میں اعتماد و بے اعتمادی کے لحاظ سے ان کا کیا مرتبہ ہے؟ سوجھ بوجھ اور بے سمجھی کے لحاظ سے ان کے بارے میں لوگوں کے کیا خیالات ہیں؟ دینی علوم اور علم کے بارے میں ان کے بارے میں لوگ کیا رائے رکھتے ہیں؟ فرائض کے احساس اور اخلاص وللّٰہیت کے لحاظ سے ان کے بارے میں ان سے متعلق لوگوں کے خیالات وتاثرات کیا ہیں؟ اس حقیقت کو تسلیم کیجیے؟ آپ کا جی چاہے یا نہ چاہے، مانیے کہ آپ وہی کچھ ہیں جو آپ کے دوست ہیں۔ یہ لوگ اس لیے آپ کے قریب ہوئے ہیں یا آپ ان کے قریب ہوئے ہیں کہ آپ کے خیالات میں یکسانیت ہے، فکر میں ہم آہنگی ہے، آرزوؤں اور تمناؤں میں موافقت ہے، طریقہ عمل کے انتخاب میں یگانگت ہے اور باہمی ہم مزاجی نے آپ کو شیر وشکر بنا دیا ہے۔ پرانے عربی ادب سے

ایک مشہور مقولہ منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔

لَا تَسْئَلْ عَنِ الْمَرْءِ بَلْ سَلْ عَنْ قَرِيْنِهٖ

''آدمی کے بارے میں نہ پوچھو بلکہ اس کے ساتھی کے بارے میں پوچھو۔''

حقیقت یہی ہے کہ آدمی کا اصل تعارف اس کے ساتھیوں ہی سے ہوتا ہے۔ آپ کے بارے میں آپ کے سماج کے لوگ آپ کے دوستوں کو دیکھ کر ہی رائے قائم کریں گے اور جو رائے قائم کریں گے بڑی حد تک اس میں حق بجانب ہوں گے، آپ نے اپنی رفاقت، دوستی اور شب و روز میں ساتھی کے لیے جس کا انتخاب کیا ہے اور جس سے وفاداری اور ایثار کے آپ خواہاں ہیں اور خود بھی اس کے لیے وفادار ہیں اور ایثار کرتے ہیں، یہ انتخاب آپ نے مزاج کی ہم آہنگی، آرزوؤں کی موافقت، زندگی کی قدروں میں یکساں سوچ اور مقاصد کے اشتراک ہی کی وجہ سے کیا ہے۔

یا پھر آپ انتہائی عیار، مطلب پرست اور استحصال کی اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے انسان ہیں، بلکہ آپ نے مختلف اغراض و مقاصد رکھنے والے لوگوں کو اپنے اردگرد اپنی غرض کے لیے جمع کر رکھا ہے انہیں اپنی دلچسپیوں میں لگا رکھا ہے، اپنی اغراض ان سے پوری کر رہے ہیں اور وہ بھی اپنی غرض کے تحت شب و روز جان و دل سے آپ کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ دنیا کی نظر میں بھی وہ آپ کے ساتھی ہیں، آپ بھی اسی حیثیت سے ان کا اور اپنا تعارف کراتے ہیں، لیکن یاد رکھیے بہت جلد اغراض کا ٹکراؤ آپ کو ان سے یا ان کو آپ سے جدا کر دے گا۔ آپ کے مستقل ساتھی، وفادار وہی ہیں اور وہی ہو سکتے ہیں جو آپ کی پہچان ہوں۔ جو فکر و خیالات کے اعتبار سے آپ کے ساتھ موافقت رکھتے ہوں، اپنی پسند و ناپسند کے معیارات کے اعتبار سے جن کی آرزوؤں اور تمناؤں کی منزل وہی ہو جو آپ کی ہو۔ اس لیے اس معاملے میں سطحی فکر سے کام نہ لیجیے بلکہ کسی کو اپنا دوست بنانے سے پہلے حالات پر اچھی طرح غور و فکر کر لیجیے۔

انسانیت کے سب سے بڑے نباض حضرت محمد ﷺ نے اپنے ایک مزاج شناس ساتھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کیا قیمتی بات کہی:

"المرء علی دین خلیله فلینظر احدکم من یخالل"

''انسان اپنے دوست اور رفیق کے دین پر ہوتا ہے، پس تم میں سے ہر شخص کو غور و فکر کر لینا چاہیے کہ وہ کس کو دوست بنا رہا ہے۔''

یہاں دین سے مراد زندگی گزارنے کا طریقۂ عمل ہے اور ظاہر ہے کہ عملی اعتبار سے آدمی جو راہ اپنے لیے پسند کرتا ہے اس میں اصل محرک اس کے معتقدات ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنے دوستوں کے بنیادی خیالات و

نظریات، اللہ اور آخرت کے بارے میں ان کے معتقدات اور دین کی قدر و قیمت کے بارے میں ان کے عام رجحانات و پسند کو ضرور پیش نظر رکھئے اس لیے کہ ایک اچھا دوست آپ کے لیے آخرت کا توشہ بھی بن سکتا ہے اور ایک برا دوست آپ کے لیے آخرت کا عذاب بھی —— اور رشتوں کے قیام کے سلسلے میں بھی لازماً اس بات کو پیش نظر رکھیں۔



# کیا رسول ﷺ سے تعلق میں ہم سچے ہیں؟

''سچا'' ہونے کے لیے صرف یہ کافی نہیں کہ قائل سچی بات کہہ رہا ہے، سچی بات تو کبھی کبھی جھوٹا آدمی بھی دہرا دیتا ہے۔ سچی بات کہنے والا ہر ایک شخص سچا نہیں ہوتا، بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زبان سے سچی بات کہتے نظر آتے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ سچے نہیں ہوتے، بلکہ جھوٹے ہوتے ہیں۔ اللہ بھی انہیں جھوٹا کہتا ہے اور انسانی معاشرے میں بھی وہ جھوٹے ہی سمجھے جاتے ہیں۔

اللہ ایک ہے، حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ رسول کی اتباع ہی میں فلاح ونجات ہے۔ یہ سرتاسر حقیقت پر مبنی باتیں ہیں، ان میں جھوٹ کا شائبہ تک نہیں۔ مگر کیا ان حقائق کو زبان سے ادا کرنے والا ہر شخص سچا کہلائے گا۔ یہ ہرگز ضروری نہیں۔ اس لیے کہ سچی بات کہنا الگ بات ہے اور سچا ہونا الگ بات ہے۔ سچی بات کہنے والا بھی جھوٹا ہوسکتا ہے۔ کسی کے سچا ہونے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ سچی بات کہہ رہا ہے۔ سچی بات کہنے والے ہر شخص کو اللہ نے بھی سچا نہیں سمجھا ہے اور انسانوں کا معاشرہ بھی اسی طرح سچی بات کہنے والے ہر شخص کو سچا نہیں سمجھتا۔

ایک شخص پوری قوت اور جوش کے ساتھ کہتا ہے۔ اللہ معبود برحق ہے، محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ سنت کی اتباع ہی میں فلاح وکامرانی ہے۔ حرام سے بچنا اور حلال کی فکر کرنا مؤمن کے لیے لازم ہے۔ صلہ رحمی کو اللہ نے فرض کیا ہے۔ ان حقیقتوں سے کون انکار کرسکتا ہے یہ باتیں سرتاسر حق ہیں۔ ان میں شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ لیکن یہ بات بھی ناقابل تردید ہے کہ ان باتوں کو زبان سے کہنے والے ہر شخص کو آپ سچا نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے کہ وہ جھوٹا بھی ہوسکتا ہے۔

ایک ایسا شخص جو پورے جوش وخروش کے ساتھ وعظ کہہ رہا ہے اور ان سچی باتوں کو دہرا رہا ہے۔ — ضروری نہیں کہ وہ سچا بھی ہو، اگر آپ دیکھیں کہ اس پرجوش واعظ کی اپنی زندگی ان سچی باتوں کی خیروبرکت سے محروم ہے، وہ حرام کھا رہا ہے۔ تقریبات میں اتباع رسول ﷺ کا مذاق اڑا رہا ہے۔ رشتے داروں اور عزیزوں کے حق مار رہا ہے، اللہ کے قانون وراثت کو رد کر رہا ہے۔ سنت رسول ﷺ کی کھلم کھلا مخالفت کر رہا ہے اور عمل کی زندگی میں سرتا

سر بے دین یا بد دین ہے تو آپ کیا کہیں گے۔ یہی نا کہ یہ شخص جھوٹا ہے، یہ کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے۔ بدترین منافق ہے۔ کیا سماج کا کوئی شخص بھی اسے سچا کہہ سکتا ہے۔ اللہ کی نظر میں بھی وہ جھوٹا ہے اور بندوں کی نظر میں بھی وہ جھوٹا اور کذاب ہے، نہ کسی دل میں اس کے لیے احترام ہوسکتا ہے۔ نہ عقیدت ومحبت ہوسکتی ہے، نہ سچے اور قابل اعتماد لوگوں میں اس کا شمار ہوسکتا ہے۔ بلکہ ایسے جھوٹے شخص کے بارے میں ہر ایک یہی کہے گا کہ یہ جھوٹا ہے' فریبی ہے اور سماج میں کوئی بھی اس کو اچھی نظر سے نہیں دیکھے گا۔

یہ واعظ جو باتیں دہرا رہا ہے وہ تو سرتا سرحق ہیں، ان میں جھوٹ کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ لیکن واعظ جھوٹا ہے۔ اس لیے کہ اس کا اپنا ایمان ویقین ان باتوں کے خلاف ہے جن کا یہ اظہار کر رہا ہے۔ اس کا یقین وایمان تو ان باتوں پر ہے، جن کی گواہی اس کے عمل کی زندگی سے مل رہی ہے۔ یہ محض زبان سے سچی بات کہہ رہا ہے۔ ان باتوں پر اس کا ایمان نہیں ہے۔ وماھم بمؤمنین: وہ ایمان والے نہیں ہیں، وہ اللہ کو دھوکا دے رہے ہیں اور ایمان والوں کو بھی۔ مگر حقیقت میں وہ صرف اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں مگر انہیں شعور نہیں ہے۔

دراصل سچا ہونے کے لیے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ قائل کی باتیں حقیقت کے مطابق ہوں۔ دوسرے یہ کہ جو باتیں قائل کہہ رہا ہے وہ اس کے قلب وضمیر سے بھی مطابقت رکھتی ہوں۔ اس کی مطابقت کی شہادت بڑی حد تک اس کی عملی زندگی سے ملے گی۔ لیکن اس کا قلب وضمیر ان حقائق پر مطمئن نہ ہو اور عمل کی زندگی سے بھی ان کا ثبوت نہ مل رہا ہو تو پھر وہ شخص سچا نہیں ہے چاہے وہ کتنے جوش اور جذبے سے سچی باتیں کہہ رہا ہو۔ قرآن کا ارشاد ہے:

إِذَا جَآءَكَ ٱلْمُنَٰفِقُونَ قَالُوا۟ نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ ٱللَّهِ ۗ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُۥ وَٱللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ ٱلْمُنَٰفِقِينَ لَكَٰذِبُونَ ۝ (المنافقون ۶۳:۱)

''اے محمد ﷺ! جب یہ منافق لوگ آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں، ہاں اللہ خوب جانتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں مگر اللہ یہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق لوگ قطعی جھوٹے ہیں۔''

منافق لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی زبان سے جس بات کی گواہی دیتے ہیں، کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، بلاشبہ یہ بات تو سچی اور حق ہے لیکن اس بات کے کہنے والے قطعی جھوٹے ہیں۔ اس لیے کہ یہ بات تو حقیقت کے عین مطابق ہے لیکن ان کے اپنے ایمان وعقیدے کے مطابق نہیں ہے، ان کا عقیدہ اور ایمان وہ نہیں ہے، جس کا اظہار یہ زبان سے کر رہے ہیں، یہ زبان سے تو آپ ﷺ کو اللہ کا رسول کہہ رہے ہیں لیکن حقیقت میں یہ آپ ﷺ کی رسالت کے منکر ہیں۔ اس لیے اللہ نے کہا'' اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق

لوگ قطعی جھوٹے ہیں۔''

سچا تو حقیقت میں وہی ہے جس کی زبان اس کے دل کی ترجمان ہو اور کہنے والا دل کی گہرائی اور اخلاص کے ساتھ وہ بات کہہ رہا ہو پھر اس کے شب و روز بھی اس بات کی شہادت دے رہے ہوں۔

مثلاً ہم کسی کو صادق الوعد کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص ہمیشہ اپنا وعدہ پورا کرتا ہے کبھی اس کو وعدہ خلاف نہیں پایا گیا، اس کے وعدے پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ہم کسی کو سچا دوست کہتے ہیں، تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ شخص عملاً دوستی کا حق ادا کرتا ہے کبھی بے وفائی نہیں کرتا۔ آڑے وقت میں بے سہارا چھوڑ کر نہیں بھاگتا، ہر موقع پر ساتھ دیتا ہے اور دوستی نبھانے کی پوری پوری کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا سچا سپاہی ہم اسی کو کہتے ہیں، جو عملاً میدان جہاد میں اپنی فدا کاری، جاں نثاری اور قربانی سے یہ ثابت کر دیتا ہے کہ وہ واقعتاً اللہ کا وفادار ہے، ہر حال میں ثابت قدم رہنے والا اور اپنے رب کے لیے سب کچھ قربان کر دینے والا ہے۔ اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ ہم سچا اس شخص کو کہتے اور سمجھتے ہیں جو سچی بات بھی کہہ رہا ہو، اپنی بات میں مخلص بھی ہو، وفادار بھی ہو اور راستباز بھی۔

اس کسوٹی پر جانچ کر دیکھئے کہ ہم کس حد تک سچے مسلمان ہیں۔ اللہ کی نظر میں اور اللہ کے بندوں کی نظر میں۔ سچا مسلمان وہی تو ہوگا جو اپنے مسلمان ہونے کا زبان سے اظہار کرے اور جرأت اور فخر کے ساتھ اظہار کرکہ ''اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ '' میں سب سے پہلے مسلمان ہوں۔'' پھر جو بات وہ زبان سے کہہ رہا ہے وہ اس کے دل کی گہرائی میں اتری ہوئی ہے اور وہ اپنے عقیدے میں پختہ اور اٹل ہے۔ جو کچھ زبان سے کہہ رہا ہے پورے اخلاق، شعور اور کامل یقین کے ساتھ کہہ رہا ہے اور اس کے شب و روز، اس کی دلچسپیاں اور اس کی تگ و دو بھی اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ وہ واقعی سچا مسلمان ہے۔ اللہ کے بندے بھی محسوس کر رہے ہیں کہ یہ واقعی سچا مسلمان ہے جو کہتا ہے وہی کرتا ہے اور اپنے قول و ایمان کے خلاف ہرگز کچھ نہیں کرتا۔ قرآن و سنت نے ہمیں یہ ایک ایسا آئینہ مہیا کر دیا ہے کہ ہم ہر وقت خود کو دیکھ اور جانچ سکتے ہیں۔ مگر انتہائی افسوس کی بات ہے کہ ہم لمحہ بھر کے لیے بھی سنجیدگی اور انصاف و اخلاص کے ساتھ سوچنے اور قرآن پاک کی اس دی ہوئی روشنی میں خود کو سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش نہیں کرتے، ہم زبان سے تو بلاشبہ خود کو مسلمان کہتے ہیں اور مسلمان ہی رہنا چاہتے ہیں، لیکن کیا ہم نے کبھی غور کیا ہے کہ ہمارے قلوب میں وہ عقیدہ راسخ ہے جو مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان ہونے کے لیے قرآن و سنت نے کن باتوں پر یقین و ایمان رکھنے کی تاکید کی ہے اور جن جن باتوں پر قرآن نے ایمان رکھنے کی تاکید کی ہے ہم ان حقیقتوں پر کسی آمیزش کے بغیر پختہ عقیدہ رکھتے ہیں یا نہیں۔

جس دین کو ہم اللہ کا دین کہتے ہیں اور جس رسول پر ایمان کو ہم اپنی زندگی کا اصل سرمایہ سمجھتے ہیں، اس دین اور

رسول کے ساتھ وفاداری کا حق بھی ادا کرتے ہیں یا نہیں، اللہ کی توحید پر ہم ایمان تو رکھتے ہیں تو کیا توحید کے تقاضے بھی ہم پورے کرتے ہیں؟ سچا مسلمان ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ ہمیں توحید، رسالت اور دینِ حق کا کامل علم اور ان کے تقاضوں کا پورا پورا شعور ہو اور پھر یہ فیصلہ کن عزم و ارادہ بھی ہو کہ انہی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ہمیں زندہ رہنا ہے اور انہی عقائد پر ہمیں مرنا ہے۔

اس وقت کرہ ارض کے ہر خطے میں، اللہ کے اس دین حق کو جس پر ہمارا ایمان ہے، مٹانے اور مغلوب کرنے کے منصوبے بن رہے ہیں، اسلام دشمن عناصر نے اس کے خلاف متحدہ محاذ بنا رکھا ہے اور تمام باطل قوتیں مل کر اس دین کو صفحہ ہستی سے ختم کر دینے کے لیے ہر طرح کے پروگرام تشکیل دے رہے ہیں اور ہر میدان میں اس کو شکست دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

کیا ہم نے کبھی سنجیدگی سے سوچا ہے کہ اپنی ہر طرح کی دلچسپیاں چھوڑ کر ہر طرح کے مفادات ٹھکرا کر ہر طرح کی مصلحتوں سے اونچے اٹھ کر دین حق کے قیام اور غلبے کے لیے جان و مال کی ساری قوتیں لگا دیں۔ کیا ہم مطمئن ہیں کہ ہم اسلام کے ساتھ اپنی وفاداری کا حق ادا کر رہے ہیں۔ اور کیا واقعی اللہ کے بندے بھی یہ سمجھ رہے ہیں اور محسوس کر رہے ہیں کہ ہم دین اسلام سے اپنے تعلق کے اظہار میں سچے ہیں۔ ہم اللہ کے دین کے لیے مخلص اور وفادار ہیں۔ اور ہمارے شب و روز اجتماعی اور انفرادی دلچسپیاں اور سرگرمیاں واقعی گواہی دے رہی ہیں کہ ہمارا جینا اور مرنا اللہ ہی کے لیے ہے اور ہم واقعی سچے مسلمان ہیں۔ ہر طرح کے سرد و گرم حالات میں اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہنے والے ہیں۔ ہر طرح کی آزمائشوں میں دین کے تقاضے پورے کرنے کے لیے تیار ہیں۔ دین کے مطالبے پر جان کی قربانیاں دینے اور اللہ کی خاطر اپنی تجوریوں کا منہ کھولنے کے لیے سچے مؤمنوں کی طرح مستعد ہیں۔

یہ کسی کو جواب دینے، کسی کو مطمئن کرنے اور کسی کو قائل کرنے کی بات نہیں ہے۔ اپنے قلب و ضمیر کو اس معاملے میں مطمئن کر لینا سب سے بڑا کارنامہ اور سب سے بڑی کامیابی ہے۔ سب سے بے نیاز ہو کر صرف خود کو مطمئن کیجیے۔ اگر آپ نے اپنے قلب و ضمیر کو مطمئن کر لیا کہ آپ واقعی ''سچے'' ہیں تو یقین مانیے کہ اللہ بھی آپ کو سچا مان لے گا۔ ہرگز ہرگز خود کو دھوکا نہ دیجیے۔ اپنے ساتھ پورا پورا انصاف کیجیے۔ اپنے نفس کو ذرا تاویل کرنے کا موقع نہ دیجیے۔ ورنہ آپ سخت گھاٹے میں رہیں گے۔ ذرا بھی اپنی زندگی میں کھوٹ، بے وفائی اور غفلت شعاری محسوس کریں تو فوراً چوکنے ہو جائیں۔ اور اپنی وفاداری، اخلاص اور راستبازی کا بے لاگ جائزہ لیں اور ذرا بھی کوتاہی اور کمی محسوس کریں تو فوراً فکر مند ہو کر اصلاح حال میں لگ جائیں۔

یاد رکھیے صرف یہ جاننا کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں یا اس کو جاننے کا جوش و عقیدت سے اظہار کرنا ہرگز کافی

نہیں ہے۔ اللہ گواہ ہے کہ یہ ہرگز کافی نہیں ہے، غفلت، بے دینی، سرکشی اور نافرمانی کی زندگی گزارتے رہنا اور محض زبان سے حضرت محمد ﷺ کو اللہ کا رسول کہنا اور ان سے عقیدت ومحبت کے پرجوش نعرے لگانا وہ روش ہے جو اللہ کو ہرگز پسند نہیں۔ یہ وہ روش ہے جو یہود نے اختیار کی تھی۔ اللہ نے ان کی اس روشِ بد کو بیان کر کے اس کے نتیجے میں جو بدترین سزا ان کو دی اس کا ذکر سورۂ صف میں کیا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

وَإِذْ قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ط (الصف ۶۱:۵)

''اور عبرت پکڑو اس واقعے سے جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے مری قوم کے لوگو! تم مجھے کیوں ستاتے ہو جب کہ تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

قرآن کے اس بیان میں دو فقرے بار بار غور کرنے کے قابل ہیں (لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ) ''تم مجھے کیوں ستا رہے ہو؟ اور تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف بھیجا گیا اللہ کا رسول ہوں۔''

یہود نہ صرف یہ کہ حضرت موسیٰ کو اللہ کا رسول جانتے تھے، بلکہ ان سے تعلق پر فخر کرتے تھے، ان کو جاننے اور ان سے تعلق رکھنے ہی کی بنا پر وہ خود کو اقوام عالم میں برگزیدہ اور اللہ کے چہیتے سمجھتے تھے اور اس زعم میں اس حد تک مبتلا تھے کہ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر ہم انتہائی گنہگار بھی ٹھہرے تو بھی چند روز ہی ہم عذاب میں رہیں گے پھر ہمارے لیے جنت ہی ہے۔



مگر اس کے باوجود حضرت موسیٰ نے ان سے کہا ''تم مجھے کیوں ستا رہے ہو؟'' اس فقرے میں دکھ اور عبرت کی ایک پوری تاریخ ہے، بنی اسرائیل کی تاریخ، نافرمانی، عہد شکنی، بے وفائی، سرکشی اور ڈھٹائی کی بڑی عبرت انگیز داستان ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس قدر دکھ اور رقت کے ساتھ ان کو متوجہ کیا اور بتایا کہ تمہاری یہ روش اور ایذا رسانی اس وجہ سے نہیں ہے کہ تم مجھے جانتے نہیں، تم مجھے خوب جانتے ہو، مجھ سے تعلق جوڑتے ہو اور اس تعلق کی بنیاد پر ہی کہتے ہو:

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ

''ہم اللہ کے فرزند اور اس کے چہیتے ہیں۔''

اس علم و واقفیت کے باوجود تم اپنی مسلسل نافرمانی، بدعہدی اور بے وفائی سے مجھے پیہم دکھ پہنچا رہے ہو؟ موسیٰ علیہ السلام کا یہ دکھ بھرا فقرہ اور رقت انگیز شکوہ ایسا نہیں ہے کہ ہم سرسری انداز میں سن کر اور سر جھٹک کر آگے بڑھ جائیں، بلکہ نہایت سنجیدگی سے اسے سنیں اور سمجھیں اور غور کریں، کہ کیا آج حضرت محمد ﷺ کے ساتھ ہماری بھی روش خدانخواستہ یہی تو نہیں ہے۔

ہم حضرت محمد ﷺ کو اللہ کا رسول جانتے ہیں، صرف خود ہی نہیں جانتے بلکہ دنیا کو متعارف کراتے ہیں، ذکر

رسول ﷺ کی محفلیں سجاتے ہیں، سیرت کے جلسے کرتے ہیں۔ عقیدت کے ساتھ نعتیں پڑھتے ہیں۔ جلوس نکالتے اور گلے پھاڑ کر رسول ﷺ سے تعلق خاطر کا ثبوت دیتے ہیں۔ لیکن کیا ہماری زندگی رسول ﷺ سے وفاداری، رسول ﷺ کی اتباع، رسول ﷺ کے لائے ہوئے دین کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں قائم کرنے، دین کے تقاضے پورے کرنے اور دیندار بن کر رہنے کے لیے ہمارے شب و روز گواہی دیتے ہیں۔ کیا ہم اللہ کی عبادت و بندگی میں سرگرم ہیں، کیا ہم عزیزوں اور رشتہ داروں کا حق ادا کر رہے ہیں، کیا ہم دین کے تقاضوں سے واقف ہیں۔ کیا میراث کے قوانین پر ہمارا عمل ہے۔ کیا خاندانی اور معاشرتی زندگی میں ہم رسول ﷺ کے احکام کی پابندی کر رہے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہم بھی نافرمانی، سرکشی، بے دینی اور بدعہدی کی اس تاریخ کو دہرا رہے ہوں اور رسول کو جاننے کے باوجود حضرت محمد ﷺ کی روح اقدس کو اسی طرح ایذا پہنچا رہے ہوں، جس طرح یہود نے ایذا پہنچائی تھی۔ ڈریں اس وقت سے اور پناہ مانگیں اللہ کی اس بات سے کہ کہیں روح محمد ﷺ تڑپ کر ہم سے یہ نہ کہہ رہی ہو کہ:

لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ ط (الصف۶۱:۵)

''تم مجھے کیوں ستا رہے ہو، جب کہ تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔''



# آرزوئیں شخصیت کا آئینہ

آرزوئیں اور تمنائیں شخصیت اور کردار کا آئینہ ہوتی ہیں، کسی کو معلوم ہو یا نہ ہو آپ خود خوب جانتے ہیں کہ آپ کی آرزوئیں اور تمنائیں کیا ہیں؟ انسانیت، شرافت، کردار، ایمان و آخرت پسندی کے لحاظ سے آپ کا مقام کیا ہے آپ کو یہ معلوم کرنے کی فکر ہونی ہی چاہیے۔ اگر آپ اپنی شخصیت کی تعمیر اور اپنی زندگی کو فضائل اخلاق سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں، آپ سے قریبی تعلق رکھنے والے، ہر وقت ساتھ رہنے والے اور آپ کے گھر کے لوگ آپ کے بارے میں جو تاثر دیتے ہیں وہ بھی نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں ہے، اس سے بھی آپ کو اپنا مقام پہچاننے میں مدد مل سکتی ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے لوگوں کے تاثر کو آپ کسی اور محرک کی پیداوار خیال کر کے بے وزن قرار دیں اور اس سے فائدہ نہ اٹھانے کی غلطی کریں، مگر آپ کے سینے میں پرورش پانے والی آرزوئیں تو آپ کی اپنی آرزوئیں ہیں۔ اپنی آرزوؤں کو آپ کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں، آپ خود کو دھوکے میں رکھنا چاہیں تو الگ بات ہے ورنہ آرزوؤں کے آئینے میں آپ کو اپنی شخصیت کی وہی صحیح تصویر ملے گی جو آپ نے تعمیر کی ہے۔

آرزوئیں ہر دل میں ہوتی ہیں اور یہی آرزوئیں بالعموم عمل و حرکت کا اصل محرک ہوتی ہیں —— یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات آدمی صرف آرزوؤں سے ہی اپنے تصور کی عمارت واقعات کی دنیا میں تعمیر کرنے کی نادانی کرتا ہے۔ یہ وہ آرزوئیں ہوتی ہیں جو فی الواقع دل کی گہرائی میں پرورش پانے والی نہیں ہوتیں اور ان میں اتنا زور اور جوش نہیں ہوتا کہ وہ آدمی کو حرکت و عمل پر آمادہ کر سکیں اور بالعموم ایسی آرزوؤں کا تعلق دینی اور روحانی معاملات سے ہوتا ہے۔ عاجلہ سے متعلق آرزوئیں عام طور پر اپنے اندر زبردست جوش اور بے پناہ زور رکھتی ہیں اور آدمی ان کو پورا کرنے کے لیے اکثر اوقات کوشش و کاوش کا حق ادا کر دیتا ہے۔ پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسان اس نادانی اور جہالت میں مبتلا رہتا ہے۔ کہ محض آرزوؤں سے اس کے خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائیں گے۔ اور محنت ومشقت کے بغیر محض چاہنے ہی سے وہ سب کچھ ہو جائے گا جو وہ چاہتا ہے —— خیر یہ بحث الگ ہے کہ آرزو کے مطابق آدمی عمل و کوشش کرتا ہے یا نہیں۔ ہوسکتا ہے اس بارے میں کسی کا نقطۂ نظر کچھ اور ہو لیکن اس حقیقت سے کون انکار کی جرأت کر سکتا ہے کہ ہر دل میں آرزوئیں اور تمنائیں ملتی ہیں اور انہی آرزوؤں اور تمناؤں کے آئینہ

میں اس کی شخصیت کی صحیح تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔کوئی دوسرا دیکھ سکے یا نہ دیکھ سکے۔وہ شخص خود تو دیکھ ہی سکتا ہے۔

اگر آپ کی آرزوئیں اور تمنائیں آپ کی انسانیت، شرافت، دیانت اور اخلاق کے لحاظ سے آپ کی کوئی قبیح اور مکروہ تصویر آپ کے سامنے رکھتی ہیں، تو نہ غصہ ہونے کی ضرورت ہے اور نہ جھنجھلا کر خود کو کوسنے کا کوئی فائدہ ہے —— آرزوئیں آپ کی ہیں' تمنائیں آپ کی ہیں۔ بدل ڈالیے اپنی آرزوؤں کو، رخ موڑ دیجیے اپنی تمناؤں کا، مضبوط عزائم اور اٹل قوت ارادی سے کام لیجیے —— اپنی لگام اپنے شعور کے ہاتھ میں دیجیے۔آخر آپ نے اپنی لگام خواہشات کے ہاتھ میں دے کیوں رکھی ہے۔اس سے بڑی نادانی کیا ہوگی کہ آپ اپنی لگام تو خواہشات کے ہاتھ میں دے دیں۔اور پھر بھی اپنی آرزوؤں میں پاکیزگی، بلندی دیکھنے کے خواہاں ہوں۔ فیصلہ کیجیے کہ آپ اپنی ذات پر خواہشات کا نہیں عقل وشعور کا کنٹرول رکھیں گے۔اور ان آرزوؤں کا گلا سینے کے اندر ہی گھونٹ دیں گے۔جو آپ کی شرافت اور انسانیت کو بٹہ لگانے والی ہیں۔آپ صرف انہی آرزوؤں کو اپنے قلب کی پاک دنیا میں پلنے اور پروان چڑھنے کا موقع دیں گے۔ جو آپ کی شخصیت کی تعمیر صحیح رخ پر کرنے والی ہوں گی۔ جو آپ کے کردار کو بلندی اور عظمت عطا کرنے والی ہوں گی۔ جو آپ کی انسانیت کے جوہروں کو نکھارنے والی ہوں گی۔ جو آپ کو ہر پرستش کی لعنت سے آزاد کر کے بندۂ حق بنانے والی ہوں گی۔ یہ کوشش اگر آپ کریں گے تو خالص اپنی ذات کے لیے کریں گے۔اور آپ سے زیادہ نادان اور کون ہوگا اگر آپ اپنی ذات کے خیر خواہ بھی نہیں ہیں۔آپ اگر خود کو دھوکہ دیتے ہیں اور دھوکے میں رکھتے ہیں، تو کسی اور کا نہیں، اپنا ہی نقصان کرتے ہیں، اپنی ہی شخصیت کو مجروح اور اپنے ہی مستقبل کو تباہ کرتے ہیں۔جس کے پاس حقیقت بین نگاہیں اور حقیقت شناس دل نہیں ہے۔اس کے پاس کچھ نہیں ہے، وہ محروم بھی ہے اور بدترین مفلس بھی، نادان بھی ہے اور جاہل بھی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا دورِ سیاست تھا، حسن اتفاق کہ مسجد حرام میں بڑی بڑی شخصیتیں جمع تھیں، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ اور عبدالملک رحمۃ اللہ علیہ، سب باہم گفتگو میں مصروف تھے، کسی ایک نے کہا: آؤ اللہ کے گھر میں اپنے اپنے دل کی آرزوئیں پیش کریں۔ اللہ کے گھر میں اپنے دل کی آرزوئیں پیش کرنے کی تجویز کس کے دل کی بات نہ ہوگی، سب نے اتفاق کیا۔عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ گویا ہوئے۔

''میری یہ آرزو ہے کہ اللہ مجھے حرم کا پاسبان بنا دے۔اور مجھے تخت خلافت سے نوازے۔''

مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ بولے: ''میری آرزو تو یہ ہے کہ قریش کی دونوں حسین ترین دوشیزائیں میرے نکاح میں آجائیں۔'' عبدالملک نے کہا: ''میں چاہتا ہوں کہ ساری دنیا کا بادشاہ بن جاؤں اور مجھے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی جانشینی نصیب ہو۔'' سب سے آخر میں عروہ رضی اللہ عنہ یوں گویا ہوئے: ''میرے دل میں آپ لوگوں کی آرزوؤں میں سے کوئی آرزو نہیں ہے۔میری آرزو صرف یہ ہے کہ میرا رب دنیا میں مجھے علم اور زہد عطا فرمائے اور آخرت میں

اپنی رضا سے نوازے۔"

قدرتِ الٰہی دیکھئے۔ اللہ کے گھر میں پیش کی گئی سب آرزوئیں پوری ہوئیں۔ عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ حرم کے پاسبان بنے اور سات سال تک حرم کے بادشاہ رہے۔ مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں وہ دونوں حسین دوشیزائیں آئیں۔ عبدالملک کو بنی امیہ کا تختِ حکمرانی نصیب ہوا۔ اور حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کو علم و زہد کی دولت نصیب ہوئی۔ اللہ کے خاص بندوں میں شمار کیے گئے اور تاریخ میں اسی حیثیت سے اپنا ذکرِ خیر چھوڑ گئے۔

اللہ اپنے بندے کو محروم نہیں کرتا۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو سب کچھ پانے کے باوجود حسرت کرتے پائے جاتے ہیں ع

بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

مگر عام طور پر اللہ تعالیٰ بندے کی آرزوئیں پوری کر دیتا ہے۔ خوب سوچ لیجئے کہ آپ اپنے اللہ سے کون سی آرزو پوری کرانا چاہتے ہیں۔ اور تاریخ میں کس حیثیت سے اپنا ذکر چھوڑ جانا پسند کرتے ہیں۔



# دین کی توفیق اللہ کے محبوب ہونیکی علامت

اللہ نے آپ کو خوش مزاج، خوش خصال اور اچھی عادتوں والا بنایا ہے، آپ کی مجلس میں بیٹھ کر لوگ مسرت اور فرحت محسوس کرتے ہیں آپ کی رفاقت اور صحبت کو پسند کرتے ہیں یقیناً یہ اللہ کا آپ پر بہت بڑا کرم اور احسان ہے۔ اچھی عادتیں، نیک خصلتیں اور خوش مزاجی اللہ کی بڑی پسندیدہ نعمتیں ہیں۔

اللہ نے آپ کو صحت، قوت اور حسن و جمال سے نوازا ہے، صحت و جمال بھی اللہ کی بڑی اہم نعمت ہے اس نعمت کی قدر کیجئے اور صحت کو ہرگز نہ بگڑنے دیجیے ایک بار جب صحت بگڑ جاتی ہے تو پھر بڑی مشکل سے سنبھلتی ہے اور زندگی بوجھ محسوس ہوتی ہے، صحت کا خیال رکھنے اور اپنے اوقات کار اور محنت و مشقت کا ایسا نظام العمل بنائیں کہ زندگی کے کام بھی انجام پاتے رہیں اور صحت کا حق بھی ادا ہوتا رہے۔ صحت اچھی ہو تو عمر کا آخری حصہ بالخصوص بہت سکون سے گزرتا ہے اور آدمی تا دیر زندگی سے لطف اندوز رہتا ہے اور خوش و خرم زندگی گزارتا ہے۔

اللہ نے آپ کو خوش حال بنایا ہے، مال و دولت سے نوازا ہے، روزی اور وسائلِ حیات کی فراوانی بخشی ہے۔ یقیناً یہ بھی اللہ کا بہت بڑا انعام ہے، مال کو اللہ نے فضل اور خیر سے تعبیر کیا ہے اور قرآن نے اس کو قیامِ حیات کہا ہے، قوام یا قیام اس رفیق کو کہتے ہیں جس پر کسی چیز کی بقا کا دارومدار ہوتا ہے، یقیناً مال کی حیثیت زندگی کے لیے قوام ہی کی سی ہے اس کی قدر کیجئے اور یاد رکھئے کہ اس کا اصل مالک وہ اللہ ہے جس نے آپ کو مال عطا فرمایا ہے۔ بہت محدود مہلتِ حیات کے لیے اس نے آپ کو اس کا امین بنایا ہے یہ صحیح ہے کہ اس کے حصول کے لیے آپ نے جدوجہد اور محنت کی ہے اور زندگی کا بہترین وقت لگایا ہے آپ کو یقیناً حق ہے کہ اس سے فائدہ اٹھائیں، اپنی سہولت اور آسائش کا سامان اس کے ذریعے فراہم کریں اور اللہ کے دیئے ہوئے وسائل سے اپنی زندگی کو پرسکون، پرلطف اور بارونق بنائیں، مگر یہ ہرگز نہ بھولیں کہ آپ کے رب نے جو کچھ دیا ہے اس کے لیے یہ ہدایت بھی فرمائی ہے کہ آپ اس کو کہاں کہاں اور کیسے خرچ کریں مگر خرچ کرنے کی آزادی اور اختیار آپ کو ضرور دیا ہے۔

یہ گونا گوں نعمتیں جو اللہ نے اپنے بندوں کو دے رکھی ہیں ان کا شمار اور حساب انسان کے بس سے باہر ہے تمام نعمتوں کا شمار ہی نہیں بلکہ کسی ایک نعمت کے فیوض و برکات کا حساب و شمار بھی ممکن نہیں۔

وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا ٥ (ابراہیم ۱۴:۳۴)

''اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔''

یہ حسین و جمیل جسم، اس کی دلکش اور حیرت انگیز ساخت، دیکھنے، سننے، سونگھنے چکھنے اور چھونے کی زبردست قوتیں، دل و دماغ کی بے پناہ صلاحیتیں۔ گونا گوں جذبات و احساسات، بے حد و حساب اخلاقی اوصاف اور جسم و جان کی بے پناہ توانائیاں ان میں سے ایک ایک قوت انسان کو حیران کر دینے والی ہے۔ ان نعمتوں کا تقاضا ہے کہ بندہ اللہ کا شکر ادا کرے اور ناشکری کی زندگی ہرگز نہ گزارے۔

دنیا کی ان نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ کے رسول نے ایک عجیب و غریب بات فرمائی ہے کہ سنتے ہی آدمی ٹھٹک جائے اور رک کر کچھ سوچنے اور فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ دنیا اس کو بھی دیتا ہے جس سے محبت کرتا ہے اور اس کو بھی دیتا ہے جس سے محبت نہیں کرتا۔ مگر دین صرف اسی کو دیتا ہے جس سے محبت کرتا ہے اور پھر آپ نے دین اور دیندارانہ زندگی کے چند اوصاف اور علامتیں بیان فرمائی ہیں۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

ان اللّٰه قسم بينكم اخلاقكم كما قسم بينكم ارزاقكم وان اللّٰه يعطي الدنيا من يحب ومن لايحب ولا يعطي الدين الا من يحب فمن اعطاه الدين فقد احبه

(مسند احمد، ترغیب)

''اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان اخلاق و عادات کی تقسیم کر دی ہے جس طرح کہ اس نے تمہارے درمیان روزی کی تقسیم کر دی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا اس کو بھی دیتا ہے جس سے محبت نہیں کرتا، پس سمجھ لو کہ جس کو دین دیا گیا ہے وہ اللہ کا محبوب ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور مصلحت کے تحت کسی کو نہایت اچھے اخلاق اور اچھی عادتیں عطا فرمائی ہیں اور کسی کو ان سے محروم رکھا ہے، اس طرح کسی کو دولت کی فراوانی اور خوشحالی سے نوازا ہے اور کسی کو تنگی اور عسرت میں رکھا ہے۔ نہ اچھی عادتیں، خوش مزاجی اور خوش گفتاری اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ نے اس بندے پر کرم فرمایا ہے اور نہ تنگ دستی، سخت مزاجی اور درشتی اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ اس بندے سے ناراض ہے اور اس پر عتاب فرمایا ہے۔ دنیا میں ان چیزوں کی تقسیم کی بنیاد اللہ کی رحمت اور اللہ کا غضب نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو آزمائش کے ذرائع ہیں۔ کسی کو قوت و شجاعت، سخت گیری اور سخت مزاجی دے کر آزماتا ہے کسی کو نرم مزاج اور کمزور بنا کر آزماتا ہے۔ کسی کو دولت خوشحالی اور اقتدار دے کر آزماتا ہے اور کسی کو تنگ دستی، بدحالی اور مظلومیت میں رکھ کر آزماتا ہے۔ یہ صرف آزمائش کے ذرائع ہیں یہ ہرگز اللہ کی محبت اور پسندیدگی کی دلیلیں اور علامتیں نہیں ہیں۔

اگر یہ جاننا ہو کہ کون اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ، مطلوب اور محبوب بندہ ہے اور کون اللہ تعالیٰ کا ناپسندیدہ اور راندۂ

درگاہ بندہ ہے تو اس کی بنیاد اور قطعی علامت صرف دین، دینی شعور، اور دیندارانہ زندگی کی توفیق ہے۔ جب آپ کسی بندے کو دیکھیں کہ وہ دین پر عمل کر رہا ہے اور دیندارانہ زندگی گزار رہا ہے تو یقین کر لیں کہ اس پر اللہ کی رحمت ہے یہ اللہ کا محبوب اور مطلوب بندہ ہے اور جب کسی شخص کو دیکھیں کہ وہ دین سے محروم ہے بے دینی یا بددینی کی زندگی گزار رہا ہے، دینی شعور سے عاری ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مطلوب اور پسندیدہ بندہ نہیں ہے، وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہے۔

محض عادات و خصائل اور دولت کی کثرت اور خوشحالی ہرگز اس بات کی علامت نہیں ہے کہ اللہ نے اس بندے کو اپنے کرم سے نوازا ہے اگر وہ دین اور دینی شعور سے محروم ہے تو سمجھ لیجئے کہ اللہ نے اس کو ڈھیل دے رکھی ہے تا کہ وہ اپنے گناہوں اور سرکشیوں کا ڈول اچھی طرح بھر لے۔ یہ قوت، وسائل، دولت اقتدار اور خوشحالی ہرگز اللہ کی عنایت اور رحمت کی دلیل نہیں ہے بلکہ اللہ اس بندے پر اپنی حجت پوری کر رہا ہے کہ میدان حشر میں اس کے پاس کوئی عذر نہ رہے اور ان وسائل سے وہ گمراہی میں جہاں تک جا سکتا ہو جائے اور دل کے ارمان پورے کر لے۔ اس لیے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کسی کو زبردستی ہدایت کی راہ پر نہیں لگاتا بلکہ آزماتا ہے۔ اور آزمائش کے لیے وہ اپنی حکمت کے تحت ہر طرح کے ذرائع فراہم کرتا ہے۔

اسی طرح غربت، تنگدستی، خستہ حالی، کمزوری اور مظلومیت بھی لازماً اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس بندے پر اللہ تعالیٰ کا عتاب ہے، وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہے اور اس کا رب اس سے ناراض ہے اگر ان کمزوریوں کے ساتھ وہ بندہ دیندار ہے دینی ذوق اور دینی شعور رکھتا ہے، اللہ اور رسول کا فرمانبردار ہے اور ان سختیوں اور مصیبتوں کے باوجود وہ دیندارانہ زندگی گزار رہا ہے تو یقین کر لیجئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ مطلوب اور محبوب بندہ ہے۔ ان آزمائشوں میں مبتلا کر کے اللہ تعالیٰ اس کی وفاداری کے مرتبے کو بلند کرنا چاہتا ہے۔ اپنی حکمت کے تحت اسے اور کندن بنانا چاہتا ہے اور ہر غل وغش سے پاک کر کے بلند درجات سے نوازنے کے لیے اپنے پاس بلانا اور مقربین میں شامل فرمانا چاہتا ہے۔

اللہ کی نظر میں کون محبوب ہے اور کون مبغوض، کون مقرب ہے اور کون راندۂ درگاہ اس کی فیصلہ کن بنیاد اور علامت ''دین'' ہے —— جس کو بھی اللہ نے دین کی دولت دی ہے اور دیندار بن کر رہنے کی توفیق بخشی ہے خواہ وہ صحت وخوشحالی میں ہو یا کمزوری، بیماری اور تنگ دستی میں ہو یقیناً وہ اللہ کا پیارا اس کا محبوب اور مطلوب بندہ ہے اور جو دین سے محروم اللہ اور رسول کی نافرمانی کی زندگی گزار رہا ہے خواہ وہ تنگی اور عسرت، خستہ حالی اور مظلومیت کی زندگی گزار رہا ہو یا خوشحالی اور صحت واقتدار کی، بہرکیف وہ اللہ تعالیٰ کا ناپسندیدہ اور راندۂ درگاہ ہے اور اللہ کے غضب میں گرفتار ہے۔

کسی کو دنیا کی نعمتوں سے مالا مال دیکھ کر آپ یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ اللہ اس بندے سے خوش ہے اور اس سے محبت کرتا ہے۔ دنیا کی یہ نعمتیں اس کو بھی دی جاتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کا محبوب ہے اور اس کو بھی دی جاتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کا مبغوض ہے اور جس پر وہ غضبناک ہے۔ البتہ جب آپ کسی شخص کو دین کی نعمت سے مالا مال دیکھیں تو یقین کر لیں کہ اس بندے پر اللہ کی نظر کرم ہے اور یہ رب کا پیارا اور محبوب و مطلوب بندہ ہے۔

انسان کی سعادت کی معراج اور اس کی طلب اور آرزو کی منتہا یہی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے رب کا محبوب اور مطلوب بندہ بن جائے، اللہ اس سے پیار کرنے لگے اور اپنے پیارے بندوں میں شامل فرمائے۔ اگر ہم واقعی اس آرزو میں سچے ہیں یہ تمنا حقیقتاً ہمارے دل میں ہے اور ہم اپنے رب کے مطلوب بندے بننا چاہتے ہیں تو حتمی فیصلہ کریں اٹل عزم کریں اور یکسوئی دلجمعی اور نشاط کے ساتھ دیندارانہ زندگی گزاریں، شعور کے ساتھ دیندار بن کر رہیں اور پوری زندگی میں اللہ اور رسول کی اطاعت میں سرگرم رہیں اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی لذت سے کسی لمحے بھی اپنی زندگی کو محروم نہ ہونے دیں۔



# اسلام کے تعارف کا انداز

اسلام کی سادہ واضح اور دل کو اطمینان کی ٹھنڈک دینے والی تعلیم کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ یہ کائنات پیدا کرنے والا اللہ ہے اور وہی انسان کا بھی خالق ہے وہ انسانوں پر بے انتہا مہربان ہے۔ شب وروز انسان کو اپنی رحمتوں، نوازشوں اور بے حدوحساب نعمتوں سے نواز رہا ہے۔ اس پروردگار کے علاوہ کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں، بندگی، عبادت اور اطاعت کے لائق صرف وہی اکیلا معبود ہے، اسلام مسلمانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس حقیقت کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کریں اس پر پختہ یقین رکھیں اور زبان سے اس حقیقت کا اعلان کریں اس یقین واعلان کے ذریعے ہی آدمی مؤمن اور مسلم بنتا ہے۔

اللہ کی بے پایاں رحمتوں اور بے حدوحساب نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے ہر دور میں انسانوں کو گمراہی اور ضلالت کی ہلاکتوں اور پستیوں سے بچانے اور راہ ہدایت دینے کے لیے رسول اور پیغمبر بھیجے، جو اللہ کی مرضی کا علم لے کر آئے اس کا دیا ہوا ہدایت نامہ لے کر آئے' یہ پیغمبر اور رسول، نوع انسانی کے سب سے برگزیدہ سب سے افضل اور مثالی انسان تھے، ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جس دین اور ہدایت کی طرف انہوں نے لوگوں کو دعوت دی۔ سب سے پہلے خود اس پر ایمان لائے سب سے بڑھ کر خود اس پر عمل کیا اور اعلان کیا کہ سب سے پہلے ہم اس ہدایت کو مانتے ہیں ''انا اول المسلمین'' ہم سب سے پہلے مسلم ہیں اور یہ برگزیدہ ہستیاں ایمان لانے والوں اور پیروی کرنے والوں کے لیے بہترین نمونہ اور مثال بنے۔ ان پیغمبروں اور نبیوں کے سردار سب سے آخر میں آئے، ان پر نبوت ختم ہوگئی۔ اب رہتی زندگی تک جو شخص بھی ہدایت کی راہ پر چلنا چاہے اور اللہ کے دین پر عمل کرنے کا آرزومند ہو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اس حقیقت پر تہ دل سے ایمان لائے اور کامل اطمینان کے ساتھ اس حقیقت کا اعلان کرے کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور ان پر نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔

ان حقیقتوں پر پختہ یقین وایمان اور اس یقین وایمان کا اعلان دین کا مرکزی نکتہ اور اسلامی نظریہ حیات کا بنیادی سرچشمہ ہے۔ اسی مرکزی نکتہ سے پورا دین اسلام پھوٹتا ہے۔ اس کے بغیر دین کا کوئی جز ٹھیک نہیں ہوتا، اسی

کو کلمہ طیبہ کہا جاتا ہے اور اسی کا اقرار و اعلان کر کے آدمی دائرہ اسلام میں داخل ہوتا اور صاحب ایمان بنتا ہے۔ اس پختہ یقین اور ایمان کے اعلان کی توفیق جس خوش نصیب کو بھی حاصل ہو اس کی دینی ذمہ داری یہ قرار پاتی ہے کہ وہ اپنے حلقہ تعارف میں اس کلمہ کو عام کرے، اس کی حقیقت اللہ کے بندوں کو سمجھائے' دلسوزی اور دلی تڑپ کے ساتھ اس کو لوگوں کے دلوں میں اتارنے کی کوشش کرے اور لوگوں کو تیار کرے کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کریں اور اس پر ایمان لائیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس حقیقت کو دل سے تسلیم کر کے سخت ترین ماحول میں اس کا اعلان کیا اور اس کلمہ طیبہ کو عام کرنے اور اللہ کے بندوں تک اس حقیقت کو پہنچانے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ وہ ایمان لانے کے بعد اپنے قبیلوں میں پہنچے۔ تو اپنوں تک یہ دعوت پہنچانے کے لیے بے چین رہے دوسرے قبیلوں میں پہنچے تو وہاں یہی دعوت پیش کی۔ ان کا مقصد زیست، زندگی کے معیار کو بلند سے بلند تر کرنا اور بنک بیلنس بڑھانا نہیں تھا بلکہ ان کا اصل ہدف اور اصل سرمایہ یہ تھا کہ وہ کتنے افراد کے دلوں میں اللہ کی یہ دعوت اتارتے ہیں اور کتنوں کو حلقہ بگوش اسلام بناتے ہیں۔

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا جب ایرانی سپہ سالار رستم اور دوسرے ایرانی کمانڈروں سے سامنا ہوا تو مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے نپے تلے لفظوں میں ان کے سامنے اپنی حیثیت اور پیغام کا اظہار اس طرح فرمایا:

''ہم لوگ تاجر نہیں ہیں ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اپنی تجارت کے فروغ کے لیے نئی منڈیاں تلاش کریں۔ ہمارا نصب العین یہ دنیا نہیں ہے بلکہ ہمارا مقصود آخرت ہے، صرف آخرت، ہم دین حق کے علمبردار ہیں اور اس دینِ حق کی طرف لوگوں کو بلانا ہمارا نصب العین ہے۔''

اسلامی کمانڈر کی زبان سے یہ دل میں اتر جانے والے کلمات سن کر رستم چونک گیا۔ اس کی فطرت نے پذیرائی کی اور بولا۔ ''عرب کمانڈر! وہ دین حق کیا ہے جس کی طرف تم اللہ کے بندوں کو بلاتے ہو ذرا اس کا تعارف تو کراؤ۔'' حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ یہی تو چاہتے تھے۔ آپ نے فرمایا:

''ہمارے دین حق کی اصل بنیاد اور مرکزی نکتہ جس کے بغیر اس دین کا کوئی جز ٹھیک نہیں ہوتا یہ ہے کہ انسان اس حقیقت کا اعلان کرے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔''

حقیقت یہی ہے کہ اس اصل بنیاد ہی سے پورا دین پھوٹتا ہے اور پورے دین کا نظام اسی شیرازے سے وابستہ ہے۔ اسلام کی اس فطری تعلیم اور بنیادی نکتے کو سننے کے بعد رستم کی طلب اور بڑھی اور اس نے کہا۔ ''مغیرہ رضی اللہ عنہ! یہ تو بہت ہی اچھی تعلیم ہے، کیا اس دین کی اور بھی کچھ تعلیم ہے۔'' رستم کے بڑھتے ہوئے شوق کو دیکھ کر مغیرہ رضی اللہ عنہ نے بڑے جذبے سے کہا:

''اس دین حق کی ایک تعلیم یہ ہے کہ انسانوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں لایا

جائے۔"

ایرانی سپہ سالار کی فطرت جاگ اٹھی اور اس نے اعتراف کرتے ہوئے کہا "یہ تو واقعی بہت اچھی تعلیم ہے کیا تمہارے اس دین کی کچھ اور تعلیم بھی ہے؟"

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "ہمارا دین یہ بھی بتاتا ہے کہ دنیا کے سارے انسان آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اور وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، سگے بھائیوں اور بہنوں کی طرح ایک ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں۔" اللہ واحد کی عبادت اور اس سے محبت کا فطری جذبہ ہر انسان کی فطرت میں ہے ایران ہو یا ترکستان، ہندوستان ہو یا چین دین حق کی بنیادی دعوت ہر انسان کی فطرت سے مانوس ہے، کسی کے لیے اس دعوت میں اجنبیت نہیں ہے۔ اور سارے انسانوں کے رحیم کی جانب سے آنے والی تعلیم اور بھیجے جانے والے پیغمبر تمام نوع انسانی کے رسول اور پیغمبر ہیں۔ ان کا خطاب کسی خاص نسل، گروہ اور قوم سے نہیں بلکہ نوع انسانی سے ہے ان کی پاکیزہ، بے لوث اور خیر خواہانہ زندگی کو ہر ایک کے سامنے پیش کیجئے' بے جھجک پیش کیجئے۔ یہ زندگیاں خود دین حق کے لیے دلیل روشن ہیں۔ بلاشبہ پچھلے انبیاء کی زندگیوں کو ان کے متبعین نے من گھڑت افسانوں سے رنگین بنایا اور ان کی حقیقی زندگیاں ماند ہو گئیں لیکن اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات بھی محفوظ ہیں اور ان کی زندگی بھی محفوظ ہے۔ اور یہ زندگی ہر طرح کے افسانوں سے پاک ایک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ اس زندگی کو اور ان کی انسانیت نواز تعلیمات کو بے کم و کاست اور بے جھجک ہر ملک ہر نسل ہر گروہ کے سامنے پیش کیجئے آپ دیکھیں گے کہ ہر فطرت میں اس کلمہ کے لیے پذیرائی کا جذبہ ہے۔ بشرطیکہ آپ پوری دلسوزی حکمت اور داعیانہ تڑپ کے ساتھ پیش کریں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

دوسری تعلیم جو اسی سرچشمے سے پھوٹتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں سے اپنی بندگی کرائے آج پوری دنیا اسی لعنت میں گرفتار ہے۔ یہی دس کی گانٹھ ہے اور دنیا کا سارا فساد اسی جڑ سے پھوٹ رہا ہے۔ آج کا ہر خوددار اور ذی شعور انسان اس مصیبت سے نجات چاہنے کے لیے بے تاب ہے۔ اس تعلیم کو یقین کی قوت اور سلیقے سے آپ جس ملک اور جس قوم میں بھی پیش کریں گے محسوس ہوگا کہ یہ مخاطب کے دل کی آواز ہے اس کے دل کی ایک کسک ہے جس کو آپ نے الفاظ کا جامہ دے دیا ہے۔ اور ہر دل کو اس کی پذیرائی کے لیے کھلا پائیں گے۔

تیسری تعلیم کہ دنیا کے تمام انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں اور روئے زمین کے سارے مرد اور ساری عورتیں سگے بہن بھائیوں کی طرح ہیں ایک ایسی حقیقت اور ایسی دلنشیں تعلیم ہے جو دنیا کے اس وقت کے تمام

جھگڑوں کو ختم کرنے والی ہے۔ بھائی اور بہن میں، بہن اور بہن میں بھائی اور بھائی میں باہم محبت، مودت، اخوت، پیار اور قربت ہوتی ہے نہ کہ کشاکش، نفرت، عناد اور بیزاری۔ آج جو قوموں کے درمیان نفرت بیزاری اور ایک دوسرے کے خلاف عناد اور دشمنی ہے، اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ رب کی یہ تعلیم ان کی نگاہوں سے اوجھل ہے، وہ اس حقیقت واقعی سے نابلد ہیں اور غلط افکار و نظریات کا شکار ہیں، دین حق کی اس تعلیم کو پورے زور اور حکمت کے ساتھ پیش کیجیے تو آپ محسوس کریں کہ ہر دل کو اس تعلیم سے سکون ملے گا۔ اور وہ اس کو اپنے دل کی آواز سمجھے گا۔ اور آپ کے وجود کو انسانی سماج کے لیے رحمت تصور کرے گا۔ ان حقائق اور بنیادی تعلیمات کو ایک اور عرب کمانڈر ربعی بن عامر نے اسی ایرانی سپہ سالار کے سامنے ان الفاظ میں پیش کیا۔

اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس فریضے پر مامور کیا ہے کہ ہم ان اللہ کے بندوں کو جن کو اللہ نے توفیق سے نوازا ہے انسانوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کریں اور اس تنگ دنیا سے نکال کر ایک وسیع اور کشادہ دنیا میں لائیں اور ظالمانہ نظام ہائے زندگی سے نکال کر اسلام کے عدل وانصاف کے سائے میں لائیں۔ پس اللہ نے ہمیں اپنا دین حق دے کر اپنی مخلوق کے پاس بھیجا ہے تاکہ ہم لوگوں کو اس دین حق کی طرف بلائیں۔

ہم سب اللہ کے بندے ہیں، ہم سب کی عبادت کے لائق صرف ایک اللہ ہے جو پوری دنیا کا خالق ہے یہی وہ تعلیم ہے جس پر ہم پوری دنیا کے انسانوں کو متحد کر سکتے ہیں اور انسانی اتحاد کی بنیاد ڈال سکتے ہیں اور اس حقیقت کے شعور سے قلب ونگاہ میں کس قدر وسعت، اعتماد اور قوت پیدا ہوتی ہے کہ روئے زمین پر بسنے والے سارے انسان خواہ وہ مرد ہوں یا عورت ہمارے بہن بھائی ہیں ہم سب ایک ماں باپ کی اولاد ہیں اور سگے بہن بھائیوں کی طرح ہیں، اللہ سے تعلق ومحبت کی یہ بنیاد اور صلہ رحمی کا یہ وسیع ترین تصور انسانیت کی مشترک میراث ہے، یہ وہ دعوت ہے جو ہمیشہ انبیا نے پیش کی ہے اور یہ ہر ملک ہر نسل، ہر قوم، ہر رنگ اور ہر زبان کے بولنے والے انسانوں کے لیے یکساں قابل قبول ہے۔ سب کے جذبہ عبودیت کو تسکین دینے والی اور سب کے الجھے مسائل کو حل کرنے والی دعوت ہے، اس کو اپنانے میں نہ کوئی زبان آڑے آتی ہے نہ کوئی قومیت اور نسل آڑے آتی ہے اور نہ کوئی ملک اور وطن اور نہ جغرافیائی حدود۔

اسلام کے داعی کو اسلام پر اسی نقطہ نظر سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ دین، نسلی میراث یا ملی شعار نہیں ہے۔ یہ تمام انسانوں کا دین ہے اولاد آدم کی مشترک میراث ہے اس پر کسی قوم، کسی گروہ کا قطعاً کوئی اجارہ نہیں ہے، یہ مشرق سے طلوع ہونے والے سورج اور فضا میں چلنے والی ہوا کی طرح نوع انسانی کے لیے ایک عام نعمت ہے یہ نعمت ہر اس انسان کے لیے ہے جو اس کو قبول کر کے اس پر ایمان لائے اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کی سعادت پائے، خواہ وہ کوئی زبان بولتا ہو، کسی رنگ کا ہو، کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو، کسی ملک کا باشندہ ہو

اور کسی قوم اور کسی قوم اور تہذیب سے تعلق رکھتا ہو۔

آج اللہ نے ہمیں برصغیر میں اس کام پر مامور فرما کر یہاں بسایا ہے، ہمارا یہاں رہنا بسنا اللہ کے عظیم تر منصوبے کا ایک حصہ ہے۔ اس ملک میں شب و روز جن سنگین مسائل کا ہمیں سامنا ہے۔ جان و مال و عزت و آبرو کے جن خطرات میں ہم مبتلا ہیں اور عملاً جن خطرات سے دوچار ہیں۔ ان کا علاج بھی یہ ہے کہ ہم اپنی اصل حیثیت کو پہچانیں اللہ کی اصل دعوت پر دھیان دیں، جس ایمان کا ہم دعویٰ کرتے ہیں اور ایمان کے جس اعلان کیساتھ ہم اس ملک میں زندگی گزار رہے ہیں اس دعوت کو پیش کرنے سے متعلق اپنے دینی فریضے کو سمجھیں اور سنجیدگی، احساس فرض اور کامل شعور کے ساتھ اللہ کی ہدایت کے مطابق اس دین کی نمائندگی کریں۔ اپنے قول و فکر سے بھی اور اپنے سیرت و اعمال سے بھی —— یہی ہمارے دنیوی مسائل کا بھی حل ہے اور یہی آخرت کی فلاح و نجات کی بھی ضمانت ہے۔



# دین و دنیا کے معاملے میں صحیح اندازِ فکر

یہ دنیا جس میں ہم آپ زندگی گزار رہے ہیں دراصل ایک امتحان گاہ ہے۔ اللہ نے یہاں موت و زیست پیدا کر کے انسان کو آزمایا ہے کہ کون اپنے پیدا کرنے والے پروردگار کی مرضی کے مطابق حسنِ عمل کی زندگی گزار رہا ہے اور کون اپنے خالق و مالک سے سرتابی کر کے اپنی خواہشات کا غلام بن کر اللہ کے غضب کو بھڑکا رہا ہے۔

آزمائش اور امتحان کے انداز اور حالات مختلف ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ دنیا امتحان کی جگہ ہے اور یہ زندگی امتحان اور آزمائش کی مہلت ہے یہاں ہر لمحے کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ اور ہر ایک اپنا ریکارڈ تیار کر رہا ہے جونہی یہ زندگی کی مہلت ختم ہوگی انسان کے عمل اور امتحان کی مہلت ختم ہو جائے گی۔

یہاں اللہ نے کسی کو دولت و ثروت سے نوازا ہے، بے پناہ وسائل حیات عطا کیے ہیں اور اس قدر دیا ہے کہ وہ حیران و پریشان ہے کہ کہاں خرچ کرے اور کوئی ایسا ہے کہ دانے دانے کو ترس رہا ہے اور افلاس کی مار سے نڈھال ہے، کسی کے پاس عظمت و اقتدار ہے، طاقت و قوت ہے اور اسے ڈھیل ملی ہوئی ہے کہ وقت مقررہ تک جس طرح چاہے من مانی کرے، کسی کو مغلوب، محکوم اور کمزور و بے بس بنا دیا ہے کہ وہ مظلومی اور بے کسی کی زندگی گزارے، کسی کو حسن و جمال اور وجاہت سے نواز رکھا ہے اور بھرپور جسمانی صلاحیتیں دے رکھی ہیں اور کسی کو اندھا، بہرا، گونگا اور معذور و اپاہج بنا دیا ہے کہ لوگوں کے لیے سامانِ عبرت بنا ہوا ہے کسی کو ناموری اور شہرت عطا کر کے عروج پر پہنچا دیا ہے اور کسی کو گمنامی کے گڑھے میں کسمپرسی کی زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

کسی کو علم و عمل سے نوازا ہے اور نیکی، تقویٰ اور خدا ترسی کی توفیق دی ہے اور کوئی سرکش اللہ سے بے نیازی اور بے عملی اور بدعملی کی زندگی گزار رہا ہے۔ کسی کو دینداری اور علومِ نبوت سے نواز کر بندوں کو اس کا عقیدت مند بنایا ہے اور کوئی اس سعادت سے محروم زندگی کے لمحات بِتا رہا ہے۔ غرض اس دنیا میں کسی کے پاس دنیا ہے اور کسی کے پاس دین ہے، آزمائش کے انداز مختلف ہیں، حالات اور کیفیات مختلف ہیں کسی کو اللہ نے دنیا اور اس کا مال و متاع دے کر آزمایا ہے اور کسی کو اللہ نے کچھ صلاحیتیں اور قوتیں دے کر آزمایا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ایک مؤمن دنیا میں لوگوں کو دینی اور دنیوی نعمتوں سے مالا مال دیکھ کر کیا اندازِ فکر اور کیا زاویہ

نگاہ اپنائے کہ دنیا میں وہ صبر و قناعت، سکون قلب اور اطمینان خاطر کی پرمسرت زندگی گزارے اور آخرت کی نعمتوں کے حصول کے لیے بھی وہ مسلسل سرگرم کار رہے اور کبھی جمود بد دلی اور اضمحلال کا شکار نہ ہو۔

دنیا میں اللہ کے بندوں کو جو کچھ حاصل ہے اور جن حالات، کیفیات اور حیثیات میں وہ زندگی گزار رہے ہیں ان کا تجزیہ جب آپ کریں گے تو دو باتیں آپ کے سامنے آئیں گی۔ کچھ تو ایسے لوگ نظر آئیں گے جن کو اللہ نے دین کی دولت سے نوازا ہے، تقویٰ، پاکیزگی، خدا ترسی اور علم و بصیرت کے جوہروں سے ان کی زندگیاں آراستہ ہیں وہ دین سے شغف رکھنے والوں کے لیے مرکز عقیدت اور نمونہ ہیں اور کچھ لوگ وہ نظر آئیں گے جن کو اللہ نے دنیوی مال و دولت، عیش و راحت، دنیوی مسائل اور خوشحالی سے نوازا ہے ان حالات میں ایک مؤمن اگر سکون قلب، عافیت اور طمانیت خاطر کی زندگی گزارنے کا طالب ہے تو وہ دو خصلتیں اپنے اندر پیدا کرے تو وہ ان شاء اللہ صبر و قناعت اور شکر و اطمینان کی کیفیت اپنے اندر پائے گا اور وہ اللہ کی نظر میں بھی صابر و شاکر قرار پائے گا۔

ایک یہ کہ جب بھی وہ دنیوی نعمتوں سے نوازے گئے لوگوں کے حالات پر غور کرے تو ہمیشہ ان لوگوں پر نگاہ جمائے جو اس سے کمتر حیثیت کے مالک ہوں، یہ اندازِ فکر اختیار کرنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ اللہ نے جن نعمتوں سے اس کو نواز رکھا ہے ان پر اس کے دل میں شکر کے جذبات پیدا ہوں گے اور وہ اللہ کا شکر ادا کرے گا۔ اور جب وہ دینی نعمتوں سے نوازے گئے لوگوں پر نگاہ کرے تو ہمیشہ اپنے سے اونچے اور بلند حیثیت کے لوگوں پر نگاہ کرے تو ان کی پیروی کرنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا جذبہ ابھرے گا اور ایسے بندے کو اللہ تعالیٰ اپنے یہاں صابر و شاکر بندہ شمار فرمائے گا اور ایک صابر و شاکر بندے کی دنیوی زندگی بھی سکون و عافیت شکر و سپاس اور صبر و قناعت کی مثالی زندگی ہوگی اور آخرت کے جہد مسلسل کے نتیجے میں آخرت کی زندگی بھی مثالی زندگی ہوگی۔

دنیا کی دولت اور دنیوی نعمتوں میں جس بندے کی نگاہ اپنے سے نیچے والے پر ہوگی وہ قناعت کے جوہر سے آراستہ ہوگا۔ وہ دنیا کے پیچھے دوڑنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے والا اور اپنی حیثیت پر اطمینان کی سانس لینے والا ہوگا۔ وہ اپنے سے نیچے کے لوگوں کو دیکھ کر شکر کے جذبات سے سرشار ہوگا۔ اور اپنے سے نیچے کے لوگوں پر ترس کھائے گا اور اسے شکر و قناعت کی قابلِ رشک زندگی گزارنے کی توفیق حاصل ہوگی وہ حرص و طمع، دجل و فریب اور مادیت پرستی کی لعنتوں سے پاک ہوگا۔ اس کے برخلاف جو دنیا میں اپنے سے اونچے پر نگاہ رکھے گا وہ ہر لمحہ دنیا کے پیچھے دوڑنے اور زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی ہوس میں پریشان اور سرگرداں رہے گا اور ہر وقت ”ھل من مزید“ کی صدا لگاتا رہے گا۔ اور جب کسی ایک اونچے مرحلے پر پہنچے گا تو دوسرے مرحلے کی فکر میں ہوگا۔ اور اس کی زندگی اس مادی دوڑ میں حیران و سرگرداں رہے گی اسے کبھی سکون و اطمینان کی اور قناعت و شکر کی زندگی نصیب نہ ہوگی اس لیے کہ بہت کچھ آگے جانے کے بعد بھی بہت سے اس سے آگے ہوں گے اور وہ اس ہوس

کی آگ میں مستقل جلتا اور پیچ و تاب کھاتا رہے گا کسی لمحے بھی اس کو اطمینان قلب اور حقیقی مسرت کی دولت میسر نہ آسکے گی۔ اطمینان قلب، قناعت و شکر اور حقیقی مسرت حاصل کرنے کا گُر تو یہی ہے کہ دنیوی زندگی میں آپ ہمیشہ اپنے سے نیچے والے کو دیکھیں۔

رہا دین اور دین میں ترقی کرنے کا معاملہ تو اس سلسلہ میں مؤمن کا نقطۂ نگاہ ہمیشہ یہ ہونا چاہیے کہ اپنے سے اونچے پر نگاہ رکھے۔ یہ نقطہ نگاہ اس کو ہر لحہ سرگرم سفر رکھے گا۔ کسی لمحے بھی اس میں جمود اور سرد مہری پیدا نہ ہوگی بہت کچھ پالینے کے بعد بھی اس کو محسوس ہوگا کہ وہ بہت سے لوگوں سے پیچھے ہے اور ابھی بہت کچھ پانے کے لیے باقی ہے۔ اور اس کی آخرت کی دائمی زندگی بہتر سے بہتر بنتی چلی جائے گی اور وہ دنیا والوں کے لیے ایک مثال قرار پائے گا۔

حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا کے واسطے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

خصلتان من کانتا فیه کتبه الله شاکرًا صابرًا، من نظرفی دینه الی من هو فوقه فاقتدٰ به ونظرفی دنیاه الی من هو دونه فحمد الله علی ما فضله الله علیه کتبه الله شاکرًا صابرًا ومن نظرفی دینه الی من هو دونه ونظر فی دنیاه الی من هو فوقه فاسف علی مافاته منه لم یکتبه الله شاکرا ولا صابرا (ترمذی)

”دو خصلتیں ہیں کہ جس بندے میں یہ ہونگی وہ اللہ کے یہاں صابر و شاکر لکھا جائے گا۔ ایک یہ کہ وہ دین کے معاملے میں ان بندوں پر نظر رکھے جو دِین میں اس سے آگے اور برتر ہیں اور وہ ان کے نقش قدم پر چلے اور دوسری خصلت یہ ہے کہ دنیا کے معاملے میں وہ ان لوگوں پر نگاہ رکھے جو اس سے نیچے اور کمتر حیثیت کے مالک ہیں پس وہ اس فضل و کرم پر اللہ کا شکر ادا کرے گا جو اللہ نے اس پر کیا ہے تو اللہ ایسے بندے کو اپنے ہاں صابر و شاکر لکھے گا اور جو شخص دین کے معاملے میں اپنے سے نیچے اور کمتر پر نظر رکھے گا اور دنیا کے معاملے میں اپنے سے اونچے پر نظر رکھے گا اور وہ ان دنیوی نعمتوں کے نہ ملنے پر افسوس کرے گا جن سے وہ محروم ہے تو اللہ ایسے بندے کو اپنے ہاں صابر و شاکر نہیں لکھے گا۔“

اس حدیث میں اللہ کے رسول صادق و امین نے دنیا کی زندگی میں پرسکون اور باوقار اور کامیاب رہنے کا یہ گُر سکھایا ہے کہ آدمی اپنے اندر دو خصلتیں پروان چڑھانے کی کوشش کرے کہ دین کے معاملے میں ہمیشہ اپنے سے فائق اور برتر پر نگاہ رکھے اور ان کی پیروی اختیار کرے تو وہ دین میں اونچا اٹھتا ہی چلا جائے گا اس لیے کہ جس مرحلے تک وہ اونچا اٹھے گا۔ اسے کچھ اور لوگ اس سے بھی اونچے اور فائق نظر آئیں گے اور اس طرح دین کے

درجات میں یہ بلندی کا سفر تا زیست جاری رہے گا۔

اور دنیا کے معاملے میں ہمیشہ اپنے سے کمتر پر نگاہ رکھے تو وہ ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا بے اختیار شکر ادا کرے گا جن سے وہ نوازا گیا ہے اور شکر کا یہ جذبہ کبھی ماند نہ پڑے گا۔ اس لیے کہ جو شخص بھی یہ عادت اپنائے گا اس کو ضرور دنیوی نعمتوں میں اپنے سے کمتر لوگ ملیں گے اور لازماً اس کے اندر ان نعمتوں پر شکر کے جذبات ابھریں گے جن سے یہ نوازا گیا ہے اور وہ لوگ محروم ہیں جو اس سے کمتر ہیں اور اس کی نظر میں ہیں۔ اس طرح وہ اپنی زندگی سے حرص وہوس اور طمع ولالچ جیسے رذائل اخلاق کو کھرچ ڈالے گا اور شکر وقناعت کے جذبات سے اس کی زندگی آراستہ ہوتی چلی جائے گی۔ وہ ہمیشہ اس احساس سے مسرور اور خوش گمان رہے گا کہ اللہ نے بہت سے لوگوں پر اسے فضیلت دے رکھی ہے اور کتنے ہی لوگوں سے زیادہ اس کو نواز رکھا ہے اور جو کچھ اسے اللہ نے دیا ہے جن سے بہت سے اللہ کے بندے محروم ہیں اس طرح وہ صبر وشکر، قناعت واطمینان کی باوقار اور پرسکون زندگی گزارے گا اور کبھی حرص ولالچ میں مبتلا نہ ہوگا۔



# حفاظتِ شکم

سیرت و کردار کی تعمیر، اصلاح باطن، اپنی شخصیت کو اللہ کی نظر میں مقبول بنانے اور اپنے رب کی بندگی کی حلاوت حاصل کرنے کے لیے جو جدو جہد مطلوب ہے اور جن چیزوں کا اہتمام کرنے کی ہدایت ہے ان میں ایک اہم ترین چیز شکم کی حفاظت و اصلاح ہے اور یہ حقیقت ہے کہ شکم کی اصلاح اور حفاظت نہایت ہی مشقت طلب اور مشکل ہے۔ اس مقصود کو حاصل کرنے کے لیے ہمہ وقتی کوشش و کاوش اور فکر و احتیاط کے علاوہ یہ جاننا بھی انتہائی ضروری ہے کہ اس سلسلے میں قرآن وسنت کی ہدایات کیا ہیں اور شکم کی اصلاح و حفاظت کا منشا اور مراد کیا ہے۔

اگر آپ اپنی شخصیت کی تکمیل اور اپنی اصلاح و تربیت کے معاملے میں واقعی سنجیدہ اور مخلص ہیں تو نہایت ضروری ہے کہ آپ اس سلسلے کی ہدایات کو نہایت توجہ اور سچی طلب کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں اور اس معاملے میں زبردست احتیاط اور کامل یکسوئی کے ساتھ مسلسل فکر و کوشش کریں اور کسی لمحہ بھی اصلاح باطن اور شکم کی حفاظت سے بے پروائی نہ کریں۔ قرآن وسنت کی مراد کو ہر حال میں پورا کرنے کی سعی کریں اور اس مراد کو پانے کے لیے بزرگوں نے جو کاوشیں کی ہیں اور اس مقصود کو حاصل کرنے کے لیے ان کے جو تجربات ہیں ان سے فائدہ اٹھائیں اور ان کی رہنمائی میں آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔

جسم و جان کی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کا سرچشمہ شکم ہے، شکم کی اصلاح اور حفاظت کے اثرات نہایت گہرے دوررس اور نتیجہ خیز ہوتے ہیں اسی طرح شکم کے بگاڑ اور اس کی حفاظت سے غفلت کے اثراتِ بد اور بگاڑ کے نتائج بھی نہایت گہرے نہایت تباہ کن اور پوری زندگی کو غلط رُخ پر لے جانے والے ہوتے ہیں اگر آپ اپنی زندگی کی اصلاح اور تزکیہ نفس کے معاملے میں مخلص ہیں تو آپ کو اپنے شکم کی حفاظت و اصلاح کے لیے ہمہ دم فکر مند رہنے اور تسلسل کے ساتھ اس معاملے میں سرگرم عمل رہنا ہوگا اور کامل احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ اس لیے کہ جسم و جان کی کمزوری، رذائلِ اخلاق، جنسی بے راہ روی، سرکشی اور اخلاقی پستی کے ظہور کا سرچشمہ بھی پیٹ ہی ہے۔ اگر واقعی اللہ کی بندگی کی حلاوت حاصل کرنی ہے اور اللہ کے دین پر اللہ کی مرضی کے مطابق عمل کر کے اللہ تعالیٰ کا مطلوب بندہ بننے اور اس کے دین کو اس کے منشا کے مطابق اختیار کرنے کا عزم و ارادہ ہے تو آپ کے لیے لازم

ہے کہ آپ سب سے زیادہ فکر اس بات کی رکھیں کہ آپ کے شکم میں کوئی حرام غذا اور حرام ریزہ نہ پہنچنے پائے، حرام ہی نہیں بلکہ مشتبہ چیزوں سے بھی دور رہیں اور پاک باطن رہنے کا تقاضا تو یہ ہے کہ فضول حلال سے بھی شکم کی حفاظت رکھیں۔

حرام اور مشتبہ چیزوں سے آپ کیوں بچیں اس سلسلہ میں اہل علم وبصیرت نے قرآن وسنت کی روشنی میں تین وجوہ کی نشاندہی کی ہے۔

## پہلی وجہ، حرام غذا جہنم کی آگ:

حرام اور مشتبہ غذا سے اپنے شکم کی حفاظت کی پہلی اور سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ ایسی غذا در اصل جہنم کی آگ ہے۔

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنے شکم کو حرام مال سے بھرتے ہیں وہ در اصل اپنے کو جہنم کی آگ میں جھونکنے کی کوشش کرتے ہیں، حرام چیزیں کھانے والا در اصل آگ سے اپنے شکم کو بھرتا ہے اور آخرت کی زندگی میں وہ بھڑکتی آگ میں جھونکا جائے گا۔

قرآن میں ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ۝ (النساء آیت ۱۰)

”جو لوگ یتیموں کا مال ظالمانہ طریقوں سے کھاتے ہیں در حقیقت وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی آگ میں جھونکے جائیں گے۔“

اور ایک دوسرے مقام پر ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۗ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ ۝

(التوبہ ۳۴،۳۵:۹)

”اے ایمان لانے والو! اہل کتاب کے اکثر علما اور درویشوں کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ دردناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی

سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔"

اور حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

كل لحم نبت من سحت فالنار اولٰى به (مسند احمد، جلد ۳، ص ۳۲۱)

"جسم کا جو گوشت حرام غذا سے بنا ہے اس کے لیے جہنم کی آگ میں جلنا ہی مناسب ہے۔"

## دوسری وجہ، حرام غذا راندۂ درگاہ بناتی ہے:

قرآن وسنت کے گہرے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ جو شخص حرام اور مشتبہ غذاؤں سے اپنا پیٹ بھرتا ہے اس کو کبھی صحیح اور مخلصانہ عبادت کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔ عبادت کی حلاوت اور عمل صالح کی توفیق کے لیے ظاہر و باطن کی پاکیزگی ناگزیر ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی آسمانی کتاب میں ایک جنبی ناپاک انسان کو اپنے پاک گھر مسجد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی ہے اور بغیر وضو کے اپنی پاک کتاب قرآن مجید چھونے کو پسند نہیں کیا ہے، قرآن کا ارشاد ہے:

وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا

"کسی جنبی کے لیے جائز نہیں کہ وہ غسل کیے بغیر مسجد میں داخل ہو الا یہ کہ وہ مجبوراً راستہ عبور کر رہا ہو۔"

اور بے وضو قرآن کو ہاتھ لگانے کے بارے میں ارشاد ہے:

لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعہ ۵۶: ۷۹)

"قرآن پاک کو وہی چھو سکتے ہیں جو پاک ہیں۔"

ظاہر ہے جنابت سے ہونا بھی ایک مباح اور جائز کام ہے اور بے وضو ہونا بھی مباح اور جائز ہے لیکن ایک مباح کام کی وجہ سے آدمی اگر ظاہری طور پر پاک نہ ہو تو اس کے لیے اللہ کے پاک گھر مسجد میں قدم رکھنے کی ممانعت ہے اور قرآن پاک کو ہاتھ لگانا ناپسندیدہ ہے تو جو شخص حرام اور مشتبہ چیزوں سے پیٹ بھر رہا ہو اور جسم و جان کی پرورش کر رہا ہو ایسا شخص رب کے حضور کھڑے ہونے کی توفیق کیسے پا سکتا ہے اور رب کی عبادت و ذکر کی حلاوت سے کیسے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ حضرت منادر ازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"طاعت و عبادت اللہ کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے اور اس خزانے کی کنجی دعا ہے اور اس کنجی کے دندانے حلال روزی ہے۔ اگر چابی میں دندانے نہ ہوں تو دروازہ ہرگز نہیں کھل سکتا اور جب تک دروازے نہ کھلیں خزانوں تک رسائی ممکن نہیں۔"

## تیسری وجہ، حرام غذا نیکی سے محرومی:

حرام اور مشتبہ غذا سے پیٹ بھرنے والا عمل صالح سے محروم رہتا ہے اس کے جو کام بظاہر نیکی یا عبادت کے کام معلوم ہوتے ہیں وہ بھی حقیقت میں نیک اعمال نہیں ہوتے، وہ اللہ کی عبادت اگر کرتا نظر بھی آتا ہے تو اللہ کی نظر میں وہ عبادت کے کام نہیں ہوتے، اس کی تمام محنت و مشقت اور کوشش و کاوش اور نیک اعمال اور عبادات اور نفل ضائع جاتے ہیں اور اس کو اپنی محنت اور وقت عزیز کے لگانے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ وہ اپنے زعم میں نیک کام اور اللہ کی عبادت کرتا ہے مگر اللہ کی نظر میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی اور اس کی محنت و ریاضت رائیگاں جاتی ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

کم من قائم لیس له من قیامه الا السهر و کم من صائم لیس له من صیامه الا الجوع والظماء

"کتنے ہی شب بیداری کرنے والے ہیں جن کو ان کے قیام اور شب بیداری سے رتجگے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور کتنے ہی روزے دار ہیں جن کو ان کے روزے سے بھوک پیاس کے سوا کچھ نہیں ملتا۔"

دراصل عبادات کا مقصود انسان کا تزکیۂ نفس، اصلاحِ باطن اور سیرت کی پاکیزگی ہے۔ عبادات میں اگر یہ مقصود ہی پیش نظر نہ رہے اور آدمی اللہ کے خوف سے بے نیاز حرام اور مشتبہ سے پرہیز ہی نہ کرے تو ایسا شخص اللہ کی عبادت اور نیک عمل سے محروم رہتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

لا یقبل اللّٰه صلٰوة امر فی جوفه حرام

"اللہ ایسے شخص کی نماز قبول نہیں کرتا جس کے شکم میں حرام غذا ہو۔"

حرام اور مشتبہ غذاؤں سے اپنے شکم کی حفاظت کرنے کے یہ تین وجوہ جو علمائے حق نے قرآن و سنت کی روشنی میں بیان کیے ہیں اس لائق ہیں کہ ان کو ہمہ وقت پیش نظر رکھا جائے اور کسی لمحے میں اس معاملے میں لاپروائی، تساہل اور بے توجہی سے کام نہ لیا جائے۔ کیا کوئی ذی شعور مؤمن بقائمی ہوش و حواس برداشت کر سکتا ہے کہ وہ اپنے پیٹ میں جہنم کے انگارے بھرے، وہ بندگی رب کی توفیق و حلاوت سے محروم ہو جائے اور نیک کام کرنے سے محرومی اس کا مقدر بن جائے۔ العیاذ باللہ



# حلال غذا ضرورت سے زیادہ کھانے کی آفتیں

حرام اور مشتبہ غذاؤں سے اپنے شکم کی حفاظت کے سلسلے میں ایک مؤمن کو انتہائی محتاط اور حساس ہونا ہی چاہیے اس لیے کہ حرام سے پرورش شدہ جسم و جان سے کسی خیر اور بھلائی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ مگر اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ ایک مؤمن حرام اور مشتبہ غذاؤں سے ہی اپنے شکم کی حفاظت کرے، بلکہ اصلاح شکم کے سلسلے میں یہ فکر بھی نہایت ضروری ہے کہ حلال غذاؤں کا استعمال بھی بقدر ضرورت ہو، حلال غذاؤں سے غیر معمولی شغف، چٹخاروں کا ذوق اور ضرورت سے زیادہ کھانے پینے کا شوق اور شکم کی خدمت ہی معمول ہو جائے یہ ہرگز مؤمن کے لائقِ شان نہیں ہے۔

ضرورت سے زائد حلال روزی اور زبان و شکم کی لذتوں سے شغف بھی اللہ کے نیک بندوں کے لیے طرح طرح کی آفات پیدا کرنے والی چیز ہے۔ امام غزالی نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ضرورت سے زائد حلال روزی اور فاضل غذا کے استعمال کی ہوس سے دس آفتیں پیدا ہوتی ہیں جو انسان کی اخلاقی اور روحانی زندگی کے لیے تباہ کن ہیں ان دس فساد انگیز آفتوں اور اخلاق سوز برائیوں سے بچے رہنے کے لیے ناگریز ہے کہ حلال روزی بھی بقدر ضرورت احتیاط کے ساتھ استعمال کی جائے اور کھانے پینے کی ہوس اور لالچ سے اجتناب کیا جائے۔

## پہلی آفت:

حلال روزی بھی اگر ضرورت سے زیادہ کھائی جائے تو اس سے قلب میں قساوت پیدا ہوتی ہے اور دل کا نور زائل ہو جاتا ہے۔ نبی صادق و امین ﷺ نے فرمایا:

لا تميتوا القلب بكثرة الطعام والشراب فان القلب يموت كالزرع اذا كثر عليه الماء

"کھانے پینے کی زیادتی سے دل کو مردہ نہ بناؤ۔ (کثرت اکل وشرب سے) دل مر جاتا ہے جس طرح ضرورت سے زائد پانی سے کھیتی مردہ ہو جاتی ہے۔"

اللہ کے صالح بندوں نے اس کی مثال یوں دی ہے کہ انسان کا معدہ دل کے نیچے ایک ابال کھانے والی ہانڈی ہے۔معدہ سے بھاپ اور بخارات دل کو چڑھتے ہیں اور ان بخارات کی کثافت سے دل آلودہ ہو جاتے ہیں۔

## دوسری آفت:

ضرورت سے زیادہ حلال کھانے سے اعضائے جسم میں فتنہ سر اٹھاتا ہے فساد برپا کرنے کی خواہش ابھرتی ہے اور بیہودہ کاموں میں دلچسپی بڑھتی ہے۔ جب آدمی خوب ٹھونس ٹھونس کر پیٹ بھرتا ہے تو جسم میں یک گونہ اکڑ اور گھمنڈ پیدا ہوتا ہے اور آنکھوں میں بدنظری کی خواہش زور مارتی ہے، کان بری باتیں سننے کے مشتاق ہونے لگتے ہیں، زبان بیہودہ بکواس پر آمادہ ہوتی ہے، شرمگاہ میں ہیجان پیدا ہوتا ہے اور پاؤں ان کے تقاضے پورے کرنے کے لیے برے ٹھکانوں کی طرف حرکت کرنے کے لیے بے قرار ہوتے ہیں۔

اس کے برخلاف اگر انسان حلال روزی بقدر ضرورت کھائے پوری طرح شکم پر نہ کرے قدرے بھوکا رہے اور بھوک رکھ کر حلال غذا کھانے کی احتیاط اور اہتمام کرے تو تمام اعضائے بدن پر سکون واطمینان طاری رہتا ہے، اعضا میں نہ کسی برائی کی خواہش اور رغبت پیدا ہوتی ہے نہ وہ برائی اور بیہودگی کو دیکھ کر مسرور اور خوش ہوتے ہیں اور نہ برے کاموں کی طرف لپکتے ہیں۔استاد ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہی خوب فرمایا ہے:

ان البطن عضو ان جاع هو شبع سائر الاعضاء يعني تسكن فلا تطلبك بشيء وان شبع هو جاع سائر الاعضاء

''پیٹ ایک ایسا عضو ہے کہ اگر وہ بھوکا ہو تو جسم کے سارے اعضا سیر ہوتے ہیں یعنی ان پر سکون طاری رہتا ہے اور یہ آپ سے کوئی خواہش نہیں کرتے اور اگر پیٹ بھرا ہوا ہو تو جسم کے تمام اعضا بھوکے (اور بھوک مٹانے کے لیے بے تاب ہوتے) ہیں۔''

حاصل کلام یہ ہے انسان کے تمام اقوال وافعال کی اچھائی، برائی کا تمامتر انحصار اس پر ہے کہ آپ کے پیٹ میں کیسی غذا پہنچ رہی ہے اگر حرام اور مشتبہ غذا پہنچ رہی ہے تو اس سے حرام اور ناروا کام ہی برآمد ہوں گے۔اور اگر حلال روزی پہنچ رہی ہے مگر ضرورت سے زائد تو فضول اور بیہودہ کاموں کا ارتکاب ہی اعضائے جسم سے ہوگا۔غذا گویا تخم کی مانند ہے اور انسان کے اعمال واقوال اس تخم سے اگنے والے پودے ہیں جیسا تخم ہوگا ویسے ہی پودے وجود میں آئیں گے۔

## تیسری آفت:

حلال روزی ضرورت سے اگر زائد استعمال کی جائے اور شکم پری کی ہوس میں انسان پڑ جائے۔تو اس سے علم

وفہم میں کمی پیدا ہوگی۔ اس لیے کہ بے تحاشا شکم پری دانائی، حکمت اور زیرکی کو ختم کر ڈالتی ہے۔ حضرت دارانی رحمۃ اللہ علیہ نے کس قدر سچی اور اچھی بات کہی ہے اگر تم دنیا اور آخرت کی حاجت وضرورت پورا کرنے کے طالب ہو تو خالی پیٹ رکھ کر اسے پورا کرنے کی کوشش وکاوش کرو۔ اس لیے کہ پوری طرح پیٹ بھر کر کھا لینے کے بعد عقل وفہم میں فتور پیدا ہو جاتا ہے اور یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جو ہر تجربہ کار پر آشکارا ہے۔

## چوتھی آفت:

پوری طرح پیٹ بھر کر کھا لینے سے عبادت میں کمی اور کوتاہی ہوتی ہے، اس لیے کہ جب کوئی شخص اچھی طرح سیر ہو کر کھا لیتا ہے تو اس کا بدن بوجھل ہو جاتا ہے، آنکھوں میں نیند بھر جاتی ہے اور اعضائے جسم سست اور ڈھیلے پڑ جاتے ہیں خواہش اور کوشش کے باوجود کچھ کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ ایسا شخص ہر وقت مردے کی طرح بے سکت اور بوجھل پڑا رہتا ہے۔ عربی کا کیا خوب مقولہ ہے۔

اذا كنت بطينا فعد نفسك زمينا

جب تو پیٹو بن جائے تو پھر خود کو بے بس لنجا اور اپاہج سمجھ۔"

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

العبادة حرفة وحانوتها الخلوة والتها المجاعة

"عبادت ایک فن ہے اور اس کی کارگاہ تنہائی اور خلوت ہے اور اس کا اوزار بھوک ہے۔"

## پانچویں آفت:

پیٹ کو حلق تک بھر لینے سے آدمی کا دل اللہ کی عبادت میں نہیں لگتا وہ عبادت کی شیرینی اور حلاوت سے محروم ہو جاتا ہے۔ حضرت صدیق اکبر رفیق غار رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

ما شبعت منذ اسلمت لا جد حلاوة عبادة ربی وما رویت منذ اسلمت اشتیاقًا الٰی لقاء ربی

"جب سے میں اسلام لایا ہوں کبھی میں نے پیٹ بھر کر نہیں کھایا تاکہ مجھے عبادت رب کی شیرینی نصیب ہو اور کبھی سیر ہو کر پانی نہیں پیا اپنے رب کی ملاقات کے شوق میں۔"

یہ صفات دراصل روشن ضمیروں کی ہیں کشف اور روشن ضمیر والے درحقیقت وہ ہوتے ہیں جو رب تعالیٰ سے اخلاص ووفا کا خصوصی رشتہ رکھتے ہیں اور جن کے سامنے آخرت کے خصوصی حالات اس طرح واضح ہوتے ہیں گویا دوسروں کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ان کی آنکھیں وہاں کے مناظر سے محظوظ اور ان کے دل وہاں کی فکر سے مسرور رہتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اسی فضیلت کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

ما فضلکم ابوبکر بفضل صوم ولا صلوٰۃ وانما ھو شیء وقرنی نفسہ

''ابوبکر روزے اور نماز کی بنا پر تم سے افضل نہ تھے بلکہ ان کے قلب میں ایک خاص وصف تھا جو ان کی افضلیت کا سبب تھا۔''

ظاہر ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی اسی شریعت کے پابند تھے، جس کے پابند تمام مسلمان ہیں اسی طرح فرض نمازیں اور فرض روزے رکھتے تھے جیسے کہ عام مسلمان رکھتے ہیں، لیکن اللہ کی وفاداری اور رب سے خصوصی تعلق اور رسول کی مزاج شناسی اور ان کے ساتھ جانثاری کا جو تعلق ان کو تھا وہ امت میں کسی کو حاصل نہ ہوا اور یہی ان کی فضیلت کا حقیقی سبب تھا، ان پر دین کے حقائق اللہ نے منکشف کر دیئے تھے۔ اور وہ اپنے یقین کامل کی بدولت زمین پر رہتے ہوئے آخرت کے نظاروں سے محظوظ ہوئے تھے۔ حضرت دارانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

احلی ماتکون العبادۃ اذا التزق بطنی بظھری

''میں عبادت کی شیرینی ان اوقات میں محسوس کرتا ہوں جب بھوک کی وجہ سے میرا پیٹ میری پیٹھ سے لگا ہوا ہو۔''

## چھٹی آفت:

جب کسی کو خوب خوب پیٹ بھرنے کی ہوس ہوگی تو وہ ہر وقت اس خطرے میں رہے گا کہ مبادا اس کے پیٹ میں حرام یا مشتبہ غذا پہنچ جائے۔ اس لیے عام طور پر حلال روزی فراوانی سے بمشکل نصیب ہوتی ہے حلال روزی گزارے کے لائق ہی میسر آتی ہے البتہ حرام روزی سیلاب کی طرح آتی ہے۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ارشاد ہے:

ان الحلال لا یاتیك الا قوتا والحرام یاتیك جزافا جزافا

''حقیقت یہ ہے کہ حلال روزی تمہیں بقدر ضرورت ہی میسر آئے گی ہاں حرام تمہاری طرف بے تحاشا آئے گا۔''

## ساتویں آفت:

ضرورت سے زیادہ حلال مال اور حلال روزی کی ساتویں آفت یہ کہ آدمی کا قلب و دماغ اس کو جمع کرنے، رکھنے، حفاظت کرنے اور پھر اس سے استفادہ کرنے میں ہر وقت لگا رہے گا اور جسم و جان کی مصروفیت بھی ہمہ وقتی ہوگی۔ پھر جتنا زائد انسان کھائے گا اس کی فراغت کے لیے بھی بار بار آنا جانا ہوگا اور زیادہ سے زیادہ وقت اسی میں صرف ہوگا۔ پھر زائد کھانے سے جسم و جان میں جو خرابیاں پیدا ہوں گی ان سے حفاظت اور سلامتی میں بھی انسان کی قوتیں صرف ہوں گی۔ اس لیے کہ زیادہ کھانے سے بھی انسان کے بدن میں گوناگوں خرابیاں رونما ہوتی ہیں

اور دینی لحاظ سے تو ہزاروں خرابیاں اور برائیاں نشو ونما پاتی ہیں۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

اصل کل داء البردة واصل کل دواء الازمة

''ہر بیماری کی اصل بدہضمی ہے اور ہر علاج کی اصل بھوک اور کم خوراک ہے۔''

حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے:

یا ھولاء تداختلفت الی الخلاء حتی استحییت ربی بسبب کثرة الاکل یالیت ان اللہ جعل رزقی فی حصاة امصھا حتی اموت

''اے لوگو! مجھے بیت الخلا کی طرف بار بار آنا جانا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ زیادہ کھانے سے مجھ کو شرم آنے لگی ہے کاش میری روزی اللہ عزوجل نے کنکریوں میں رکھی ہوتی کہ میں ان کو چوس لیا کرتا۔ اور اسی طرح ایک دن مجھے موت آجاتی۔''

پھر زیادہ کھانے کا مریض دنیا کی طلب میں پڑا رہتا ہے اور لوگوں سے لالچ اور طمع کرتا رہتا ہے اور عمر عزیز خورد ونوش کی فکر ہی میں ضائع کرتا رہتا ہے۔

## آٹھویں آفت:

آخرت کے دن حساب کے ہول اور دہشت کا سبب بھی ضرورت سے زیادہ کھانا ہے اور سکرات موت کی شدت کا باعث بھی یہی پُرخوری ہے۔ روایات میں آیا ہے:

ان شدة سکرات الموت علی قدر لذات الدنیا فمن اکترله من تلك

''واقعہ یہ ہے کہ سکرات موت کی شدت لذات دنیا کے مطابق ہوتی ہے جس نے زیادہ لذتیں حاصل کیں اس کو نزع کی تکلیف بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔''

## نویں آفت:

آخرت کے اجر وثواب میں کمی کا باعث بھی یہی پُرخوری اور لذات دنیا کے پیچھے پڑا رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِىْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ۝ (الاحقاف ۴۶:۲۰)

''تم اپنی دنیا کی زندگی دنیا کی نعمتوں سے خوب لذت اندوز ہو چکے ہو اور ان سے خوب استفادہ کر چکے ہو آج تم کو لذت کی سزا دی جائے گی اس لیے کہ تم دنیا میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے اور اس بنا پر کہ تم نافرمانی کی زندگی گزارتے تھے۔''

اس دنیا کی نعمتوں سے انسان جس قدر زیادہ استفادہ کرے گا اسی قدر اس کا حصہ آخرت میں کم ہو جائے گا۔ اس لیے کہ جب اللہ عزوجل نے اپنے حبیب حضرت محمد ﷺ کے سامنے دنیا کو پیش کیا تو ارشاد فرمایا کہ: اگر اس سے لذت اندوز ہو گے تو بھی آخرت میں اس کے بدلے تمہاری لذتیں کم نہ کروں گا۔ یہ روایت حضور ﷺ کے ساتھ خصوصی معاملے کو واضح کرتی ہے۔ ورنہ عام انسانوں کے لیے تو وہی اصول ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کے ساتھ کوئی خصوصی معاملہ کرنا چاہے تو وہ مختار مطلق ہے۔

ایک مرتبہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو کھانے پر بلایا، جب فاروق اعظم کھانے پر بیٹھے تو فرمایا: یہ کھانے تو ہمارے لیے ہیں، مگر ان فقرا مہاجرین کے لیے کیا ہے جو فوت ہو چکے ہیں اور جنہیں جو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر میسر نہیں آئی۔ خالد رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ان کے لیے وہاں جنت الفردوس ہے۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر وہ جنت کی نعمتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ہم نے اپنا صلے کا بڑا حصہ اس دنیا میں پالیا تو ہمارے اور ان کے مرتبے میں بہت عظیم فرق ہے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو پیاس محسوس ہوئی کہ آپ نے ایک شخص سے پانی لانے کو کہا، اس نے آپ کو ایک برتن دیا جس میں کھجوروں کا رس تھا، جب آپ نے یہ جام منہ سے لگایا تو مٹھاس اور ٹھنڈک کی لذت محسوس ہوئی آپ نے جام منہ سے ہٹا لیا اور ایک سرد آہ کھینچی! وہ شخص قدرے گھبرایا اور بولا حضور اللہ گواہ ہے میں نے اس کو میٹھا رکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ فاروق اعظم نے جواب دیا! اسی مٹھاس نے تو مجھے اس کے پینے سے روک دیا اگر ہمیں آخرت کی فکر نہ ہوتی تو ہم بھی دنیا داروں کی طرح عیش وعشرت میں پڑے رہتے۔

## دسویں آفت:

حلال روزی سے اوپر تک پیٹ بھر لینے اور ضرورت سے زیادہ اس لذت کے پیچھے پڑے رہنے سے آدمی ترک ادب کا مرتکب ہوتا ہے اس کی وجہ سے وہ روز حشر موقف میں روکا رکھا جائے گا اور اس سے پوری طرح حساب لیا جائے گا اور اس کو ضرورت سے زیادہ کھانے اور پیٹ کی پرورش میں لگے رہنے پر شرم دلائی جائے گی اور ملامت کی جائے گی اور شہوت پرستی میں پڑے رہنے پر اس کو برا بھلا کہا جائے گا۔ حلال چیزوں کی کثرت استعمال پر اس سے کڑا احساب لیا جائے گا۔ اور شہوات کے پیچھے پڑے رہنے پر اس کو ڈانٹ ڈپٹ اور تنبیہ کی جائے گی۔

یہ دس آفات ہیں جو حلال روزی کو ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے اور ہمہ وقت نفس کی خواہشات پوری کرنے کے پیچھے لگے رہنے کی وجہ سے پیش آتی ہیں۔ سمجھدار اور صاحب بصیرت آدمی کے لیے تو ان میں سے ایک آفت بھی بہت زیادہ اور نا قابل گوارا ہے۔

# دعوت الی اللہ کی تین اہم باتیں

اللہ کی طرف دعوت دینے کے معنی یہ ہیں کہ لوگ اللہ کی نافرمانی سے بچیں اور اس کی بندگی کریں اور دنیا میں نیکی کا چلن عام ہو، آپ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بندگانِ اللہ کو برائیوں سے بچائیں گے، اس کی نافرمانی سے روکیں گے اور تنہا اس کی بندگی کے لیے آمادہ کریں گے اور نیکی کی زندگی گزارنے کے لیے لوگوں کو تیار کریں گے۔ بہت ہی مبارک عزم و فیصلہ ہے۔

اللہ گواہ ہے کہ آپ کا یہ عزم و فیصلہ بہت بڑی سعادت ہے، اللہ کی طرف سے آپ کو اس سعادت سے سرفراز کرنا اس کا بہت بڑا اکرم ہے اس سعادت، توفیق اور کرم کا تہ دل سے شکر ادا کیجیے اور شکر کا پورا پورا حق ادا کیجیے۔ اللہ کا وعدہ ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (ابراہیم ۱۴:۷)

''اگر تم نے شکر ادا کیا تو میں تمھیں اور زیادہ عطا کروں گا۔''

جس کام پر اللہ نے آپ کو اپنی توفیق سے لگا دیا ہے اس کی قدر کیجیے اور اس فریضے کا حق ادا کرنے کی پوری پوری کوشش کیجیے۔ اس فریضے کا حق ادا کرنے کے لیے آپ کو تین باتوں کا اہتمام ضرور کرنا چاہیے۔

اولین بات یہ کہ آپ خود برائیوں سے بچیں، اللہ کی نافرمانی کے قریب نہ پھٹکیں اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت اور دینداری کی زندگی گزاریں۔ جو کچھ آپ سماج میں دیکھنا چاہتے ہیں اور جس رنگ میں اللہ کے بندوں کو رنگنا چاہتے ہیں اگر آپ کی اپنی زندگی اس خیر و برکت سے محروم ہے اور آپ خود اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے نہیں ہیں تو پھر آپ اور آپ کی دعوت ایک مضحکہ بن جائے گی اور آپ کی دعوت کا کوئی وزن نہیں رہ جائے گا۔ لوگوں کے سینے اس کی قبولیت کے لیے نہ کھلیں گے اور اگر اللہ کی حکمت و مشیت کے تحت کسی نے آپ کی بات قبول کر کے دیندارانہ زندگی اختیار کر بھی لی تو اس شخص کا بھلا تو ہو گیا لیکن آپ دین و ایمان کی خیر و برکت سے محروم رہے اور اس نیکی قبول کرنے والے کی زندگی کا کوئی صلہ آپ کو ملنے کی بجائے الٹی آپ کے خلاف حجت ہو گی۔ ہاں اگر آپ نے اس دعوت کو سب سے پہلے قبول کیا جس کی طرف آپ لوگوں کو دعوت

دے رہے ہیں۔لیکن بشری کمزوریوں کی وجہ سے آپ سے کوتاہیاں ہوگئی ہیں تو اللہ سے توقع ہے کہ وہ آپ کے استغفار کو قبول کر کے آپ کی کوتاہیوں سے درگزر فرمائے گا۔ اور نیکی قبول کرنے والوں کے اجر میں بھی آپ کو برابر کا شریک کرے گا۔

بے شک ہر دعوت دینے والے کو یہ بات سوچنا تو چاہیے کہ میری دعوت میں اثر پیدا ہو۔لوگ اسے قبول کریں اور میری بدکرداری اور بے عملی کی وجہ سے خود دعوت لوگوں کے لیے بے وزن اور مضحکہ نہ بن جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کا قبول کرنا نہ کرنا ثانوی چیز ہے۔ اس سے پہلے ایک داعی کے لیے فکر کی بات یہ ہے کہ اگر میرا کردار اور میری زندگی میری دعوت کے خلاف ہوئی تو میں تباہ ہوگیا۔ میں تو خیر و برکت سے محروم ہوگیا۔ میرے ایمان کو اللہ کیسے قبول کرے گا۔لوگ آپ کی دعوت مانیں یا نہ مانیں۔ اس سے پہلے آپ کے لیے فکر کی بات یہ ہے کہ جو دعوت آپ نے قبول کی ہے خود آپ کی زندگی اس کی برکتوں سے مالا مال ہے یا نہیں، اللہ کی نظر میں آپ اس کے مطلوب اور محبوب بندے بن سکے یا نہیں اور آپ اس کے نزدیک اس کے اطاعت گزار بندے قرار پائے یا نہیں، اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہوگی کہ آپ جس خیر کی طرف دنیا کو بلا رہے ہیں خود آپ اس سے محروم رہ جائیں اور حشر کے میدان میں آپ خدانخواستہ خالی ہاتھ ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ دعوت کا کام اللٹپ نہ کریں بلکہ اس کا منصوبہ بنائیں۔ اپنے حالات، ماحول اور مخاطب کے ذہن و حالات کو نگاہ میں رکھیں اور منصوبہ بند انداز میں حکمت کے ساتھ دعوت کا کام کریں اور اپنا احتساب بھی کریں کہ آپ کو کیا مواقع حاصل تھے اور کتنا آپ کر سکے۔ مواقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ اور اپنے سر اتنا ہی کام لیں جس کو تسلسل اور التزام کے ساتھ کر سکیں اور برابر اپنا احتساب کرتے رہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ منصوبے اور حکمت کے خلاف ان چیزوں پر اپنی قوتیں صرف کر رہے ہیں جس کی حیثیت بہت ضمنی اور جزئی ہے اور ان چیزوں کو نظر انداز کر رہے ہیں جن کی حیثیت بنیادی اور اللہ کے فرض کردہ احکام کی ہے۔

دین کی بنیادی قدروں پر اپنی توانائیاں صرف کریں، اپنے سماج میں دین کی بنیادی قدروں اور بنیادی احکام کو فروغ دینے کی کوشش کریں اور ایک منصوبہ بنالیں کہ آپ کو کس طرح اللہ کی بندگی کے چلن کو عام کرنا ہے۔

اس کے لیے قرآن پاک سے بھی اور حدیث سے بھی ترغیب و ترہیب کی آیات اور احادیث کا انتخاب کریں اور برابر مطالعہ کر کے جذبات کو گرم رکھیں اور جذبے اور نشاط کے ساتھ جوش و خروش سے دعوت کے کام میں لگیں۔ اضمحلال، افسردگی اور مردہ دلی جیسے امراض کو اپنے قریب نہ پھٹکنے دیں۔ یہ احتساب بھی کریں کہ جو کچھ آپ دوسروں کو بتاتے ہیں اور دوسروں سے چاہتے ہیں خود کس حد تک کر رہے ہیں اور آپ

کی زندگی اور عمل کس حد تک لوگوں کے لیے نمونہ ہے اور یہ احتساب بھی کرتے رہیں کہ اللہ نے آپ کو جو توانائیاں جو صلاحیتیں اور جو مواقع عطا فرمائے ہیں ان سے کس حد تک کام لے رہے ہیں۔ اگر کوئی غفلت اور کوتاہی ہورہی ہے تو استغفار کریں اور آئندہ کے لیے اپنے رب سے عہد کریں کہ جہاں تک ممکن ہوگا آپ کوئی کوتاہی اور غفلت نہیں کریں گے اور ایک وفا شعار مزدور کی طرح اللہ کی لگائی ڈیوٹی پر اہتمام اور تسلسل کے ساتھ لگے رہیں گے۔

تیسری بات یہ کہ شیطان کے وساوس سے اپنے کو محفوظ رکھیے۔ ہر قدم پر خود کو اللہ کی پناہ میں دیجیے۔ دعوت کے معنی بے شک یہی ہیں کہ اللہ کے بندے اللہ کی نافرمانی سے رک جائیں، ان کی زندگیاں برائیوں سے پاک ہو جائیں اور اللہ کی بندگی کا چلن عام ہو جائے۔ لوگ زندگی کے ہر معاملے میں اللہ کے احکام کے پابند ہو جائیں اور لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگیاں اللہ کے رنگ میں رنگ جائیں جس کو ہم غلبہ دین یا اسلامی نظام کا قیام وغیرہ الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ اکثر لوگ اس وسوسے میں مبتلا ہوتے ہیں کہ اتنا عرصہ ہو گیا اور اس میدان میں ہم کوئی قابل ذکر ایسا کام نہیں کر سکے جو لوگوں کو دکھا سکیں اور بتا سکیں کہ غلبہ دین اور اسلامی نظام کے قیام کے اتنے مرحلے ہم طے کر چکے ہیں۔ بے شک اس سلسلے میں منصوبہ بنانے کی بھی ضرورت ہے اور برابر جائزہ لیتے رہنا بھی ضروری ہے لیکن اس راہ کے نتائج کے متعلق یقینی تصور نہ کریں اور نہ توقعات پوری نہ ہونے سے اپنے اوپر مایوسی طاری کریں۔ ہاں یہ احتساب اور جائزہ ضرور لیتے رہیں کہ جو مواقع میسر تھے ان سے آپ نے پورا استفادہ کیا یا نہیں۔ جو وسائل اور ذرائع آپ کو حاصل تھے ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا یا نہیں اور جو قوتیں اور صلاحیتیں اللہ نے آپ کو دی ہیں ان کو اللہ کی راہ میں لگایا یا نہیں۔

یقین کیجیے کہ اگر آپ نے حاصل مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے اور وسائل و ذرائع کو پوری طرح استعمال کیا ہے اور اپنی پوری توانائیاں، صلاحیتیں اور قوتیں اس راہ میں لگا رکھی ہیں تو یقین کر لیجیے کہ آپ کامیاب ہیں۔ دراصل اس راہ میں اپنی قوتوں، صلاحیتوں اور اموال و وسائل کے ذریعے مسلسل لگے رہنا ہی کامیابی ہے اور اس راہ میں لگے لگے جس مرحلے پر بھی موت آ جائے آپ کامیاب و کامران، خواہ دعوت کے لیے سوچے مرحلوں میں سے کوئی مرحلہ بھی آپ نے طے نہ کیا ہو اور راہ میں نشاط و انشراح کے ساتھ لگے رہنے والوں کے لیے یہ فکری اور ذہنی اطمینان و سکون بھی ناگریز ہے اور اس طرح کے وسوسوں سے بچنا اور اللہ کے دامن میں پناہ لینا بھی ضروری ہے۔

وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ (حم السجدۃ ۴۱:۳۶)

''اور اگر شیطان کی طرف سے تمہیں کوئی وسوسہ اور دغدغہ آ گھیرے تو اللہ کے دامن میں پناہ چاہو بے شک وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

دراصل آپ کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ انتہائی گہرائی اور گیرائی سے حالات کا جائزہ لے کر منصوبہ بنائیں، اخلاص، یکسوئی اور تسلسل کے ساتھ اللہ کی راہ میں کام کرتے رہیں۔ اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں پر نگاہ رکھیں۔ استغفار کرتے رہیں لیکن آپ کی کوششوں کو بارآور کرنا بہترین ثمرات اور نتائج برآمد کرنا، یہ خالص اللہ کا کام ہے۔ آپ اپنے حصہ کا کام پوری ذمہ داری اور جوش وخروش ونشاط کے ساتھ کرتے رہیں لیکن اللہ کا کام اپنے ذمہ نہ لیں۔ اللہ کا کام اس پر چھوڑ دیں اور یہ یقین رکھیں کہ اس راہ میں جان و مال سے لگے رہنا اور لگے لگے اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کرنا ہی اصل کامیابی ہے اور اس راہ میں داعی حق کو کسی مرحلے میں موت آجائے وہ کامیاب و کامران ہے اور یقیناً اسکی زندگی اقامت دین اور غلبۂ دین کی راہ میں کام آئی اور وہ اللہ کے یہاں اس کے صلہ کا مستحق قرار پائے گا۔



# امر بالمعروف نہی عن المنکر

اللہ عزوجل نے جس عظیم مہم کو انجام دینے کے لیے انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا، اپنے اپنے دور میں ہر نبی نے اس کا حق ادا کیا اور اللہ کے بندوں کو زمین پر اللہ کی مرضی کے مطابق رہنا سکھایا۔ سب سے آخر میں اس عظیم مہم کو انجام دینے کے لیے حضرت محمد ﷺ کو بھیجا اور عرفات کے میدان میں امت نے اعتراف کیا کہ اللہ کے آخری رسول ﷺ نے کارِ نبوت کا حق ادا کر دیا۔ درود وسلام ہو ان پر اور ان کی آل اولاد پر۔

کارِ نبوت کے لیے قرآن وحدیث میں کئی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں، دعوت الی اللہ، شہادت علی الناس، اظہارِ دین، اقامت دین، اعلائے کلمۃ اللہ، انذار وتبشیر، تبلیغ وجہاد، تذکیر ونصیحت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر وغیرہ۔ ان میں سے ہر اصطلاح اپنی جگہ نہایت اہم اور کسی خصوصی پہلو کو اجاگر کرنے والی ہے اور کارِ نبوت کی وضاحت کے لیے ہر ایک کا اپنا ایک مقام ہے۔ ان اصطلاحات میں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ایک جامع اصطلاح ہے۔ اس اصطلاح کی جامعیت اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ کارِ نبوت کے پورے مفہوم پر حاوی ہے۔ اور اس کے استعمال سے اس مہم کا پورا خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ کہ کن چیزوں کو انسانی سماج سے خارج کرنا ہے اور کن قدروں کو سماج میں قائم کرنا اور رواج دینا ہے۔ ساتھ ہی ذہن میں یہ بات بھی آجاتی ہے کہ کارِ نبوت کو انجام دینے کے لیے خیر وشر کی طویل کشمکش سے گزرنا بھی ناگزیر ہے۔

اسلام کی دعوت دینے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ خیر اور معروف کو قائم کیا جائے اور منکر کو ہٹایا جائے۔ خیر یا معروف وہ ہے جس کو انسانی فطرت ہمیشہ بہتر سمجھتی رہی ہے اور اسی کو وحی الٰہی نے بھی خیر اور معروف کہا ہے۔ دین کے اندر جو کچھ ہے وہ خیر ہی ہے خواہ اس کا تعلق، عقائد ونظریات سے ہو یا اخلاق ومعاشرت سے، حقوق سے ہو یا معاملات سے قانون وسیاست سے ہو یا عبادت وریاضت سے۔ اور جو کچھ اسلام سے باہر ہے وہ شر ہی شر ہے۔ خیر صرف وہ ہے جس کو اسلام نے اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ خیر اور معروف کی ان قدروں پر انسانی سماج کی تعمیر اسی وقت ممکن ہے جب شر اور منکر کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے اور شر کو مٹانے اور انسانی سماج سے اس کی گرفت ختم کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ اہل شر سے کشمکش ہو اس کشمکش کے بغیر انسانی سماج میں خیر اور معروف کی

قدروں کو رواج دینا ممکن نہیں۔

دنیا میں جتنے انبیا اور رسول بھی آئے اسی کارِ نبوت کو انجام دینے کے لیے آئے اور سب سے آخر میں اللہ کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ بھی اسی کارِ نبوت کو انجام دینے کے لیے بھیجے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے نبوت آپ ﷺ پر ختم کر دی اور اعلان فرمایا کہ اب قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا۔ ساتھ ہی یہ اعلان بھی فرما دیا کہ اب یہ کارِ نبوت حضرت محمد ﷺ کی امت جو آخری امت ہے رہتی زندگی تک انجام دیتی رہے گی۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (البقرہ ۲:۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تمہیں (ہر افراط تفریط سے پاک) درمیانی اور افضل امت بنایا تاکہ تم انسانوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول ﷺ تم پر گواہی دینے والے ہوں۔''

یعنی نبوت تو ختم ہو گئی مگر کارِ نبوت باقی رہے گا اور جس طرح رسول تم پر گواہ رہے تم اب رہتی دنیا تک انسانوں پر گواہ رہو گے۔ یعنی وہی انبیائی کام اب تم بحیثیت امت انجام دیتے رہو گے۔ دوسری جگہ امت کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

(آل عمران ۳:۱۱۰)

''تم بہترین امت ہو جسے انسانوں کی فلاح کے لیے برپا کیا گیا تم معروف کا حکم دو اور منکر سے روکو۔''

پہلی آیت میں اس آخرت امت کو امت وسط یعنی درمیانی امت جس کو امتوں میں صدر نشینی کا مقام حاصل ہے اور جو ہر طرح کے افراط و تفریط سے محفوظ توازن و اعتدال پر اٹھائی گئی ہے اور یہی اس کی وجہ امتیاز و فضیلت ہے۔ دوسری آیت میں اسی امت وسط کو خیر امت کہا گیا اور کارِ نبوت کی تعبیر کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

بلاشبہ اس مہم پر مامور کیے جانے والے اور اس خطاب کے اعزاز سے نوازے جانے والے قرآن کے اولین مخاطب حضور ﷺ کے وہ صحابہ کرام ہی ہیں جن سے بہتر انسانوں کی کوئی جماعت کرۂ ارض پر کبھی نہیں دیکھی گئی۔ جنہوں نے حالت ایمان میں اللہ کے رسول ﷺ کا دیدار کیا اور جنہوں نے یہ شرف پایا کہ رسول ﷺ کی براہ راست تربیت میں پروان چڑھے۔

البتہ رسول پاک ﷺ کی امت میں شامل ہونے والے تمام مسلمان خواہ وہ کسی دور میں ہوں، کسی ملک اور خطے میں بستے ہوں، کسی بھی رنگ و نسل کے ہوں اور کوئی بھی زبان بولتے ہوں۔ ایمان لا کر جب وہ رسول ﷺ

کی امت میں شامل ہوئے تو یقیناً وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے جانشین اور ان کے نقش قدم پر ہیں اور وہ بھی اس اعزاز و اکرام کے مخاطب ہیں۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت، خیر امت ہی ہیں اور ان کی منصبی ذمہ داری بھی قرآن کے نزدیک یہی ہے کہ وہ معروف کا حکم دیں اور منکر سے روکیں، اپنی توانائی، صلاحیت، حیثیت اور وسائل کے مطابق ہر مسلمان مرد اور عورت کو یہ کام انجام دینا ہے، خواہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو، یا رسمی طور پر تعلیم سے بے بہرہ ہو، تقریر و تحریر سے کام لے سکتا ہو یا صرف زبان سے یا صرف جان و مال سے اس کام میں اپنا حصہ ادا کر سکتا ہو۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر امت مسلمہ کا وہ فریضہ ہے جس پر قیام دین اور بقائے دین کا مدار ہے۔ دین کا تحفظ و احیا بھی اسی پر منحصر ہے اور امت کی زندگی بھی اسی فریضے کی انجام دہی میں ہے۔ اسی لیے قرآن نے بھی امت کو مختلف انداز سے بار بار اس کی تاکید کی ہے۔ ترغیب و ترہیب کے مختلف پیرائے اختیار کیے ہیں اور اس سے غفلت کے انجام سے ڈرایا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی مختلف موقعوں پر امت کو اس کام کی ترغیب دی ہے اور تنبیہ فرمائی ہے کہ امت جب بھی اس کام سے غفلت برتے گی اس کا انجام نہایت بھیانک ہوگا اور امت اللہ اور بندوں کی نظر میں بے وزن ہو جائے گی۔ دراصل ہر چیز اسی وقت تک وقعت کے ساتھ باقی رہتی ہے جب تک وہ اپنے وجود کا مقصد پورا کرتی رہتی ہے اس اصول کے تحت امت کے ساتھ بھی اللہ کا یہی معاملہ ہے۔ امت اس مہم کو سرانجام دیتی رہے گی اور اپنے اس مشن سے پہچانی جاتی رہے گی، دنیا میں عزت و سربلندی پاتی رہے گی اور دنیا میں کارِ نبوت کا علم و عمل باقی رہے گا اور جب بھی یہ امت غفلت اور اللہ سے بے نیازی کی وجہ سے اس کار عظیم کی بساط لپیٹ کر رکھ دے، اس سعادت کا علم فراموش کر دے اور اس کے شعور سے محروم ہو کر اس پر عمل چھوڑ بیٹھے تو کارِ نبوت ختم ہو جائے گا۔ دین سے غفلت عام ہو جائے گی اور دھیرے دھیرے دین نہایت کمزور اور نامانوس ہو جائے گا اور امت کے ہوتے ہوئے جاہلیت کا دور پھر لوٹ آئے گا۔ علم کی روشنی کمزور پڑتے پڑتے ختم ہونے لگے گی اور جہالت کی تاریکی عام ہو جائے گی۔ زندگی کے گوشے گوشے میں فساد پھوٹ پڑے گا۔ ہر جانب بگاڑ ہی بگاڑ ہوگا۔ آباد بستیاں ویران ہونے لگیں گی۔ کشت و خون اور لوٹ و غارت گری کا بازار گرم ہوگا۔ نسلیں تباہ ہو جائیں گی۔ کھیتیاں اور باغات اجڑ جائیں گے اور امت ایسی ہلاکت و غفلت میں مبتلا ہوگی کہ قیامت سے پہلے اس کو اپنی ہلاکت کا احساس نہیں ہوگا۔

امت مسلمہ پچھلی تین چار صدیوں میں انحطاط و پستی، ذلت و خواری، کمزوری و بے وقعتی اور مظلومیت و بے بسی کے جس عبرتناک دور سے گزر رہی ہے اور نتیجے کے طور پر عالم انسانیت جس خلفشار بے یقینی، بداعتمادی، باہم نفرت و بیزاری، ظلم و جور اور فتنہ و فساد میں مبتلا ہے، اس کی بنیادی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ کارِ نبوت معطل ہو کر رہ گیا ہے جس پر امت مسلمہ کو مامور کر کے خیر امت کے لقب سے نوازا گیا ہے، دراصل انسانیت کا امن،

سکون، نفع و خیر و صلاح کا مدار اس پر ہے کہ کارِ نبوت جاری رہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے امت سر گرم رہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ان گزشتہ صدیوں میں امت وسط نے اس فریضہ منصبی کے علم و شعور سے بھی غفلت برتی اور عملاً بھی اس نے کوشش و کاوش کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ ہوسکتا ہے کوئی بندۂ حق انفرادی طور پر یا چند ساتھیوں کے ساتھ اس کارِ خیر میں لگا رہا ہو، لیکن امت کی عظیم اکثریت نے اس کا علم بھی فراموش کر دیا ہے اور عمل سے بھی یکسر غافل رہی ہے۔

اللہ نے جن خوش نصیبوں کو اس علم سے نوازا تھا اور جن سے بجا طور توقع تھی کہ وہ عملاً اس فریضے کو انجام دیتے رہیں گے، انہوں نے حالات سے سازگاری بُروں سے مصالحت اور دین کے معاملے میں مداہنت کی روش اختیار کر لی اور ان کو اللہ کی ذرا شرم نہیں رہی۔ اور عام لوگ مفاد پرستی، خواہش پرستی اور دنیا پرستی میں اس طرح غرق ہوگئے کہ ان کی زندگیاں جانوروں اور درندوں سے بھی بدتر ہوگئیں اور وہ اس طرح زندگی گزار رہے ہیں گویا اس کے پاس آسمانی ہدایت آئی ہی نہیں ہے اور ایسا کوئی گروہ نظر نہیں آتا جس کو دیکھ کر اطمینان سے کہا جا سکے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی پروا نہیں کرتے جو اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ ان سے محبت کرتا ہے، جو خدا بیزاروں کے لیے انتہائی سخت اور اصحابِ ایمان کے لیے نہایت نرم ہیں۔

ان سنگین اور مشکل ترین حالات میں جو گروہ بھی اٹھ کر سوسائٹی کو برائیوں سے پاک کرنے اور بھلائی کو قائم کرنے کے لیے آواز اٹھائے بگڑی ہوئی سوسائٹی کا چیلنج قبول کر کے ہر طرح کی قربانی، فداکاری اور نقصان کے لیے میدان میں آئے، جہالت اور جاہلیت کو دور کرنے کا بیڑا اٹھائے اور ان شگافوں کو بند کرنے کے لیے ہمت و جرأت دکھائے جن سے برائیاں پھوٹ رہی ہیں۔ خواہ اس کے لیے تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دے یا زبان و قلم سے اس کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کرے یا عملاً دینی قدروں کو قائم اور نافذ کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے اور اس طرح رسول پاک ﷺ کی مٹتی ہوئی سنتوں کی تجدید کا بار گراں اٹھائے اور مٹتی ہوئی سنتوں کو زندہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو اور اس عزم کے ساتھ کمر کس لے کہ وہ سنت کو زندہ کر کے ہی دم لے گا تو ایسی سنت جس کو زمانے نے مٹا دیا ہے۔ زندہ کرنے کے صلے میں اللہ اپنی مخلوق کے درمیان نہایت اونچا اور ممتاز مقام عطا فرمائے گا اور دربارِ الٰہی میں اس کو قرب کا وہ مقام حاصل ہوگا کہ قربت کا کوئی بھی درجہ اس کی بلندی کو نہ پا سکے گا۔

امت مسلمہ کی موجودہ زبوں حالی، خون کے آنسو رلانے والی مظلومیت و بے بسی اور عبرتناک پستی خیر امت کے ہر ہر فرد کی غیرت کو للکار رہی ہے کہ وہ اٹھے اور اللہ و رسول ﷺ کی پکار پر لبیک کہے۔ ہر طرف آواز گونج رہی

ہے:

”مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ“

اُٹھیے اور نحن انصار اللہ کہتے ہوئے آگے بڑھیے اور اپنے رب سے انعام و اکرام پانے اور اس کے قرب کا مقام امتیاز حاصل کرنے کے لیے دوڑ پڑیے، یہ اس عظیم و رحیم ہستی کا وعدہ ہے جو کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ یہ جاگنے اور کچھ کرنے کا وقت ہے اور جو اس وقت بھی نہیں جاگا اور مہلت کی ان گرانقدر گھڑیوں کو بھی جس نے کھو دیا اس کے حصے میں رنج و غم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔



# روشن صبح جس کی کوئی شام نہیں

عالم انسانیت کی سب سے روشن صبح وہ تھی جب طلوع آفتاب سے کچھ پہلے ''زمین وآسمان کا چاند'' زیرِ آسماں طلوع ہوا۔ اور اس کی جہانتاب چاندنی سے مرکز عرب ہی نہیں مرکزِ عالم جگمگا اٹھا۔ انسانیت کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ اور پھر جب یہ بدر کامل ثنیات الوداع سے نمودار ہوا، تو یثرب کی معصوم اور بھولی بچیوں نے دلنواز گیتوں سے اس کا استقبال کیا۔

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع

''چودھویں کا چاند'' 'ثنیات الوداع' کی جانب سے ہم پر طلوع ہو گیا۔'' (ﷺ)

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی روشنی تین تہائی عرب پر چھا گئی، لیل ونہار نے کچھ اور گردشیں پوری کیں اور پھر ایک کربناک صبح غم کا اندھیرا لیے نمودار ہوئی۔ جوں جوں دن چڑھ رہا تھا۔ سورج اوپر آرہا تھا۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ غم واندوہ کی سیاہ گھٹاؤں میں دم گھٹ رہا تھا۔ ہر دل اداس تھا' ہر آنکھ نم تھی، ہر زبان گنگ تھی۔ اور فضا پر سکتے کا عالم طاری تھا۔ خبر گونجی کہ بدرِ منیر غروب ہو گیا، ایک حواس باختہ شیر دل ننگی تلوار لیے فضا میں گرجا ''خبر دار یہ الفاظ پھر کوئی دہرانے کی جرأت نہ کرے، ورنہ سر قلم کر دوں گا۔'' دور عرفات کے میدان میں ایک آواز کی فکر انگیز گونج ابھی تک موجود تھی۔ لوگوں کے کانوں میں دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی:

> ''لوگو! نہ تو میرے بعد اب کوئی نبی آنے والا ہے اور نہ کوئی نئی امت پیدا ہوگی۔ خوب سن لو! اپنے رب کی بندگی کرو، پانچ وقت کی نماز ادا کرو، ماہ رمضان کے روزے رکھو، خوش دلی کے ساتھ اپنے مالوں کی زکوٰۃ دو، اپنے رب کے گھر کا حج کرو اور اپنے ذمہ داروں کی اطاعت کرو، تو تم اپنے رب کی جنت میں داخل ہو گے۔ لوگو! میرا خیال یہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ پھر کبھی اس میدان میں نہ آسکوں گا دو چیزیں (قرآن وسنت) میں تمہارے لیے چھوڑے جا رہا ہوں انہیں مضبوط پکڑے رہو، جب تک تم انہیں مضبوط پکڑے رہو گے شاہراہ مستقیم سے ہرگز نہ بھٹکو گے۔''

شیر دل جاں نثار پھر گرجا، خبر دار، ایسی ویسی بات کوئی زبان پر نہ لائے۔ ورنہ گردن اڑا دوں گا۔ سب کے

ہوش گم تھے۔ایک پیکر ایمان واستقامت نے جھرجھری لی، وہ کھڑا ہوا اور پر جوش لہجے میں اس نے کہنا شروع کیا:

''جو محمد ﷺ کی بندگی کر رہا تھا وہ سن لے، محمد ﷺ رخصت ہو چکے اور جو اللہ کی بندگی کر رہا تھا، تو اللہ زندہ ہے اور اسے کبھی موت نہ آئے گی۔''

اور پھر ایمانی جذبات سے سرشار ہو کر اس نے یہ ارشاد ربانی پڑھا:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ (آل عمران ۳:۱۴۴)

''محمد ﷺ اللہ کے رسول ہی ہیں، ان سے پہلے کتنے ہی رسول گزر چکے، کیا وہ اگر وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔''

یہ آیت ربانی سنتے ہی سب کی آنکھیں کھل گئیں۔شیر دل فاروق رضی اللہ عنہ کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور فرمایا: اللہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کا بھلا کرے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے یہ آیت آج ہی نازل ہوئی ہے۔اور پھر یہ روشن ستارے رسول ﷺ کی چھوڑی ہوئی دو چیزوں کی حفاظت اشاعت اور نفاذ میں تن من دھن سے لگ گئے۔یہی دو چیزیں کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ، انسانیت کی نجات' ارتقا اور فوز وفلاح کا وہ دائمی منشور ہے جس کی صحت ومقبولیت کو اللہ کی سند حاصل ہے یہ منشور پا کر دنیا نے دیکھ لیا، محسوس کر لیا، بلکہ یقین کر لیا کہ زمین وآسمان کا یہ چاند افق آسمانی سے طلوع ہونے والا وہ چاند نہیں ہے جو غروب ہو تو اندھیرا چھا جائے۔یہ بدر کامل غروب ہوا تو اس کی چاندنی اور پھیل گئی۔قیامت تک پھیلتی رہے گی اور جب اس کے جاں نثار میدان حشر میں جمع ہوں گے' پل صراط سے گزریں گے، جنت کے محلوں میں آباد ہوں گے تو وہاں بھی اسی چاند کی چاندنی سے اپنی آنکھیں روشن کریں گے۔

وما مدحت محمدا بمقالتي ولكن مدحت مقالتي بمحمد

''میں بھلا اپنے کلام سے محمد کی تعریف وتوصیف کیا کروں گا میں نے تو محمد ﷺ کے ذکر جمیل سے اپنے کلام کو سجانے کی کوشش کی ہے۔''



# ایمان خطرے میں

آپ ہر خطرہ مول لے سکتے ہیں۔ بڑے سے بڑا نقصان برداشت کر سکتے ہیں، لیکن بہ سلامتی ہوش وحواس اس کے لیے ہرگز تیار نہیں ہو سکتے کہ آپ کے ایمان کے لیے کوئی خطرہ لاحق ہو۔ ایمان ہی تو آپ کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ یہ متاع عزیز ضائع ہوگئی تو آپ بالکل ہی لٹ گئے۔ آپ کے پاس تو کچھ بھی نہ رہا۔ آپ دانستہ طور پر کوئی ایسی حرکت اور کوتاہی نہیں کریں گے جس سے ایمان جیسی چیز خطرے میں پڑے۔ لیکن اطمینان کی سانس نہ لیجئے ہوسکتا ہے نادانستہ طور پر، لاعلمی اور لاپروائی میں آپ کوئی ایسی کوتاہی کر رہے ہوں جس سے آپ کی یہ متاعِ عزیز خطرے میں ہو اور آپ کو احساس بھی نہ ہو۔

ایک کوتاہی ایسی خطرناک کوتاہی ہے کہ اس سے آدمی کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے اور یہ انتباہ کسی عام آدمی کی جانب سے نہیں ہے خود دین پہنچانے اور بتانے والے رسول ﷺ کی جانب سے ہے۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ہوشیار ہو جایئے اور غور کیجئے کہیں آپ اس کوتاہی اور جرم میں تو مبتلا نہیں ہیں —— خدانخواستہ اگر ہوں تو کسی حیل و حجت اور تاویل کے بغیر فوراً اس کی تلافی کی فکر میں لگ جائیں، اس لیے کہ ناپائیدار زندگی کا کوئی بھروسا نہیں کب ختم ہو جائے اور اللہ نہ کرے ایمان کا یہ خطرہ واقعی خطرہ بن جائے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اللہ نے اپنے بندوں پر چار بنیادی عبادتیں فرض کی ہیں۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج —— اور یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ کسی بندے کو یہ حق اور اختیار نہیں ہے کہ وہ ان میں سے کوئی دو یا تین عبادتیں اپنے ذوق اور مرضی سے منتخب کر لے۔ اگر کوئی نادان صرف ایک عبادت کو ترک کر کے تین عبادتیں ادا کرتا رہا تو اللہ کے رسول ﷺ کی وضاحت اور تنبیہ یہ ہے کہ یہ تینوں عبادتیں قطعاً اس کے کام میں نہ آئیں گی۔ اللہ کے یہاں صرف اسی بندے کی عبادتیں قبول کی جائیں گی جو اللہ کی فرض کردہ چاروں عبادتیں اللہ کے حکم کے مطابق ادا کرے گا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

اربع فرضهن الله في الاسلام، فمن اتى بثلاث لم يغنين عنه شيئًا حتّٰى ياتي بهن جميعا الصلٰوة والزكٰوة وصيام رمضان وحج البيت (مسند احمد)

''چار عبادتیں ہیں جو اسلام میں اللہ نے فرض کی ہیں۔ جو شخص ان میں سے تین بجالائے اور چوتھی چھوڑ دے، تو وہ تینوں اس کے کام نہ آئیں گی، جب تک وہ چاروں ادا نہ کرے۔ وہ چار عبادتیں یہ ہیں، نماز، زکوٰۃ، رمضان کا روزہ اور حج۔''

آج کے دور میں مسلمان بے شک اپنے فرائض میں کوتاہ ہیں۔ لیکن پھر بھی نماز روزہ اور زکوٰۃ ادا کرنے کا خاصا اہتمام کرتے ہیں۔ البتہ حج ادا کرنے کی طرف زبردست غفلت ہے۔ بہت سے غافل مسلمان حج کو جانے کی استطاعت رکھتے ہیں، خوشحال ہیں، صحت مند ہیں، کوئی معذوری مجبوری بھی نہیں ہے اور پھر بھی وہ حج کو نہیں جاتے اور انہیں احساس ہی نہیں ہے کہ وہ کس قدر عظیم اور بھیانک جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ وہ ایک ایسے بھیانک جرم میں مبتلا ہیں، جس سے ایمان خطرے میں ہے۔ اللہ نے ایسے لوگوں سے اپنی بے نیازی اور بے تعلقی کا اعلان کیا ہے اور جس سے اللہ اپنی بے نیازی اور بے تعلقی کا اعلان کرے اس کا دنیا اور آخرت میں کہیں ٹھکانہ نہیں۔ الا یہ کہ وہ اپنے جرم کی تلافی کر کے اپنے کو اللہ کی نظرِ عنایت کا مستحق بنالے۔ اللہ کی تنبیہ کے الفاظ یہ ہیں:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ○ (آل عمران ۳:۹۷)

''انسانوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو وہ جان لے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔''

یعنی جو اس فرض سے انکار کرے اور استطاعت رکھنے کے باوجود بیت اللہ کا حج نہ کرے، تو وہ خوب سن لے کہ اللہ سارے جہان والوں سے بے نیاز ہے، اللہ کسی کا محتاج نہیں ہے، بندہ ہی اس کا محتاج ہے اور اگر یہ محتاج بندہ اس کی فرض کی ہوئی عبادت سے غفلت اور بے نیازی برتتا ہے تو اللہ کو اس کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ اللہ کے یہاں سے وہ راندۂ درگاہ ہے۔ اللہ اس سے بالکل بے نیاز ہے اور غافل اس کی نظرِ عنایت سے محروم ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے اور زیادہ واضح لفظوں میں ایسے غافل نادانوں کو دھمکی دی ہے اور صاف صاف متنبہ کیا ہے کہ جو لوگ استطاعت رکھنے کے باوجود حج کرنے کے لیے نہیں جاتے ان کا ایمان خطرے میں ہے۔

عن ابی امامه عن النبی صلی اللّٰه علیه وآله وسلم من لم تجسه حاجه ظاهرة او مرض حابس او سلطان جابر ولم یحج فلیمت ان شاء یهودیا او نصرانیا

(ترغیب وترہیب)

''حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ، نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کو واقعی کوئی محتاجی نہیں ہے، حج سے روک دینے والی بیماری بھی نہیں ہے، کسی ظالم اقتدار کی طرف سے بھی رکاوٹ

نہیں ہے پھر بھی اس نے حج نہ کیا تو وہ چاہے یہودی ہو کر مرے چاہے نصرانی۔''

دل ہلا دینے والی اس تنبیہ سے بھی جس کی آنکھیں نہ کھلیں اور وہ اس فکر میں نہ لگ جائے کہ اس کا خاتمہ اسلام پر ہو، تو واقعی اس کا ایمان خطرے میں ہے۔ جسے زادِراہ بھی حاصل ہے، صحت بھی میسر ہے، کوئی ظاہری رکاوٹ بھی نہیں ہے اور پھر بھی وہ اللہ کی فرض کی ہوئی عبادت میں کوتاہی برت رہا ہے یا موقع میسر آنے کے باوجود ٹال مٹول کر رہا ہے، اسے واقعی یہ فکر نہیں ہے کہ اس کا خاتمہ اسلام پر ہو۔ اس لیے کہ ایسے کوتاہ کار کے بارے میں صاف صاف اللہ کے رسول ﷺ نے بتا دیا ہے کہ وہ چاہے نصرانی ہو کر مرے چاہے یہودی ہو کر مرے۔ مسلمان ہو کر مرنے کی اگر اسے آرزو ہے تو وہ فوراً اس عظیم فرض کو ادا کرنے کے لیے تیار ہو جائے اور ناپائیدار زندگی کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرے —— کسی کو معلوم نہیں کہ اس کا اگلا پل اس زندگی کا ہے یا موت کے بعد کی زندگی کا۔ جب معاملہ اس قدر نازک ہے تو ایک ایسا مؤمن جسے اپنا انجام عزیز ہو، ایسے جرم میں ہرگز مبتلا نہیں رہ سکتا، جس سے اس کا ایمان خطرے میں ہو۔



# صحیح تصور دین

دین کا صحیح تصور کیا ہے، یہ محض ایک علمی قسم کا فلسفیانہ سوال نہیں ہے اور نہ اس پر غور وفکر کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ معلومات میں کچھ اضافہ کیا جائے۔ یہ ایک عملی سوال ہے—— جو شخص بھی دین سے محبت رکھتا ہے، دین کے تقاضے پورے کرنا چاہتا ہے، دین کے راستے پر چلنا چاہتا ہے اور دیندارانہ زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ پہلے دین کا صحیح تصور معلوم کرے، مستند ذرائع سے معلوم کرے، محض سنی سنائی باتوں پر بھروسا نہ کرے، نہ ان رائج طریقوں اور عوام میں پھیلی ہوئی روایات کو ہی مستند سمجھے، بلکہ سنجیدگی کے ساتھ اللہ کی کتاب اور رسول ﷺ کی سنت سے اصل حقیقت کو پانے کی کوشش کرے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی غلط تصور دین کے تحت وہ زندگی گزارے اور اپنے زعم میں یہ سمجھے کہ وہ دین کا حق ادا کر رہا ہے۔ لیکن دین کی نظر میں اس کی زندگی مطلوب زندگی نہ ہو یا خدانخواستہ وہ مجرم قرار پائے۔ دین کا صحیح تصور معلوم کر کے اور دین کی صحیح پیروی کر کے ہی ایک شخص اس فلاح وکامرانی کا مستحق ہو سکتا ہے جس کا اللہ نے مؤمنین صالحین سے وعدہ فرمایا ہے۔

دین کے بارے میں عام تصور یہ پایا جاتا ہے کہ آدمی عبادت وریاضت اور ذکر وفکر میں مشغول رہے۔ بعض چیزوں میں حرام وحلال کی سختی سے پابندی کرے اور ایک خاص قسم کی وضع اختیار کر لے۔ بس ایسا شخص دیندار ہے، دین کا مطلوب انسان ہے اور فلاح وکامرانی اس کے لیٔے لازمی ہے۔ مگر قرآن وسنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کا یہ تصور ناقص اور غیر مطلوب ہے اور وہ لوگ گھاٹے میں ہیں جو اس محدود اور ناقص تصور دین کے تحت اپنے زعم میں دیندارانہ زندگی گزارتے ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ انہی جیسے افراد اللہ کو مطلوب ہیں اور وہ واقعی اللہ کی نظر میں دیندار ہیں۔ قرآن وحدیث کی نظر میں دیندار ہیں۔ قرآن وحدیث کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دین کا یہ محدود اور ناقص تصور ہر دور میں انسانی ذہن کو اپنا نشانہ بناتا رہا ہے اور لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہوتے رہے ہیں کہ محض اللہ کی عبادت اور ذکر وفکر ہی دین کا اصل مقصود ہے۔ دنیوی ذمہ داریوں کو پورا کرنا اور انسانی حقوق کا وسیع معنی میں اہتمام کرنا دنیاداری ہے، دینداری نہیں۔ دنیا کے وسائل وذرائع اور نعمت وزینت سے فائدہ اٹھانا دینداری کے منافی ہے۔ اس محدود اور غلط مطلوب تصور دین کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہ ہے

کہ ایسا انسان دھیرے دھیرے انسانی حقوق کی طرف سے بالکل غافل ہو جاتا ہے اور بسا اوقات اللہ کے بندوں کے ساتھ ظالمانہ رویہ اختیار کرنے کے باوجود اس زعم میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ دیندار ہے اور آخرت کی سرخروئی اسی کے لیے مقدر ہے۔

قرآن نے اس تصورِ دین کی سختی کے ساتھ تردید کی ہے۔ دنیا کی نعمتوں اور آسائشوں سے بیزاری اور ترک دنیا کو غلط قرار دیا ہے اور اس غلط تصورِ دین کو چیلنج کرتے ہوئے کہا ہے، کون ہے جس نے دنیا کی نعمتوں اور زینتوں کو حرام کیا ہے۔ لائے وہ ثبوت اور سند۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ (الاعراف ۷:۳۲)

”اے رسول ﷺ! ان سے کہیے، کس نے اللہ کی زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے اللہ کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں، کہیے یہ ساری چیزیں زندگی میں بھی ایمان لانے والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے روز تو خالصتاً انہی لوگوں کے لیے ہوں گی۔“

ایک دوسرے مقام پر بہت وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ سارے انسان اللہ نے ایک ہی ماں باپ سے پیدا کیے ہیں، ان سب کو اللہ نے پیدا کیا ہے اس لیے یہ سب اللہ کے بندے ہیں اور مخلوق ہونے کے ناطے یہ سب ہی اللہ کو پیارے ہیں۔ پھر یہ سب چونکہ ایک ہی ماں باپ سے ہیں، اس لیے یہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ان کے درمیان اخوت، محبت، باہمی حقوق کی پاسداری اور جذبات کا باہمی لحاظ ہونا چاہیے اور پھر اس کے بعد نہایت تاکیدی انداز میں جس طرح اپنا یہ حق بتایا ہے کہ میرے بندے صرف مجھ ہی سے ڈریں، اسی طرح آیت میں یہ تاکید بھی کی ہے کہ بندے آپس کی رشتہ داریوں اور قربت داریوں کے حقوق کا پورا لحاظ رکھیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝ (النساء ۴:۱)

”انسانو! ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں دنیا میں پھیلا دیے۔ ڈرتے رہو اس اللہ سے جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے ہو اور رحم اور رشتے کے حقوق کا پاس و لحاظ رکھو۔ یقین رکھو کہ اللہ تمہاری نگرانی کر رہا ہے۔“

ان دونوں آیتوں سے یہ حقیقت پوری طرح نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ قرآن پاک دین و دنیا کی نعمتوں سے

بیزاری اور دنیا سے فرار کے تصور کو غلط قرار دیتا ہے اور تاکید کرتا ہے کہ انسانوں کے درمیان رہ کر ان سے پیار و محبت کا تعلق رکھ کر اور ان کے حقوق کی پوری پوری پاسداری کر کے ہی دینِ حق کا تقاضا پورا کیا جا سکتا ہے۔ قرآن پاک کا تصورِ دین یہی ہے اور ایسے ہی دیندار افراد اُسے مطلوب ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے بھی مختلف مواقع پر اس بیمار ذہن کی اصلاح فرمائی ہے اور تفہیم کے لیے پیغمبرانہ بصیرت کے شاہکار اسلوب اختیار فرمائے کہ اصل حقیقت دل میں پیوست ہو جائے اور غلط فہمی کے لیے کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک نشست میں آپ ﷺ نے ایک سوال اٹھایا:

تدرون من المفلس ؟

''جانتے ہو نادار کون ہے؟''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب دیا:

المفلس فینا من لادرھم له ولا متاع

''ہم میں مفلس و نادار وہ شخص ہے جس کے پاس نہ روپیہ پیسہ ہو اور نہ کوئی مال و متاع۔''

یہ جواب دینے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انتہائی اشتیاق، دلچسپی اور حقیقت طلب نگاہوں کے ساتھ اللہ کے رسول ﷺ کی طرف متوجہ تھے کہ آخر اللہ کے رسول ﷺ آج کون سی حقیقت ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

ان المفلس من امتی من یاتی یوم القیٰمه بصلٰوۃ وصیام وزکٰوۃ ویاتی وقد شتم ھذا وقذف ھٰذا واکل مال ھذا وسفك دم ھٰذا وضرب ھٰذا فیعطی ھٰذا من حسناته وھٰذا من حسناته فان فنیت حسناته قبل ان یقضی ما علیه اخذ من خطایا ھم فطرحت علیه ثم طرح فی النار

(مسلم، کتاب البر، حدیث ۵۹ ص ۱۱۲۹)

''میری امت کا مفلس اور دیوالیہ وہ شخص ہے جو قیامت کے روز نمازوں، روزوں اور زکوٰۃ کا توشہ لیے ہوئے اللہ کے حضور آئے گا مگر اس طرح آئے گا کہ فلاں شخص کو گالی دی ہے، فلاں شخص پر تہمت لگائی ہے، فلاں شخص کا مال کھایا ہے، فلاں شخص کا ناحق خون بہایا ہے اور فلاں کو مارا پیٹا ہے تو اس کی یہ ساری نیکیاں اللہ ان (فریادی) لوگوں پر تقسیم کر دے گا، کچھ اس کو دے گا اور کچھ اس کو۔ اب اگر یہ ساری نیکیاں فریاد کرنے والوں پر کی ہوئی زیادتیوں کی تلافی سے پہلے ختم ہو گئیں تو پھر فریاد کرنے والوں کے گناہوں کا وبال اس کے سر ڈال دیا جائے گا اور پھر اس کو جہنم کی آگ میں جھونک دیا جائے

گا۔“

اپنے اٹھائے ہوئے سوال کے جواب میں آپ ﷺ نے جو توضیح فرمائی، اس میں سننے اور پڑھنے والوں کو جو چیز بے حد متاثر کرتی ہے وہ آپ ﷺ کا پیغمبرانہ اندازِ تفہیم ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس سے زیادہ مؤثر، دلنشیں اور انقلاب انگیز اندازِ تفہیم ممکن نہیں ہے ـــــ اس پیرایہ بیان کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ ہر سننے والا لرز جائے۔ وہ اپنے انجام کی فکر میں بے قابو ہو کر، اپنی زندگی سے اس طرح کی کوتاہیاں و گندگیاں خزاں رسیدہ پتوں کی طرح جھاڑ دینے کے لیے بے چین ہو جائے اور زندگی کو دین کے اس صحیح تصور کے تحت بنانے سنوارنے کا خوشگوار اور اٹل فیصلہ کر لے ـــــ اور یہ نہایت ہی اہم پہلو ہے، دوسرا پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ آپ ﷺ نے صرف یہی نہیں کیا کہ امت کو جوں توں حق پہنچانے کی کوشش فرمائی بلکہ حق پہنچانے کے لیے ایسے ایسے مؤثر، دل نشین اور حکیمانہ انداز اختیار کیے کہ سننے والے اس حق کو اپنے دل کی آواز اور اپنی سب سے بڑی ضرورت سمجھ کر جذب کر لیں۔ اندرونی جذبے سے وہ اپنی زندگیوں میں خوشگوار انقلاب لانے کی دھن میں لگ جائیں اور حق کو اپنا سب سے زیادہ عزیز اور قیمتی سرمایہ سمجھ کر اسے لینے کے لیے بے اختیار لپکیں۔

داعی اعظم نے دین کا صحیح تصور سمجھانے کے لیے یکبارگی تفہیم شروع نہیں فرما دی، بلکہ پہلے ایک سوال اٹھایا، حاضرین سے جواب چاہا، ان کا جواب اطمینان سے سنا اور پھر جب حاضرین کو پوری طرح اپنی جانب متوجہ پایا اور دل کی زمین ہدایت کا بیج قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئی تو آپ ﷺ نے حاضرین کے ذہنوں کو حکمت کے ساتھ دوسری دنیا کی طرف موڑا اور نہایت نفسیاتی انداز میں بتایا کہ مؤمن کو ہر معاملہ میں آخرت کے نقطہ نظر سے سوچنا چاہیے۔ دنیا کی خوشحالی یا غربت، یہاں کا ساز و سامان یا فقر و فاقہ تو عارضی چیز ہے۔ اصل میں تو دیوالیہ اور مفلس وہ شخص ہے جو حشر کے میدان میں خالی ہاتھ رہ جائے۔ پھر آپ ﷺ نے سادہ انداز میں یہ حقیقت ہی نہیں سمجھائی کہ اصل مفلس میدان حشر کا مفلس ہی کیوں ہے، بلکہ آپ ﷺ نے نہایت ہی عبرت انگیز انداز میں اللہ کے سامنے حاضری کی ایسی تصویر کھینچی کہ حاضرین تھوڑی دیر کے لیے خود کو میدان حشر میں موجود محسوس کرتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ گویا ان کے سامنے ایک بندہ نماز، روزہ اور زکوٰۃ جیسی بنیادی اور اہم عبادتوں کا توشہ لیے ہوئے اللہ کے حضور پہنچتا ہے، لیکن اس کے ساتھ کچھ فریادی بھی اس کا دامن اور گریبان پکڑے ہوئے آتے ہیں۔ فریادی اللہ سے فریاد کرتے ہیں کہ پروردگار! اس نے ہمارے حقوق دبائے، ہمارے ساتھ زیادتی کی اور ہماری عزت و آبرو لوٹی اور ہمارا دل دکھایا۔ اللہ نے ان مظلوموں کی فریادرسی فرمائی اور پھر یہ دین کے صحیح تصور سے ناآشنا بندہ ان فریادیوں کے گناہوں کی پاداش میں ذلت کے ساتھ جہنم میں جھونک دیا جاتا ہے۔

اس پیغمبرانہ اندازِ بیان کا کمال یہ ہے کہ آدمی بندے کے حقوق سے لاپروائی اور ان پر ظلم و زیادتی کا انجام

اپنے تصور کی آنکھوں سے دیکھ کر لرز اٹھتا ہے اور بے اختیار جھرجھری لے کر اٹل فیصلہ کرتا ہے کہ اب اللہ کے کسی بندے کا دل نہ دکھاؤں گا، کبھی کسی کا حق نہ دباؤں گا اور کبھی کسی کی عزت و آبرو کو بٹہ نہ لگاؤں گا اور یہ حقیقت ہے کہ اس خوشگوار فیصلہ تک مخاطب کو پہنچانے میں داعی اعظم ﷺ کی پیغمبرانہ تفہیم کا بہت بڑا حصہ ہے۔

جو اصل اور اہم حقیقت آپ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں بٹھانا چاہتے ہیں، وہ ہے ''دین کا صحیح تصور'' ـــــ دین کا صحیح تصور نہ ہو تو زندگی میں نہ وہ دلکشی اور جامعیت پیدا ہو پاتی ہے جو دین کو مطلوب ہے اور نہ اللہ کے نزدیک آدمی دیندار قرار پاتا ہے۔ پھر دیندارانہ زندگی گزارنے کا حاصل ہی کیا اگر آدمی کو آخرت میں فلاح و نجات نصیب نہ ہو۔ دین و دنیا کی تفریق ایک انتہائی گمراہ کن تصور ہے۔ اس غلط تصور کے نتیجے میں ایک شخص خود کو دیندار تصور کرتا ہے، دینداری کے زعم میں مبتلا ہوتا ہے لیکن حقیقت میں وہ دین سے بہت دور ہوتا ہے، بلکہ دین کی نگاہ میں بدترین مجرم ہے۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ آخرت کے لیے توشہ تیار کر رہا ہے اور وہاں اس کا دامن بھرا ہوا ہے، لیکن حقیقت میں وہ دیوالیہ ہوتا ہے اور حشر کے میدان میں خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔ ایسا شخص خود بھی دین اور دین کی برکتوں سے محروم ہوتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اس کی زندگی سے دین سیکھنے اور دین کی عظمت محسوس کرنے کی بجائے دین سے بدکنے لگتے ہیں اور یہ غلط تصور دین ایسے لوگوں کو بظاہر دینداری اختیار کیے رہنے کے باوجود دین سے بہت دور کر دیتا ہے۔ اس میں شک اور تذبذب کی کیا گنجائش ہے کہ دین میں عبادات کی بڑی اہمیت ہے۔ اسلامی زندگی کی ساری دلکشی اور رعنائی عبادات ہی کے دم سے ہے۔ عبادات دین کا ستون ہیں۔ انہی پر دین کی عمارت قائم ہے اور ان ارکان دین کے بغیر دین کے نہ کوئی معنی ہیں اور نہ دین کا تصور ہی کیا جا سکتا ہے، لیکن ان ستونوں پر دین کی عمارت اسی وقت قائم ہوتی ہے جب عبادت کرنے والے کو ان کی اصل روح کا شعور ہو اور دین میں اس کی اصل حیثیت کو سمجھ کر دین کی منشا کے مطابق ان کا اہتمام اور التزام کرتا ہو۔

اللہ کے رسول ﷺ نے امت کو دین کے بارے میں جو صحیح تصور دیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ دین دراصل اللہ اور اللہ کے بندوں کے حقوق کے معتدل امتزاج کا نام ہے، دیندار مسلمان وہ ہے جو اللہ اور بندے دونوں کا حق ادا کرتا ہے ـــــ بات یہ نہیں ہے کہ عبادت کرنے والے کو اللہ کے بندوں کے حقوق ادا کرنے چاہئیں ـــــ یہ انداز بہت ڈھیلا ڈھالا ہے، اس سے اصل حقیقت کی صحیح اور واقعی ترجمانی نہیں ہوتی، جس طرح یہ انداز بیان صحیح نہیں ہے کہ بندوں کے حقوق ادا کرنے والے کو نماز روزے کا بھی پابند ہونا چاہیے ـــــ صحیح بات یہ ہے کہ اللہ کا حق اور بندے کا حق ایک ہی اسلامی کردار کے دو رخ ہیں۔ جس طرح سکے کے دو رخ ہوتے ہیں اور یہ کہنے کی بات نہیں ہوتی، کہ سکے کا اگر یہ رخ ہے تو وہ بھی ہونا چاہیے، بلکہ سکہ تو ہوتا ہی وہ ہے جس کے دو رخ ہوں۔ اسلامی عقائد کے سرچشمے سے جس طرح عبادات کے اہتمام کا جذبہ ابھرتا ہے اسی طرح انسانی حقوق کا احساس بھی لازماً

پیدا ہوتا ہے اور ایمان باللہ کے عقیدے سے بیک وقت کردار کے یہ دونوں حسین رخ جنم لیتے ہیں۔

بندوں کے حقوق غصب کرنے والا، بندوں کے ساتھ ظالمانہ رویہ اختیار کرنے والا' نماز روزے کا اہتمام کرتا نظر آتا ہے تو یقین کر لیجیے کہ وہ ان عبادات کی روح کو نہیں پا سکا ہے، وہ دین کے صحیح فہم سے محروم ہے اور وہ دین کی اطاعت دین کے منشا کے مطابق نہیں کر رہا ہے۔ اسی طرح اگر ایک شخص بندوں کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کر رہا ہے، لیکن نماز، روزہ اور دوسری بنیادی عبادتوں سے یکسر غافل ہے تو وہ بھی دین سے محروم ہے اور اس کی یہ زندگی بھی وہ اسلامی زندگی نہیں ہے جو اسلام کو مطلوب ہے۔

اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق کا مثالی احساس اور مطلوب امتزاج وہ پاکیزہ نمونہ ہے جو ہمیں داعی اعظم ﷺ کی زندگی میں نظر آتا ہے ـــــ آپ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی قیام گاہ میں بیٹھے ہوئے ہیں، گھر کے لوگوں سے مختلف قسم کی گفتگوئیں ہو رہی ہیں اور ایک خوشگوار گھریلو ماحول ہے کہ اسی دوران مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوتی ہے۔ اذان کی آواز سنتے ہی آپ ﷺ یکا یک اس طرح اٹھ جاتے ہیں گویا گھر کے یہ سارے لوگ اجنبی ہیں اور آپ ﷺ کو ان سے کوئی سروکار نہیں ـــــ یہ اللہ سے حسن تعلق کا رخ ہے۔

دوسرا رخ دیکھئے۔ آپ ﷺ مسجد نبوی میں نماز پڑھا رہے ہیں۔ دل بستگی کے ساتھ قرآن پاک کی تلاوت کر رہے ہیں اور بے اختیار آپ ﷺ کا جی چاہتا ہے کہ قرأت کچھ اور طویل کر دیں، کہ اسی دوران کسی بچے کے رونے کی آواز آتی ہے، آواز سنتے ہی آپ ﷺ نماز مختصر کر دیتے ہیں کہ ماں کے نازک دل کو بچے کے رونے کی وجہ سے کہیں تکلیف نہ پہنچ جائے ـــــ یہی دین کا صحیح تصور ہے اور یہی مطلوب اسلامی زندگی ہے۔ اسلام ایک جامع دین ہے، وہ دین اور دنیا کو دو الگ الگ خانوں میں بانٹنے کا روادار نہیں ہے ـــــ وہ عبادات کے اہتمام کی بھی تاکید کرتا ہے اور بندے کے حقوق کی مکمل فہرست دے کر ان کے ادا کرنے کا بھی تاکیدی حکم دیتا ہے ـــــ بلکہ ان کو ادا کیے بغیر نجات کی ضمانت نہیں دیتا اور ایسے نادان دیندار کو حشر کا سب سے بڑا مفلس قرار دیا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذہنوں میں دین کا یہ صحیح تصور بٹھانے اور صحیح خطوط پر ان کے ذہنوں کی تربیت کرنے کے لیے آپ ﷺ نے ایک طرف تو یہ حکیمانہ پیرایہ بیان اختیار فرمایا، دوسری طرف اپنے عمل سے انتہائی سبق آموز اور رقت انگیز نمونے پیش فرمائے۔

حضور ﷺ سخت بیماری میں مبتلا ہیں، بخار کی شدت سے بدن جل رہا ہے، سر میں شدید درد ہے اور تکلیف کے مارے آپ ﷺ نے سر کو کپڑے سے کس کر باندھ رکھا ہے ـــــ اسی شدید تکلیف اور بیماری میں آپ ﷺ حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہ سے کہتے ہیں "فضل! مجھے مسجد لے چلو اور لوگوں سے کہو کہ وہ مسجد میں جمع ہو جائیں۔" حضرت فضل نے آپ ﷺ کو مسجد پہنچایا اور مسجد میں لوگ اپنے رسول ﷺ کی تقریر سننے کے لیے جمع ہو گئے۔

آپ ﷺ منبر پر تشریف لے گئے، اللہ کی حمد وثنا بیان کی اور پھر فرمایا:

''لوگو! میں تم سے بہت جلد رخصت ہونے والا ہوں۔ لوگو! جس کسی کی پیٹھ پر بھی میں نے کبھی کوڑا مارا ہو تو وہ مجھ سے بدلہ لے لے، میری پیٹھ حاضر ہے، میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے دنیا ہی میں بدلہ لے لے۔ اگر میں نے کسی کو ناحق برا بھلا کہا ہو تو میں حاضر ہوں، وہ بھی یہیں مجھ سے اپنا بدلہ لے لے اور جس شخص کا میرے ذمہ کوئی بھی مال ہو تو وہ مجھ سے وصول کر لے اور یہ خوف نہ کرے کہ بعد میں اس کی کسر نکالوں گا، یہ میری شان کے منافی ہے۔ تم میں سب سے زیادہ مجھے وہ آدمی پیارا ہے جو مجھ سے اپنا حق دنیا میں ہی وصول کر لے یا پھر خوشی خوشی معاف کر دے، تاکہ میں اپنے رب کے حضور خوش خوش حاضر ہوں۔

لوگو! تم میں سے جس کسی نے بھی کسی کا حق دبا رکھا ہو وہ اس کا حق لوٹا دے اور دنیا کی رسوائی کا خیال نہ کرے۔ ورنہ پھر آخرت کی رسوائی کے لیے تیار رہے —— جہاں کی رسوائی دنیا کی رسوائی سے کہیں زیادہ سخت اور عبرتناک ہوگی۔''

تقریر کا ایک ایک فقرہ یقین وایمان کی اس کیفیت کو جلا بخشتا ہے کہ بندوں کے حقوق سے غافل رہ کر آدمی اللہ کے حضور سرخرو نہیں ہوسکتا اور آخرت کی فلاح وکامرانی اسی خوش نصیب کا حصہ ہے جو اللہ کو بھی پہچانے اور بندوں کا حق بھی ادا کرے اور جو دین کے اس صحیح تصور کے ساتھ زندگی گزارے کہ اللہ سے بھی بہترین تعلق قائم رکھے اور بندوں سے بھی، اللہ کا شکر گزار بندہ بھی رہے اور بندوں کے لیے رحمت وشفقت کا پیکر بھی۔

بے شک عبادت وریاضت اور ذکر وفکر کی دین میں بڑی اہمیت ہے اور ان سے محروم اجاڑ زندگی اسلام کو ہرگز پسند نہیں ہے، لیکن عبادت ونوافل اور ذکر وفکر کی کوئی ایسی مشغولیت جو آدمی کو دنیاوی ذمہ داریوں سے یکسر غافل کر دے اور وہ دنیا کے کسی مصرف ہی کا نہ رہے اسلام کی نظر میں ہرگز پسندیدہ نہیں۔ اسلام کا مطلوب انسان وہ ہے جو عبادت وذکر سے بھی شغف رکھے، انسانی حقوق بھی ادا کرے اور دنیوی ذمہ داریاں ادا کرنے میں بھی چاق وچوبند ہو۔

ایک بار کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم کسی سفر سے واپس آنے کے بعد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے سفر کے ایک ساتھی کی بہت تعریف کرنے لگے کہ فلاں ساتھی بہت نیک ہے۔ ایسا نیک تو ہم نے کسی کو پایا ہی نہیں۔ سفر کے دوران یہ مسلسل قرآن کی تلاوت میں لگے رہتے اور جب بھی ہمارا قافلہ کسی جگہ پڑاؤ کرتا، یہ صاحب کسی دوسرے کام کی طرف توجہ نہ دیتے، بس نوافل واذکار میں مشغول ہو جاتے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ ذہن سامنے آنے کے بعد آپ ﷺ نے ضروری سمجھا کہ فکر ونظر کی تربیت کی جائے اور

آپ ﷺ نے بڑے حکیمانہ انداز میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دو سوال کر کے دوران سفر کی دوسری اہم ذمہ داریوں کی اہمیت واضح فرمائی، آپ ﷺ نے پوچھا:

''پھر اس کے سامان کی حفاظت کون کرتا تھا؟ اور اس کے اونٹ کو چارا پانی کون دیتا تھا؟''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بولے ''ہم سب ان کے سامان کی حفاظت کرتے تھے اور ہم ہی ان کے اونٹ کو چارا پانی دیتے تھے۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ جواب سن کر آپ ﷺ نے فیصلہ کن انداز میں ایک ایسی بات کہی کہ ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''تب تو تم لوگ اُس سے بہتر ہو۔''

یہ فیصلہ دے کر دراصل آپ ﷺ نے ان کو بتایا کہ اسلام کو ذکر وفکر اور درود وظائف کی کوئی ایسی مشغولیت ہرگز مطلوب نہیں ہے جس کی وجہ سے آدمی اپنی دوسری ساری ذمہ داریوں سے غافل ہو جائے۔ یہ یک رخا انداز فکر وعمل دین کے منشا کے خلاف ہے۔ دین دنیوی ذمہ داریوں سے فرار کو پسند نہیں کرتا، بلکہ دنیا کی ذمہ داریوں کو مثالی انداز میں پورا کرتے ہوئے آخرت کو کامیاب بنانے کا سبق دیتا ہے اور اس سبق کی اہمیت وتاکید کا حال یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ جب دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں، نزع کا عالم ہے، سانس میں گھڑ گھڑاہٹ شروع ہو چکی ہے، تکلیف کی شدت سے آپ ﷺ کبھی چادر منہ پر ڈالتے اور کبھی ہٹاتے ہیں۔ اسی بے چینی اور تکلیف میں آپ ﷺ کے ہونٹ ہلتے ہیں۔ قریب بیٹھے لوگوں نے کان لگائے اور آپ ﷺ فرما رہے تھے:

| وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ | اَلصَّلٰوةُ الصَّلٰوة |
|---|---|
| اور تمہارے زیر دست | نماز، نماز۔ |

چلتے چلتے آپ ﷺ نے امت کو بتایا کہ دین اللہ اور اللہ کے بندوں کے حقوق ادا کرنے ہی کا نام ہے۔ اللہ کے حقوق میں سے بڑا حق یہ ہے کہ نماز کا اہتمام رکھا جائے اور اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ توجہ کے مستحق معاشرے کے وہ گرے پڑے لوگ ہیں، جو تمہارے ماتحت اور دست نگر ہیں۔



# جب آپ کی بیٹی کا پیغام آئے

آپ بیٹی کے باپ ہیں۔ بیٹی کے باپ کا سر ہمیشہ نیچا رہتا ہے۔ اسے ہمیشہ بہت کچھ سننا اور سہنا پڑتا ہے۔ بیٹی والا کبھی سر اونچا نہیں اٹھا سکتا۔ اسے ہمیشہ اپنی بات نیچی ہی رکھنی پڑتی ہے۔

بیٹی کا باپ بنا ہے تو اس کے لیے ذلت مقدر ہو چکی ہے۔ بیٹی کے باپ کے لیے عزت، خوشی اور مسکراہٹ کہاں، اسے تو عمر بھر رونا ہی ہے—— یہ باتیں آپ بھی مسلمان سماج میں سنتے ہیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی دبی زبان سے تائید کر دیتے ہیں۔

آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے عرب سماج میں بیٹی سے متعلق جو تصورات تھے، اس کا عبرت انگیز نقشہ قرآن نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

> ''جب ان میں سے کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے، سوچتا ہے ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے، یا مٹی میں دبا دے، کیسے برے حکم ہیں جو یہ اللہ کے بارے میں لگاتے ہیں''۔

یہ ایک جاہلی سماج کا انداز فکر تھا اور وہ جس کی بادل ناخواستہ کبھی کبھی آپ کو بھی تائید کرنی پڑ جاتی ہے۔ آج کے مسلمان سماج کا انداز فکر ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں انداز فکر جاہلیت کی پیداوار ہیں۔ دونوں کا سرچشمہ ضلالت و جہالت ہے۔ دونوں سراسر باطل ہیں۔

بیٹی ذلت کی پوٹ نہیں، سعادت کا سرمایہ ہے۔ بیٹی ٹھکرانے کی چیز نہیں، استقبال کرنے کی چیز ہے۔ بیٹی اللہ کا انعام ہے۔ آپ کی بیٹی آپ کی جنت ہے اور جہنم سے آپ کے لیے آڑ ہے۔ آپ کے گھر جب بیٹی جنم لے تو اللہ کا شکر ادا کیجیے۔ غمزدہ ہونا، منہ بسورنا، دل تھوڑا کرنا اور بیٹی کو وبال سمجھنا مؤمن کی شان نہیں ہے۔ خوشی منائیے اور اس سعادت اور انعام پر فخر کیجیے کہ اللہ نے آپ کی جنت آپ کے گھر بھیج دی اور جہنم سے بچنے کی کنجی آپ کے گھر بھیج دی۔

کیا اس سے بڑھ کر فخر کی کوئی بات ہو سکتی ہے کہ آپ کو بیٹی کی بدولت رسول پاک ﷺ سے ایک نسبت اور مشابہت حاصل ہے۔ فخر موجودات حضرت محمد ﷺ بھی بیٹی والے تھے۔ آپ بھی بیٹی والے ہیں اور آپ کا ایمان ہے کہ حضرت محمد ﷺ اس کائنات میں سب سے افضل، سب سے برتر، سب سے عظیم اور سب سے زیادہ اللہ کے مقرب ہیں، آسمان کی آنکھ نے نہ ان سے افضل واعلیٰ انسان دیکھا ہے نہ کبھی دیکھ سکتی ہے —— اور حضور ﷺ بیٹی والے تھے۔ تو پھر آپ بیٹی والے ہو کر حقیر کیوں ہوں گے، آپ کا سر نیچا کیوں ہوگا اور سماج میں آپ ذلیل کیوں ہوں گے؟ رسول ﷺ پر ایمان رکھنے والا مسلمان سماج اگر بیٹی والے کو حقیر و ذلیل سمجھتا ہے۔ تو یہ بدترین قسم کی گستاخی، عبرتناک قسم کا ظلم اور انتہائی افسوسناک قسم کی جہالت ہے۔ رسول ﷺ سے نسبت جوڑنے والے مسلمان سماج کو کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ وہ اس طرح کا طرزِ فکر رکھے اور اسلام کو اپنا دین کہنے کے باوجود دینی افلاس کا ثبوت دے —— یقیناً آپ کے لیے یہ بات انتہائی فخر و مسرت کی ہے کہ آپ کے رسول ﷺ بھی بیٹی والے تھے اور آپ بھی بیٹی والے ہیں۔ اس نسبت پر آپ جتنا فخر کریں بجا ہے۔

مگر یہ ہرگز نہ بھولیے کہ آپ کو یہ نسبت حاصل ہے تو اس نسبت کی لاج رکھنا بھی آپ کا کام ہے۔ رسول ﷺ نے اپنی بیٹی کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، ان کی پیروی میں آپ بھی وہی سلوک کریں اور بیٹی کی اسی طرح قدر کریں جس طرح رسول ﷺ نے کی۔

بیٹی کے سلسلے میں ایک بہت نازک ذمہ داری اور انتہائی اہم حق یہ ہے کہ آپ اچھی جگہ اس کا رشتہ کریں، جب آپ کے یہاں بیٹی کا پیغام آئے تو آپ اچھے پیغام کو ترجیح دیں۔ اچھا رشتہ منتخب کریں اور کبھی بھی کسی دباؤ، لالچ، جہالت اور ناعاقبت اندیشی سے بچی کی زندگی تباہ نہ کریں۔

بیٹی کے لیے اچھا رشتہ کونسا باپ نہیں چاہتا، بے شک ہر باپ اپنی پیاری بیٹی کے لیے اچھا ہی رشتہ قبول کرتا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ایک شخص مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود اچھا رشتہ اسے سمجھتا ہے، جس کو سماج اچھا رشتہ کہتا ہے یا جو اس کے اپنے زعم میں اچھا رشتہ ہوتا ہے۔ اسے یہ پروا نہیں ہوتی کہ اللہ اور رسول ﷺ کے نزدیک بھی یہ اچھا رشتہ ہے یا نہیں، آپ اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان لائے ہیں۔ آپ کا معاملہ تو نہایت آسان ہے۔ آپ اللہ اور رسول ﷺ ہی سے پوچھیے کہ بیٹی کے لیے اچھا رشتہ کونسا ہے اور اچھے رشتے کی پہچان کیا ہے —— کیا اللہ اور رسول ﷺ نے آپ کو اس سلسلہ میں ہدایت نہیں دی ہے؟ کیا اس معاملہ میں کتاب وسنت نے آپ کو یونہی چھوڑ دیا ہے کہ، آپ تاریکی میں بھٹکتے رہیں؟ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ آپ کو اللہ اور رسول ﷺ نے ہر معاملہ میں صاف صاف اور متعین ہدایت دی ہے، بلکہ آپ کے دعویٰ ایمان کو قبول کر کے اللہ اور رسول ﷺ نے آپ سے یہ اختیار بھی چھین لیا ہے کہ آپ مؤمن ہوتے ہوئے اپنی مرضی سے کوئی فیصلہ کریں، مؤمن کا کام تو

صرف یہ ہے کہ وہ اللہ اور رسول ﷺ کے ہر فیصلے پر سر تسلیم خم کر دے اور پھر اس فیصلے پر اس کا ذہن وقلب ایسا مطمئن ہو کہ گویا اس نے اپنے دل کی مراد پالی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ؕ (الاحزاب۳۳:۳۶)

''کسی مؤمن اور مؤمنہ کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول ﷺ کسی معاملہ کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اس معاملہ میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے تو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑ گیا۔''

رسول ﷺ پر ایمان لانے کا مطلب یہی تو ہے کہ آپ پوری زندگی میں دل وجان سے ان کی کامل پیروی کریں اور یہ یقین رکھیں کہ دنیا میں ان سے زیادہ سچا، ان سے زیادہ آپ کا خیر خواہ، ان سے زیادہ شفیق ورحیم اور ان سے زیادہ حکیم ودانا اور کوئی نہیں ہے۔ رسول ﷺ نے جو کچھ آپ کے لیے فیصلہ فرمایا ہے اسی میں آپ کی بہتری ہے۔ یقیناً اسی پر عمل کر کے آپ دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو سکتے ہیں اور اس سے سرتابی کریں گے تو کوئی طاقت آپ کو دنیا اور آخرت کی ذلت سے نہیں بچا سکتی۔ اس حقیقت پر دل کی گہرائیوں سے مطمئن ہو جائیے کہ آپ کی بھلائی، آپ کے خاندان کی بھلائی، آپ کی بیٹی کی بھلائی صرف اس ہدایت کی تعمیل میں ہے جو رسول ﷺ نے آپ کو دی ہے۔ آپ کی بیٹی کے لیے بہترین رشتہ صرف وہی ہے جس کو آپ کے رسول ﷺ بہترین رشتہ کہیں۔ آپ تو اس رسول ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں، جن کے بارے میں اللہ کی گواہی آپ نے بارہا سنی ہوگی:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (التوبہ۹:۱۲۸)

''تم لوگوں کے پاس ایک رسول آ گئے ہیں جو خود تم ہی میں سے ہیں۔ تمہارا مشقت میں پڑنا ان پر بہت شاق ہے۔ وہ تمہاری فلاح کے حریص ہیں۔ مؤمنوں کے لیے وہ نہایت ہی شفیق اور نہایت ہی مہربان ہیں۔''

ایسے شفیق، سراپا رحمت رسول ﷺ پر آپ کا ایمان ہے۔ آپ کسی معمولی مشقت میں مبتلا ہوں، تو ان کا دل دکھتا ہے۔ وہ آپ کی فلاح کے حریص ہیں اور آپ کو اپنا بنانا چاہتے ہیں۔ یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ بیٹی کے لیے اچھے رشتے کے انتخاب میں انہوں نے آپ کی رہنمائی نہ کی ہو اور اس اہم ترین معاملے میں آپ کو یونہی چھوڑ دیا ہو کہ آپ اندھیرے میں بھٹکتے رہیں۔ بے شک انہوں نے اس معاملے میں آپ کو صاف صاف ہدایت دی ہے۔ اپنا روشن اسوہ آپ کے لیے چھوڑا ہے اور آپ کو یہ تنبیہ بھی کی ہے کہ ان کے اسوہ سے منہ موڑ کر ان کی ہدایت کے

خلاف آپ اگر کوئی رویہ اختیار کریں گے تو آپ کے خاندان اور آپ کے سماج میں زبردست فتنہ اور عظیم فساد رونما ہو جائے گا — اب آپ اپنے دل کو ٹٹو لیے — کہ دعویٰ ایمان کے باوجود آپ ان کے فیصلے اور ہدایت پر عمل کرنے سے کیوں کتراتے ہیں اور کیوں جان بوجھ کر اپنی تباہی کا سامان اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں۔

جب آپ کی بیٹی کا پیغام آئے تو آپ کیا دیکھیں۔ عام طور پر چار چیزیں دیکھی جاتی ہے۔ ۱- مال و دولت۔ ۲- حسب ونسب۔ ۳- حسن و جمال اور ۴- دین واخلاق۔

آپ کو ان میں سے کس چیز کا لحاظ کرنا چاہیے اور کس حد تک' یہ سنجیدگی سے سوچنے کی بات ہے۔

میرے نزدیک اس اہم سوال کا ایک ہی جواب ہے کہ آپ دین واخلاق کو دیکھیں اور اسی پر فیصلہ کا ارادہ کریں۔ مگر خوب سمجھ لیجئے جب میں آپ کو یہ جواب دیتا ہوں تو میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ باقی ساری چیزیں یکسر نظر انداز کر دیجیے۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ دین واخلاق کی خاطر آپ ساری چیزوں کو نظر انداز کر سکتے ہیں، لیکن ان کی خاطر دین واخلاق کو نظر انداز کرنا آپ کے لیے کسی طرح اور کسی وقت مناسب نہیں ہے — میں یہ نہیں کہتا کہ آپ مال و دولت کا خیال نہ کریں، مال و دولت سے نفرت کریں۔ جی نہیں، مال و دولت بھی قابل لحاظ چیز ہے، مال اللہ کا انعام ہے۔ اللہ نے مال کو فضل کہا ہے، خیر کہا ہے اور فضل تلاش کرنے کی ترغیب دی ہے۔ پھر مال کو قیام کہا ہے۔ قیام یا قوام اس جوہر کو کہتے ہیں جس پر کسی چیز کے وجود کی بنیاد ہوتی ہے۔ مال زندگی کا قوام ہے، مال زندگی کا دار و مدار ہے، زندگی کی بے شمار ضرورتیں اسی سے پوری ہوتی ہیں اور زندگی کی رونق کا ایک بڑا ذریعہ مال ہے — اللہ ہر ایک کو افلاس اور ناداری کی آفتوں سے محفوظ رکھے اور کسی ایمان لیوا آزمائش میں مبتلا نہ کرے۔

پھر مال ہی کے ذریعہ عادات واطوار، برتاؤ اور سلوک میں کچھ اعلیٰ قدریں پیدا ہوتی ہیں، اس لیے یہ کون کہہ سکتا ہے کہ بیٹی کے لیے رشتہ قبول کرتے وقت اس کا لحاظ ہی نہ کیا جائے اور اس طرف سے بالکل ہی آنکھیں بند کر لی جائیں۔ مال و دولت سے زندگی کی آسائشیں، سہولتیں حاصل ہوتی ہیں اور ایک حد تک سوسائٹی میں اس سے مقام بھی بنتا ہے، پھر مال و دولت کا فرق بعض اوقات لڑکی کے لیے پریشانیوں اور الجھنوں کا باعث بن جاتا ہے۔ اس لیے مال و دولت قطعی طور پر نظر انداز کر دینے کی چیز ہرگز نہیں ہے۔ اگر آپ کو کوئی یہ مشورہ دیتا ہے تو اسے خود اپنے مشورے پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔

خاندان کا پاس ولحاظ بھی کرنا ہی چاہیے۔ بے شک سارے انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ کسی پر کسی کو محض نسب کی وجہ سے برتری حاصل نہیں ہے۔ نسلی برتری کا غرور بے علمی اور جہالت کی پیداوار ہے، تو پھر کیا آپ خاندان اور برادری کے بارے میں مطلق نہ سوچیں — جی میں یہ بھی نہیں کہتا، دراصل شادی بیاہ کے وقت آپ

جب خاندان اور برادری کی بات کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ آپ کسی خاندان کو اونچا سمجھتے ہیں اور کسی کو نیچا اور آپ نسلی غرور میں مبتلا ہیں —— کسی خاندان کو کسی خاندان پر ترجیح دینے کی بعض معقول وجوہات بھی ہوتی ہیں اور بیٹی والے کو ان کا لحاظ کرنا ہی پڑتا ہے بلکہ کرنا ہی چاہیے۔

بعض خاندانوں کا رہن سہن، عادات و اطوار، طبیعت و مزاج، ذوق و سلیقہ، حالات و روایات دوسرے خاندانوں سے اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ دونوں میں اجنبیت اور غیریت کا زبردست فاصلہ ہوتا ہے۔ پھر بعض خاندانوں میں کچھ طبعی اور اخلاقی خرابیاں ایسی ضرور ہوتی ہیں، جن کو کسی طرح برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خرابیاں یا کمزوریاں اس لیے نہیں ہوتیں کہ یہ کسی نسل اور نسب کا خاصہ ہیں۔ بلکہ سماج میں کسی وجہ سے کوئی خاندان پس ماندہ سمجھا جانے لگا، وہ احساس کمتری کا شکار ہو گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ اس میں کچھ اخلاقی اور طبعی کمزوریاں پروان چڑھنے لگیں، پھر یہ کمزوریاں نسل در نسل منتقل ہونے لگیں اور عرصہ تک پیچھے رہ جانے کی وجہ سے یہ خرابیاں ایسی رچ بس گئیں کہ یہ اس خاندان کی امتیازی علامتیں قرار پا گئیں۔ بے شک عادات واطوار اور اخلاق و کردار کی یہ خرابیاں تربیت اور حالات کی تبدیلی سے دور ہو سکتی ہیں، مگر ان کا دور ہونا ایسا آسان بھی نہیں ہے۔ پشتوں سے جو کمزوریاں چلی آ رہی ہیں، ان کو ختم کرنے کے لیے بھی کم از کم دو ایک پشت تک تو انتظار کرنا ہی ہوگا۔ یہ کمزوریاں عام طور پر جہالت، ناداری، آرام طلبی اور احساس کمتری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، ان اسباب کی بنا پر اگر آپ رشتہ قبول کرتے وقت کسی خاندان کو کسی پر ترجیح دیتے ہیں، تو آپ کی حکمت، بصیرت، دور اندیشی اور سوجھ بوجھ کا یہی تقاضا ہے۔ اپنی بیٹی کو کسی ایسے خاندان میں بھیجنا، جس کا انداز معاشرت، ذوق و سلیقہ، عادات و اطوار، حالات و روایات آپ کے خاندان سے مختلف ہوں' عقلمندی نہیں ہے۔ ایسے ماحول میں آپ کی لڑکی خود کو کھپانے اور ایڈجسٹ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے گی اور طرح طرح کی الجھنیں اور مسائل پیدا ہوں گے جو آپ کے لیے زندگی بھر اذیت اور کوفت کا باعث ہوں گے اور لڑکی کی زندگی بھی بے مزہ اور بے رونق ہو کر رہ جائے گی۔ بیٹی کی محبت کا بھی تقاضا ہے، آپ کی دانائی کا بھی تقاضا ہے، دینی سوجھ بوجھ کا بھی تقاضا ہے اور بیٹی کا یہ حق بھی ہے کہ آپ رشتہ قبول کرتے وقت اس پہلو سے خاندان برادری اور کنبہ کا بھی خیال رکھیں۔ علمائے دین نے شادی کے سلسلے میں کفو کی جو بات کہی ہے، اس کا مفہوم یہی ہے کہ ان باتوں کا بھی لحاظ کیا جائے تاکہ شادیاں کامیاب رہیں۔

تیسری بات شکل و صورت کی ہے —— بے شک فیصلہ کرنے کے لیے سب کچھ شکل و صورت ہی نہیں ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ شکل و صورت کو بالکل نظر انداز کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ اچھی صورت ہر ایک کو اچھی لگتی ہے۔ حسن وصورت اور شخصیت بھی اللہ کا انعام ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ آپ اپنی لخت جگر کے لیے لڑکے کا انتخاب کرتے وقت اس کا سرے سے لحاظ ہی نہ کریں، میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اپنے لیے رفیق حیات منتخب کرتے وقت حسن و

جمال کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ تو یہ ظلم اور ناانصافی نہ ہوگی! کہ اپنے لیے تو ایک شخص اس کی اہمیت محسوس کرے اور بیٹی کے لیے اس بات کو یکسر نظر انداز کر دے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

إِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ وَّ يُحِبُّ الْجَمَالَ (مسلم: کتاب الایمان، ۲۶۵، ۲۶۷، ۲۶۹)

''اللہ جمال والا ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔''

کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس کا لحاظ نہ کریں۔ پھر حسن و جمال کا معاملہ بس اتنا ہی نہیں ہے کہ اس کا تعلق صرف آپ کی لڑکی کی پسند اور ناپسند تک ہی رہے بلکہ اس کے اثرات بہت دوررس ہوتے ہیں۔ آئندہ اولاد اور ان کی شادیوں پر بھی اس کے اثرات پڑتے ہیں —— اور اولاد کی شادیوں کا مسئلہ جان گھلا دینے والا غم بن کر رہ جاتا ہے —— آپ کی اولاد کی الجھن اور غم آپ کی اپنی الجھن اور غم ہی تو ہے۔ آپ کی دانائی اور بصیرت کا تقاضا یہی ہے کہ آپ یہ فیصلہ سنجیدگی سے کریں، محض جذباتی بن کر یہ فیصلہ نہ کریں۔ یہ زندگی بھر کا فیصلہ ہے۔ یہ فیصلہ شریفوں کی زندگی میں بار بار نہیں ہوتا۔ صرف ایک بار ہوتا ہے۔

پھر یہ بھی خیال رہے کہ یہ فیصلہ خاندان اور گھر کے قابل اعتماد افراد کے مشورے سے کریں، ان کا جذباتی تعاون ضرور حاصل کریں۔ اگر آپ کی کوئی اولاد جوان ہے تو اس کی رائے کو بھی سامنے رکھیں۔ کسی ایک اولاد کی شادی کا فیصلہ صرف اس اولاد پر یا آپ پر ہی اثر انداز نہیں ہوگا، آپ کی دوسری اولاد اور اس کے قریبی لوگ بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس کے اچھے برے اثرات آپ کے کنبے کے سب ہی لوگوں کو بھگتنا پڑتے ہیں۔ سب کا لحاظ رکھنا آپ کا فرض بھی ہے اور دوسروں کا فطری حق بھی۔ یہ فیصلہ جذباتی انداز میں نہ کیجیے، غم، غصہ، مسرت، محبت وغیرہ کے جذبات سے متاثر ہو کر کبھی جلد بازی میں زبان سے کوئی ایسا لفظ نہ نکالیے جس کے لیے پھر آپ کو زندگی بھر پچھتانا پڑے۔ زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو کمان سے نکلا ہوا تیر سمجھیے —— نکلے ہوئے الفاظ پھر واپس نہیں آتے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کی غلطی کا خمیازہ عمر بھر آپ کی اولاد کو بھگتنا پڑے اور آپ بھی اولاد کے ساتھ پھر غم کے آنسو بہاتے رہیں۔

بے شک آپ پیغام قبول کرتے وقت مال و دولت اور معاشی حیثیت کا بھی لحاظ رکھئے، خاندان، برادری کو بھی نظر انداز نہ کیجیے، حسن و جمال پر بھی نگاہ رکھئے۔ ان عوامل کو نظر انداز کرنا دینداری نہیں اور نہ ان کو اہمیت دینا بے دینی ہے، البتہ یہ بات ہرگز نہ بھولیں کہ مؤمن ماں باپ کے لیے فیصلہ کن عامل صرف دین و اخلاق ہے۔ آپ مال و دولت، خاندان، منصب اور حسن و جمال وغیرہ سب کچھ تو دیکھیں اور دین و کردار کا بالکل ہی خیال نہ کریں تو یہ ایک ایسا جرم ہے جو ہرگز قابل معافی نہیں، یہ عبرتناک جہالت ہے، دین و ایمان کی ناقدری ہے، ایسا سماج جس

میں یہ عبرتناک جہالت عام ہو جائے اس کو تباہی اور بربادی اور فتنہ وفساد سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔

آپ کی پیاری بیٹی کا جب پیغام آئے تو سب سے پہلے آپ اخلاق و کردار کو دیکھیں کہ پیغام دینے والوں میں اللہ اور رسول ﷺ سے تعلق کا کیا حال ہے، دینی قدروں کے احترام کی کیا کیفیت ہے۔ اللہ کا خوف دلوں میں ہے یا نہیں، دینی فرائض کا احساس کس حد تک ہے —— سب کچھ ہو اور دین و اخلاق نہ ہو تو اٹل فیصلہ کر لیجئے کہ آپ کی صاحب ایمان لڑکی ایسے گھرانے میں نہیں جا سکتی —— ایسے گھرانے سے خیر کی توقع نہیں رکھ سکتے، جہاں دینی قدروں کا احترام نہ ہو، دینی فرائض کا احساس نہ ہو، اللہ اور رسول ﷺ کا ذکر نہ ہو، دلوں میں اللہ کا خوف نہ ہو اور زندگیوں میں دین کی کوئی چھاپ نہ ہو۔ یہ نہیں کہا جا سکتا اور نہ آپ ایسا سوچیں کہ دیندار گھرانے میں اگر آپ نے بیٹی بیاہ دی تو اب کوئی کشمکش نہ ہوگی، کوئی الجھن پیدا نہ ہوگی، کوئی مسئلہ نہ اٹھے گا۔

جی نہیں، انسانوں کی اس دنیا میں ایسا نہیں ہوتا —— کشمکش بھی ہوگی، الجھنیں بھی پیدا ہوں گی —— لیکن ایسے لوگوں سے معاملات طے کرتے وقت آپ اللہ رسول کا واسطہ دے سکتے ہیں، اللہ اور رسول ﷺ کے احکام درمیان میں لا کر یاددہانی کرا سکتے ہیں، اللہ کا خوف انہیں جھنجوڑ سکتا ہے، جذبات سے مغلوب ہو کر اگر وہ کبھی غلطی یا زیادتی کر بیٹھیں تو یاددہانی کراتے ہی ان کی آنکھیں کھل سکتی ہیں۔ ان کی غفلت کا پردہ چاک ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی غلطی پر نادم ہو سکتے ہیں اور اللہ سے ڈر کر اپنی روش بدل سکتے ہیں۔ لیکن جہاں اللہ اور رسول ﷺ کا ذکر ہی نہ ہو، اللہ کا خوف نام کی کوئی چیز ہی نہ ہو تو ایسے لوگوں کو آپ کیا یاد دلائیں گے۔ ان کے دلوں پر آپ کہاں سے اثر انداز ہوں گے۔ دنیا کا خوف انہیں کتنے دنوں تک صحیح روش پر قائم رکھ سکے گا —— جو ناشکرے اپنے رب کی قدر نہ کرتے ہوں وہ کسی اور کی کیا قدر کر سکیں گے۔ کسی خدا فراموش اور حق سے غافل گھرانے میں اپنی لخت جگر کو بھیج کر آپ کس طرح یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ دین پر قائم رہے گی۔ اپنے دین و ایمان کو سلامت رکھے گی، آپ کی دی ہوئی تعلیم و تربیت پر قائم رہے گی اور اللہ اور رسول کے فرائض کو انجام دیتی رہے گی —— تو پھر کیا آپ اس کے لیے تیار ہو گئے ہیں کہ آپ کی لخت جگر بیٹی خدا فراموش ہو جائے، اللہ اور رسول ﷺ کے فرائض سے غافل ہو جائے، دینی روایات سے بے بہرہ ہو کر خدا فراموش ماحول کے رنگ میں رنگ جائے —— للہ ایسا نہ کیجئے، مؤمن کو تو اس کا تصور ہی لرزا دینے کے لیے کافی ہے۔

آپ بیٹی والے ہیں اور بیٹی کی شادی آپ کو کرنا ہی ہے، بیٹی کا پیغام قبول کرنا ہی ہوگا —— فیصلہ کر لیجئے کہ آپ اللہ اور رسول ﷺ کی ہدایات کے تحت ہی کسی پیغام کو قبول کریں گے۔ ہر حال میں اللہ اور رسول ﷺ کی مرضی کو ہی مقدم رکھیں گے۔ کسی رشتے کو رد کرنے کا معیار آپ کے لیے صرف اللہ اور رسول ﷺ کی ہدایت ہوگی۔ آپ کسی پیغام کو رد کریں گے تو اس لیے کہ اللہ اور رسول ﷺ نے آپ کو اس کے رد کرنے کی ہدایت فرمائی

ہے اور کسی پیغام کو قبول کریں گے تو صرف اس لیے کہ اللہ اور رسول ﷺ کی مرضی یہی ہے۔

بے شک آپ دوسری چیزوں سے بھی آنکھیں بند نہ کیجیے، لیکن فیصلہ کن بنیاد صرف دین و کردار کو بنائیے۔ اسی میں دین و دنیا کی بھلائی ہے، یہی روش اختیار کر کے آپ دنیا میں بھی سکون پائیں گے اور یہی روش آپ کو آخرت میں بھی سرخرو کرے گی۔ کسی کے دین و ایمان کی طرف سے آپ مطمئن ہوں لیکن دوسرے پہلو مثالی نہ ہوں تو بھی اپنی بچی کی دنیا اور آخرت خراب نہ کیجیے —— اپنے محسن رسول اللہ ﷺ کی ہدایت اس یقین کے ساتھ قبول کیجیے کہ اسی کو قبول کرنے میں دونوں جہاں کی کامرانی اور سعادت ہے۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

اذا خطب الیکم من ترضون دینه وخلقه فزوجوه الا تفعلوه تکن فتنه فی الارض و فساد کبیر (جامع ترمذی: کتاب النکاح)

”جب تمہارے یہاں کوئی ایسا شخص نکاح کا پیغام دے جس کے دین و اخلاق سے تم مطمئن اور خوش ہو تو اس سے بچی کی شادی کر دو، اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں زبردست فتنہ اور فساد پھیل جائے گا۔“



# نظامِ دین میں زکوٰۃ کی اہمیت

ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے سب اللہ کا ہی دیا ہوا ہے۔ یہ جسم و جان' یہ قوت وصلاحیت' یہ مال و دولت ان میں سے کون سی چیز ہماری پیدا کی ہوئی ہے؟ ہر چیز کا خالق و مالک وہی ہے اور کوئی چیز اس کے قبضہ سے باہر نہیں ہے۔ یہ حقیقت دن کے سورج سے زیادہ روشن ہے لیکن اس کے باوجود کچھ نادان' کم فہم اور جاہل ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو اپنی جان و مال کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں اور اصل خالق و مالک سے بے نیاز ہو کر جان و مال کے معاملے میں اپنی من مانی کرتے ہیں۔ افکار کے اسی اختلاف کے نتیجے میں سارے انسان دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں ایک وہ جو اپنی ہر چیز کا مالک اللہ کو مانتے ہیں اور اس کے بندے بن کر رہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو ہر چیز کو اپنی ملکیت سمجھ کر اپنے یا شیطان کے بندے بن کر رہتے ہیں۔ پہلا گروہ مؤمن اور مسلم ہے دوسرا گروہ کافر اور باغی ہے۔

## مؤمن کا نقطہ نظر:

مؤمن کے اس نقطہ نظر کی تشریح قرآن حکیم میں اس طرح کی گئی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ (التوبۃ 9:111)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض میں خرید لئے ہیں۔

ایمان لاکر در حقیقت مؤمن نے اللہ سے بیع کا ایک معاملہ کر لیا ہے۔ اس نے اپنی جان و مال کو اللہ کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ اور اللہ نے اسے خرید لیا ہے۔ یوں تو واقعی اصل کے اعتبار سے سب کچھ اللہ ہی کا ہے۔ اور آدمی چاہے یا نہ چاہے حقیقت میں اس پر اللہ کا ہی قبضہ ہے لیکن اللہ نے انسان کو اپنی جان اور اپنی دولت پر جو تھوڑا بہت اختیار دے دیا ہے کہ وہ جہاں چاہے ان دونوں کو صرف کرے اور جس طرح چاہے ان دونوں سے کام لے۔ اسی اختیار میں انسان کی آزمائش ہے اور اسی اختیار کے صحیح یا غلط استعمال کی وجہ سے مؤمن یا کافر کہلاتا ہے۔ مؤمن دراصل وہ ہے جو اپنے اختیار' ارادے اور دل کی خوشی سے سب کچھ اللہ کے حوالے کر دے' اس میں اپنے ارادے اور اپنے اختیار کو دخل دینے کے بجائے اللہ کی رضا پر راضی رہے اور اللہ سے جنت کا وعدہ پا کر اپنا سب کچھ اس کے ہاتھ

بیچ دے اور یہ سمجھے کہ بیچنے کے بعد اب بِکی ہوئی چیز میں ہمارا کوئی اختیار نہیں' اب تو خریدنے والا جو چاہے ان کے ساتھ کرے اور جہاں چاہے لگائے' ہم دینے والے یا روکنے والے کون ہوتے ہیں؟

## عبادت کا مقصود:

یہی صحیح اسلامی تصور ہے اور ایک مؤمن کی عملی زندگی اسی بنیادی تصور سے شروع ہوتی ہے۔ اسی حقیقت کو دلوں میں جمائے رکھنے اور اس معاہدہ کو ہر دم تازہ رکھنے کے لئے اللہ نے مؤمن پر دو قسم کی عبادتیں فرض کی ہیں' جانی عبادتیں اور مالی عبادتیں۔

## نماز اور زکوٰۃ:

نماز جسمانی عبادتوں میں اہم ترین عبادت ہے اور زکوٰۃ ایک اہم ترین مالی عبادت ہے۔ قرآن حکیم میں جگہ جگہ ان دونوں عبادتوں کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ط (البقرہ 2:110)

''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو''

کہنے کو تو یہ دو لفظ ہیں لیکن درحقیقت یہ پورے دین کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ مومن کے کئے ہوئے معاہدہ کے دو ستون ہیں' ان میں سے اگر ایک ستون بھی گرا تو ''معاہدہ ایمان'' کی پوری عمارت دھڑام سے زمین پر آ گرے گی اور اگر کوئی ایک کمزور ہوا تو ''معاہدہ ایمان'' کی عمارت کمزور ہو جائے گی۔

اللہ سے ہم نے جو معاہدہ کیا ہے وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہم نہ اپنے جسم و جان کے مالک ہیں نہ مال و دولت کے۔ ہماری موت و زیست' ہماری عبادت و قربانیاں سب کچھ اللہ کے لئے ہیں' ہمارے جسم و جان کے لئے وہ جو احکام دے یا جو حقوق عائد کرے ہم خوشی خوشی انہیں ادا کریں گے۔ اسی طرح ہمارے مال و دولت میں وہ حقوق جن بندوں کے قائم کرے ہم برضا و رغبت انہیں پہنچائیں گے۔

نماز اور زکوٰۃ اہم ترین جانی اور مالی عبادتیں ہیں ان کی حقیقت پر غور کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ یہ آدمی کی ایمانی اور اسلامی زندگی کی شہادت بھی ہیں اور ضمانت بھی۔

## نماز کیا ہے؟

نماز یہ ہے کہ آدمی اپنے وجود کو اللہ کے آگے ڈال دے۔ اس پر اپنی مرضی چلانے سے دست بردار ہو جائے اور خود کو اللہ کے قدموں میں ڈال کر اللہ کا مقرب اور اس کی رحمتوں کا مستحق بن جائے۔

## زکوٰۃ کیا ہے؟

زکوٰۃ یہ ہے کہ آدمی کے دل میں خدا کے سوا کسی چیز کی محبت نہیں' وہ اپنے دل کو مال و دولت جیسی پرکشش چیز

کی محبت سے بھی پاک کر چکا ہے۔ یہ اللہ کی امانت ہے وہ اس سے ضرورت بھر فائدہ اٹھائے گا اور اسے اللہ کی مرضی کے مطابق صرف کرے گا۔ زکوٰۃ آدمی کے دل میں یہ حقیقت جماتی ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے سب اللہ کا ہے اور سب اسی کی راہ میں' اس کی مرضی کے مطابق ہی صرف ہونا چاہیے۔ اللہ کا دیا ہوا مال تنہا ہمارا نہیں ہے بلکہ اس میں غریبوں' ناداروں' اپاہجوں اور سوسائٹی کے دوسرے کمزور اور بے سہارا لوگوں کا بھی حق ہے یہ اللہ کا محض فضل و کرم ہے کہ اس نے ہمیں یہ فضیلت بخشی اور اس لائق بنایا کہ ان کا حق ہمارے ہاتھوں کے واسطے سے ان تک پہنچتا ہے۔ مال آدمی کے اپنے علم و ہنر اور کوششوں کا حاصل نہیں' بلکہ اللہ کا فضل ہے۔ آدمی نے جن ہاتھوں' جن قوتوں' جس دماغ' جس ذہن' جس زبان اور جس توانائی کی کاوش سے مال حاصل کیا ہے' ان سب کا خالق اللہ ہی ہے۔

جان و مال کے بارے میں یہ تصور' صحیح اسلامی تصور ہے۔ اس پر یقین رکھنے والا اور اس کے مطابق اپنی پوری زندگی کو بنانے اور ڈھالنے والا مؤمن اور مسلم ہے اس تصور کو نہ ماننے والا اور اس کے خلاف زندگی گزارنے والا کافر و مشرک ہے۔

### اللہ سے وفاداری کی شہادت:

اللہ نے انہی لوگوں کو اپنا وفادار بندہ قرار دیا ہے جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں' ایسے ہی لوگ اللہ کی کتاب سے ہدایت حاصل کرتے ہیں اور ایسے ہی لوگ فی الواقع آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔

هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ○ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ○ (لقمان 31:3:4)

''جو نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں''۔

جو لوگ جان و مال کے معاملہ میں اللہ کی ہدایت اور حقیقت کے تقاضوں سے بے نیاز ہو کر اپنی من مانی کرتے ہیں' زکوٰۃ کا انکار کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں ادا کرنے سے جی چراتے ہیں' قرآن نے ایسے لوگوں کو آخرت فراموش اور مشرک و کافر قرار دیا ہے۔

وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ○ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ○

(حم السجدۃ 41:6:7)

''اور تباہی ہے ان مشرکوں کے لئے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور یہی لوگ ہیں جو آخرت کے منکر ہیں''۔

جو شخص زکوٰۃ نہیں دیتا در حقیقت وہ اپنے اللہ سے غافل ہے' آخرت کے یقین سے محروم ہے' نفس کا غلام ہے اور دنیا کی لذتوں میں اس طرح ڈوب چکا ہے کہ اس کی آنکھیں بے نور ہو چکی ہیں' دل زنگ آلود ہو چکا ہے اور یہ حقیقت اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہے کہ بندے کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے' بندے

کے لئے ہرگز سزاوار نہیں کہ وہ جان و مال میں اپنی من مانی راہ پر چلے اور حقیقی مالک سے سرتابی کرے۔

نماز اور زکوٰۃ نظام دین میں قلب و جگر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے بغیر اسلامی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا' جس طرح انسانی زندگی اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک قلب و جگر اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور اگر ان میں سے کوئی ایک بھی جواب دے جائے تو انسانی زندگی کا باقی رہنا محال ہو جاتا ہے۔ ٹھیک یہی حال نماز اور زکوٰۃ کا ہے۔ جب تک ان دونوں کا قیام و اہتمام رہتا ہے۔ اسلامی زندگی بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ باقی رہتی ہے لیکن اگر ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار کر دیا جائے یا عملاً کسی ایک سے بھی صرف نظر کر لی جائے تو پھر اسلامی زندگی کی بقا ناممکن ہو جاتی ہے۔ اسلامی زندگی کو باقی رکھنے کے لئے نماز و زکوٰۃ درحقیقت ایک ضمانت ہیں۔ جب یہ دونوں اسلامی زندگی میں روح پھونکتی رہتی ہیں' دینی نظام اپنی تمام برکتوں سمیت قائم و برقرار رہتا ہے اور جوں ہی ان میں سے کسی ایک ستون کو گرایا دیا جاتا ہے' دینی نظام کی پوری عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہتی ہے۔

## مسلم کے خطاب کا تقاضا:

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے بار بار ان دونوں کی ایک ساتھ تاکید کی ہے۔ اسے ایمان و اسلام کی شہادت قرار دیا ہے۔ اور مسلمان ملت کے اٹھائے جانے کا مقصد ہی یہ بتایا ہے کہ وہ اس دنیا میں نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کریں۔

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ط (الحج 22'78)

اس نے تمہارا نام پہلے ہی سے اور اسی امر کے پیش نظر مسلم رکھا ہے کہ رسول تم پر گواہ ہوں اور تم تمام لوگوں پر گواہ ہو پس نماز قائم کرو زکوٰۃ دو اور اللہ (کے دین) کو مضبوط پکڑے رہو۔

## مانعین زکوٰۃ سے جہاد:

خلیفہ اوّل کے زمانے میں جب کچھ لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو آپ نے ان کے خلاف جہاد کا اعلان فرمایا: اور آپ نے کہا: جو کوئی نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے اور زکوٰۃ دینے سے انکار کرے اگر وہ بکری کا ایک بچہ بھی زکوٰۃ میں روکے گا تو میں اس کے خلاف جہاد کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ ان سے جہاد کیسے کر سکتے ہیں جب یہ کلمہ توحید کے قائل ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: یقیناً رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمہ توحید کا اقرار کرنے والوں سے لڑنے کا منع فرمایا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا ہے جب تک یہ کلمہ توحید کا حق ادا کرتے رہیں۔ زکوٰۃ براہ راست کلمہ توحید کا حق ہے جو اس حق کا انکار کرے گا میں اس سے جہاد کروں گا اور صحابہ رضی اللہ عنہم بھی یہ سن کر مطمئن ہو گئے۔

## مسلم معاشرے کا امتیاز:

زکوٰۃ دراصل اسلامی معاشرہ کے دعویٰ ایمان کی تصدیق ہے اور وہ امتیازی علامت ہے جس کی بنیاد پر وہ

دوسرے معاشروں سے ممتاز ہوتا ہے۔ سورۂ توبہ میں اللہ تعالیٰ نے مشرکوں' یہودیوں اور منافقوں سے براۃ اور بیزاری کا اعلان کیا ہے اور مسلمانوں کو ہدایت دی ہے کہ وہ اپنی سوسائٹی کو شرک' بے دینی اور نفاق کی گندگیوں سے پاک کریں۔ اسی سورہ کے شروع میں یہ ہدایت بھی ہے کہ اگر یہ مشرک اور کافر' کفر و شرک سے توبہ کر کے نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو یہ تمہارے دینی بھائی ہیں' یعنی ''اسلامی معاشرہ'' کا امتیاز'' کافر معاشرہ'' کے مقابلہ میں یہ ہے کہ کافر معاشرہ اللہ اور بندوں کے حقوق سے غافل ہوتا ہے اور مسلم معاشرہ اللہ اور بندوں کے حقوق ادا کرتا ہے۔ اگر یہ مشرکین ایمان لائیں تو اس دعویٰ کی تصدیق اس بات سے ہوگی کہ وہ نماز قائم کرنے لگیں اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں۔ اگر یہ نماز ادا کرنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انہوں نے ایمان کی راہ کو اپنا لیا ہے اور اسلام کو اپنی زندگی کا دین قرار دے لیا ہے۔ اب یہ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کے ساتھ دینی بھائیوں جیسا سلوک کیا جائے۔

فَاِنۡ تَابُوۡا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ ؕ (التوبۃ 11:9)

''پس اگر یہ اپنی روش سے باز آجائیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو یہ تمہارے دینی بھائی ہیں''۔

## خلافت الٰہیہ کا مقصد:

پھر زکوٰۃ کی اہمیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو خلافت کے عظیم الشان منصب پر سرفراز فرمائے گا' ان کا اوّلین کام ہی یہ ہوگا کہ وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے' یعنی امت مسلمہ جس عظیم الشان فریضہ کے لئے برپا کی گئی ہے اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم ہو۔

اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ (الحج 41,22)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار بخشیں تو یہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے۔

حقیقت بھی یہ ہے کہ خلافت الٰہیہ اور اسلامی نظام کے قیام کا مقصد اس کے سوا کچھ ہو نہیں سکتا' اسلامی نظام کا مفہوم یہی تو ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام ہی معاملات دین کے تحت ہوں اور پوری زندگی پر دین نافذ ہو۔ غور کیجئے' دین اس کے سوا اور کیا ہے کہ آدمی اللہ کے حقوق پہچانے' اس کا سچا بندہ بنے اور اس سے اپنے تعلق کو مضبوط کرے' اللہ کے بندوں سے اللہ کی مرضی کے مطابق خوشگوار تعلقات رکھے اور ان کے حقوق ادا کرے۔ سوچیے' نماز اور زکوٰۃ کی روح اس کے سوا کیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ زکوٰۃ پچھلی امتوں پر بھی فرض رہی ہے اور قرآن کی شہادت ہے کہ انہیں نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کی گئی تھی۔

وَ جَعَلۡنٰـہُمۡ اَئِمَّۃً یَّہۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡہِمۡ فِعۡلَ الۡخَیۡرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوۃِ وَ اِیۡتَآءَ الزَّکٰوۃِ ۚ وَ کَانُوۡا لَنَا عٰبِدِیۡنَ ۙ (الانبیاء 73:21)

''اور ہم نے انہیں وحی کے ذریعہ ہدایت کی کہ نیک کام کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور وہ سب ہماری بندگی کرنے والے تھے''۔

اس آیت کریمہ سے پہلے حضرت موسیٰ' حضرت ہارون علیہما السلام کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ہم نے انہیں ایک ایسی کتاب دی جو حق و باطل میں فرق کرنے والی' نصیحت کرنے اور روشنی بخشنے والی تھی اس کے بعد پھر ابراہیم علیہ السلام کا تفصیلی قصہ ہے کہ انہیں آگ میں ڈالا گیا اور آگ اللہ کے حکم سے ٹھنڈی ہوگئی پھر اسی ضمن میں حضرت لوط' حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کا ذکر ہے قرآن کی شہادت یہ ہے کہ ان سب کو نماز اور زکوٰۃ کی ہدایت کی گئی ہے۔

وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ○ ۔(مریم31:19)

''اور اللہ نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کی ہے جب تک زندہ ہوں''۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کرتے رہتے تھے۔

## زکوٰۃ کی ترغیب:

زکوٰۃ کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر قرآن حکیم نے طرح طرح سے اس کی ترغیب دی' اور خود رسول اللہ ﷺ نے بھی مختلف طریقوں سے زکوٰۃ دینے پر ابھارا ہے کبھی آپ ﷺ نے اسی کے دنیوی فوائد بتا کر اکسایا' کبھی آپ ﷺ نے ان انعامات کا ذکر فرمایا جو آخرت میں ملنے والے ہیں اور اس طرح زکوٰۃ کی برکتیں بتا کر وہ آخرت میں ملنے والے اجر عظیم یاد دلا کر آپ ﷺ نے مسلمانوں کو ترغیب دی ہے کہ وہ زکوٰۃ ادا کرنے میں انتہائی خوش دلی اور وسعت قلب کا ثبوت دیں' قرآن مجید میں ہے۔

وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ط اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِیْهِمْ اَجْرًا عَظِیْمًا ○ (النساء162:3)

''اور نماز قائم کرنے والوں زکوٰۃ دینے والوں اور اللہ اور یوم آخر پر سچا ایمان رکھنے والوں کو ہم ضرور اجر عظیم عطا کریں گے''۔

یہ اجر عظیم کیا ہے؟ خطاؤں کی معافی' مغفرت' قیامت کے ہولناک دن میں اطمینان و سکون' اللہ کی معیت' ولایت' حکمت کی بیش بہا دولت اور ایسی سدا بہار جنتیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں سورۂ مائدہ میں ہے۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا ط وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ ط لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ

قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ○

''اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا تھا میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دی اور میرے رسولوں پر ایمان لائے اور ان کی مدد کی اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے تو یقین رکھو کہ میں تمہاری برائیاں زائل کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں''۔ (المائدہ5:12)

سورہ بقرہ میں انفاق اور اللہ کی راہ میں بہترین مال خرچ کرنے کا حکم دینے کے بعد کہا گیا ہے۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ○ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ○

''شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے مگر اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے اللہ بڑا ہی فراخ دست اور دانا ہے جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت ملی اس کو حقیقت میں بڑی دولت مل گئی''۔ (البقرہ2، 268، 269)

سورۂ بقرہ ہی میں ایک دوسری جگہ کہا گیا ہے:

''جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں اور نماز قائم کریں زکوٰۃ دیں ان کا اجر بے شک ان کے رب کے پاس ہے' انہیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم''۔

واقعتاً سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ آدمی آخرت کے دن سکون و اطمینان سے ہو۔ نہ اسے یہ ملال ہو کہ میری زندگی اکارت گئی اور نہ یہ اندیشہ ہو کر یہ آخرت کی نعمتیں کبھی مجھ سے چھین جائیں گی۔

اسی سورہ میں ایک موقع پر ترغیب دیتے ہوئے کہا گیا ہے اللہ کی راہ میں جو شخص ایک حبہ خرچ کرتا ہے۔ اللہ اسے سات سو گنے تک بڑھا کر اس کا اجر دیتا ہے اور اللہ سے اسی کی توقع رکھنی چاہیے' کیونکہ وہ بہت فراخ دست ہے اور وہ زکوٰۃ کی مقدار کو نہیں دیکھتا ہے بلکہ ان جذبات پر بھی اس کی نظر ہے جو آدمی کو زکوٰۃ پر ابھارتے ہیں یا زکوٰۃ دیتے وقت دل میں موجزن ہوتے ہیں۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ○

''جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ پر خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا

جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں اسی طرح اللہ تعالیٰ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزائش عطا کرتا ہے وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی''۔ (البقرہ 261:2)

اسی طرح حدیث میں بھی زکوٰۃ کی بڑی ترغیب دی گئی ہے اور مختلف طریقوں سے اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے پر ابھارا گیا ہے۔

نبی ﷺ فرمایا کرتے تھے اگر میرے پاس احد پہاڑ کے برابر بھی سونا ہو تو میری خواہش یہ ہوگی کہ تین دن میں سب خیرات کر دوں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: تین چیزیں ہیں جن کے بارے میں قسم کھا سکتا ہوں (دیکھو) ایک تو وہ شخص ہے جس کا اسلام میں حصہ ہے اور ایک وہ ہے جس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں' اللہ ان دونوں کے ساتھ ہے' اللہ اس دنیا میں ہرگز یکساں سلوک نہ کرے گا اور اسلام کے حصے تین ہیں' نماز' روزہ اور زکوٰۃ' اور یہ ممکن نہیں کہ اللہ دنیا میں جس کی دستگیری کرے اسے قیامت میں یونہی دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے اور اپنی رحمت سے اس کی دستگیری نہ کرے۔ (مسند احمد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک دن رسول اللہ ﷺ خطبہ دینے کھڑے ہوئے تو آپ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! تین بار آپ نے اسی طرح قسم کھائی اور پھر آپ ﷺ نے سر جھکا لیا آپ کا چمکتا چہرہ ہمارے لئے سرخ اونٹوں سے زیادہ مرغوب تھا' پھر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اللہ کا جو بندہ بھی پانچ وقت کی نماز پڑھے' روزے رکھے' زکوٰۃ ادا کرے اور سات بڑے گناہوں سے بچا رہے' اس کے لئے جنت کے دروازے کھلے ہوں گے اور اس سے کہا جائے گا تشریف لایئے! اللہ آپ کو سلامت رکھے''۔ (نسائی' ابن ماجہ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک بار نبی ﷺ کے پاس ایک دیہاتی شخص آیا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! کوئی ایسا عمل بتایئے جس کی پابندی کر کے میں جنت میں داخل ہو جاؤں آپ نے ارشاد فرمایا: اللہ کی بندگی کر' اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ بنا اور فرض نماز پابندی سے پڑھتا رہ' اور اللہ نے جو زکوٰۃ فرض کی ہے اسے ادا کرتا رہ اور رمضان کے روزے رکھ''۔ وہ بولا اس ''اس اللہ کی قسم! جس کے قبضہ میں میری جان ہے نہ اس میں ذرا کچھ اضافہ کروں گا اور نہ کمی کروں گا''۔ جب وہ جانے لگا تو نبی ﷺ نے لوگوں سے کہا جو شخص جنتی آدمی کو دیکھنا چاہتا ہے' وہ اس کو دیکھ لے۔ (بخاری)' (کتاب الزکوٰۃ باب اوّل وجوب الزکوٰۃ' ص 109)

حضرت عمرو ابن مرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قبیلہ قضاعہ کا ایک آدمی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اور یہ کہ آپ اللہ کے رسول ﷺ ہیں اور یہ کہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتا

ہوں' رمضان میں دن کو روزے رکھتا ہوں اور رات میں نوافل پڑھتا ہوں اور زکوٰۃ ادا کرتا ہوں''۔ رسول اللہ ﷺ نے جواب میں فرمایا: جو یہ عمل کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوا وہ صدیقین اور شہداء کے گروہ میں ہوگا۔

## زکوٰۃ نہ دینے کی لرزہ خیز سزا

جو لوگ مال و دولت کے پجاری بن کر دن رات اس کے سمیٹنے اور جمع کرنے ہی میں لگے رہتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرنے اور غریبوں کا حق دینے کا ذرا فکر نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ○ (التوبہ 9-34-35)

''اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو''۔

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ھُوَ خَيْرًا لَّھُمْ ۭ بَلْ ھُوَ شَرٌّ لَّھُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ (آل عمران 180:3)

اور جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لئے اچھی ہے۔ نہیں' یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔

احادیث رسول ﷺ میں اور بھی زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ان دردناک سزاؤں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کے پاس سونا چاندی ہو اور وہ اس کا حق یعنی زکوٰۃ نہ دے' تو قیامت کے دن اس کے لئے آگ کی تختیاں تیار کی جائیں گی اور دوزخ کی آگ میں تپا کر دونوں پہلو' پیٹھ اور پیشانی کو داغا جائے گا اور جب جب وہ ٹھنڈی ہوگی پھر تپائی جائے گی اور داغا جاتا رہے گا۔

(مشکوٰۃ کتاب الزکوٰۃ فصل اول ص 155 'طباعت کراچی)

ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

''جس کسی کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت سے نوازا اور اس نے اس کی زکوٰۃ نہیں دی تو اس کا یہ مال قیامت کے دن نہایت زہریلے سانپ کی شکل اختیار کرلے گا جس کے سر پر دو کالے نقطے ہوں گے اور وہ سانپ اس کے گلے میں لپٹ جائے گا پھر یہ سانپ اس کے دونوں جبڑوں کو پکڑ کر کہے گا میں تیرا مال ہوں میں تیرا جمع کیا ہوا خزانہ ہوں''۔(ابن ماجہ' کتاب الزکوٰۃ' باب 2 ماجاء فی منع الزکوٰۃ ص 2583)

احادیث میں اس کے علاوہ بھی بہت سی ہولناک سزائیں بیان کی گئی ہیں جن کے تصور ہی سے آدمی کے ہوش اڑنے لگتے ہیں۔ اللہ ہمیں ان سزاؤں سے محفوظ رکھے۔ دراصل زکوٰۃ کا انکار یا اس کی ادائیگی سے غفلت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اسلام کے اس بنیادی تصور سے ہی محروم ہے کہ ہماری جان و مال سب کچھ اللہ کا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے بغیر ایمان و اسلام کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

## آدابِ زکوٰۃ:

زکوٰۃ کی اس اہمیت اور فضیلت کو سامنے رکھئے تو یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ کوئی مؤمن زکوٰۃ دینے میں بھی کوتاہی کرے گا۔ یہ تو اپنے دین و ایمان کے ثبوت دینے کا ایک موقع ہے جو سال بھر میں صرف ایک ہی بار آتا ہے اور مؤمن کی تو یہ تمنا ہوتی ہے کہ بار بار اسے ایسے مواقع ملتے رہیں کہ اللہ سے وفاداری' رسول سے والہانہ تعلق اور دین سے شغف کا ثبوت دے سکے' لیکن یہ ثبوت اسی وقت مکمل ہو گا اور زکوٰۃ سے آپ دینی اور دنیوی فوائد حاصل کر سکیں گے جب چند باتوں کا لحاظ رکھیں ان کو ہم آدابِ زکوٰۃ کہہ سکتے ہیں۔

1- سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ زکوٰۃ خلوصِ نیت سے ادا کیجئے' محض اللہ کی رضا اور آخری کے اجر و ثواب کو پیش نظر رکھئے' اس کے سوا کوئی دوسرا مقصود آپ کے سامنے نہ رہے۔ اللہ ایسے ہی لوگوں کے مال و دولت میں خیر و برکت فرماتا ہے جو محض اللہ کو خوش کرنے کے لئے پوری رغبت اور فراخ دلی سے زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔

2- زکوٰۃ میں وہ مال دیجئے جو آپ کی نظر میں بہتر ہے' غور کیجئے آپ جب دوسروں سے کچھ لیتے ہیں تو کبھی خراب اور گھٹیا چیز نہیں لیتے اور پوری احتیاط اور باریک بینی سے اچھے سے اچھا لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر آپ واقعی زکوٰۃ کی اہمیت کو محسوس کر کے زکوٰۃ دیتے ہیں اور دین و دنیا میں اللہ کی رحمتوں کے طالب ہیں تو اللہ کی راہ میں ایسا مال دیجئے جو آپ کی نظر میں سب سے بہتر ہو اور جو اللہ کے غریب بندوں کے لئے زیادہ سے زیادہ فائدہ بخش ہو۔

3- آپ جس کو زکوٰۃ دیں اس میں احساسِ کمتری نہ پیدا ہونے دیں' اسے نیچا نہ سمجھیں' اس کی دل آزاری نہ کریں اور کوئی ایسا سلوک نہ کریں جس سے اس کی خودداری کو ٹھیس لگے۔

4- زکوٰۃ دے کر آپ اترائیں نہیں' اپنی بڑائی نہ جتائیں بلکہ اللہ کا تہ دل سے شکر ادا کریں اس نے آپ کو زکوٰۃ اد

ا کرنے کی توفیق دی اور آپ کو یہ موقع بخشا کہ آپ کے ہاتھوں سے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ ہو اور آپ کو اپنا فریضہ ادا کرنے کا موقع ملا۔

5- جس کو زکوٰۃ دیں اس پر کوئی احسان نہ جتائیں' آپ کے پاس اپنا ہے کیا؟ جو احسان جتائیں۔ آپ تو خود اللہ کے محتاج ہیں' آپ کیا' سارے ہی انسان اس کے محتاج ہیں' غنی اور بے نیاز تو صرف اللہ ہے۔ (وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اللہ ہی غنی ہے اور تم سب محتاج ہو) آپ کو اللہ نے جو کچھ دیا تھا اسی لیے تو دیا تھا کہ آپ اپنے کام میں لائیں اور اللہ کے دوسروں بندے کا حق ادا کریں۔ کیا حقدار کا حق دے کر کوئی احسان جتاتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اس شخص کو ہم کلامی کے شرف اور نظرِ عنایت سے محروم رکھے گا جو کسی کو عطیہ دے کر احسان جتاتا ہو۔

زکوٰۃ ادا کرنے سے پہلے آسمانی کتاب کی اس آیت پر غور کیجئے اور بار بار غور کیجئے۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (البقرہ 2:266)

''کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس ایک ہرا بھرا باغ ہو' نہروں سے سیراب' کھجوروں' انگوروں اور ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہوا اور وہ عین اس وقت تیز گرم بگولے کی زد میں آ کر جھلس جائے جب کہ خود بوڑھا ہو اور اس کے کمسن بچے بھی کسی لائق نہ ہوں؟ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیتیں تمہارے سامنے بیان کرتا ہے شائد کہ تم غور فکر کرو''۔



# زوالِ ملت کے دو اہم اسباب

حق و باطل کی کشمکش ازلی ہے' ہر دور میں باطل' حق سے نبرد آزما رہا ہے۔ مگر آج یہ کشمکش پورے عروج پر ہے۔ آج باطل کی تمام طاقتیں متحد اور منظم ہو کر ہلاکت خیز ہتھیاروں اور تباہ کن منصوبوں کے ساتھ ملت اسلامیہ پر حملہ آور ہیں اور انتہائی عیاری اور بدترین سازشیں کر کے ملت کو اپنی درندگی' سفاکی' بربریت اور ظلم وستم کا نشانہ بنا رہی ہیں۔ ان سازشی ٹولوں کا منصوبہ اور ارادہ یہ ہے کہ یہ سب مل کر اہل اسلام کو اس قدر مجبور اور بے بس بنا دیں کہ وہ پھر کہیں سر نہ اٹھا سکیں۔ یا تو صفحۂ ہستی سے ان کو بالکل مٹا کر ہی دم لیں یا اگر یہ ملت زندہ بھی رہے تو مقہور' مغلوب' بے وقعت' بے اثر اور دست نگر ہو کر اس طرح زندہ رہے کہ عالم انسانیت میں نہ اس کا کوئی کردار رہے اور نہ اس کی کوئی آواز ہو۔

وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ○

(ابراہیم 46:14)

''انہوں نے زبردست سازشیں کیں اور ان کی ہر سازش کا اللہ کے پاس توڑ ہے اگرچہ ان کی سازشیں اس غضب کی ہیں کہ پہاڑ ان سے ٹل جائیں''۔

بلاشبہ اللہ کے پاس ان سفاک ظالموں اور درندہ صفت جابروں کی ہر سازش کا توڑ ہے' وہ چاہے تو ان کی تمام سازشیں انہیں پر لوٹا دے اور دم بھر میں ان کو تہس نہس کر دے' مگر ایسا کرنا اللہ کی سنت نہیں ہے' اس دنیا کو اس نے امتحان گاہ بنایا ہے۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے اسباب کے تحت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ہر قوم کو عمل و اختیار کی آزادی دے رکھی ہے اور عزت و ذلت' پستی و بلندی اور عروج و زوال کے اصول و ضابطے مقرر کر رکھے ہیں' انہی اصولوں اور ضابطوں کے تحت کوئی قوم اقتدار پاتی ہے اور کوئی قوم اقتدار سے محروم کی جاتی ہے' کوئی عزت کی بلندیوں پر پہنچتی ہے اور کوئی پستی کے گڑھے میں دھکیلی جاتی ہے۔

یہ سب کچھ اللہ کی سنت کے مطابق' اس کے بنائے ہوئے قانونِ عروج و زوال کے تحت اور اللہ کی حکمت اور قدرت کے مطابق ہوتا ہے۔

آج ملت اسلامیہ کے خلاف باطل پرستوں نے متحد و متفق ہو کر جو یلغار کر رکھی ہے اور ملت جس پستی' ذلت' بے قدری اور عبرتناک زبوں حالی میں مبتلا ہے یہ کوئی وقتی حادثہ نہیں ہے بلکہ اس کے بھی اسباب و وجوہ ہیں اور اللہ کی سنت کے مطابق ہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ یوں تو یہ سارے ہی اسباب اس لئے ہیں کہ ملت کے دردمند اور با شعور افراد اور جماعتیں سر جوڑ کر بیٹھیں' ان اسباب کو دور کریں اور ملت کو ذلت' مسکنت کی دلدل سے نکالنے کی کوشش کریں۔ لیکن ان اسباب میں سے دو نہایت اہم سبب اس لائق ہیں کہ ان کو اوّلین توجہ کا مستحق سمجھا جائے۔

1- ملت کا افتراق کا انتشار

2- وہن یعنی حب دنیا اور موت کا خوف

یہ دو روگ جب کسی ملت میں پیدا ہو جائیں تو سمجھ لیجئے کہ اس نے تباہی' پستی' زبوں حالی اور ذلت سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ مگر یاد رہے کہ اس قعرِ مذلت سے ملت کو نکالنے کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ ملت کے دانشوران حالات کا ماتم کرتے رہیں اور مرثیے تصنیف کر کے مطمئن ہو جائیں کہ ہم نے اپنا فریضہ انجام دے لیا بلکہ ضرورت ہے کہ وہ نہایت ہوشمندی اور سنجیدگی سے ان دونوں اسباب کا جائزہ لیں اور ملت کو ان روگوں سے نجات دلانے کے لئے تسلسل کے ساتھ منفی اور مثبت کوشش و کاوش کریں اور قرآن و سنت کی روشنی میں ان لوگوں کا علاج کرنے کے لئے اپنی قوتیں اور صلاحیتیں کھپا دیں۔

## ملت کا افتراق و انتشار:

آج باطل کی تمام چھوٹی بڑی طاقتیں متحد و منظم ہیں اور سب نے مل کر ملت اسلامیہ کے خلاف اجتماعی یورش کر رکھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان طاقتوں میں باہم بھی اپنے مفادات اور اغراض کے لئے اختلافات ہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ اختلافات شدید ہیں لیکن یہ حقیقت نصف النہار کے سورج سے زیادہ روشن ہے کہ جہاں تک ملت اسلامیہ کا سوال ہے ملت سے بغض و عناد رکھنے اور ملت کے خلاف یلغار کرنے کے معاملے میں یہ ساری طاقتیں متحد و متفق ہیں۔ اس معاملے میں ان کے درمیان کوئی ادنیٰ اختلاف بھی نہیں ہے بلکہ اس مقصد کے لئے تو گویا یہ سب ایک ہی ملت اور ایک ہی طاقت ہیں۔

ملت اسلامیہ کا المیہ یہ بھی ہے کہ باہم فرقوں' گروہوں اور جماعتوں میں بٹی ہوئی ہے اور یہ فرقے گروہ اور جماعتیں بھی اور مسلمانوں کی چھوٹی بڑی حکومتیں بھی عرصے سے ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہیں مگر اس سے بڑا المیہ یہ ہے کہ دشمنانِ اسلام کی متفقہ یلغار کے مقابلے میں بھی ان کے درمیان اتفاق و اتحاد نہیں ہے بلکہ پستی کی انتہا یہ ہے کہ دشمنوں کے ہاتھوں اپنے ہی بھائیوں کو تباہ کرانے اور تماشا دیکھ کر خوش ہونے کی ذلت میں مبتلا ہیں۔
ملت کے اس ذلت انگیز روگ نے اس کی دھاک اور ساکھ بھی ختم کر دی ہے اور اس کی عبرتناک زبوں حالی اور پستی

دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ نے بھی اپنی نصرت و رحمت کا ہاتھ اس پر سے اٹھا لیا ہے اور اللہ کی حمایت و نصرت سے محروم ہو جانیوالی قوم کا جو حال ہوتا ہے وہی حال اس ملت کا ہو رہا ہے۔

فَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا۔

''پس ہم اپنے نفس کے شر اور برے اعمال سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں''۔

دشمنانِ دین و ملت نے ہر طرف سے ملت پر یورش کر رکھی ہے۔ وہ اپنی انتہائی حقیر اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے جو چاہ رہے ہیں اور جس طرح چاہ رہے ہیں کر رہے ہیں' بلکہ اپنی عیاری اور سازش سے ملت کے گروہوں اور حکومتوں کو بھی اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں اور ملت کے یہ گروہ اور حکومتیں اپنے انتہائی گھٹیا مفادات کی خاطر دین و ملت کے عظیم ترین اور وسیع ترین مفادات کو نظر انداز کر کے ان کا شکار ہو رہی ہیں اور دشمنانِ اسلام دین و ملت کو تاراج کرنے کے لئے اس طرح آزادی کے ساتھ دندنا رہے ہیں کہ شیطان اور اس کی ذریت بھی انگشت بدنداں ہے۔ یہ ظالم نہ حدود و قیود کے پابند ہیں نہ حق و انصاف کا انہیں لحاظ ہے نہ کسی عہد و میثاق کا انہیں خیال ہے' نہ ان کے سینوں میں انسانیت کا کوئی درد ہے۔ یہ انسانوں پر وہ ظلم ڈھا رہے ہیں کہ درندے بھی شرما جائیں۔ یہ عورتوں' بچوں' بوڑھوں' معذوروں کے ساتھ وہ انسانیت سوز سلوک کر رہے ہیں کہ انسانیت شرما رہی ہے۔

ملت اسلامیہ کی عبرتناک تصویر یہ ہے کہ وہ سب گوارا کر رہی ہے۔ ہر ذلت اور ہر رسوائی اسے برداشت ہے' ہر ظلم اور ہر ستم سہنے کے لئے وہ آمادہ ہے' ہر طاقت کی طرف تعاون طلب نگاہوں سے دیکھ رہی ہے' ہر بودے سہارے کی طرف ہاتھ بڑھا رہی ہے' ہر تدبیر اپنانے کے لئے تیار ہے لیکن تیار نہیں ہے تو صرف اس کے لیے کہ وہ متحد اور متفق ہو کر اپنے مسائل حل کرے۔ پوری ملت منظم ہو کر دشمنان دین کی یلغار کا مقابلہ کرے۔ ان میں یہ ہمت اور کشادگی نہیں ہے کہ اپنے معمولی اختلافات ختم کر کے یکجا ہو جائیں' اپنے حقیر مفادات کو ملت کے وسیع تر مفاد کے لئے قربان کریں اور سب مل کر اور منظم ہو کر اپنے دشمن کو للکاریں' عقل حیران ہے کہ یہ امت بیضاء کہاں پہنچ گئی ہے۔

کتاب و سنت میں ملت کو اتحاد و اتفاق' اخوت اور تنظیم کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے' اسی کو ایمان کا صریح تقاضا اور اسلام کی سب سے بڑی دین بتایا گیا ہے' اسی کو ملت کے دکھوں کا مداوا' ذلت و پستی سے نکلنے کا ذریعہ اور عروج و سربلندی کی شاہراہ قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ ہدایت کی گئی ہے کہ بودے' کمزور اور فانی سہاروں کی طرف ہرگز نہ دوڑو' اللہ تعالیٰ حی و قیوم سے اپنا تعلق مضبوط کرو' اسی پر کامل اعتماد کرو اور اللہ کے دین کی بنیاد پر متحد و منظم ہو کر دشمنان دین و ملت کی یلغار کا مقابلہ کرو' اجتماعیت تمہاری بنیادی ضرورت تمہارا دینی شعار' تمہاری قوت و شوکت اور تمہارے تعلق

باللہ کی علامت ہے۔ لہٰذا تم رشتہ توحید کی بنیاد پر منظم اور متحد ہو جاؤ۔ فرقوں، گروہوں اور ٹولیوں میں بٹ کر نہ رہو، ہر سطح پر خود کو بغض عناد اور کینہ کپٹ سے محفوظ رکھو، تمہاری ذلت و رسوائی، پستی اور بے وقعتی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے تم گروہوں اور ٹولیوں میں بٹ گئے ہو، تمہاری کتنی ہی حکومتیں ہیں لیکن وہ اپنی ادنیٰ اور حقیر ترین مفادات اور اغراض کے لئے ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں آپس میں ٹکرا رہی ہیں، آپس میں ٹکرانے والی اور قوت کو اپنے ہاتھوں پارہ پارہ کرنے والی امت بھلا منظم اور متحد یورپ کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہے؟

دشمن کے مقابلے میں آ کر دانت کھٹے کرنے کا عزم ہے تو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر دشمنوں کی یلغار کے مقابلے میں صف بستہ ہو جاؤ اور متحد و منظم ہو کر دشمنوں کے مقابلے میں ڈٹ جاؤ اور ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا دو۔ اللہ سے تعلق استوار کر و اس کی یاد سے قوت حاصل کرو اور ہرگز کمزوری نہ دکھاؤ، آپس میں لڑنے اور ایک دوسرے کو گرانے کی غلطی نہ کرو۔ تمہاری ساکھ اور دھاک ختم ہو جائے گی۔ تم کم ہمت، بزدل اور کمزور ہو جاؤ گے اللہ کا ارشاد ہے۔

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَٱثْبُتُوا۟ وَٱذْكُرُوا۟ ٱللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ وَأَطِيعُوا۟ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَلَا تَنَـٰزَعُوا۟ فَتَفْشَلُوا۟ وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ ۖ وَٱصْبِرُوٓا۟ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّـٰبِرِينَ ۝ (الانفال 8:45-46)

”اے ایمان والو! جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو تا کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو، اور اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی صبر و ثبات سے کام لو یقیناً اللہ تعالیٰ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے“۔

ان دو آیتوں میں چار نہایت اہم ہدایات دی گئی ہیں۔

1- یہ کہ دشمن کے مقابلے میں ڈٹ جاؤ۔

2- یہ کہ اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور اس سے تعلق استوار کرو۔

3- یہ کہ اللہ اور رسول کے فرمانبردار بن کر رہو۔

4- یہ کہ آپس میں نہ جھگڑو۔

ضرورت ہے کہ ملت اخلاص و عزیمت کے ساتھ ان ہدایات پر کاربند ہو کر حالات کا مقابلہ کرے۔

## دشمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرو:

بلاشبہ اہل اسلام امن پسند ہوتے ہیں وہ ہمیشہ شر کو فرو کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی کسی پر ظلم و زیادتی نہیں

کرتے ہمیشہ عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں لیکن ان کی عفو و درگزر کی پالیسی کسی کمزوری کی بنیاد پر نہیں ہوتی بلکہ شرافت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ ان کی شرافت نفس کا تقاضا ہوتا ہے کہ جب یہ قادر ہوں تو کمزور اور زیر دستوں کے ساتھ نرمی اور درگزر کا معاملہ کریں لیکن اگر کوئی طاقتور ظالم و جابر اپنی طاقت اور اقتدار کے زعم میں ان کو للکارے اور ان پر دست درازی کرنے لگے تو یہ چٹان کی طرح مقابلے میں ڈٹ جاتے ہیں اور دشمن کے چیلنج کا ایسا جواب دیتے ہیں کہ اس کے دانت کھٹے کر دیتے ہیں۔ اہل اسلام کبھی درندہ صفت ظالموں اور جابروں سے نہیں دبتے۔ اقتدار کے نشے میں بدمست ظالموں اور متکبروں کے لئے وہ لوہے کے چنے ہوتے ہیں جنہیں چبانے کی کوشش کرنے والے ظالم اپنے ہی جبڑے توڑ ڈالتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ (الشوریٰ 39:42)

''اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو یہ ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں''۔

اہل اسلام کبھی مقابلے میں پیٹھ نہیں دکھاتے وہ دشمن کے مقابلے میں فتحیاب ہو کر آگے بڑھتے ہیں یا شہید ہونے کی آرزو میں میدانِ مقابلہ میں اترتے ہیں۔ وہ ثابت قدم ہوتے ہیں اور ان کی پامردی' استقلال' آہنی عزم اور چٹانی ثبات کی بنیاد اللہ کی یہ ہدایت اور یقین دہانی ہوتی ہے۔ ''واصبروا ان اللہ مع الصابرین'' ڈٹے رہو۔ اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ یقین دہانی ان میں بے پناہ قوت بھر دیتی ہے وہ اس عزم و یقین کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں کہ جس لشکر کے ساتھ اللہ ہے اس لشکر کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔

## اللہ کو کثرت سے یاد کرو

یعنی اللہ سے اپنے تعلق کو استوار رکھو۔ جنگ کے نازک مرحلے میں اس کو کثرت سے یاد کرو کہ تمہاری کامیابی اسی کی نصرت و حمایت سے ہوگی۔ اپنی طاقت اور اپنے وسائل کے زعم میں کبھی مبتلا نہ ہو بلکہ اسی پر بھروسہ رکھو' اسی کی مدد' اسی کی نصرت اور اسی کی حمایت سے تم فتح یاب ہو گے تاریخ گواہ ہے کہ ملت اسلامیہ کو جب جب فتح و کامرانی نصیب ہوئی ہے اللہ تعالیٰ ہی کی نصرت و حمایت سے نصیب ہوئی ہے۔ بدر کے میدان میں لشکر اسلام کی تعداد انتہائی قلیل تھی۔ ان کے پاس نہ ضرورت کے مطابق سواریاں تھیں اور نہ ہتھیار اور مقابلے میں دشمن کی تعداد بھی کثیر تھی اور وسائل و ذرائع کے لحاظ سے بھی وہ ان کے مقابلے میں بہت بڑھ کر تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت نے لشکر اسلام کی دستگیری کی تو دشمن کو شرمناک شکست ہوئی اور اہل اسلام کو ایک تاریخی فتح نصیب ہوئی اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ اور مسلمانوں کو مخاطب کر کے جو کچھ فرمایا ہے وہ بار بار دہرانے اور ذہن و قلب میں راسخ کرنے کی ضرورت ہے۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۠ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ (الانفال 8"17)

"تم لوگوں نے ان دشمنوں کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور اے رسول ﷺ آپ نے جو تیر چلائے تو وہ آپ نے نہیں مارے بلکہ اللہ نے مارے"۔

حقیقت یہی ہے کہ مؤمن اللہ کی نصرت و مدد سے ہی فتح و کامرانی پاتا ہے اور یہ کامرانی انہی کے حصے میں آتی ہے جو اللہ کو کثرت سے یاد کرتے ہیں اور اس سے اپنے تعلق کو مضبوط رکھتے ہیں۔

## اللہ اور رسول ﷺ کے فرمانبردار بن کر رہو:

جنگ میں وہی لوگ اللہ کو یاد کریں گے' وہی لوگ اللہ سے تعلق استوار کریں گے اور وہی لوگ حق کے لئے لڑیں گے اور متحد و متفق ہو کر دین و ملت کی خاطر میدان جنگ میں اتریں گے جو اللہ اور رسول ﷺ کے فرمانبردار ہوں گے' جو عام زندگی میں اللہ اور رسول ﷺ سے بے نیاز ہوں گے اور جن کی عام زندگی سرکشی اور نافرمانی میں گزر رہی ہو ان سے کیسے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اخلاص کے ساتھ اللہ اور رسول ﷺ اور اس کے دین کو سر بلند کرنے اور ملت کو اونچا اٹھانے کے لئے لڑیں گے۔ یہ توقع تو انہیں سے کی جا سکتی ہے جو معمول کے حالات میں بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فرمانبردار ہوں اور ہنگامی حالات میں بھی فرمانبرداری اور اطاعت ہی ان کا شعار ہو۔

## آپس میں نہ جھگڑو:

آخری ہدایت یہ ہے کہ آپس میں چھوٹے چھوٹے مفادات اور اغراض کے لئے باہم برسرِ پیکار نہ رہو' اتحاد و اتفاق اور اخوت و نظم کی زندگی گزارو۔ باہمی افتراق و انتشار وہ بدترین بیماری ہے جس میں مبتلا ہونے والی امت پست ہمت' کمزور بزدل اور بے وقعت ہو جاتی ہے۔ نہ اس کی دھاک رہتی ہے اور نہ ساکھ' وہ میدان کی گیند بن جاتی ہے کہ جو کھلاڑی جدھر چاہے ٹھوکر مار کر کھدیڑ دیتا ہے۔

اسلام کو ماننے اور قبول کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ نے اپنا سب سے بڑا احسان یہی جتایا ہے کہ اسلام کی بدولت ان کی برسوں کی خانہ جنگی ختم ہو گئی ان کی آپس میں دشمنیاں ناپید ہو گئیں اور اسلام کی وجہ سے ان کے قلوب میں باہمی الفت و مودت پیدا ہو گئی اور رشتہ اسلام کی بدولت بھائی بھائی بن گئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ (آل عمران 103:3)

"اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم

سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے اللہ نے تم کو اس سے بچالیا''۔

آگ کے گڑھے سے مراد جہنم بھی ہے اور باہمی جنگ کی آگ بھی ہے۔ اسلام ہی کی بدولت اللہ تعالیٰ نے دونوں سے ان کو بچالیا اور ان کو اسلام کے رشتہ اخوت ومحبت میں پرو کر بھائی بھائی بنا دیا۔

یہی اخوت' مودت' رفاقت اور اللہ کی بنیاد پر مضبوط اجتماعیت ملت اسلامیہ کی عظمت وشوکت' رفعت وسر بلندی اور رعب واقبال کی ضمانت ہے۔ یہ اتحاد واجتماعیت ایمان کا صریح تقاضا اور ایمان کی فطرت ہے۔

## اتحاد واجتماعیت کی تاکید حدیث رسول ﷺ میں:

حدیث میں بھی نبی اکرم ﷺ نے مضبوط اجتماعیت اور اتحاد واتفاق کی انتہائی پرزور تاکید فرمائی ہے جس کو نظر انداز کر کے ملت یہ اطمینان ہرگز نہیں کر سکتی کہ وہ اسلام پر عامل ہے اور اس کی زندگی اسلام کے مطابق گزر رہی ہے اس لئے کہ کتاب وسنت اتحاد واجتماعیت کی سفارش نہیں کرتی بلکہ تاکیدی حکم دیتی ہے اور تاکیدی حکم سے انحراف اور لاپروائی پر عبرتناک انجام اور رسوائی کی وعید سناتی ہے۔

حضرت ابو درداء سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کسی جنگل میں تین آدمی ہوں اور وہ اجتماعی طور پر مل کر نماز کا اہتمام نہ کریں تو لامحالہ ان پر شیطان مسلط ہو کر رہے گا''۔

''غور سے سنو! جماعت سے بہر حال وابستہ رہو ورنہ تمہارا حشر اس بھیڑ کا سا ہو گا جو ریوڑ سے الگ ہو جاتی ہے اور بھیڑیا اسے اپنا لقمہ بنا لیتا ہے''۔ (ابوداؤد)

حضرت امام تیمیہؒ نے اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب سفر کی عارضی اور غیر مستقل حالت میں اجتماعی اور منظم ومتحد رہنے کی اس قدر غیر معمولی تاکید ہے تو قیام اور حضر کی حالت میں تو اجتماعیت کی تاکید اور زیادہ شدید ہو گی۔ کیا رسول ﷺ کی اس صریح اور پرزور ہدایت کے ہوتے ہوئے قیام وحضر کے دوران معمول کے حالات میں نظم واجتماعیت کو نظر انداز کرنے اور غیر متحد رہنے کی کوئی گنجائش ہو سکتی ہے اور ایسی غیر اجتماعی زندگی اسلامی زندگی کہلائی جا سکتی ہے؟

مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے جس کی طرف علامہ ابن تیمیہؒ نے متوجہ فرمایا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ شدید ہے۔ حضور ﷺ نے اجتماعیت اور اتحاد کی صرف تاکید ہی نہیں فرمائی ہے بلکہ اتحاد اجتماعیت کو نظر انداز کرنے اور تفرقے کی زندگی گزارنے کے بارے میں یہ وعید بھی سنائی ہے کہ اسکا انجام لازماً تباہی اور عبرتناک ذلت ہے۔

آپ نے فرمایا: ایسے لوگوں پر لامحالہ شیطان مسلط ہو کر رہے گا اور ایسے لوگوں کا حشر وہی ہو گا جو ریوڑ سے الگ ہو جانے والی بھیڑ کا ہوتا ہے کہ بھیڑیا اس کو اپنا لقمہ تر بنا لیتا ہے۔ کیا اس سے زیادہ ذلت وخواری اور تباہ کن انجام کچھ اور ہو سکتا ہے۔ پھر اسی حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دن میں پنج وقتہ اجتماعی نماز' اجتماعیت کی زندگی

گزارنے ہی کی مشق اور سبق ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی ایک اور روایت ہے جو صاحب مشکوٰۃ نے اپنی کتاب میں نقل کی ہے اس میں آپس کے انتشار اور جماعت سے الگ رہنے کے عبرتناک انجام کی کچھ اور تفصیلی وضاحت ملتی ہے۔

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس طرح بھیڑیا بکریوں کا دشمن ہے اور وہ ریوڑ سے الگ ہونے والی بھیڑ کا آسانی سے شکار کر لیتا ہے اسی طرح شیطان انسان کا بھیڑیا ہے۔ اگر لوگ جماعت بن کر نہ رہیں تو وہ ان کو الگ الگ نہایت آسانی سے شکار کر لیتا ہے تو اے لوگو! پگڈنڈیوں پر مت چلنا بلکہ تمہارے لئے ضروری ہے کہ جماعت اور عامۃ المسلمین کے ساتھ رہو''۔ (مسند احمد' جلد 5' 222)

پھر حدیث رسول ﷺ سے سوچنے کا یہ مومنانہ انداز بھی ملتا ہے کہ اتحاد و اجتماعیت صرف اسی لئے مطلوب نہیں ہے کہ یہ دنیا میں عزت و اقتدار کا ذریعہ ہے بلکہ اس کا اصل صلہ آخرت میں اللہ کی رضا اور اس کی بے مثال نعمتوں کا گھر جنت ہے۔ اور اس جنت کی طلب کا ذریعہ یہ ہے کہ آدمی جماعت سے چمٹا رہے اور اتحاد اور اجتماعیت کی زندگی گزارے' حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

''جو شخص جنت کے وسط میں اپنا ٹھکانہ بنانے کا خواہشمند ہو اسے چاہیے کہ وہ جماعت سے چمٹا رہے اس لئے کہ آدمی اکیلا ہو تو شیطان اس کے ساتھ ہوتا ہے اور جب دو ساتھ ہو جائیں تو شیطان دور بھاگتا ہے''۔

یہ مطلوب اجتماعیت اسی وقت وجود میں آسکتی ہے جب کرۂ ارض کے ہر خطے کے مسلمان دین و ملت کے لئے مخلص ہوں' دین و ملت کی عظمت' غلبہ اور سربلندی ہی ان کا نصب العین ہو۔ ہر مسلک و مکتب فکر کے مسلمان اور ان کی تمام حکومتیں اپنی محدود اغراض' اپنی انا اور اپنے جھوٹے وقار کو دین و ملت پر اور دین و ملت کے عظیم تر مفاد پر قربان کرنے کو تیار ہوں اور اپنے معمولی مفادات اور اغراض سے اونچے اٹھ کر دین و ملت کو سربلند رکھنے اور اس کی عزت و آبرو پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے آمادہ اور مستعد ہوں۔ اسی وقت مسلمان ملت کی دھاک اور ساکھ قائم ہو سکتی ہے اور وہ ایک طاقتور' باعزت اور سربلند ملت کی حیثیت سے ابھر سکتی ہے اور اس سے وہ توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو برپا کیا ہے۔

دشمنانِ اسلام کے مقابلے میں اتحاد و اتفاق کے ساتھ ڈٹنے اور جم کر ان کا مقابلہ کرنے میں کسی وقت یہ رکاوٹ سامنے آسکتی ہے کہ دشمنان اسلام کو جس قائد نے للکارا ہے وہ اپنی عام زندگی میں اور زندگی کے پچھلے مرحلوں میں معیاری نہ رہا ہو' یا اسلام اور ملت سے اس کا تعلق مضبوط اور قابل لحاظ نہ رہا ہو' یا شبہ میں ڈالنے والا رہا ہو' یا وہ کچھ ایسی چیزوں کا حکم دے رہا ہو' یا ایسی پالیسی اپنا رہا ہو جو دوسروں کو اپنی بصیرت و حکمت کے تحت زیادہ

موزوں اور کارآمد نہ معلوم ہو رہی ہو تو ایسی صورت میں یقیناً سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اجتماعیت سے الگ ہو کر اپنی خیر منانے کی کوشش کرنا دین کا تقاضا ہے یا مسلمانوں کے اتحاد کو برقرار رکھنا اور ملت کے عظیم تر مفاد میں لڑنا دین کا تقاضا ہے۔ اس کا نہایت واضح اور دوٹوک جواب یہ ہے کہ ہر حال میں اجتماعیت کا ساتھ دیا جائے اور عامۃ المسلمین کے ساتھ مل کر اس قیادت کے تحت ملت کے اتحاد کو برقرار رکھنے کی کوشش کی جائے اور قیادت کے احکام اپنی مرضی کے خلاف بھی سُنے جائیں اور اطاعت کی جائے۔ ہاں اگر سربراہ صراحتاً اللہ کی نافرمانی کا حکم دینے لگے تب اطاعت کا کوئی سوال نہیں۔ اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں کی جاسکتی لیکن جب تک سربراہ صریح طور پر اللہ کی نافرمانی کا حکم نہ دے اس کی اطاعت کی جائے اور مسلمانوں کے اتحاد کو ہرگز متاثر نہ ہونے دیا جائے۔ البتہ دین کی اس روح کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے کہ حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے کی جرأت کو کبھی مضمحل نہ ہونے دیا جائے اور کسی مرحلے میں بھی دین وملت کے عظیم تر مفاد کو نظر انداز نہ کیا جائے اور حکمت عملی پر کتاب وسنت کی بالادستی ہمیشہ برقرار رکھی جائے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''مسلمانوں پر سمع واطاعت واجب ہے (یعنی صاحب امر کا حکم سننا اور ماننا واجب ہے) خواہ صاحب امر کا حکم گوارا ہو یا ناگوار' ہاں اگر اللہ کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو نہ سمع نہ طاعت (یعنی ایسا حکم نہ سنا جائے اور نہ اس کی اطاعت کی جائے)''۔ (بخاری کتاب الاحکام باب 4 السمع الطاعت 595)

## وہن' یعنی حب دنیا اور موت سے نفرت:

دوسرا سبب یہ ہے کہ ملت میں وہن یعنی دنیا کی محبت' مال وجاہ کی طمع ولالچ اور موت کا خوف اور ناگواری پیدا ہوگئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرض کی واشگاف انداز میں نشان دہی کی ہے اور بتایا ہے کہ ملت میں جب یہ بیماری پیدا ہو جائے گی تو چاروں طرف سے قومیں اس پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جس طرح بھوکے دستر خوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں:

عن ثوبان قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یوشك الامم ان تداعی علیکم کما تداعی الاکلة الی قصعتها قال قائل ومن قلة نحن یومئذ قال بل انتم یومئذ کثیر ولکنکم غثاء لغثاء السیل ولینزع عن اللّٰه من صدور عدوکم المهابة منکم ولیقذفن فی قلوبکم الوهن قال قائل یا رسول اللّٰه وما الوهن قال حب الدنیا وکراهیة الموت (بخاری کتاب السلام' باب 5 ص 1536)

''حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عنقریب ایسا ہوگا کہ (دشمن) قومیں

لقمہ تر سمجھ کر تم پر ٹوٹ پڑیں گی جس طرح کھانے والے ایک دوسرے کو دستر خوان پر دعوت دیتے ہیں۔ ایک شخص نے پوچھا کیا ایسا اس لئے ہوگا کہ اس دور میں ہماری تعداد کم ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں بلکہ تم اس وقت تعداد میں بہت زیادہ ہوگے لیکن تمہاری حیثیت سیلاب کے خس و خاشاک سے زیادہ نہ ہوگی تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا رعب اٹھ جائے گا اور تمہارے اندر ''وہن'' کی بیماری پیدا ہوجائے گی ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ! وہن کیا چیز ہے؟ ارشاد فرمایا: دنیا کی محبت اور موت سے نفرت''۔

مخبر صادق ﷺ نے چودہ سو سال پہلے جو پیشین گوئی فرمائی ہے آج ہم سر کی آنکھوں سے یہی کچھ دیکھ رہے ہیں۔ آج صورت حال یہ ہے کہ تمام بڑی طاقتیں نوالۂ تر سمجھ کر ملت اسلامیہ پر ٹوٹ پڑی ہیں اور ملت کی ذلت و پستی انتہا کو پہنچ گئی ہے اور وجہ وہی ہے جس کی نشان وہی رسول صادق امین ﷺ نے فرمائی ہے یعنی ملت وہن کی مریض ہوگئی ہے۔

وہن عربی زبان کا لفظ ہے اور عرب میں بولا جاتا تھا لیکن اس کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ وہن کیا ہے؟ پوچھنے کی وجہ یہ تھی کہ خود رسول ﷺ کے نزدیک ملت کے لئے اس لفظ کو استعمال کرنے سے کیا مراد ہے اور جو تشریح آپ ﷺ نے فرمائی اس میں وہ اصل حقیقت سامنے آگئی جو آپ کی تشریح اس کے بغیر ہرگز سامنے نہ آتی۔ وہن کے لغوی معنی ہیں کمزوری لیکن ملت کے لئے اس لفظ کے استعمال کا مفہوم یہ ہے کہ ملت دنیا کی محبت کے مرض میں مبتلا ہوجائے گی جس کا لازمی نتیجہ ہے موت سے بیزاری اور فرار اس تشریح میں ملت کی اصل کمزوری بھی سامنے آگئی اور ذلت پستی اور کمزوری کی وجہ بھی' حب دنیا اور موت سے نفرت اصلاً کفر اور بے دینی کا نتیجہ ہے اور یہ کسی قوم اور فرد کی وہ سب سے بڑی برائی ہے جو تمام اخلاقی روگوں' کمزوریوں اور برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

حب الدنیا رأس كل خطيئة

دنیا کی محبت تمام خطاؤں اور گناہوں کی جڑ ہے۔

حب دنیا کی روگی ملت اور اس کا ہر فرد جینے کا انتہائی حریص اور موت سے انتہائی خائف ہوتا ہے۔ ایسی ملت ہرگز اس لائق نہیں ہوتی کہ وہ اس کشاکش کی دنیا میں کسی کا سامنا کر سکے۔ پستی ذلت' مسکنت اور خواری ہی اس کا مقدر ہوتی ہے اور کارگاہ حیات میں اس کا کوئی قابل ذکر کارنامہ نہیں ہوتا۔ حب دنیا اور موت کا خوف لازم و ملزوم ہیں جو فرد یا ملت بھی دنیا کی محبت میں گرفتار ہوگی اور جینے کے لئے بے تاب ہوگی وہ لازماً موت سے متنفر ہوگی بلکہ موت کے نام سے ہی اسے موت آئے گی اور موت سے ڈرنے والی ملتیں اسی لائق ہوتی ہیں کہ اپنی موت آپ مر

جائیں اور ان پر ملی موت مسلط ہو جائے۔ یہود کی تاریخ کا یہی عبرتناک واقعہ قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَھُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَھُمُ اللّٰہُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْیَاھُمْ

''کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر بھی غور کیا جو موت کے ڈر سے گھر بار چھوڑ کر نکلے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں تھے تو اللہ نے ان سے کہا مر رہو''۔ (البقرہ:۲-۲۴۳)

یعنی موت سے ڈرنے والی قوم کا یہی حال ہوتا ہے کہ اس پر قومی موت مسلط کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ یہود تاریخ کے ایک طویل عرصے تک موت کی حالت میں رہے زندہ قوموں کے درمیان ان کا کوئی تذکرہ نہ تھا۔

ایک دوسرے مقام پر قرآن نے یہود کے اس پر روگ کو نہایت ہی عبرت انگیز الفاظ میں یوں بیان فرمایا ہے:

وَلَتَجِدَنَّھُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوۃٍ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا یَوَدُّ اَحَدُھُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَۃٍ وَمَا ھُوَ بِمُزَحْزِحِہٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ یُّعَمَّرَ (بقرہ96:2)

''اور آپ ﷺ انہیں تمام لوگوں سے زیادہ جینے کا حریص پائیں گے، حتیٰ کہ اس معاملے میں یہ مشرکوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ کس طرح ہزار برس جیے حالانکہ لمبی عمر بہر حال اسے عذاب سے تو دور نہیں پھینک سکتی''۔

یہود جس روگ میں مبتلا تھے آج اسی روگ میں ملت اسلامیہ پوری شدت کے ساتھ مبتلا ہو گئی ہے۔ دنیا سے محبت، دنیا کی زندگی سے بے پناہ پیار، موت سے خوف اور نفرت یہ بیماری آج ملت میں پیدا ہو گئی ہے اور ملت کی پستی، ذلت، مسکنت اور بے وقعتی کی ایک بڑی وجہ یہی ''وہن'' کی بیماری ہے جس کی نشان وہی رسول امین ﷺ نے فرمائی تھی۔

ملت اگر واقعی اس ذلت سے نکلنا چاہتی ہے تو اس کا واحد راستہ یہی ہے کہ ملت ان دو بنیادی اسباب پر سنجیدگی سے غور کرے، اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرے گروہی اور مسلکی اختلافات کو ختم کرے، مسلم حکومتیں اپنی ذاتی اغراض اور مفادات سے اونچی اٹھیں اور سب مل کر دین کے رشتہ پر مضبوط اجتماعیت وجود میں لائیں۔ عالمی اتحاد و اخوت کی بنیاد ڈالیں اور دین و ملت کے وسیع تر مفاد پر اپنے تمام مفادات کو قربان کر کے پھر ایک زندہ اور تابندہ ملت کی حیثیت سے ابھریں اور پھر عالم انسانیت میں اس آخری ملت کی دھاک اور ساکھ قائم کر کے دین اسلام کو سر بلند کرنے کی سعادت حاصل کریں۔

# چند لمحے رسول اکرم ﷺ کی مجلس میں

دنیا کی گوناگوں الجھنیں' پریشانیاں' رنگینیاں' جھمیلے اور خرخشے' بعض اوقات ذہن وقلب کو بری طرح متاثر کر دیتے ہیں اور آدمی قلب کے سکون اور ذہن کے اطمینان سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایسی کیفیت میں ایمان کو تازہ کرنے اور روحانی سکون وسرور حاصل کرنے کا یقینی طریقہ یہ ہے کہ آدمی چند لمحے رسول اکرم ﷺ کی مجلس میں گزارے اور قلب وروح کو ایمانی جذبات سے گرمائے۔ تاریخ کی وہ زندہ جاوید درخشاں ہستیاں اسی مجلس سے ابھریں جن کے نام سے آپ نہایت عقیدت سے لیتے ہیں اور جن کو اپنے لئے نمونہ بناتے ہیں اور جن کا نام لیتے ہوئے آپ بڑی عقیدت سے یہ کہتے ہیں اللہ ان سے راضی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ روئے زمین پر ایسا قابل رشک گروہ ان سے پہلے آسمان کی آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کے نقش قدم پر چلنے کا عزم ہو تو چند لمحے رسول اکرم ﷺ کی پاکیزہ مجلس میں گزارنے کا معمول بنا لیجئے۔ انسانی قافلے کی قابل رشک اور قابل عقیدت ومحبت ہستیاں اسی داعی' اسی معلم اور اسی ہادئ برحق کی مجلس میں' انہی کی زیر تربیت تیار ہوئی تھیں مگر اس نورانی مجلس سے فیض یاب وہی لوگ ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں جو مجلس کا پورا پورا ادب واحترام ملحوظ رکھیں جو عقیدت ومحبت کے جذبات سے سرشار ہوں اور جو اطاعت کی خالص نیت سے مجلس میں شریک ہوں۔

کچھ لوگ ایک دن رسول اللہ ﷺ کی پاک مجلس میں حاضر ہوئے اور انہوں نے ایک ایسی خاتون کی سفارش کرنی چاہی جو چوری کے جرم میں پکڑی گئی تھی۔ رسول اکرم ﷺ نے اطمینان سے ان لوگوں کی بات سنی اور فرمایا تم سے پہلی قومیں اسی لئے ہلاک ہوئیں کہ جب سماج میں ان کے معمولی لوگ کوئی جرم کرتے تھے تو ان کو سزا دی جاتی تھی اور جب سوسائٹی کے بڑے لوگ کوئی جرم کرتے تھے تو ان کے لئے سفارشیں پہنچ جاتی تھیں اور وقت کے حکام صرفِ نظر کر لیا کرتے تھے۔ (بخاری)

ایک بار ایک صحابی ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ام المؤمنین نبی اکرم ﷺ کی کوئی خصوصی بات آپ نے دیکھی ہو تو بتائیے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے' جنہیں رسول کی مجلس سے فیض یابی کے سب سے زیادہ مواقع حاصل تھے' فرمایا:

"آپ کی تو ہر بات ہی خاص تھی کس کس بات کا تذکرہ کروں ایک بار ایسا ہوا کہ اللہ کے رسول میرے ہی یہاں

تشریف فرما تھے، کچھ رات گزر چکی تھی تو یکا یک آپ اٹھے اور باہر نکل گئے۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ یہ خیال بھی آیا کہ آج تو میری باری ہے حضور کسی اور جگہ کیوں جا رہے ہیں، قدرے فکر مند میں پیچھے پیچھے روانہ ہوگئی آپ مسجد میں داخل ہوئے کچھ دیر میں رکی رہی پھر میں بھی اندر پہنچ گئی اور میں نے بڑا ہی رقت انگیز منظر دیکھا اور بے ساختہ میری زبان سے نکلا ہائے اللہ میں کیا کیا سوچ رہی تھی اور رسول اللہ ﷺ کس حال میں ہیں۔

اس وقت رسول اللہ ﷺ ایک عاجز بندے کی طرح دونوں ہاتھ باندھے اپنے ربّ کے حضور کھڑے ہیں اور زار و قطار رو رہے ہیں، ہچکی بندھی ہوئی ہے، آنسو بہہ رہے ہیں، ریش مبارک تر ہوگئی ہے اور سینے تک آنسو آ رہے ہیں پھر آپ نے رکوع فرمایا: رکوع میں بھی اسی طرح روتے رہے پھر سجدہ کیا سجدہ میں بھی روتے رہے پھر سجدے سے اٹھے اور برابر روتے رہے کسی طرح آپ کا رونا کم نہیں ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ ستارے ڈوبنے لگے اور بلال نے آ کر فجر کی اذان دی۔ نماز سے فارغ ہو کر جب آپ اندر تشریف لائے تو میں نے دیکھا کہ آپ کے دونوں پاؤں سوجے ہوئے ہیں، پیروں کے انگوٹھے پھٹ گئے ہیں اور ان سے پانی رس رہا ہے۔ میں نے گلوگیر آواز میں کہا: یا رسول اللہ ﷺ! اللہ آپ کو سلامت رکھے آپ کیوں اپنے آپ کو ہلکان کر رہے ہیں اللہ نے آپ کی اگلی پچھلی سب لغزشیں معاف فرمادی ہیں پھر آپ اتنی مشقت کیوں اٹھا رہے ہیں؟

حضور ﷺ نے فرمایا: عائشہ! جب میرے ربّ کریم نے مجھ پر بے پایاں کرم کیا ہے؟ تو کیا میں اس کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ عائشہ میں ایسا کیوں نہ کروں جب کہ آج مجھ پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائی ہیں اور پھر آپ نے سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی ابتدائی آیتیں سنائیں۔

حضرت جابر بن سلیم ایک صحابی ہیں وہ نبی مکرم ﷺ کی مجلس میں اپنی پہلی حاضری کا قصہ بیان کرتے ہیں:

''میں نے دیکھا کہ مجلس میں ایک بزرگ بیٹھے ہیں، جو وہ کہتے ہیں سب لوگ اس کو بجا لاتے ہیں۔ میں نے معلوم کیا: یہ بزرگ کون ہیں؟ لوگوں نے بتایا: یہ میر مجلس، اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔ یہ سن کر میں نے کہا: اے اللہ کے رسول (علیك السلام) آپ پر سلام ہو۔ میں نے دو مرتبہ کہا مگر آپ ﷺ خاموش رہے۔ پھر ارشاد فرمایا (علیك السلام) نہ کہو یہ مردہ کا سلام ہے۔ (السلام علیک) کہو۔ میں نے عرض کیا: ''کیا آپ اللہ کے رسول ہیں؟''۔ فرمایا: ''ہاں میں اس اللہ کا رسول ہوں جس کو تم تکلیف میں پکارتے ہو تو وہ اس تکلیف کو دور کر دیتا ہے اور جس سے تم خشک سالی کے وقت بارش مانگتے ہو تو وہ زمین سے اگاتا ہے اور وہ جس سے تم دعا کرتے ہو جب تم لق و دق بے نشان بیابان میں ہوتے ہو اور وہاں تمہاری سواری گم ہو جاتی ہے تو وہ اس کو تمہارے پاس لوٹا دیتا ہے''۔ میں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! مجھے کوئی نصیحت فرمایئے!''۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کسی کو برا نہ کہو''۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''آپ کے اس کہنے کا اثر یہ ہوا کہ میں نے پھر زندگی میں کسی کو برا نہیں کہا،

نہ کسی آزاد شریف کو نہ کسی غلام کو یہاں تک کہ کسی جانور کو بھی برا نہ کہا‘‘۔

دوسری نصیحت آپ نے یہ فرمائی کہ ’’کسی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی حقیر نہ جانو بلکہ تسلسل کے ساتھ کئے جاؤ اور تم جب بھی اپنے کسی بھی بھائی سے بات کرو، تمہارا چہرہ کھلتا اور مسکراتا رہے، یہ بھی نیکی ہے اور اپنا تہمد آدھی پنڈلی تک اٹھائے رکھو اگر یہ نہ ہو تو ٹخنوں سے اونچا تو ضرور رکھو اس لیے کہ تہمد نیچے تک لٹکانا گھمنڈ کی علامت ہے اور اللہ تعالیٰ غرور کو پسند نہیں کرتا اور اگر تمہیں کوئی شخص گالی دے اور تمہیں اس برائی سے عار دلائے جو تمہارے اندر واقعی ہے تو تم اس کی جو برائی جانتے ہو اس کو عار نہ دلاؤ کہ اس برائی کا وبال اسی کی گردن پر ہوگا‘‘۔

(ابوداؤد کتاب اللباس، باب ۲۵، ما جائی اسبال الازار ص ۱۵۲۱)

ایک بار کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور مجلس میں بیٹھ گئے۔ اس کے بعد آپ نے حاضرین سے عجیب و غریب سوال کیا۔ فرمایا: کیا میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں سب سے اچھا کون اور برا کون ہے؟ حاضرین چپ رہے۔ آپ نے پھر یہی سوال دہرایا، سب خاموش رہے۔ تیسری بار پھر آپ نے یہی سوال کیا۔ ایک شخص بول اٹھا: جی ہاں یا رسول اللہ ﷺ ضرور ارشاد فرمایئے۔ ارشاد فرمایا: تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس سے اچھائی کی امید کی جائے اور جس سے لوگوں کو برائی کا اندیشہ نہ ہو اور تم میں سب سے برا وہ ہے جس سے اچھائی کی امید نہ کی جائے اور جس کی برائی سے کوئی مامون و محفوظ نہ ہو۔ (ترمذی)

ایک بار آپ نے مجلس میں لوگوں سے پوچھا: تم میں سے کون مجھ سے پانچ باتیں سیکھنا چاہتا ہے کہ خود بھی ان پر عمل کرے اور دوسروں کو بھی سکھائے کہ وہ ان پر عمل کریں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! میں..... حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا، پھر پانچ باتیں گن کر بتائیں۔

۱۔ گناہوں سے پرہیز کرو تو تم سب سے بڑے عبادت گزار ہو جاؤ گے۔

۲۔ اللہ نے تم کو جو دیا ہے اس پر راضی رہو تو سب سے بڑے دولت مند ہو جاؤ گے۔

۳۔ اپنے پڑوسی کے ساتھ احسان کرو تو مومن بن جاؤ گے۔

۴۔ دوسرے لوگوں کے لئے وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو تو مسلمان ہو جاؤ گے۔

۵۔ اور زیادہ نہ ہنسا کرو۔ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ (جامع ترمذی) (مسند احمد جلد ۲، ص ۳۱۰)

آپ ﷺ مسجد نبوی میں چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ تشریف فرما تھے، ایک بدوی آیا۔ اتفاق سے اس کو پیشاب کی ضرورت پیش آ گئی۔ وہ وہیں مسجد میں ایک طرف کو بیٹھ کر اپنی ضرورت پوری کرنے لگا۔ مجلس کے لوگ یہ منظر دیکھ کر چاروں طرف سے اس کو مارنے کے لئے دوڑے۔ آپ نے ان لوگوں کو روکا اور فرمایا: تم لوگ سختی کے لئے نہیں بلکہ نرمی کے لئے بھیجے گئے ہو۔ اس کے بعد اس بدوی کو بلا کر فرمایا: یہ عبادت کی جگہ ہے، یہ نجاست اور غلاظت کے لئے نہیں۔ یہ

اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز و قرآن کے لئے ہے اور پھر مجلس کے شرکاء سے کہا' اس پر پانی بہا دو۔ (صحیح بخاری ۱)

ایک بار حضرت حنظلہ رسدی رضی اللہ عنہ روتے ہوئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: حنظلہ رضی اللہ عنہ کیا بات ہے؟ بولے: حنظلہ منافق ہو گیا۔ دیکھو نا جب ہم رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں ہوتے ہیں اور آپ ﷺ جنت اور جہنم کا تذکرہ فرماتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم اپنی آنکھوں سے جنت اور جہنم کو دیکھ رہے ہیں لیکن جب رسول ﷺ کی مجلس سے اٹھ کر اپنے گھر والوں میں اور دنیا کے دھندوں میں لگ جاتے ہیں تو سب کچھ بھول جاتے ہیں...... حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ سنا تو ان پر بھی ایک کیفیت طاری ہو گئی اور بولے: یہ حالت تو ہماری بھی ہوتی ہے اور دونوں بزرگ یہ فکر لیے ہوئے رسول پاک ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ ساری سرگزشت سنائی...... حضور نے ان کی یہ روداد سنی اور فرمایا: اگر یہ حالت ہمیشہ بدستور قائم رہے تو فرشتے تم سے تمہاری مجلسوں میں مصافحے کرنے لگیں۔ یہ حالت تو کبھی کبھی ہوتی ہے۔ (ترمذی) (کتاب صفۃ القیامۃ' باب ۵۹' حدیث حنظلہ ص ۱۹۰۴)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوا اور بولا: یا رسول اللہ! میرے کچھ رشتہ دار ہیں' میں تو ان کے ساتھ ملتا ہوں مگر وہ نہیں ملتے' کٹتے ہیں۔ میں بھلائی کرتا ہوں' وہ برائی کرتے ہیں۔ وہ میرے ساتھ جہالت پر اتر آتے ہیں اور میں تحمل و برداشت سے کام لیتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ اس شخص کی بات سنتے رہے۔ پھر فرمایا: اگر واقعہ ایسا ہی ہے جیسا کہ تم کہتے ہو' تو تم ان کے منہ میں گرم گرم راکھ بھرتے ہو اور جب تک تم اس روش پر قائم رہو گے اللہ کی طرف سے تمہاری مدد ہوتی رہے گی۔ (مسند احمد' جلد ۲' ص ۱۸۱)

ایک بار رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں یہودیوں کی ایک جماعت آئی اور رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے کہا: السام علیکم (تم کو موت آئے) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سمجھ گئیں اور جواب میں فرمایا: وعلیکم السام واللعنۃ (یعنی تم پر موت ہو اور تم پر لعنت ہو) رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا: عائشہ رک جاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمام کاموں میں نرمی کو پسند فرماتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: یا رسول اللہ ان لوگوں نے جو کچھ کہا وہ آپ نے نہیں سنا۔ ارشاد فرمایا: میں نے بھی تو جواب میں کہہ دیا وعلیکم (اور تم پر بھی وہی ہو)

رسول اللہ ﷺ کے اس جواب میں سختی اور انتقام کی درشتی بھی نہیں ہے اور یہ حکمت بھی ہے کہ اگر ذرا بھی انسانیت ہو تو سننے والا شرمندگی محسوس کرے گا۔

ایک مرتبہ رسول پاک ﷺ نے اپنی مجلس میں جنت کا تذکرہ فرمایا اور اس قدر تفصیل کے ساتھ مؤثر انداز میں جنت کا نقشہ کھینچا کہ مجلس میں ایک بدوی موجود تھا۔ بولے: یا رسول اللہ یہ جنت کس کو ملے گی؟ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا: جس نے خوش کلامی سے کام لیا' بھوکوں کو کھانا کھلایا' اکثر روزے رکھے اور اس وقت وہ نماز پڑھنے کے لئے کھڑا رہا جب کہ لوگ آرام سے سو رہے ہوں۔

ایک بار ایک صحابیؓ نے اللہ کے رسول ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ! اگر کوئی یہ پسند کرے کہ اس کے کپڑے اچھے نفیس اور سلیقے کے ہوں اور اس کا جوتا بھی عمدہ اور خوبصورت ہو تو کیا یہ بھی غرور ہے' ارشاد فرمایا: نہیں اور فرمایا:

اَللّٰہُ جَمِیْلٌ وَّیُحِبُّ الْجَمَالُ (مسلم کتاب الایمان' حدیث ۱۴۷ ص ۶۹۴)

''اللہ جمال والا ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے''۔

ایک شخص نبی ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوا اور گزارش کی کہ یارسول اللہ مجھے نصیحت فرمایئے۔ ارشاد فرمایا: غصہ نہ کیا کرو۔ اس شخص نے کئی مرتبہ اپنا سوال دہرایا۔ ہر مرتبہ آپ نے یہی جواب دیا: ''غصہ نہ کیا کرو''۔

(صحیح بخاری) کتاب الادب' باب ۷۶ الحذر من الغضب ص ۵۱۶)

ایک بار مجلس میں آپ نے لوگوں سے سوال کیا: ''تم لوگ پہلوان کس کو سمجھتے ہو؟''۔ لوگوں نے جواب دیا: پہلوان وہ ہے جس کو لوگ کشتی میں نہ پچھاڑ سکیں۔ فرمایا: نہیں پہلوان وہ ہے جو غصہ کی حالت میں اپنے آپ پر قابو رکھے۔ (بخاری کتاب الادب' باب ۷۶' ص ۵۱۶)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جمعیت کے ساتھ حضور ﷺ کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ راہ میں ایک یہودی قرض خواہ نے اپنے قرض کا مطالبہ کیا۔ آپ نے فرمایا: ''بھئی مدینے پہنچنے پر سب سے پہلے تمہارا قرض ادا کروں گا''۔ وہ بولا: جی نہیں' میں تو اپنا قرضہ لیے بغیر یہاں سے نہیں ٹلوں گا۔ آپ وہیں بیٹھ گئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو رسول پاک ﷺ کے ہمراہ تھے' اس یہودی کی گستاخی اور سخت روی پر برافروختہ ہو گئے اور اس کو کچھ سخت سست کہنا چاہا۔ مگر اللہ کے رسول ﷺ نے منع فرمایا اور یہودی سے کہا: اب میں یہیں تیرے ساتھ بیٹھوں گا۔ ظہر کی نماز آپ ﷺ نے وہیں ادا فرمائی۔ عصر کی وہیں ادا فرمائی۔ رات کی تاریکی چھانے لگی تو آپ نے قرض خواہ یہودی سے کہا: بھائی شہر جانے دو۔ سب سے پہلے تمہارا ہی قرض ادا کروں گا۔ مگر وہ نہ مانا۔ آپ برابر تحمل اور بردباری سے کام لیتے رہے اور کسی ناگواری کا اظہار کیے بغیر رات وہیں گزاری' فجر کی نماز بھی وہیں ادا کی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم جزبز ہوتے رہے اور رسول ﷺ سے کہا: یارسول اللہ ایک یہودی نے آپ کو روک رکھا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں ایک یہودی نے روک رکھا ہے' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے روک دیا ہے کہ میں کسی پر کوئی زیادتی کروں۔

دھوپ نکل آئی' دوسرا دن شروع ہو گیا۔ یہودی نے یہ سب کچھ دیکھا تو کہا: یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان مجھے کلمہ پڑھا کر دائرہ اسلام میں داخل کیجئے اور اپنے فداکاروں میں شامل فرمایئے۔ یارسول اللہ! میں اپنا آدھا مال اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں' میں نے یہ گستاخانہ انداز صرف اس لیے اختیار کیا کہ میں نے توراۃ میں نبی خاتم المرسلین ﷺ کے جو اوصاف پڑھے تھے' ان کا تجربہ کروں۔

ملک یمامہ کا ایک رئیس ثمامہ رضی اللہ عنہ ابن اثال اسلام کا اور حضرت محمد ﷺ کا سخت دشمن تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا

ایک دستہ نجد کی طرف روانہ کیا گیا تھا' اتفاق کی بات کہ وہاں راہ میں کسی مقام پر ثمامہ مل گیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو گرفتار کر کے مدینہ لے آئے اور یہاں مسجد نبوی کے ایک ستون سے اس کو باندھ دیا گیا۔ حضور ﷺ نماز کے لئے مسجد میں آئے تو ثمامہ کو ستون سے بندھا ہوا دیکھا' پوچھا: ثمامہ تمہارے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہئے' ثمامہ نے کہا: محمد! اگر آپ مجھے قتل کریں گے تو ایک ایسے شخص کو قتل کریں گے جو خونی مجرم ہے اور اگر آپ مجھے معاف فرمائیں گے تو یہ آپ کا احسان ایک ایسے شخص پر ہوگا جو احسان شناس ہے اور اگر آپ کو مال درکار ہے تو آپ ارشاد فرمائیں مال پیش کر دیا جائے گا۔ ثمامہ کی بات سن کر آپ آگے بڑھ گئے اور اس کو اسی حالت میں چھوڑ گئے۔ دوسرے دن پھر یہی گفتگو ہوئی اور آپ تشریف لے گئے' تیسرے روز پھر اسی قسم کی بات چیت ہوئی اور حضور ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے ثمامہ کے بندھن کھول دیئے اور اس کو رہا کر دیا...... حضور ﷺ کے اس حسن سلوک کا ثمامہ پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ مسجد سے باہر نکلا اور آڑ میں کسی موزوں مقام پر غسل کر کے پھر مسجد میں داخل ہوا اور کلمہ شہادت ادا کر کے حلقہ بگوش اسلام ہو گیا اور حضور ﷺ سے کہا: محمد ﷺ! آج سے پہلے زمین پر آپ کے چہرے سے زیادہ کوئی چیز میرے لیے مبغوض نہ تھی' لیکن آج وہ چہرہ مجھے روئے زمین کی ہر چیز سے زیادہ محبوب ہے۔ مجھے آپ کے دین سے زیادہ کسی چیز سے دشمنی نہ تھی لیکن آج وہ دین مجھے ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ مجھے آپ کے شہر سے زیادہ کسی شہر سے کد نہ تھی' مگر آج آپ کا وہ شہر مجھے تمام شہروں سے زیادہ پر کشش نظر آتا ہے۔

(بخاری کتاب المغازی' باب اے وفد بنی حنیفہ وحدیث ثمامہ' ص ۳۵۸)

حضور ﷺ مجلس میں تشریف فرما ہیں کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ داخل ہوتے ہیں اور اپنی چادر میں ایک چڑیا اور اس کے بچوں کو لئے ہوئے کہتے ہیں کہ اے اللہ کے رسول! میں نے ایک جھاڑی میں سے ان بچوں کو اٹھایا اور اپنے کپڑے میں رکھ لیا تو ان کی ماں میرے سر پر منڈلانے لگی۔ میں نے بچوں کے اوپر سے کپڑا ذرا سا سرکا دیا تو بچوں کی ماں اپنے بچوں پر آ کر گر پڑی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: "کیا تم کو بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تعجب ہے۔ قسم ہے اس ہستی کی جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے جس قدر محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے' اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ محبت ہے۔ (ابوداؤد)

کس قدر دلنشین اور خوبصورت انداز میں اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ کی بے پایاں محبت کا تعارف کرایا ہے۔ اس نورانی مجلس میں گاہ گاہ حاضری بھی بہت بڑی سعادت ہے لیکن کس قدر خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو بلا ناغہ روزانہ اس مجلس میں کچھ لمحات گزارتے ہیں اور اپنے ایمان کو تازہ کرنے کا سامان کرتے ہیں۔ انسانیت' شرافت اور راہ راست کا سبق اسی مجلس سے ملتا ہے۔

# دین کی سوجھ بوجھ

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اللہ جس بندے کا بھلا چاہتا ہے اس کو دین میں تفقہ عطا کرتا ہے''۔

اس فقرے سے سب سے پہلی بات تو یہ سامنے آتی ہے کہ اللہ صرف اس بندے کا بھلا چاہتا ہے جو صاحب دین ہو اس لیے کہ دین کا دشمن، دین میں تفقہ کیوں حاصل کرے گا اور دشمنِ دین کا اللہ کیوں بھلا چاہے گا۔ اللہ اسی کا بھلا چاہتا ہے، جس کا اللہ سے تعلق ہو، جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو، اللہ سے اور اللہ کے دین سے محبت رکھتا ہو، اور دین میں گہری بصیرت اور مثالی سوجھ بوجھ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہو، کوشش اور کاوش کئے بغیر، اس عمل کی دنیا میں اللہ تعالیٰ کسی کو کچھ نہیں دیتا۔ یہ دنیا اللہ نے اسی قانون فطرت پر بنائی ہے اور قدرتی دستور یہی ہے کہ جو کوشش کرتا ہے وہ پاتا ہے، جو کوشش سے جی چراتا ہے وہ محروم رہتا ہے۔

اللہ کا ارشاد ہے:

اَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (النجم۵۳:۳۹)

آدمی کو صرف وہی ملتا ہے جس کی وہ سعی و کوشش کرتا ہے اور یہ حقیقت آفتاب کی طرح روشن ہے کہ دین میں تفقہ حاصل کرنے اور دین کے علم میں بصیرت پیدا کرنے کی کوشش وہی خوش نصیب کرے گا جو دین سے مشرف ہو اور ایمان کی دولت سے مالا مال ہو۔

دوسری بات ایک اصولی حقیقت کے طور پر یہ سمجھ میں آتی ہے کہ یہ بات جس طرح مرد کے لئے ہے اسی طرح عورت کے لئے بھی ہے، ایسا نہیں ہے کہ ایک صاحب دین مرد کا تو اللہ بھلا چاہتا ہے مگر صاحب دین عورت کا بھلا نہیں چاہتا۔ مرد بھی اللہ کا بندہ ہے اور عورت بھی اللہ کی بندی ہے۔ مرد کوشش کرے گا تو وہ بھی اپنے کئے کا صلہ پائے گا اور عورت کوشش کرے گی تو وہ بھی اپنے کئے کا صلہ پائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِیۡبٌ مِّمَّا اکۡتَسَبُوۡا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِیۡبٌ مِّمَّا اکۡتَسَبۡنَ ؕ (النساء۴:۳۲)

مردوں نے جو کمائی کی ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور عورتوں نے جو کمائی کی ہے اس کے

مطابق ان کا حصہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی آبادی اور رونق کے لئے انسان کی دو صنفیں پیدا کی ہیں اور دونوں کو یکساں مواقع دیئے ہیں کہ وہ اپنی دنیا اور آخرت بنانے کے لئے کوشش و کاوش کریں۔ دونوں کو یکساں حصہ ملے گا۔ اللہ کا تعلق دونوں سے یکساں ہے وہ کسی کے ساتھ ناانصافی ہرگز نہ کرے گا۔ وہ دونوں کا خالق، دونوں کا ربّ اور دونوں کا بہی خواہ ہے اور دونوں کو اپنی نعمتوں سے نوازنا چاہتا ہے۔ اس نے دونوں کے لئے یکساں ہدایت کا سامان کیا ہے۔ دونوں کے لئے جنت کو سنوارا ہے اور دونوں کے لئے اس کارگاہ حیات میں سعی و جہد اور اعمالِ صالحہ کے یکساں مواقع رکھے ہیں۔ ان میں سے جس کا بھی اللہ بھلا چاہتا ہے اس کو تفقہ فی الدین کی نعمت سے نوازتا ہے۔ اگر علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اس نے فقاہت و بصیرت سے نوازا ہے تو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بھی دین کے اسرار و حکم میں درک عطا فرمایا ہے۔ اگر وہ علوم نبوت سے فیضیاب ہوئے ہیں تو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی فیضیاب ہیں، اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فہم دین، اجتہادِ فکر، استنباطِ مسائل، حفظ و ضبطِ واقعات، دانش و بینش، درایت، اصابت رائے، تفقہ فی الدین اور احکام دین کے اسرار و رموز کو سمجھنے اور پانے کی غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ قرآن پاک کی آیتوں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کی جو تاویلیں، یقین نواز حکمتیں اور توجیہیں آپ سے منقول ہیں وہ دینی علوم کے ذخیرے میں ملت کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔

ایک روز حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے دربار کے ایک شخص سے پوچھا: لوگوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ درباری نے جواب دیا: امیر المومنین آپ ہیں۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تمہیں قسم دیتا ہوں، سچ سچ بتاؤ۔ یہ سن کر درباری نے کہا: امیر المومنین اگر یہ بات ہے تو سنئے سب سے زیادہ علم والی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی ایک روایت جامع ترمذی میں منقول ہے۔ ”ہم صحابہ رضی اللہ عنہم کو کوئی ایسی مشکل بات کبھی پیش نہیں آئی جس کے بارے میں ہم نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا ہو اور ان کے پاس اس کے متعلق ہم نے معلومات اور جواب نہ پایا ہو۔ (ترمذی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا: ”آدھا دین اس حمیرا (سرخ و سفید) سے پوچھو۔

احادیث کے ذخیرے کا مطالعہ کیجئے تو آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے تفقہ فی الدین، اجتہاد بصیرت اور دین کے اسرار و حکم میں مہارت سے متعلق بہت کچھ پائیں گے۔

تیسری بات اس فقرے میں قابل غور یہ ہے کہ تفقہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قدر غیر معمولی انداز کیوں اختیار فرمایا ہے اور تفقہ کا مفہوم کیا ہے؟

تفقہ کے معنی ہیں ''سوجھ بوجھ'' دین میں سوجھ بوجھ کے معنی یہ ہیں کہ آدمی دین کی حکمتوں کو سمجھتا ہو' دین کے منشا اور مراد پر اس کی نظر ہو' دین کا مزاج شناس ہو' حالات کی نبض پر اس کی انگلی ہو اور وہ حالات اور زمانے کے تقاضوں کو سمجھ کر دین کے احکام اور اصول کو منطبق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو' وہ محض اندھا مقلد نہ ہو بلکہ شعور و بصیرت رکھتا ہو اور دانش و بینش سے کام لے کر شعور کے ساتھ دینی احکام پر عمل پیرا ہو' ایسا ہی شخص حقیقت میں صاحب دین ہے' دین کی معرفت رکھتا ہے' دین کے حقائق و معارف اس پر روشن ہیں اور وہ احکام دین کی غرض و غایت اور دین کی تعلیمات اور اصول و ہدایات کی روح اور مزاج کو سمجھتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ زندگی وہی زندگی ہے جو اللہ کی اطاعت' بندگی اور روئے زمین پر اللہ کی مرضی پوری کرنے میں گزرے۔ اس کے بغیر جو لوگ زندگی گزار رہے ہیں وہ دراصل زندگی کی حقیقت و سعادت اور زندگی کی لذت و کامرانی سے محروم ہیں۔

اسی لیے اللہ کے رسول ﷺ نے تفقہ فی الدین کو اللہ کی سب سے بڑی نعمت قرار دیا اور بتایا کہ جس بندے کو اللہ کی اس نعمت عظمٰی سے سرفراز پاؤ' سمجھ لو کہ اللہ نے اس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کیا ہے اس پر اپنا خصوصی فضل فرمایا ہے اور اس کو تفقہ اور بصیرت دینی کے جوہر سے نواز کر ساری بھلائیوں کا دروازہ اس پر کھول دیا ہے۔

عبادت و ریاضت' اخلاق و معاملات' افکار و نظریات حسنات و اعمال صالحہ' ان میں سے ہر چیز کی قدر و قیمت کا انحصار' تفقہ' فہم دین' بصیرت اور دینی دانش و بینش پر ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت بیہقی نے نقل کی ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان رجل ليكون من اهل الصلوٰة و الصوم والزكوٰة والحج والعمرحتى ذكر سهام الخير كلها وما يجزى يوم القيامة الا بقدر عطه (بیہقی)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک شخص نماز بھی پڑھتا ہے' روزہ بھی رکھتا ہے' زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہے' حج اور عمرہ بھی کرتا ہے' یہاں تک کہ آپ نے ہر قسم کی بھلائیوں اور نیکیوں کا ذکر کیا' مگر قیامت کے روز اس کو صلہ اس کی سوجھ بوجھ کے مطابق ہی دیا جائے گا۔

تفقہ اور فہم دین کی حیثیت اور اہمیت کو سمجھنے کے باب میں یہ حدیث اس لائق ہے کہ ہمہ وقت پیش نظر رکھی جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ دین میں تفقہ' دین کا فہم اور دین کی روح اور مزاج سے واقفیت ہی کی بدولت آدمی دین کے منشا کو پورا کر سکے گا' عبادات اور اعمال صالحہ کے تقاضوں کو سمجھ سکے گا اور یہ خیال رکھ

سکے گا کہ یہ عبادات دراصل کس لیے ہیں اور زندگی میں کس طرح کے ہمہ گیر انقلاب کی متقاضی ہیں۔ ایسے شخص کی زندگی میں تضاد' دورنگی عدم توازن اور بدعملی آپ ہرگز نہ پاسکیں گے۔ وہ عبادات اور حسنات کے ارکان اور ظاہری آداب پورے کرنے پر ہی قوت نہیں لگائے گا بلکہ یہ سمجھنے کی کوشش بھی کرے گا کہ اللہ نے کس عبادت کو فرض کیوں کیا ہے' کیا مقاصد پیش نظر ہیں۔ کس نیکی کے حکم سے اللہ تعالیٰ کن برائیوں سے میری زندگی کو پاک کرنا چاہتا ہے اور کن بھلائیوں سے آراستہ دیکھنا چاہتا ہے۔

ایک فقیہ دین کی پوری کی پوری زندگی اللہ کے رنگ میں رنگی ہوئی ہوگی۔ ایسا نہ ہوگا کہ وہ زکوۃ تو ادا کرتا ہو' اڑھائی فیصد نکالنے پر تو بہت زور دیتا ہو اور اس' معاملے میں بڑی جزرسی سے کام لیتا ہو' لیکن رشتے داروں کا حق ادا کرنے میں کوتاہ کار ہو' حج کرنے کا تو اہتمام ہو' نہ صرف فرض حج کا اہتمام بلکہ نفل حجوں کا بھی اہتمام ہو لیکن بہن اور بیٹی کی میراث ادا کرنے میں تاویلیں کرتا ہو' اس کی نظر اللہ کے بتائے ہوئے احکام کو ظاہری طور پر پورا کرنے پر ہی نہیں ہوگی بلکہ دین کی روح اور غرض و غایت پر ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ نماز باجماعت تو پانچ وقت بڑی پابندی سے ادا کرتا ہو لیکن اس کے پڑوسی اس کے شر سے ہر وقت پناہ مانگتے ہوں' اس کی عبادات' اس کے حسنات سے اس کی پوری زندگی اور زندگی کا ہر ہر پہلو آراستہ ہوگا۔ اور بحیثیت مجموعی پوری زندگی میں دلکشی اور رعنائی ہوگی اور ہر معاملہ میں اس پر بھروسہ کیا جائے گا۔ دھوکہ دہی یا زیادتی' یا بدخواہی کا اندیشہ اس سے ہرگز نہ ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

سمعت ابا القاسم صلی اللہ علیہ وسلم یقول خیر کم اسلاما احسنکم اخلاقاً اذا فقھو (الادب المفرد)

میں نے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ آپ فرماتے تھے: تم لوگوں میں اسلام میں وہ لوگ سب سے بہتر ہیں جو اخلاق میں سب سے بہتر ہیں جبکہ وہ دین کی سوجھ بوجھ رکھتے ہوں۔

ظاہر ہے' یہاں اخلاق سے مراد برتاؤ' سلوک اور معاشرت و معاملات کے وہ جملہ پہلو ہیں جن میں ایک شخص کا دوسرے شخص سے ربط و تعلق ہوتا ہے۔ ان سارے پہلوؤں میں ایک شخص اسلام کا نمونہ اور ترجمان اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ اللہ کے احکام کے ظاہری ڈھانچے کو جزرسی کے ساتھ سنوارنے اور ادا کر دینے ہی پر نظر نہ رکھتا ہو بلکہ دین کی منشا اور غرض و غایت کو پورا کرنے اور اللہ کی مرضی کے سانچے میں خود کو ڈھالنے کی کوشش کرتا ہو اور اسی کا نام تفقہ فی الدین ہے۔

تفقہ فی الدین اور گہری بصیرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ایسا انسان خود کو اپنے ازلی دشمن کی ان سازشوں سے

بھی محفوظ رکھ سکے گا جن سازشوں کو پھیلانے اور انسانوں کو شکار کرنے میں وہ انتہائی ذہانت اور زبردست مکاری کے ساتھ ہمہ وقت سرگرم ومصروف ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

''اللہ کے بندے کے لئے دین میں تفقہ اور سمجھ حاصل کرنے سے بڑھ کر فضیلت کی کوئی بات دوسری نہیں ہوسکتی' دین میں ایک سوجھ بوجھ رکھنے والا' شیطان پر' ہزاروں عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔ ہر چیز کی ایک بنیاد ہوتی ہے اور اس دین اسلام کی بنیاد تفقہ ہے''۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دین کی اندھا دھند پیروی اور محض ظاہری ڈھانچے کی پاسداری دین میں مطلوب نہیں ہے بلکہ مطلوب یہ ہے کہ آدمی سوجھ بوجھ سے کام لے' شعور وبصیرت کے ساتھ احکام دین کی پیروی کرے اور اللہ کی تعلیمات کی روح ومنشا کو سمجھ کر اس کو پورا کرنے کی کوشش کرے۔ بنیاد کے بغیر عمارت کا وجود نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو متزلزل اور قطعاً ناپائیدار ہوتا ہے۔ اگر اسلام کی عمارت تعمیر کرنا ہے تو اس کی بنیاد تفقہ اور فہم دین ہے۔

رسول پاک ﷺ کے اس فقرے کا مفہوم یہ بھی ہے کہ دین کی پیروی کرنے والے اندھے مقلد نہ بنیں بلکہ شعور کے ساتھ دین کو اپنائیں اور اس پر عمل کریں اور سوجھ بوجھ سے کام لے کر اسلام کے تقاضوں کو پورا کریں اور یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ اس دین کی بنیاد چونکہ سوجھ بوجھ پر ہے اس لیے حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرنے والے کھلی آنکھوں اور کھلے کانوں سے دنیا کا مشاہدہ کرنے والے اور اللہ کی دی ہوئی فہم وبصیرت سے کام لینے والے کبھی اس دین سے محروم نہیں رہ سکتے۔ اگر انسان عقل وخرد سے کام لے' باپ دادا کی اندھی تقلید کا مریض نہ ہو' جانبداری اور تعصب کے رنگ سے اس کا فہم زنگ آلود نہ ہو اور وہ دل سے حق کی تلاش کا خواہشمند ہو تو وہ ضرور اس حق کو قبول کرے گا۔ اس لیے کہ اس کی بنیاد ہی سوجھ بوجھ اور دانش وخرد پر ہے۔



# اللہ کے نزدیک محبوب کردار

اللہ تعالیٰ کو جس کردار سے پیار ہے' وہ ایمان کامل اور اخلاص فی الدین کی بنیاد پر وجود میں آتا ہے۔ یہ کردار فرد کا بھی ہوتا ہے اور جماعت کا بھی' فرد کے قلب میں جب ایمانِ کامل اور اخلاص فی الدین جگہ پاتا ہے تو فطری طور پر اس کے اندر دوسرے اہل ایمان کے لئے مودت و رحمت قربت و یگانگت اور نصح و خیر خواہی کے جذبات ابھرتے ہیں' اس لئے کہ ایمان و اخلاص کا خاصا ہی یہ ہے کہ وہ اہل ایمان کو باہم جوڑتا ہے' یہ ممکن نہیں کہ دو افراد ایمان و اخلاص کی دولت سے مزین ہوں اور وہ الگ الگ ہوں' اور ایک دوسرے سے تعلق نہ رکھتے ہوں' جماعت بھی بحیثیت جماعت دوسرے اہل ایمان کے لئے قربت و محبت کے جذبات رکھتی ہے' اور اخلاص و ایمان کی بدولت' مسلمانوں میں باہم ایسی مثالی اخوت و قربت اور محبت و یگانگت پیدا ہوتی ہے' جس کی نظیر کوئی انسانی سوسائٹی فراہم نہیں کر سکتی۔

اللہ کے رسول ﷺ نے مسلمانوں کو اس اتحاد و محبت کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے۔

المومن للمومن کالبنیان لیشد بعضه بعضا ثم ثبك بين اصابعه (بخاری' مسلم)

ایمان والوں کا باہم تعلق عمارت کی طرح کا ہوتا ہے کہ اس کے اجزا باہم ایک دوسرے کی قوت اور مضبوطی کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے انگلیوں میں انگلیاں ڈالیں (کہ اس طرح باہم پیوستہ اور جڑے ہوئے ہوتے ہیں)

مسلمانوں کو دیوار یا عمارت سے تشبیہ دینے سے یہ حقیقت ذہن نشین کرنا ہے کہ جس طرح ایک مضبوط دیوار کی اینٹیں آپس میں ایک دوسرے سے چسپاں اور باہم پیوست ہوتی ہیں اسی طرح اہل ایمان بھی آپس میں باہم دگر جڑے ہوئے اور ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہوتے ہیں' اور جس طرح عمارت کی ہر اینٹ دوسری اینٹ کا سہارا اور اس کو قوت پہنچانے اور جمانے کا کام دیتی ہے۔ اسی طرح ایک مومن بھی دوسرے مومن کا سہارا' اس کو قوت پہنچانے والا اور اس کو استقامت بخشنے والا ہوتا ہے۔ پھر حضور ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ میں ڈالیں اور عملی شکل میں اسی قربت' اخوت اور ایک دوسرے کے لئے قوت و سہارا ہونے کو محسوس کرا دیا۔ دراصل

ایمان و اخلاص کی فطرت کا خاصہ ہی یہ ہے کہ اہل ایمان باہم محبت و مودت اور اخوت و قربت کا نمونہ ہوں۔ آپس میں بے تعلق ہونا' یا ایک دوسرے سے بے زار ہونا' اور ایک دوسرے کے خلاف دل میں بغض و عناد کے جذبات پالنا یہ تو نفاق کی علامت ہے۔ ان رذائل کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں۔ منافقین کے معاشرے کی تصویر کشی قرآن نے اس طرح کی ہے:

تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ط (الحشر ۵۹:۱۴)

تم انہیں باہم متحد گمان کرو گے درآنحالیکہ ان کے دل باہم پھٹے ہوئے اور متفرق ہیں۔

ایمان و اخلاص کے ساتھ بغض و عناد اور افتراق و انتشار کا کوئی جوڑ نہیں۔ قرآن نے مومنوں پر اجتماعی کردار کے لئے بنیان مرصوص کا لفظ استعمال کیا ہے اور حضور ﷺ نے بھی اس کے لئے بنیان کی مثال کا انتخاب فرمایا ہے۔ قرآن کے الفاظ کس قدر مؤثر اور کس قدر بلیغ ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ○ (الصف ۶۱:۴)

اللہ کو تو ان لوگوں پر پیار آتا ہے جو اس کی راہ میں صف بستہ ہو کر اس طرح لڑتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

یہ منظر تو میدان جنگ کا ہے لیکن اگر آپ زندگی کو ایک ہمہ وقتی رزم گاہ تصور کر لیں جہاں ہر وقت حق و باطل برسرِ پیکار ہیں' اور اہل حق اور اہل باطل کی کشمکش ہر دم اور ہر مقام پر ہے تو آپ اس تصور میں اہل ایمان کو اہل باطل کے مقابلے میں صف بستہ اس طرح سرگرم کار پائیں گے' گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

امت کے باشعور دانشوروں کا کام یہ ہے کہ وہ امت کو اخوت و محبت کا درس دیں اور عمل کی زندگی میں اس کے مواقع بھی فراہم کریں۔ یہ قربت و مودت جن بنیادوں پر وجود میں آتی ہے' ان بنیادوں کو مضبوط کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ یہ بنیادیں ایمان اور اخلاص ہیں' ان بنیادوں کی فکر کرنا اور ان کو مضبوط کرنا یہی ہمارا اصل کام ہے۔ اور انہی کے طفیل اہل ایمان کا وہ کردار وجود میں آسکتا ہے جو اللہ کے نزدیک محبوب کردار ہے۔



# ایمان کی چار علامتیں

یوں تو اللہ نے ہمیں بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے اور ایک سے ایک نعمت بیش بہا ہے۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان نعمتوں میں ''ایمان'' سب سے بڑی نعمت ہے۔ ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ایمان ہے' ایمان ہی واحد متاع ہے جس کی بدولت ہم آخرت کی دائمی زندگی میں اللہ کی رضا اور جنت حاصل کر سکیں گے اور اس بھڑکتی آگ سے بچ سکیں گے جس کا نام جہنم ہے۔اللہ کا ارشاد ہے:

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ (آل عمران:۱۸۵:۳)

جو شخص جہنم کی آگ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا وہ کامیاب ہو گیا۔

اور یہ حقیقت ہے کہ یہ کامیابی انہی کے حصے میں آئے گی جن کو اللہ نے دولت ایمان سے نوازا ہے۔ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم بھی صاحب ایمان ہیں' مگر ہمارا ایمان اسی وقت معتبر ہوگا جب اللہ تعالیٰ بھی اعتراف فرمائے کہ تم صاحب ایمان ہو' بڑا فرق ہے ایمان کا دعویٰ کرنے میں اور اس حقیقت میں کہ اللہ کے نزدیک بھی ہمارا ایمان معتبر ہو' اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے:

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (الانفال:۱:۸)

اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم واقعی مومن ہو۔

یعنی اللہ کے نزدیک دعویٰ ایمان میں وہی شخص صادق ہے اور اسی کا ایمان اللہ کے نزدیک معتبر ہے جو اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں زندگی گزارے وہ شخص اللہ کے نزدیک حقیقی صاحب ایمان نہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت سے آزاد سرتابی اور نافرمانی کی زندگی گزار رہا ہے۔اسی حقیقت کو اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ نے بھی ایک موقع پر ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:

لایومن احد کم حتی یکون ھواہ تبعالما جئت بہ

(تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہش نفس اس طریقے کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں)

یعنی میرا لایا ہوا طریقِ عمل جو شخص اپنائے گا اور اس کی اتباع میں زندگی گزارے گا وہی درحقیقت صاحب ایمان ہے اور جو اس سے آزاد ہے اور خواہش نفس کی اتباع میں زندگی گزار رہا ہے وہ حقیقت میں مومن نہیں ہے۔

ایک مقام پر قرآن نے اس حقیقت کو اور زیادہ واضح اور قدرے ایمان افروز تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذَا دُعُوْٓا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَاؕ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ○ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ○ (سورہ نور ۲۴:۵۱:۵۲)

ایمان والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسول کی طرف بلائے جائیں تا کہ رسول ان کے معاملے کا فیصلہ کر دیں تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور کامیاب وہی ہیں جو اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کریں اور اللہ سے ڈریں اور اس کی نافرمانی سے بچیں۔

قرآن کی ان توضیحات کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے بارے میں محض ایمان کے دعوے کی بنیاد پر یہ اطمینان نہ کر لے کہ وہ مومن ہے۔ اگر وہ حقیقت میں مومن بننے کا آرزو مند ہے تو وہ اس کردار کو اپنائے جس کو قرآن نے حقیقی مومن کا کردار قرار دیا ہے۔ قرآن نے فوز و فلاح پانے والا حقیقی مومن اس کو قرار دیا ہے جس کا کام یہ ہو کہ وہ اللہ اور رسول کا حکم سن کر سمعنا واطعنا کی روش اپنائے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری کی زندگی گزارے' اللہ کا تقویٰ اختیار کرے اور اس سے ڈرتے ہوئے اپنے شب و روز بسر کرے۔

قرآن حکیم نے ایک موقع پر ایمان کی چار علامتیں بیان کر کے فیصلہ کن انداز میں بتایا ہے کہ جن لوگوں میں یہ چار علامتیں پائی جائیں وہی حقیقی مومن ہیں۔ درحقیقت قرآن نے ایک آئینہ فراہم کیا ہے جس میں مومن کے روئے انور کے چار خدوخال بیان کئے ہیں' ہر وہ شخص جس کو اپنا ایمان جان و دل سے زیادہ عزیز ہے وہ اس آئینے میں ان خدوخال پر غور کرے اور اپنے بارے میں فیصلہ کرے کہ اللہ کی نظر میں وہ درحقیقت مومن ہے یا نہیں۔ ایمان درحقیقت انہی کا معتبر ہے جن خوش نصیبوں کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ نے اعتراف فرمایا ہے کہ یہ ہیں حقیقی مومن۔

اللہ نے قرآن حکیم میں ایسے مومنوں کی چار علامتیں بیان فرمائی ہیں:

## ایمان کی پہلی علامت

ایمان کی پہلی علامت قرآن نے اپنے لفظوں میں یوں بیان کی ہے:

إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (الانفال ۸:۲)

(جب اللہ کا ذکر آئے تو ان کے قلوب دہل جائیں)

یعنی جب ان کے سامنے اللہ کی شان وقدرت کا ذکر ہو‘ اس کے بے پایاں انعامات واحسانات کا بیان ہو اور اس کی سخت پکڑ اور بے لاگ انصاف کا تذکرہ کیا جائے تو ان کے دلوں پر اس کی ہیبت طاری ہو جائے اور اس کے رعب وجلال کے تصور سے ان کے دل لرزنے لگیں‘ وہ اللہ کی باتیں غفلت اور لاپرواہی کے ساتھ نہ سنیں بلکہ پوری توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ دھیان دے کر سنیں۔ اس سے لو لگائیں اور اس کی ناراضی‘ بے توجہی اور عتاب سے لرزنے لگیں‘ اس کی ذات وصفات اور کارنامہ ہائے قدرت کا تذکرہ سن کر آنکھیں نم ہو جائیں‘ دلوں پر خوف اور رعب طاری ہو جائے‘ اس کی شدت محبت سے قلب لرزاں وترساں ہو اور یہ فکر ذہن پر غالب ہو کہ میرا محسن‘ آقا‘ مالک اور پروردگار میری طرف سے کہیں نظریں نہ پھیر لے‘ اپنی رحمتوں اور عنایتوں سے مجھے محروم نہ کر دے‘ مجھ پر برابر عنایت اور رحمت کی بارش کرتا رہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مومن کے سامنے اس کے رب کا تذکرہ ہو اور اس پر بے حسی اور غفلت طاری رہے‘ اللہ کا ذکر سن کر اس کے جذبات میں طوفان اٹھتا ہے اور اللہ کی یاد سے اس کا دل دھڑکنے لگتا ہے‘ اپنے رب کا تذکرہ سن کر اگر قرآن کی یہ بیان کردہ کیفیت آپ اپنے اندر پاتے ہیں تو اللہ کا شکر ادا کیجئے‘ ایمان کی علامت موجود ہے اور خدانخواستہ اللہ کے ذکر کے وقت آپ پر بے حسی اور لاپروائی ہی طاری رہتی ہے‘ نہ دل پگھلتا ہے اور نہ اس پر خوف وجلال کی کوئی کیفیت طاری ہوتی ہے تو فکرمند ہو جائیے کہ یا تو آپ ایمان سے محروم ہو رہے ہیں یا اگر ایمان موجود ہے تو انتہائی کمزور اور مضمحل ہو گیا ہے‘ اس کی زندگی اور حرارت کی فکر کیجئے۔

## ایمان کی دوسری علامت



ایمان کی دوسری علامت قرآن نے یوں بیان کی ہے:

وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا (الانفال:۸:۲)

''اور جب ان کو اللہ کی آیات سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھتا محسوس ہوتا ہے''۔

دراصل ایمان ایک بیج ہے جو دل کی سرزمین میں جڑ پکڑتا ہے اور اس سے دین وشریعت کے برگ وبار پھوٹتے اور اخلاق وکردار کے ثمرات نمودار ہوتے ہیں۔ اگر دل کی سرزمین بنجر نہ ہو اس میں ایمان کا بیج بویا جائے تو یقیناً آدمی زندگی میں اخلاق واعمال کی بہار دیکھتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ بیج بھی درست اور جاندار ہو اور زمین بھی زرخیز ہو مگر شاداب اور پر بہار درخت نہ اگے اور درخت میں برگ وبار نہ آئیں۔

مومن جس کے دل میں ایمان جڑ پکڑ چکا ہے اس کے سامنے جب اللہ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں اور دین کے احکام وتقاضے اور ایمان کے مطالبے پیش کئے جاتے ہیں تو اس کا دل باغ باغ ہونے لگتا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ ایمان کے شجر طیبہ میں برگ وبار آ رہے ہیں اور اس کا ایمان بار آور ہو رہا ہے اور وہ اس طرح خوشی محسوس کرتا ہے جس طرح ایک کسان اپنی محنت سے لگائی ہوئی فصل کو لہلہاتے دیکھ کر خوشی اور مسرت محسوس کرتا ہے۔

مومن کے سامنے جب اللہ کی آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں اور دین کے احکام اور فرامین سامنے آتے ہیں تو وہ اپنے ایمان میں حرارت' بیداری اور اضافہ محسوس کرتا ہے کہ اپنے رب سے وفاداری کا موقع ہاتھ آ رہا ہے۔ اپنے ایمان کے پھلوں سے لذت اندوز ہونے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے اور یہ شرف مل رہا ہے کہ میں اپنے رب سے اظہارِ محبت کرسکوں' وہ اپنے ایمان میں بالیدگی اور گرمی محسوس کرتا ہے۔ ایمان کے تقاضے اور دین و شریعت کے مطالبے سن کر اس کے دل میں کڑھن اور ناگواری نہیں ہوتی۔ اس کی پیشانی پر بل نہیں آتے بلکہ وہ اپنے رب کا حکم بجالانے اور اس کی اطاعت کی سعادت حاصل کرنے کے لئے بے چین ہو جاتا ہے۔

آیاتِ الٰہی کی تلاوت سے ایمان میں بالیدگی اور گرمی' ایمان کی علامت بھی ہے اور ایک کسوٹی بھی۔ ہر وہ شخص جسے ایمان عزیز ہے' وہ آیاتِ الٰہی کی تلاوت کے وقت اپنا جائزہ لے۔ اگر تلاوت آیات کے وقت اس کے ایمان میں گرمی' بالیدگی اور اضافہ محسوس ہوتا ہے اور اللہ کے احکام سن کر ان کی تعمیل کے لئے بیداری اور نشاط کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو اللہ کا شکر ادا کرے کہ اس کا دل ایمان سے مزین ہے اور وہ علامت موجود ہے جس کو اللہ نے ایمان کی علامت قرار دیا ہے اور اگر خدانخواستہ تلاوت آیات سننے اور احکام دین سامنے آنے سے دل میں ناگواری اور پیشانی پر شکنیں نمودار ہونے لگتی ہیں اور طبیعت میں اکتاہٹ اور کڑھن پیدا ہوتی ہے اور احکام دین کی تعمیل میں سستی' بے ذوقی اور ٹال مٹول کی کیفیت نمودار ہوتی ہے تو فکرمند ہو جانا چاہئے کہ قلب ایمان کے نور سے محروم کھنڈر بن رہا ہے اور ایمان پر نزع کی کیفیت طاری ہے۔ اللہ کی آیات سن کر دل کا کسمسانا اور طبیعت میں نشاط کے بجائے کڑھن پیدا ہونا' دراصل نفاق کی علامت ہے۔ سمجھ لینا چاہئے کہ ایمان دل کی گہرائی میں داخل ہی نہیں ہوا ہے اور اگر ایمان کا دعویٰ ہے تو محض دعویٰ ہے...... قلب کی دنیا ایمان کے نور سے محروم ہے۔ قلب کی زمین میں ابھی ایمان نے جڑ نہیں پکڑی ہے' اگر قلب کی سرزمین میں ایمان نے جڑ پکڑی ہوتی تو احکام دین کی اطاعت کے لئے تلاوت آیات سن کر تڑپ اور بے چینی پیدا ہوتی اور اطاعت ربّ کا موقع پا کر ایمان بڑھتا محسوس ہوتا۔

قرآن کی یہ آیت مومن کے لئے علامت ایمان قرار پاتی ہے اور اس کو اطمینان بخشتی ہے لیکن یہی آیت ایمان کے جھوٹے مدعی کو بے نقاب کرتی ہے اور نشاندہی کرتی ہے۔ دوسرے اس کو تاڑ سکیں یا نہ تاڑ سکیں اور دوسروں کے سامنے وہ بے نقاب ہو سکے یا نہ ہو سکے' خود اپنے سامنے وہ ضرور بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اگر وہ سنجیدہ ہے تو اپنے بارے میں وہ ضرور فیصلہ کرسکتا ہے کہ وہ ایمان کے مقام پر کھڑا ہے یا نفاق کے مقام پر۔ بندے اس کے بارے میں دھوکا کھا سکتے ہیں لیکن جس رب پر ایمان لانا ہے اور جس کی رضا ہی ایمان کا اصل مرکز ہے' اس پر خوب عیاں ہے کہ کس بندے کا مقام کیا ہے؟

اس علامت کی تلاوت کرتے ہوئے اس آیت سے نہایت مؤثر انداز میں یہ ہدایت بھی ملتی ہے کہ قرآن

یونہی بے فکری' لاپروائی اور بے توجہی کے ساتھ نہ پڑھنا چاہیے بلکہ پوری توجہ' دلبستگی اور شعور کے ساتھ سمجھ سمجھ کر تلاوت کرنی چاہیے تا کہ جس طرح کی آیات تلاوت کی جائیں انہی کے مطابق آدمی پر کیفیات طاری ہوں اور قرآن کے آئینے میں وہ اپنے چہرے کے خدوخال دیکھ کر اپنے کو سنوارنے کی فکر کر سکے۔ وہ ایک بے شعور مشین کی طرح قرآن کے الفاظ دہرانے کا عادی نہ ہو بلکہ ایک حساس دل کے ساتھ قرآن کی آیات سے اثر لیتے ہوئے اور آیات پر غور کرتے ہوئے تلاوت کرے۔ جب اللہ کی نوازشوں' رحمتوں اور نعمتوں کا ذکر آئے تو اس کی روح پر وجد کی کیفیت طاری ہو اور جب اللہ کے قہر وغضب اور جہنم کی ہلاکت خیزیوں کا تذکرہ ہو تو رب کے خوف سے لرزنے لگے۔ یہ کیفیت اسی وقت طاری ہو سکتی ہے جب بندۂ اللہ کی آیات کو غور وفکر کے ساتھ سمجھ کر پڑھنے اور ان سے اثر لینے کی کوشش کرے گا اور جو شخص بے سوچے سمجھے یونہی رَواں دواں تلاوت کرے گا وہ کیا سمجھ سکے گا کہ ایمان کی کن علامات کا ذکر ہو رہا ہے اور وہ علامات اس کی ذات میں پائی جا رہی ہیں یا نہیں۔

## ایمان کی تیسری علامت

ایمان کی تیسری علامت ہے: وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ (الانفال:۸:۲)

''اور وہ اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں''۔

یہ بھروسا اور اعتماد دراصل اللہ کی صفات پر پختہ یقین اور صفات کے استحضار سے پیدا ہوتا ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کی مشیت اور حکم سے ہوتا ہے' بندے کے معاملات کو سب سے زیادہ جاننے والا اللہ ہے۔ اس نے اپنے بندوں کو جو احکام دیئے ہیں اور دین کے جو تقاضے بتائے ہیں اس کی تعمیل وتکمیل میں سرتاسر بندے کی بھلائی اور فوز وفلاح ہے اور اسی رویے کا نام توکل ہے۔ حالات انتہائی سنگین ہوں یا ساز گار' دین کے مطالبات آسان ہوں یا مشکل' دنیوی مفادات تباہ ہوتے نظر آئیں یا ان کا پاس ولحاظ ہو' ہر حال میں اللہ کے احکام کی کامل پیروی میں ہی بندے کی بھلائی ہے۔ یہ سمجھنا اور یقین رکھنا کہ میرے نفع ونقصان کو' میری ناکامی اور کامرانی کو' میری بھلائی اور بہتری کو' میرا رب مجھ سے زیادہ جانتا ہے اور اس نے جو کچھ کرنے کا مجھے حکم دیا ہے اسی میں کامیابی ہے۔ اس نے میری سکت سے زیادہ مجھ سے کوئی مطالبہ نہیں کیا ہے۔ بظاہر کسی حکم میں چاہے کتنا ہی نقصان نظر آتا ہو' مجھے اپنے مفادات تباہ ہوتے نظر آتے ہوں لیکن حقیقت میں میری بہتری اور بھلائی اسی میں ہے جس کا میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے۔ اس کا کوئی حکم اور کوئی فرمان حکمت ومصلحت سے خالی نہیں ہوتا ہے۔ خیر وبرکت اور حکمت و بھلائی اسی میں ہے جو رب نے فیصلہ فرمایا ہے۔ مومن اسی بھروسے اور اسی اعتماد کے ساتھ ہر قسم کے نرم وگرم حالات میں اللہ کے احکام کی کامل اطاعت کرتا ہے وہ دنیوی مفادات کے ترازو میں اللہ کے احکام کو تولنے کی بیماری میں مبتلا نہیں ہوتا۔

جو لوگ دین کے احکام اور شریعت کے تقاضوں کو دنیوی نفع اور نقصان ہی کے ترازو میں تولتے ہیں اور اس سے بلند ہو کر اللہ کے بھروسے پر سوچنے کے عادی نہیں ہوتے وہ ایمان کی اس تیسری علامت توکل علی اللہ سے محروم ہوتے ہیں۔ وہ دین و شریعت کے تقاضوں اور اللہ کی ہدایتوں کو اپنے وضع کردہ میزان نفع و نقصان میں تولنے کے عادی ہو جاتے ہیں' انہیں احکام دین اور تقاضائے شریعت' مصلحت وقت کے خلاف اور ناقابل عمل نظر آتے ہیں۔ ان کی دینی سوچ خامی ہوتی ہے اور نقصان کو برداشت کرنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔

مومن تو حقیقت میں وہی ہیں جو اللہ کو اپنا رب تسلیم کر لینے کے بعد خود کو اللہ کے حوالے کر دیتے ہیں' اسی پر اعتماد کرتے ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ رب کے احکام پر عمل کرنے ہی میں سرتا سر ہماری بھلائی ہے۔

## ایمان کی چوتھی علامت

ایمان کی چوتھی علامت نماز کا قیام اور ادائے زکوٰۃ ہے۔ یہ مومن کے وہ دو بنیادی عمل ہیں جو تمام اوصاف حمیدہ کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقامت صلوٰۃ دراصل اللہ کے حقوق پہچاننے اور ادا کرنے کا نام ہے اور ادائے زکوٰۃ بندوں کے حقوق جاننے اور ادا کرنے کا عنوان ہے۔ عمل کی زندگی میں ان کے بغیر ایمان کا دعویٰ معتبر نہیں۔ یہ وہ دو نیک عمل ہیں جن کا پابند مسلم سوسائٹی میں مسلمان قرار دیا جائے گا اور اس کے اسلام کا اعتبار کیا جائے گا۔

اسلام دراصل اللہ اور بندوں کے حقوق کے صحیح شعور ہی کا نام ہے' نماز اللہ کے حقوق کا شعور بخشنے والی اور زکوٰۃ بندوں کے حقوق کا شعور بخشنے والی عبادت ہے۔ ان دو اعمال صالحہ کا اہتمام اور التزام کرنے والوں ہی سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ایمان کے تمام تقاضوں کو پورا کریں گے اور روئے زمین پر حقیقی مومنوں کی طرح زندگی گزار سکیں گے۔

جو لوگ ایمان کے بلند بانگ دعوے کرنے کے باوجود ان دو اعمال کا التزام و اہتمام بھی نہ کر سکیں ان سے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ دین کے دوسرے تقاضوں کو پورا کر سکیں گے جو یہ کم سے کم مطالبہ بھی پورا نہ کر سکیں' ان سے امید نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان کرنے اور خود کو اللہ کے حوالے کر دینے کے دعوے میں سچے ہو سکتے ہیں۔

ایمان کی جن چار علامتوں کا ہم نے یہاں ذکر کیا ہے' ان کی حیثیت صرف یہ ہے کہ قرآن پاک نے ایک موقع پر ان چار علامتوں کا ذکر کر کے یہ فرمایا ہے کہ جن میں یہ چار علامتیں پائی جائیں حقیقت میں وہی سچے مومن ہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ایمان کی بس یہی چار علامتیں ہیں' ہاں اتنا ضرور ہے کہ اگر کسی کی زندگی میں یہ چار علامتیں پائی جائیں تو یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس میں دوسری علامتیں بھی ہوں گی' یا ان کے پیدا کرنے میں وہ ضرور

سرگرم ہوگا۔ اس لیے قرآن نے ان چار علامتوں سے آراستہ زندگی رکھنے والوں کے بارے میں دوٹوک انداز میں فرمایا:

أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ط (الانفال ۸:۴)

''یہی لوگ حقیقت میں مومن ہیں''۔

یعنی محض دعویٰ کرنے اور بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ حقیقی مومن وہ ہوتا ہے جس میں یہ چار علامتیں پائی جائیں۔

قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے جب ہم یہ آیات پڑھیں گے تو اس آئینے میں اپنے خدوخال دیکھنے کی فکر کریں۔ اپنی زندگیوں میں ان چار علامتوں کو دیکھنے اور پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ نہ یہ کہ چار علامتوں کی فہرست لے کر ہم دوسروں کی زندگیاں دیکھنے میں اپنے اوقات لگائیں اور اپنے شب وروز اس مہم میں صرف کریں کہ کن لوگوں میں یہ چار علامات موجود ہیں جن کو ہم حقیقی مومن کہہ سکیں اور کن لوگوں کو یہ کہہ سکیں کہ یہ جھوٹے مدعی ایمان ہیں' یہ طرز فکروعمل ہرگز مطلوب و مستحسن نہیں ہے بلکہ سراسر گھاٹے اور نقصان کا عمل ہے۔ صحیح طرز فکروعمل صرف یہ ہے کہ اس آئینے میں ہم اپنے ایمان کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کریں اور اپنے ایمان کے خدوخال درست کرنے کی فکر کریں اور یہ سوچیں کہ ہم ایمان کی کن علامتوں کے ساتھ اللہ کے حضور حاضر ہوں گے۔ ایسے لوگ حقیقت میں کامیاب وکامران ہیں۔



# خیر کا اصل سرچشمہ

وہ شخص کس قدر بدذوق، غبی، محروم، مردہ دل اور ویران و سرگرداں ہے جو اپنے رب کے وجود پر یقین نہیں رکھتا اور اس حقیقت پر غور کرنے سے بھی بے پرواہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص رب کے وجود پر یقین کی لذت سے محروم ہے وہ دنیا کی ہر لذت سے محروم ہے۔ دنیا میں جو بھلائیاں موجود ہیں، جن بھلائیوں سے انسان کا ذہن آشنا ہے، جن بھلائیوں کا ہم تصور کر سکتے ہیں اور جن کی برکتوں سے ہم فیضیاب ہیں، ان سب کا سرچشمہ، تمام فضائل و مکارم کی بنیاد، شرافت و انسانیت کی معراج، حسن ذوق، حسن نظر، حسن کردار اور معرفت و بصیرت کا اصل منبع اللہ کے وجود کا یقین ہے۔ اس یقین کی لذت سے جو محروم ہے وہ اس کائنات کا بدترین قلاش اور محروم انسان ہے۔ شرافت و انسانیت کا معیار اللہ کے وجود پر یقین کی نعمت اور حلاوت ایمان ہے۔ یہ ایمان و یقین کہ میرا اور اس کائنات کا ایک پیدا کرنے والا ہے جو نہایت ہی مہربان، بڑا ہی رحیم اور انتہائی محبت کرنے والا ہے۔ اس کا فضل و کرم نہ ہو تو میں ایک سانس نہیں لے سکتا، میری زندگی اور اس کی بے پایاں برکتیں، میری بے پناہ صلاحیتیں اور توانائیاں، انسانی زندگی کی تمام تر رونق اور کائنات کی دلنواز بہاریں اسی کے وجود سے ہیں، یہ ذات میری محبتوں کا مرکز ہے۔ میری انتہائی آرزو اور دل کی گہرائی میں پلنے والی تمنا یہی ہے کہ یہ ذات اقدس کبھی مجھ سے خفا نہ ہو، کل جب میں اس کے حضور پہنچوں اور یہ مجھ سے اپنی بے حد و حساب نعمتوں کا حساب لے تو میں ناکام و نامراد نہ ہوں اور یہ رحمت بیکراں مجھ سے ناراض نہ ہو، یہ لذت یقین وہ دولت ہے جس سے پوری زندگی خیر و برکت کا سرچشمہ اور نور ہی نور بن جاتی ہے۔

آپ سنجیدگی اور بے لاگ انداز میں اپنا جائزہ لیجئے کیا آپ کو یہ لذت یقین اور حلاوت ایمان حاصل ہے۔ اگر حاصل ہے تو آپ قابل مبارکباد ہیں۔ آپ کو وہ سب کچھ حاصل ہے جس کی ایک مومن تمنا کر سکتا ہے۔ آپ انسانی سعادت کے اس مقام بلند پر فائز ہیں جس کی آرزو اور کوشش میں مومن اپنے شب و روز گزارتا ہے۔ یقیناً آپ کی زندگی پر فیوض و برکات کی بارشیں ہو رہی ہوں گی اور آپ اپنے رب کی نوازشوں میں سانس لے رہے ہوں گے۔ بے شک آپ خود تو اس زندگی سے پوری طرح شاد کام ہو رہے ہوں گے، سوسائٹی بھی آپ کی زندگی پر

رشک کررہی ہوگی اور آپ کی مبارک زندگی سے پوری طرح فیضیاب ہورہی ہوگی۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو روایتی طور پر اللہ کو مانتے ہیں' یا اللہ پر یقین رکھنے والے گروہ میں شامل ہوتے' گاہ گاہ نماز بھی پڑھتے ہیں اللہ عادتاً تسلسل سے پڑھنے والے بھی ہوتے ہیں اور بعض فرض سمجھ کر نماز کا ناغہ نہیں کرتے لیکن اقامت صلوٰۃ سے محروم رہتے ہیں' نماز پڑھتے ہیں مگر نماز کا حق ادا نہیں کرتے۔ یہ لوگ اللہ کے وجود کو ماننے کا نہ صرف دعویٰ کرتے ہیں بلکہ گفتگو کیجئے تو بعض اوقات دلائل بھی دیتے ہیں مگر ان کی زندگی کی بے رونقی اعلان کرتی کہ وہ اللہ پر یقین کی لذت سے محروم ہیں۔ روایتی طور پر اللہ کو ماننے والے گروہ میں شامل ہونا اور خود کو شامل سمجھنا اور بات ہے اور واقعی رب پر یقین کی لذت سے شادکام ہونا اور بات ہے اگر آپ اس بات سے متفق ہیں تو پھر سوچئے اور کوشش کیجئے کہ آپ واقعی اللہ کے وجود پر یقین کی لذت اور حلاوت پالیں۔

بلاشبہ کبھی کبھی علم بھی اس مقصود کے حصول میں مددگار ثابت ہوتا ہے لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے اور علوم وفنون میں مہارت رکھنے والے لازماً اس دولت سے بھی مالا مال ہوں گے۔ یقین کی یہ لذت اور ایمان کی یہ حلاوت بعض اوقات ان لوگوں کو بھی حاصل ہوتی ہے جو روایتی تعلیم سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں' دراصل اس لذت کا اصل سرچشمہ انسان کا اندرون اور اس کے قلبی جذبات وعزائم ہیں' خودشناسی اور خداشناسی کا جوہر اس مردمومن کے حصے میں آتا ہے جو اپنے قلب وروح کو اس کے لئے تیار کرتا ہے۔ ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بڑی بڑی ڈگریاں رکھنے والے اور علم وفضل کی دولت سے آراستہ لوگ اس دولت سے محروم ہیں اور سماج کا ایک ان پڑھ اور ان گڑھ دیہاتی انسان اس دولت سے مالا مال ہے اور وہ اپنی بے علمی کے باوجود اللہ کے وجود پر ایسی بصیرت افروز اور دلنشیں دلیل دیتا ہے کہ روح جھوم اٹھتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس چیز کو ہم شب وروز دیکھ رہے تھے' شب وروز سن رہے تھے' شب وروز محسوس کررہے تھے' پھر بھی ہمیں کچھ نہ نظر آیا' ہم نے کچھ نہیں سنا' کچھ نہیں محسوس کیا' حقیقت میں ہم دیکھ رہے تھے مگر نہیں دیکھ رہے تھے' سن رہے تھے مگر نہیں سن رہے تھے' محسوس کر رہے تھے مگر کچھ نہیں محسوس کررہے تھے۔ اس چیز کو ایک صاحب بصیرت اور زندہ دل انسان نے دیکھا تو سب کچھ پا لیا۔ دراصل کائنات کے آثار اور قدرت کے شاہکار سے ایک لطیف وخبیر ہستی تک پہنچنے کے لئے قلب کی بینائی اور بیداری درکار ہے اور لطیف وخبیر ہستی تک وہی شخص پہنچ سکتا ہے جس کا قلب زندہ اور شعور بیدار ہو' خودشناس اور خدا شناس ہو۔ حقیقت میں اس ہستی تک نہ پہنچنے میں آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل اندھے ہوجاتے ہیں۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ○ (الحج:۲۲:۴۶)

کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے یا ان کے کان سننے والے ہوتے؟

حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

دل میں بصیرت موجود ہو تو ایک بدو بھی کائنات میں پھیلی ان نشانیوں کو دیکھتا ہے تو ایسی بات نکال کر لاتا ہے کہ روح فرطِ مسرت سے وجد کرنے لگتی ہے دراصل آدمی یقین کی لذت سے آشنا ہو تو سامنے کی ہر چیز اسے رب کی معرفت بخشتی ہے۔ روزمرہ کی چیزوں سے وہ معرفتِ رب کی ایسی دلیلیں نکال کر لاتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے اور ایمان میں گرمی اور روح میں بالیدگی محسوس ہونے لگتی ہے۔ تفسیر کی ایک معروف اور معتبر کتاب میں ایک آیت کی تفسیر کے تحت مفسر نے ایک بدو کا ایک شہ پارہ نقل کیا ہے جتنی بار پڑھیں گے ایمان میں تازگی اور روح میں بالیدگی محسوس ہو گی۔

بدو کہتا ہے:

ان البعر لیدل علی البعیر وان اثر الاقدام لیدل علی السیر فالسما ذات ابراج وارض ذات فجاج و بحار ذات امواج الاتدل علی اللطیف الخبیر

واہ کیا خوب! مینگنی اونٹ کا پتہ دیتی ہے اور نشاناتِ قدم (یقینی طور پر) چلنے والے کا پتہ دیتے ہیں تو پھر یہ برجوں والے آسمان یہ شاہراہوں والی زمین یہ موجوں والے سمندر کیا کسی مہرباں اور باخبر ہستی کا پتہ نہیں دے رہے ہیں؟

ان چیزوں کو روزانہ کی زندگی میں کون نہیں دیکھتا۔ مگر دیکھتے ہیں اور لاپروائی سے یونہی گزر جاتے ہیں لیکن خداشناس بدو' جس نے شہر کی تہذیب دیکھی ہے نہ کسی تعلیم گاہ سے فیض پایا ہے وہ جب ایک شکر گزار اور حق شناس نگاہ اور بصیرت سے معمور دل کے ساتھ ان عام چیزوں کو دیکھتا ہے تو ان معمول کی چیزوں سے اللہ کے وجود کی ایسی دلیل ڈھونڈ نکالتا ہے کہ دل یقین کی ٹھنڈک اور روح ایمان کی لذت محسوس کرنے لگتی ہے۔

شب و روز کی مشغول زندگی میں کیا کچھ ہم نہیں دیکھتے' کیسے کیسے عبرتناک مناظر اور کیسے کیسے سبق آموز واقعات سامنے آتے ہیں' کیسے کیسے معاملات سے سابقہ پیش آتا ہے' کیا کچھ دیکھتے ہیں کیا کچھ سنتے ہیں مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ہم نے کچھ نہیں دیکھا۔

روزمرہ کی ان چیزوں میں انہی لوگوں کو کچھ نظر آتا ہے' جن کے مشاہدہ کی قوت تیز ہو' نگاہ عبرت آموز ہو' احساس و شعور بیدار ہو' روح میں زندگی ہو اور دل زندہ اور بابصیرت ہو۔

جب آپ خود کو اس یقین کی لذت سے محروم پائیں اور اپنی محرومی کا احساس آپ کو تنگ کرے تو آپ اپنے رب سے دل زندہ کی تمنا کیجئے...... یہ اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے۔

حضور کے مشہور صحابی حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کیا ہی فکر انگیز اور بصیرت افروز بات فرمائی ہے۔

اطلب قلبك في ثلثة مواطن عند سماع القران وفي مجالس الذكر و في اوقات الخلوة فان لم يجده في هذه المواطن فسل الله ان يمن عليك بقلب فانه لا قلب لك۔

''تین مواقع پر اپنے قلب کو ٹٹولو' قرآن پاک سنتے وقت' ذکر کی مجالس کے موقع پر اور تنہائی کے اوقات میں۔ اگر تم ان تین مواقع پر اپنے پہلو میں دل نہ پاؤ تو اللہ سے درخواست کرو کہ وہ تمہیں ایک دل عطا فرمائے اس لئے کہ تمہارے پاس دل نہیں ہے''۔

اپنے پہلو میں دل نہ پانے کا مفہوم یہ ہے کہ ان کاموں میں دل نہ لگے' قرآن کی تلاوت ہو رہی ہو اور کوئی اثر قبول نہ کرے' اللہ کی نعمتوں اور نوازشوں کا تذکرہ ہو اور دل نہ پگھلے۔ خلوت میں اپنے رب کا خیال آئے اور قلب پر کوئی لرزہ طاری نہ ہو۔ خدانخواستہ یہ کیفیت ہے تو یقین کر لیجئے کہ آپ کا پہلو دل سے محروم ہے۔ آپ کے سینے میں وہ دل نہیں ہے جو زندہ اور بیدار ہو' جس میں احساس و شعور کی قوت ہو' جو حالات و کیفیات سے عبرت حاصل کر سکے۔

غور کیجئے قرآن پاک کیا ہے اللہ کی آواز ہے' اس کی گفتگو ہے' اس کے احکام اور اس کی پکار ہے۔ قرآن اللہ کی آواز ہے جو آپ کا سب سے بڑا محبوب اور محسن ہے جس کے وجود کا آپ کو یقین ہے' جس کی بے پایاں نوازشوں اور نعمتوں میں آپ جی رہے ہیں اور جس پر ایمان کی لذت و حلاوت سے آپ مالا مال ہیں یا آپ کو مالا مال ہونا چاہئے اس کی آواز آپ سنیں اور جذبات میں کوئی ہلچل پیدا نہ ہو' اس کی گفتگو کی لذت آپ کی سماعت کو حاصل ہو اور آپ اس کی محبت سے بے تاب نہ ہوں' اس کے کرم اور عنایات کا تذکرہ ہو اور آپ پر کوئی کیفیت طاری نہ ہو خلوت میں آپ کو اس کا خیال آئے اور دل کی دھڑکن تیز نہ ہو' آنکھوں سے آنسو رواں نہ ہوں تو کیسے باور کیا جائے کہ آپ کے پہلو میں دل ہے۔ بات یہی صحیح ہے کہ آپ کے پاس دل نہیں ہے۔ آپ دل کی نعمت سے محروم ہیں آپ کے حق میں صحابی رسول کا یہ مشورہ بالکل بجا اور برحق ہے کہ آپ اپنے رب سے درخواست کیجئے کہ وہ آپ کو دل عطا فرمائے' آپ کے پاس دل نہیں ہے۔ یقین کیجئے جس کے پاس دل نہیں ہے وہ ہدایت کی نعمت سے محروم ہے' وہ اللہ پر یقین کی لذت سے محروم ہے' وہ ایمان کی حلاوت اور چاشنی سے محروم ہے۔ اللہ کی کتاب بے شک ہدایت اور دعوت ایمان کی کتاب ہے۔ تذکیر و یاددہانی کی کتاب ہے لیکن صرف اس خوش نصیب کے لئے جس کے پاس دل ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ (ق۵۰:۳۷)

بلاشبہ اس قرآن میں تذکیر و یاددہانی ہے اس شخص کے لئے جس کے پاس قلب ہے۔

قلب سے محروم انسان ہر خیر سے محروم ہے اس کے لئے تذکیر و موعظت بے سود ہے۔ قرآن کی تذکیر و ہدایت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے اور جو دل سے محروم ہے وہ گزرگاہ جلیل اکبر سے محروم ہے۔ وہ اپنے رب کے تعلق سے محروم ہے اور جو شخص اپنے رب کو نہیں پہچانتا' اس کے وجود پر یقین نہیں رکھتا اس کے ساتھ بندگی کا تعلق نہیں رکھتا وہ یقیناً ہر خیر اور بھلائی سے محروم ہے۔



# احسان شناسی اور خیر خواہی

ایک بڑا ہی حیرت انگیز واقعہ ہے جو تاریخی داستان کے طور پر نقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ یہ واقعہ سچا ہے یا محض من گھڑت مگر یہ حقیقت ہے کہ اس میں نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے بڑا ہی سبق ہے۔

گزرے وقتوں کی بات ہے کہ ایک بادشاہ اپنے غلام پر بڑا مہربان تھا۔ ہر وقت وہ اس کو انعام واکرام سے نوازتا رہتا تھا اور غلام نہایت ہی عیش وعزت سے زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ شومئی قسمت ایک دن بادشاہ کو غلام کی کوئی حرکت ناگوار گزری اور وہ اس پر برس پڑا اور اسے بہت کچھ سخت سست کہہ ڈالا۔ غلام نے بھلا اس طرح کی ڈانٹ پھٹکار کب سنی تھی' وہ تو ہمیشہ سے عنایتوں اور نوازشوں کا عادی تھا' وہ بہت رنجیدہ ہوا اور رنجیدہ رہنے لگا۔ آخر کار اس نے ایک دن وہاں سے نکل جانے کا ارادہ کیا اور بغیر کچھ کہے سنے ایک دن وہاں سے فرار ہو گیا۔ بادشاہ نے غلام کی تلاش میں ہر طرف اپنے لوگوں کو روانہ کیا' لوگوں نے ہر طرف تلاش کیا' لیکن غلام نہ ملا' بادشاہ غلام کے ساتھ ہمیشہ ہی نیکی کرتا تھا' بادشاہ کو اس بات کی بے پناہ تکلیف ہوئی کہ اس نے اپنے اس غلام کے ساتھ ہمیشہ نیک سلوک کیا' انعام واکرام سے نوازا' شفقت ومحبت سے پیش آیا اور ایک دن غصے میں کچھ کہہ دیا تو وہ ایسا احسان فراموش نکلا کہ زندگی بھر کے احسنات اور انعامات کو اس نے یکسر بھلا دیا اور اس نے دل میں یہ طے کیا کہ آخر کبھی نہ کبھی تو وہ ملے گا' جب بھی وہ مل گیا اس کی گردن اڑائے بغیر نہ مانوں گا اور وہ اس دن کا انتظار کرنے لگا۔

ادھر غلام بادشاہ کو چھوڑ کر چلا تو آیا مگر وہ بادشاہ کا حسن سلوک اور اس کے احسانات بھلا نہ سکا' جب بھی اسے بادشاہ کے حسن سلوک کی یاد آتی تو وہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے اور اپنا قصور معاف کرانے کے لئے بے چین ہو جاتا۔ مگر خدمت میں حاضری کے لئے اس کی ہمت نہ ہوتی۔ اس شش وپنج میں ایک مدت گزر گئی۔ آخر ایک دن غلام نے ہمت کر ہی لی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ضرور اپنے محسن کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے قصور کی معافی چاہے گا۔ یہ سوچ کر وہ روانہ ہوا اور بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ غلام کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا اور اس سے پہلے کہ وہ کہے' بادشاہ غصے میں گرجا: بلاؤ جلاد کو اور جلاد کو حکم دیا کہ اڑا دو اس کی گردن۔ جلاد حکم پاتے ہی ننگی تلوار لئے آگے بڑھا۔ غلام نے نہایت عجز وانکساری سے بادشاہ سے عرض کیا: حضور یہ گردن حاضر ہے اس پر

آپ کے احسانات کا بہت بوجھ ہے اسے اڑا دیجئے مگر مجھے چند منٹ کی مہلت دیجئے کہ میں اپنے رب سے دعا کر لوں۔ بادشاہ نے غصے سے کہا: مانگ لے جو دعا مانگنا چاہتا ہے مگر تیری گردن اڑا دینے کا میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ دعا کی اجازت ملتے ہی جلاد پیچھے کو ہٹا اور غلام نے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے۔ وہ یوں گویا ہوا: ''اے میرے رب جس آقا نے آج میری گردن اڑانے کا حکم دیا ہے زندگی بھر اس نے مجھ پر نوازشیں کی ہیں' اس نے مجھے عزت واقبال سے نوازا ہے۔ پروردگار! اس آقا کے مجھ پر بے پناہ احسانات ہیں۔ پروردگار! یہ آج مجھے قتل کرا رہے ہیں' میں تجھے گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے اپنا خون ان کو معاف کر دیا اور تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ کل حشر کے میدان میں ان کی پکڑ نہ کرنا' میں اپنے اس محسن کو کل حشر کے میدان میں شرمندہ نہ دیکھ سکوں گا' پروردگار! میں اپنا خون ان کو معاف کرتا ہوں' تو بھی کل میدان حشر میں ان کو معاف کر دینا۔ اس محسن کے یہاں گزرے ہوئے صبح و شام میری زندگی کے یادگار اور زندگی کے حاصل صبح وشام ہیں' پروردگار! تو اس سے بھی زیادہ عزت واکرام سے ان کو نوازنا''۔

غلام دل کی گہرائیوں سے یہ دعا مانگ رہا تھا اور بادشاہ کے دل کی کیفیت بدل رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کس قسم کا غلام ہے' وہ حیران تھا کہ میں اس کو قتل کرا رہا ہوں اور اس کو میرے انجام کی فکر ہے۔ یہ میری آخرت اور عاقبت کا کس قدر خیر خواہ ہے' یہ وہاں کی پکڑ سے مجھے بچانے کے لئے بے چین ہے' اس کا سارا غصہ کافور ہو گیا اور آگے بڑھ کر بادشاہ نے بے قراری کے ساتھ اس کو گلے سے لگا لیا اور پہلے سے بھی زیادہ عزت واکرام سے نوازا اور غلام کے صبح وشام پھر عیش وآرام اور خوشی ومسرت میں گزرنے لگے۔

بادشاہ کے اس سلوک پر مصاحبین نے حیرت کا اظہار کیا اور ایک دن بادشاہ سے پوچھا کہ حضور آپ یا تو اس غلام کو قتل کرائے دے رہے تھے یا پھر پہلے سے بھی زیادہ اس پر انعام واکرام کی بارش ہونے لگی! بادشاہ نے مصاحبین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: میں نے اس غلام میں دو ایسی خوبیاں دیکھیں کہ میں الٹا اس کا احسان مند ہو گیا۔ ایک یہ کہ یہ سچا احسان شناس ہے وقتی طور پر اس سے غلطی ہوئی لیکن یہ میرے احسانات کو بھولا نہیں اس نے میری وفاداری کا حق ادا کر دیا اور دوسری خوبی یہ کہ اس نے میری وہ خیر خواہی کی کہ اس خیر خواہی تک میری سوچ نے بھی کبھی میرا ساتھ نہ دیا۔ اس نے اپنے قتل کا حکم سننے اور جلاد کے ہاتھ میں ننگی تلوار دیکھنے کے بعد بھی ذرا میری طرف سے دل میلا نہ کیا اور اس نے آخرت میں اللہ کی پکڑ سے مجھے بچانے کے لئے اللہ سے درخواست کی' اپنی جان دے کر بھی اس نے مجھے شرمندہ اور معتوب دیکھنا گوارہ نہ کیا' اس سے بڑی کوئی خیر خواہی نہیں ہو سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی یہ دو خوبیاں ایک احسان شناسی اور دوسری سچی خیر خواہی' ایسی بنیادی خوبیاں ہیں کہ جو نہ صرف بندے کو انسان کی نظر میں محبوب اور قابل قدر بناتی ہیں بلکہ اللہ کی نظر میں بھی وہ بندہ قابل قدر اور

محبوب ہوتا ہے۔

ایمان کی راہ احسان شناسی اور شکر گزاری ہی تو ہے‘ اللہ کی نعمتوں کے احساس سے سرشار ہو کر جب بندہ دل کی گہرائیوں سے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہتا ہے۔ الحمد للہ رب العالمین تو یہی احسان مندی اور شکر گزاری کا جذبہ اس پر ایمان کی راہ کھولتا ہے‘ بندہ اس جذبے سے بے تاب ہو کر اپنے رب سے درخواست کرتا ہے کہ پروردگار مجھ پر وہ راستہ واضح کر دے کہ میں تیرا شکر گزار اور مطیع فرمان بن کر زندگی گزاروں اور تیرے ناشکروں اور نافرمانوں میں میرا شمار نہ ہو اور اللہ اپنے ہی بندے پر ایمان و ہدایت کی راہ کھولتا ہے۔

اور رسول پاک ﷺ نے فرمایا ہے کہ ایمان کی لذت اسی بندے کو ملتی ہے جو دوسروں کا سچا خیر خواہ ہوتا ہے اور دوسروں کے لئے وہی چاہتا ہے جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے۔ ہر بندے کی آرزو و چاہت یہی ہے کہ کل حشر کے میدان میں اسے شرمندگی نہ ہو اور اس کا خالق بھی اس سے راضی ہو۔ بڑی سے بڑی قربانی دے کر بھی وہ اپنے بھائی کے لئے یہی چاہے اور آرزو کرے تو واقعی وہ سچا خیر خواہ ہے‘ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے اس شخص کو ایمان کا لذت شناس تسلیم ہی نہیں کیا ہے جو اپنے بھائی کا سچا خیر خواہ نہ ہو اور اس کے لئے بھی وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

لا یومن احدکم حتی یحب لا خیہ ما یحب لنفسہ (بخاری کتاب الایمان باب ۷ ان یحب لا فیم ص ۶۸۸)

”تم میں سے کوئی شخص ایمان کو پا ہی نہیں سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے“۔

احسان شناس بندہ وہی ہے جو اللہ کے احسانات کو ہمہ دم یاد رکھے اور ہر لمحے اس کا شکر ادا کرتے ہوئے شکر گزار بندوں کی طرح زندگی گزارے۔ کبھی غفلت اور نافرمانی کا عمل ہو بھی جائے تو جلد پلٹ آئے اور اپنے رب سے قصور کی معافی چاہے۔ بندہ اللہ کی نعمتوں اور نوازشوں کا بھی شمار نہیں کر سکتا‘ وہ اس کی کسی ایک نعمت کی برکتوں کا بھی شمار نہیں کر سکتا اور شکر گزاری ہی وہ روش ہے کہ اللہ ایسے بندے کو اور زیادہ نوازتا ہے۔

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (ابراہیم ۱۴:۷)

”البتہ اگر تم شکر گزار بنو گے میں تمہیں لازماً مزید دوں گا“۔

اللہ تعالیٰ دوسروں کی خیر خواہی چاہنے والے بندے کو ایسا مقبول‘ عزیز اور اس قدر قلبی اطمینان و سکون عطا کرتا ہے کہ یہ نعمتیں وہ کسی قیمت پر حاصل نہیں کر سکتا۔

شمار میں تو یہ خوبیاں‘ صرف دو ہیں: احسان شناسی اور خیر خواہی لیکن ان کے صلے اور برکتیں اس قدر ہیں کہ ان کا شمار انسان کے بس سے باہر ہے۔

# آزمائش اسی میں ہے جو تمہیں دیا گیا ہے

نواب صاحب نہایت ہی کروفر کے ساتھ اپنے تخت پر زرق برق لباس پہنے نیم دراز حالت میں جلوہ افروز ہیں۔ وزیر' مصاحب اور درباری لوگ اپنی اپنی نشستوں پر نہایت احترام اور وقار کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ نوکر' غلام اور باندیاں بھی اپنے اپنے کاموں میں یکسوئی کے ساتھ مصروف ہیں۔ نواب صاحب یکا یک درباریوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور نہایت ہی رعب اور دبدبے کے ساتھ درباریوں سے کچھ کہنا شروع کرتے ہیں اور چاروں طرف سے تائید اور پذیرائی میں سبحان اللہ' ماشاء اللہ کی صدائیں بلند ہوتی ہیں' غلام بھی دربار میں ادھر ادھر آتے جاتے نظر آتے ہیں کہ یکا یک پردہ گرتا ہے۔

پردہ پھر اٹھتا ہے' یہ پارلیمنٹ کا ایک باوقار اجلاس ہے۔ جناب اسپیکر اپنے اونچے پائے کی کرسی پر ایک خاص تمکنت کے انداز سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ مختلف محکموں کے وزیر اور مختلف علاقوں کے آئے ہوئے پارلیمنٹ کے ممبران بھی اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ملک کے دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے یہ ممبران پارلیمنٹ اپنے اپنے علاقوں کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ ان کی تہذیبیں مختلف ہیں' لباس مختلف ہیں' لہجے مختلف ہیں' زبانیں مختلف ہیں' ذوق مختلف ہیں اور سوچنے کے انداز بھی مختلف ہیں' اپنی اپنی سمجھ' سوچ اور بصیرت کے مطابق ہر ایک بحث میں حصہ لے رہا ہے۔ اپنی اپنی باری پر ہر ایک اظہار خیال کر رہا ہے' اپنے مسائل بھی پیش کر رہا ہے' وزرائے محکمہ جات پر تبصرے بھی ہو رہے ہیں' سوالات بھی اٹھائے جا رہے ہیں' شکایتیں بھی ہو رہی ہیں اور اسپیکر کے پکارے جانے پر وزراء اپنے اپنے محکمہ سے متعلق جوابات بھی دے رہے ہیں اور مطمئن کرنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ یہ ملک کے وہ لوگ ہیں جو سوسائٹی کا مکھن سمجھے جاتے ہیں' پارلیمنٹ ہاؤس میں نوکر چاکر اور چپراسی لوگ بھی اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر لگے ہوئے ہیں' یہ وہ لوگ ہیں جن کا سوسائٹی میں کوئی مقام نہیں سمجھا جاتا' ان کی حیثیت اور سماجی مقام بس یہ ہے کہ یہ بڑے لوگوں کی خدمت گزاری کریں اور انہیں یہ یکسوئی مہیا کریں کہ وہ انسانوں کی قسمتوں کے فیصلے کرتے رہیں' یکا یک پردہ گر جاتا ہے۔

کچھ ہی لمحوں کے بعد پردہ پھر اٹھتا ہے' یہ ایک سرکاری دفتر ہے اس عظیم عمارت میں مختلف شعبوں کے متعلق

کلرک اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ یہاں چائے پانی لانے والے چپڑاسی بھی ہیں' صفائی کرنے والے خستہ حال ملازم بھی ہیں اور ان کا ایک بارعب افسر بھی ہے' ان کا باس کبھی کسی کلرک کو بلاتا ہے اور کوئی فائل منگواتا ہے یا حوالے کرتا ہے' کبھی چپڑاسی کو ادھر سے ادھر دوڑاتا ہے۔ کبھی فون پر مصروف گفتگو ہوتا ہے' کلرک بھی کچھ تو اپنے فائلوں میں گم ہیں۔ کچھ ہنسی مذاق میں مصروف ہیں کچھ آپس میں دفتر کی کارگزاری سے متعلق بحث ومباحثہ کر رہے ہیں اور پردہ گرتا ہے۔

کچھ ہی لمحوں کے بعد پھر پردہ اٹھتا ہے' یہ ایک تھانے کا منظر ہے' تھانیدار ماتھے پر بل ڈالے نہایت ترش روئی کے ساتھ رعب دار آواز میں کسی سپاہی کو ڈانٹ رہے ہیں' ایک طرف دو سپاہی ایک مجرم کو لئے کھڑے ہیں' مجرم کے چہرے اور لباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے مارا پیٹا گیا ہے' کچھ اور سپاہی آتے ہیں اور سلیوٹ لگا کر کچھ کہہ کر واپس ہو جاتے ہیں' فون کی گھنٹیاں بھی بج رہی ہیں تھانیدار صاحب بڑے مضحکہ خیز انداز میں رسیو اٹھاتے ہیں' کبھی تو گرجتے ہیں اور کبھی سر' سر کی رٹ لگاتے ہیں اور جی جی کے سوا کوئی لفظ زبان پر نہیں لاتے۔ کبھی چہرے پر مسکراہٹ دوڑتی ہے اور انتہائی اپنائیت کا لہجہ اختیار کرتے ہیں۔ ممکن ہے نوٹوں کی سرسراہٹ کی آواز بھی ٹیلیفون سے آنے والی آواز میں شامل ہو جاتی ہو' کبھی غرور کا ایسا انداز اختیار کرتے ہیں گویا یہاں سب کچھ انہی کے فیصلوں سے ہو رہا ہے۔

شہر کے کچھ سپاہی اور سماجی ورکر بھی وقفے وقفے سے آتے ہیں' کسی سے تو بڑے احترام سے پیش آتے ہیں اور کسی کے ساتھ نہایت کھرا انداز اختیار کرتے ہیں' غرض یہ عجیب وغریب پیکر بڑے مہارت کے ساتھ گوناگوں اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہیں' کچھ تیسرے اور چوتھے درجے کے ملازمین بھی ہیں جو ڈانٹ پھٹکار بھی سنتے ہیں مار بھی کھاتے ہیں اور خوشی خوشی کام بھی کرتے ہیں' ان کی پیشانی پر کوئی ناگواری نظر نہیں آتی' گویا وہ اس سلوک کو اپنی قسمت سمجھتے ہیں' اس کے عادی ہو گئے ہیں اور اسی پر راضی ہیں۔ پردہ گر جاتا ہے۔

ایک بار پھر پردہ اٹھتا ہے یہ ایک عظیم عدالت کا ہال ہے' عدالت کی کرسی پر نہایت شان عظمت کے ساتھ جج صاحب جلوہ افروز ہیں' سامعین اور ناظرین سے پورا ہال بھرا ہوا ہے' ملزم کٹہرے میں کھڑے ہوئے ہیں' گواہان سے بھی حلف لیا جا رہا ہے' جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا' سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔

مجرموں کے عزیز اور حامی لوگ بھی ہال میں موجود ہیں' مقدمے کی کارروائی بڑے ذوق شوق اور توجہ سے سن رہے ہیں' وکیل صاحبان بھی اپنی قانون دانی' چرب زبانی اور زور بیان کے جوہر دکھا رہے ہیں پیشکار ایک جانب اپنی فائلیں لئے سر جھکائے بیٹھا ہے۔ آواز لگانے والا چپڑاسی اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا ہے' یوں تو ہر ایک اپنا رول بہتر سے بہتر انداز میں ادا کرنے میں لگا ہوا ہے لیکن ہال میں موجود بیشتر لوگوں کی نگاہیں اس چپڑاسی کے انداز اور

گفتار پر لگی ہوئی ہیں' یہ چپڑاسی سماجی حیثیت سے معمولی انسان ہے' سماج میں اس کی پوزیشن کچھ بھی نہیں ہے مگر اپنا رول اس خوبی سے ادا کر رہا ہے کہ کوئی بھی اسے نظر انداز نہیں کر پا رہا۔

ایک سمت کو تین جج صاحبان الگ تھلگ بیٹھے نہایت انہماک اور توجہ سے ڈرامے کے ہر سین کو دیکھ رہے ہیں اور ایک ایک کردار کے رول کو نہایت بالغ نظری اور سنجیدگی سے دیکھ رہے ہیں ان کو پورے انصاف اور غیر جانبداری سے ہر کردار کو نمبر دینے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ڈرامے میں ملے ہوئے کردار کا حق کس نے ادا کیا اور کون اپنا رول ادا کرنے میں واقعی کامیاب رہا۔

ڈرامہ ختم ہو گیا اور ڈرامہ دیکھنے میں کھوئے ہوئے سامعین اب ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہیں۔ مختلف کرداروں کے بارے میں اپنے اپنے خیالات' تاثرات اور احساسات ایک دوسرے سے بیان کر رہے ہیں کہ یکا یک جج صاحبان نتیجے کا اعلان کرنے کے لئے اسٹیج پر پہنچ گئے۔

ناظرین بڑے اشتیاق اور توجہ کے ساتھ اسٹیج کی طرف متوجہ ہیں اور جج صاحبان کا فیصلہ سننے کے لئے منتظر ہیں کہ کون خوش نصیب آج اعزاز و اکرام سے نوازا جاتا ہے اور پہلا انعام حاصل کرتا ہے۔

آپ کیا سوچتے ہیں کہ پہلا انعام نواب صاحب کو ملنا چاہئے جو بڑے طمطراق کے ساتھ تختِ حکومت پر بیٹھے انسانوں پر حکومت کر رہے تھے یا پارلیمنٹ کے اس اسپیکر کو ملنا چاہئے جو پارلیمنٹ کی صدارت کی اونچی کرسی پر بیٹھ کر اپنے منصب پر نازاں تھے یا اس جج کو ملنا چاہئے جو شان و وقار کے ساتھ لوگوں کی رہائی یا سزا اور عزت و ذلت کے فیصلے سنا رہے تھے یا پھر انعام کے مستحق وہ وکیل صاحبان ہیں جو اپنی قانونی نکتہ رسی' چرب زبانی' قوت استدلال اور زورِ بیان سے کمرۂ عدالت کو مسحور کر رہے تھے! میں سمجھتا ہوں آپ ایسا نہیں سوچتے اور نہیں سوچ سکتے' اس لئے کہ ڈرامے میں دیا گیا کردار پہلا انعام پانے اور اعزاز و اکرام سے نوازے جانے کی بنیاد نہیں ہے۔ پہلا انعام پانے اور اعزاز و اکرام حاصل کرنے کی بنیاد یہ حقیقت ہے کہ ڈرامے میں ملے ہوئے کردار کا حق کس نے ادا کیا' کس کا رول کیا رہا اور کون اپنا رول ادا کرنے میں پوری طرح کامیاب رہا۔ لیجئے جج صاحبان کی جانب سے اعلان ہوا اور انعام نواب صاحب کو ملا نہ اسپیکر کو نہ جج صاحب کو ملا اور نہ کسی وکیل کو۔ آج کا پہلا انعام عدالت کے کمرے میں کام کرنے والے اس معمولی حیثیت کے چپڑاسی کو ملا جو ملزموں کو بلانے کے لئے آواز لگا رہا تھا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس فیصلے پر کسی کو حیرت نہیں ہوئی بلکہ لوگوں کی خوشی اور مسرت کے اظہار سے ایسا محسوس ہوا کہ گویا یہی سب کے دل کی آواز تھی اور حق بحقدار رسید کے فیصلے سے سب کو اطمینان اور دلی خوشی ہے اور یہ اس لئے کہ سب اس حقیقت کو سمجھتے اور تسلیم کرتے ہیں کہ اعزاز و اکرام پانے اور پہلا انعام حاصل کرنے کی بنیاد ڈرامے کے وہ کردار نہیں ہیں جو ڈرامہ پیش کرنے والوں کو دیئے گئے تھے۔ انعام کی بنیاد تو یہ امر ہے کہ کس نے اپنا رول بہتر

سے بہتر ادا کیا۔ یہ چپڑاسی جس کو آج ڈرامے میں اعزاز و اکرام سے نوازا گیا اور پہلے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ یہ تو اپنی حیثیت سے نہایت معمولی اور خستہ حال تھا' اپنے ساتھیوں میں بھی نہایت کمزور درجے کا انسان تھا' سماجی لحاظ سے اس کا کوئی مقام نہ تھا مگر اس نے اپنا رول اس خوبی اور کامیابی سے ادا کیا کہ ہر ایک کی نظریں اس پر جم گئیں اور جج صاحبان نے اس کے نام کا اعلان کیا تو نہ صرف یہ کہ حاضرین کو کوئی تعجب نہ ہوا بلکہ ان کے چہروں پر بشاشت کی لہر دوڑ گئی کہ یہ فیصلہ ان کے دل کی آواز تھا' اور وہ سب بھی اسی کو انعام کا مستحق سمجھ رہے تھے۔

یہ فیصلہ سن کر اور ڈرامے کا یہ اختتام دیکھ کر میرا ذہن قرآن کی اس آیت کی طرف منتقل ہوا جس میں اللہ نے اسی حقیقت کو نہایت جامع اور فیصلہ کن انداز میں بیان فرمایا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰـكُمْ ؕ (الانعام:۶:۱۶۵)

وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں جانشین بنایا' اور تم میں بعض کو بعض سے بلند درجے عطا کیے تا کہ وہ تمہیں آزمائے اس میں جو کچھ اس نے تمہیں عطا کیا ہے۔

قرآن کا یہ خطاب رسول ﷺ خاتم النبیین کے بلند مرتبہ ساتھیوں سے بھی ہے اور عام انسانوں سے بھی' ہر دور میں مختلف قومیں' پہلوں کی جانشین بنائی جاتی رہی ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم سے خطاب ہے کہ اب یہ تمہارا دور ہے اور عام انسانوں سے بھی خطاب ہے کہ تمام انسان زمین پر جانشین ہیں اور ہر ایک کی اسی میں آزمائش ہے کسی کا دائرہ آزمائش بہت وسیع ہے اور کسی کا مختصر' کسی کے دائرہ امانت میں صرف مادی چیزیں ہیں اور کسی کو انسانوں پر بھی نگران بنایا گیا ہے جو کچھ جسے دیا گیا ہے' اسی میں اس کی آزمائش ہے۔

لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰـكُمْ ؕ (المائدہ۵:۴۸)

تا کہ آزمائے اس میں جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے۔

قرآن پاک کی یہ حقیقت افروز بات ہر وقت پیش نظر رکھنے کی ہے' کہ جو کچھ انسان کو عطا کیا گیا ہے اور جس حیثیت میں اس کو رکھا گیا ہے اس میں اس کی آزمائش ہے اور یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ کس کی آزمائش کس حیثیت میں اس کے حق میں بہتر ہے۔

حشر کی عدالت میں کامیابی یا ناکامی' ذلت یا سرخ روئی کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ کون دنیا میں بادشاہ وقت تھا اور کون بے آسرا غلام' کون دولت و جاگیر کا مالک تھا اور کون فقیر بے نوا' کون عظیم عہدے پر فائز تھا' اور کون بے حیثیت چپڑاسی' کون لوگوں کی قسمت کے فیصلے کرتا تھا اور کون ان فیصلوں کا شکار ہوتا تھا' کون فقر و فاقے میں مبتلا تھا اور کون افراط زر سے پریشان تھا' کون صحت و قوت کا مالک تھا اور کون مریض و معذور' کون وقت کا عبقری تھا اور

کون دماغی طور پر مفلوج تھا' دراصل حشر کی عدالت میں کامیابی و ناکامی' اور عظمت و ذلت کا فیصلہ اس بنیاد پر ہوگا کہ اللہ نے جس حیثیت اور جن حالات میں دنیا کے اندر انسان کو رکھا ہے اور جو کچھ اس کو عطا کیا ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اسی میں اس کا امتحان ہے کہ اس حیثیت اور ملے ہوئے وسائل میں اس نے اپنا رول کس طرح ادا کیا۔

یہ ڈرامہ جو اسٹیج سے ہم دیکھتے ہیں اس میں بھی یہی تو دکھایا جاتا ہے کہ سپرد کیے گئے کردار کو انسان کس طرح ادا کرتا ہے۔ اور ڈرامے میں دی گئی حیثیت میں وہ اپنا رول کس طرح ادا کرتا ہے یہاں اپنا رول ادا کرنے کے لئے چند لمحے دیئے جاتے ہیں اور دنیا کے اسٹیج پر ملی ہوئی حیثیت میں اپنا رول ادا کرنے کے لئے مہلت کچھ طویل ہوتی ہے مگر بہرحال محدود ہوتی ہے اور یہی فیصلہ کن چیز ہے' کس نے اپنا رول کس طرح ادا کیا خواہ ڈرامے میں اس کی حیثیت کچھ بھی رہی ہو اور ڈرامے میں ادا کرنے کے لئے اس کو کوئی بھی کردار دیا گیا ہو۔

طبرانی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میرے بندوں میں بعض ایسے ہوتے ہیں جن کا ایمان فقیری ہی میں درست رہ سکتا ہے۔ اگر میں ان پر کشادگی کردوں تو معاملہ خراب ہو جائے گا۔ بعض ایسے ہوتے ہیں' جن کا ایمان کشادگی میں ہی درست رہ سکتا ہے اگر میں انہیں نادار بنا دوں تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ میرے بندوں میں بعض وہ ہوتے ہیں جن کا ایمان بیماری ہی میں درست رہ سکتا ہے اگر میں انہیں صحت عطا کردوں تو معاملہ بگڑ جائے گا اور بعض ایسے ہوتے ہیں جن کا ایمان تندرستی ہی میں درست رہ سکتا ہے اگر میں انہیں بیماری دے دوں تو معاملہ خراب ہو جائے گا اور ان میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جو عبادت کا کوئی دروازہ کھولنا چاہتے ہیں لیکن میں انہیں روک دیتا ہوں کہ کہیں غرور و تکبر کا شکار نہ ہو جائیں۔ میرے بندوں کے دلوں میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے علم کی بنیاد پر ہی میں ان کے معاملے کی تدبیر کرتا ہوں' میں زیادہ علم اور خبر رکھنے والا ہوں۔



# اعمالِ خیر کا بندھن

بندۂ مومن کی انتہائی آرزو اور منتہائے مقصود اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسے اللہ کی رضا کا گھر جنت نصیب ہو جائے وہ اسی شوق اور فکر میں شب و روز گزارتا ہے کہ کسی طرح جنت نعیم میں داخل ہونے کی سعادت حاصل ہو جائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو پوری امت کے لئے نمونہ کی ہستیاں تھیں اور جن سے بہتر شخصیتیں روئے زمین پر کبھی پائی نہیں گئیں ان کی آرزو اور فکر بھی یہی تھی اور یہی سوال وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کرتے تھے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ایک ممتاز صحابی ہیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایک بار فرمایا تھا: ”معاذ میں تم سے محبت کرتا ہوں“۔ اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم جس سے محبت کریں اور کہیں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اس سے بڑا سعادت مند کون ہوگا۔ اس کی خوش بختی پر کون نہ رشک کرے گا اور اس کی شان عظمت کا بھلا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اللہ ان سے راضی ہو۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی نے ایک بار رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: ”یا رسول اللہ! اخبرنی بعمل یدخلنی الجنة ویبا عدنی عن النار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: ایا لقد سالت عن عظیم۔

معاذ تم نے تو بہت ہی عظیم بات پوچھ لی' ظاہر ہے اس سے عظیم بات اور کیا ہوگی' مومن کی زندگی کی تمام تر تگ ودو اور شب و روز کی جدوجہد کا منتہائے مقصود اس کے سوا اور کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو جنت سے نوازے اور جہنم کی دہکتی آگ سے بچالے۔

مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا اس آرزو کی تکمیل اور اس کوشش میں کامیاب ہونے کی سبیل اللہ کے رسول کے سوا کوئی اور بتا سکتا ہے؟...... کس قدر عظیم سوال ہے اور کس قدر موزوں شخصیت سے کیا جا رہا ہے جن کی بعثت ہی اللہ نے اس لئے کی ہے کہ وہ بندوں کو جہنم سے بچائیں اور جنت میں داخل ہونے کی سبیل اور اعمال سے واقف کرائیں اور جو تدبیر و سبیل بتا رہے ہیں وہ بھی یقینی' آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی وجہ ہی یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صادق و امین ہیں اور آپ نے جو سبیل و تدبیر بتائی ہے وہ صدفی صد سچی اور اللہ کی ہدایت کے

مطابق ہے...... ان دونوں باتوں میں جس کو بھی ذرا تردد اور رشک ہو اس کا ایمان ہی مشکوک ہے۔

اس وضاحت کے بعد مومن کے دل میں کس قدر تڑپ اور کس قدر شوق ابھرے گا کہ وہ تدابیر وہ اعمال اور وہ سبیل مجھے معلوم ہو جائے جس سے میں جنت میں داخل ہو جاؤں اور جہنم سے بچ جاؤں...... جبکہ بتانے والی ہستی وہ ہے جس کو اللہ نے یہی بتانے کے لئے بھیجا ہے اور اس لئے اپنا رسول منتخب کیا ہے کہ وہ صادق اور امین ہیں۔

حضرت محمد ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے سوالِ عظیم کے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ نہ صرف گوش ہوش اور جذبہ اطاعت کے ساتھ سننے کی باتیں ہیں بلکہ فیصلہ کن عزم کے ساتھ عمل کرنے کے اعمال ہیں۔

پہلی اور بنیادی بات یہ ہے کہ بندہ اللہ ہی کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔

دوسری بات یہ کہ وہ نماز قائم کرے۔

تیسری بات یہ کہ وہ زکوٰۃ ادا کرے۔

چوتھی بات یہ کہ وہ رمضان کے روزے رکھے۔

پانچویں بات یہ کہ وہ بیت اللہ کا حج کرے۔

پھر رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں تمہیں ابواب خیر کی رہنمائی کیوں نہ کروں؟

دیکھو روزہ ڈھال ہے۔

اور صدقہ گناہ کی تپش کو اس طرح بجھا دیتا ہے جس طرح آگ کو پانی بجھا دیتا ہے اور بندے کی آدھی رات کی نماز۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۙ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (السجدہ:۱۶،۱۷)

''ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں۔ وہ اپنے رب کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے رہتے ہیں جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے راہ حق میں خرچ کرتے رہتے ہیں۔ پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے کن اعمال خیر کے صلے میں ان کے لئے چھپا رکھا گیا ہے۔ اس کا کسی متنفس کو کوئی علم نہیں''۔

پھر حضور ﷺ گویا ہوئے: کیا میں تمہیں دین کے سر رشتے اور اس کے ستون اور اس کی بلند ترین چوٹی کے بارے میں نہ بتاؤں!

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: ضرور ضرور یا رسول اللہ ﷺ

ارشاد فرمایا: دین کا سر رشتہ اسلام یعنی خود کو اللہ کے حوالے کر دینا ہے اور اس کا ستون نماز ہے اور اس کی بلند ترین چوٹی جہاد ہے۔

پھر فرمایا: کیا میں تمہیں ان سب کا بندھن نہ بتا دوں؟

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: ضرور بتایئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان پکڑی اور فرمایا: اس کو قابو میں رکھو۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم سے ان باتوں پر بھی مواخذہ ہوگا۔ جو ہم زبان سے بولتے رہتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تیرا بھلا ہو۔ اے معاذ! کیا لوگوں کو ان کے منہ کے بل جہنم میں گرانے والی چیز زبان کی پیداوار کے علاوہ کچھ اور ہے۔ (الترمذی' کتاب الایمان' باب ۸' ماجاء حرمۃ اہلا' ص ۱۹۱۵)

یہ ہیں وہ اعمال جن کی بدولت انسان جہنم کی آگ سے بچ کر جنت میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کر سکتا ہے اور ان سب کے آخر میں آپ نے جس بات کی تنبیہ فرمائی اس کو عام طور پر لوگ بہت معمولی بات سمجھ کر نظر انداز کرتے رہتے ہیں' حالانکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تمام اعمال کا بندھن اور شیرازہ قرار دیا ہے۔

ملاک دراصل اس بندھن کو کہتے ہیں جس کے سہارے چیزیں قابو میں رہتی ہیں اور ادھر ادھر بکھر کر ضائع نہیں ہوتیں۔ زبان کی حیثیت ایک بندھن اور شیرازے جیسی ہے۔ اگر آدمی اس پر قابو رکھے تو اس پر سارے اعمال اپنی اپنی جگہ مفید اور موثر اور اللہ کی نظر میں باوقعت ہوں گے اور اگر زبان بے قید اور آزاد ہو گئی تو زبان وہ چیز ہے جو تمام اعمال کو برباد کر کے رکھ دینے والی ہے اسی لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اعمال خیر کا بندھن قرار دے کر سخت تنبیہ فرمائی اور خبردار کیا کہ اس کا حاصل اور پیداوار انسان کو جہنم میں منہ کے بل گرا دینے والی چیز ہے۔



# برائیوں سے سمجھوتا کرنے کا عبرتناک انجام

بگاڑ اور فساد کسی قوم یا ملت میں یکبارگی نمودار نہیں ہوتا بلکہ نہایت ہی دھیمی رفتار اور خاموشی میں سر اٹھاتا اور عیارانہ چالوں سے سماج میں اپنے لئے گنجائش پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نہایت صبر، تسلسل اور مکاری سے سرگرم رہتا ہے کہ اسے گوارا کیا جانے لگے۔ یہ اس کی جیت اور کامیابی کا پہلا مرحلہ ہوتا ہے۔ اس مرحلہ پر پہنچ کر وہ اطمینان کی سانس لیتا ہے کہ اب آگے کے مراحل آسان ہو گئے۔ پھر زیادہ وقت نہیں لگتا کہ سماج میں بگاڑ نمودار ہوتا ہے اور رواج پانے لگتا ہے اسے گونہ مقبولیت حاصل ہونے لگتی ہے اور ہوتے ہوتے بگاڑ و فساد سماج کا معمول بن جاتا ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ ایک پاکیزہ انسانی معاشرہ میں شرپسند مجرمین دبے ہوئے ہوتے ہیں۔ اول اول برائیاں کرتے ہوئے وہ جھجکتے ہیں، ان پر سماج کا اخلاقی دباؤ ہوتا ہے، پاکباز لوگوں کی ایک ہیبت ہوتی ہے، مجرمین کسی بڑے فعل کا ارتکاب کرتے خوف محسوس کرتے ہیں۔ صرف عام اور سوسائٹی کے بے اثر لوگ ہی نہیں بلکہ سوسائٹی کے اصحاب ثروت اور با اثر لوگ بھی سوسائٹی کے خوف سے دبے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کی اصل اور بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ سماج کے خیر پسند، پاکباز اور شافی جوہروں سے آراستہ لوگ سماج میں کسی برائی کو برداشت کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوتے۔ برائیوں کے خلاف ہمہ وقت مسلح اور محاذ آرا رہتے ہیں۔ وہ کسی قیمت پر شرپسند مجرمین سے سمجھوتا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے لیکن یہ بند اس وقت ٹوٹتا ہے جب ان خیر پسند اور باشعور افراد میں سستی آتی ہے۔ ان میں دھیرے دھیرے جرات و ہمت اور برائیوں سے نفرت میں کمی پیدا ہونے لگتی ہے اور وہ شرپسندوں کو للکارنے اور ان کے خلاف نبرد آزما ہونے کا حوصلہ کھونے لگتے ہیں۔ اس کمزوری کو بھانپ کو اول اول اصحاب ثروت اور ماہر مجرمین میں ڈھٹائی، ہٹ دھرمی، سرکشی اور برائی پر اڑنے کی جرات نمودار ہوتی ہے۔ خیر پسند اپنے فریضے میں کوتاہ ہونے لگتے ہیں۔ ان میں برائیوں کو گوارہ کر لینے اور بروں سے مفاہمت کر لینے کی پالیسی رواج پانے لگتی ہے۔ ابتداء نہی عن المنکر یعنی برائیوں کو روکنے کی جرات اور اخلاقی حوصلہ ختم ہوتا ہے اور اپنی اس کمزوری کی حکمتیں اور مصلحتیں بیان کرنے کا رواج عام ہوتا ہے۔ پھر یہ حوصلہ باقی نہیں رہتا کہ کسی کو نیکی کا حکم دے سکیں اور

سماج میں بھلائی کا اہتمام کرنے کے لئے بھی پرزور انداز میں زبان کھول سکیں۔ یہ سماج کے بدترین دن ہوتے ہیں۔ برائیاں عام ہونے لگتی ہیں۔ سماج میں ہر طرف فساد اور بگاڑ رونما ہونے لگتا ہے...... برے لوگ سماج پر چھا جاتے ہیں اور ہر طرف یہی لوگ سرگرم نظر آتے ہیں۔"

صحیح بنیادوں پر تعمیر ہونے والے معاشرے کا ابتدائی دور سنہرا ہوتا ہے۔ سماج پر پاکباز لوگوں کا اثر ہوتا ہے۔ ان کی اخلاقی ساکھ سے پورا سماج مرعوب ہوتا ہے۔ عوام ہی نہیں بلکہ بااثر اصحاب ثروت بھی کھلم کھلا کسی برائی کا ارتکاب کرنے کی جرات نہیں کرتے۔ سوسائٹی کے پاکباز طبقے کا لحاظ کرتے ہیں۔ ان کی نیکی' تقویٰ اور پاکبازی کی وجہ سے نہ صرف ان کا احترام کرتے ہیں بلکہ ان کی موجودگی میں کوئی ناروا بات یا نارواعمل کرتے شرم اور جھجک محسوس کرتے ہیں اور اس طرح برائیاں گومٹ تو نہیں جاتیں مگر سماج میں دبی رہتی ہیں' گویا ان کا وجود ہی نہیں ہے۔ اگر کبھی سر اٹھاتی بھی ہیں تو اس کو پورے سماج کی نفرت' بیزاری اور دباؤ سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے اور وہ سر اٹھاتے ہی دب جاتی ہیں لیکن جونہی شرپسند یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ خیر پسندوں میں شر کو گوارا کر لینے کی کمزوری جنم لے رہی ہے تو ان کی جرات بڑھنے لگتی ہے۔

جب تک سماج کا خیر پسند' باشعور اور پاکباز طبقہ اپنے فرائض کا گہرا احساس رکھتا ہے' اپنا فریضہ ادا کرنے میں سرگرم رہتا ہے اور جرات کے ساتھ برائیوں کے خلاف ڈٹا رہتا ہے' سماج میں اس کی ساکھ ہوتی ہے۔ سماج پر اس کا اخلاقی دباؤ اور ایک ہیبت ہوتی ہے۔ سماج اس کا اثر محسوس کرتا ہے اور تہ میں برائیاں موجود بھی ہوں تو سر نہیں اٹھاتیں۔ ایسا لگتا ہے کہ سماج میں گویا کوئی برائی ہے ہی نہیں۔ اس لئے کہ سماج میں برائیوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور سماج کے عام لوگوں میں نیکی کا رجحان' برائی سے نفرت اور اہل خیر کے اثرات کی فضا قائم رہتی ہے۔

کسی سوسائٹی کا یہ دور انتہائی خوش بختی' ترقی' خوشگواری اور خیر و برکت کا دور ہوتا ہے۔ ہر طرف امن و سکون' راحت و عافیت' خوش حالی و خیر سگالی اور مسرت و اطمینان کی فضا ہوتی ہے اور سوسائٹی جنت کا نمونہ ہوتی ہے۔ شیطان بھلا اس خیر و برکت اور نیکی و پاکیزگی کی فضا کو کیسے گوارا کر سکتا ہے۔ وہ برابر اپنی چالیں چلتا رہتا ہے اور خیر پسندوں پر مسلسل حملے کرتا رہتا ہے اور پھر سوسائٹی کو یہ روز بد دیکھنا پڑتا ہے کہ نیک لوگوں کے طبقے میں سہل انگاری' عافیت کوشی' فرائض سے غفلت' سستی اور لاپروائی جیسی کمزوریاں نمودار ہونے لگتی ہیں۔ وہ دھیرے دھیرے برائیوں کو گوارا کر لینے اور اہل شر سے سمجھوتا کرنے کی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ شرپسندوں کے مقابل آنا انہیں للکارنے اور ان کو برائیوں سے روکنے کی جرات و ہمت کھونے لگتے ہیں اور عافیت اسی میں محسوس کرتے ہیں کہ شرپسندوں سے مصالحت اور مفاہمت رہے۔ شرپسند چونکہ اسی وقت کے انتظار اور آرزو میں عمر عزیز کی گھڑیاں بتاتے ہیں اس لئے وہ جلد اہل خیر کی اس کمزوری کو بھانپ لیتے ہیں اور ان کے برے ارادوں میں جان پیدا ہونے

لگتی ہے۔ پھر زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ برائیوں کا چلن عام ہو جاتا ہے اور شر پسند ہر طرف دندناتے اور شر و فساد پھیلاتے نظر آتے ہیں اور بالآخر سماج میں شر پسندوں کا دباؤ اور بالادستی کی فضا عام ہو جاتی ہے۔ خیر پسند اور پاکباز طبقے کے اثرات ختم ہونے لگتے ہیں۔ ان کا اخلاقی دباؤ ڈھیلا پڑنے لگتا ہے اور شر پسند عناصر کو کھل کھیلنے، من مانی کرنے اور دل کے ارمان پورے کرنے کے آزادانہ مواقع فراہم ہو جاتے ہیں۔ سوسائٹی کے لوگ جن کی بہت بڑی اکثریت جواب تک خیر پسند طبقے کے اثرات اور دباؤ سے برائیوں سے بچے ہوتے تھے، وہ بھی اس ریلے میں بہہ جاتے ہیں۔ سارے بند ٹوٹ جاتے ہیں اور پورا سماج برائیوں کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ خیر پسند لوگ سماج کی ہماہمی اور پیدا ہونے والے مسائل سے کنارہ کشی اختیار کرنے اور زندگی کی سرگرمیوں سے ہٹ کر گوشۂ عافیت تلاش کرنے......لگ جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سماج میں خیر پسندوں اور پاکباز لوگوں کا کوئی رول ہی نہیں رہا ہے وہ سماج میں اپنی ساکھ، اپنا اخلاقی دباؤ اور اپنے اثرات سب کچھ کھو بیٹھتے ہیں۔

کسی سوسائٹی کے لئے یہ انتہائی بدبختی اور زبوں حالی کا دور ہوتا ہے۔ ہر طرف شر و فساد، ہنگامے، آوارگی، عیاشی، ظلم و زیادتی اور انارکی پھیل جاتی ہے۔ باہمی تعلقات بگڑ جاتے ہیں۔ خاندانی بند ٹوٹنے لگتے ہیں۔ خانگی زندگیاں برباد ہونے لگتی ہیں۔ عزت و آبرو، جان و مال کی حفاظت، چھوٹے بڑے کا لحاظ اور شرم و حیا جیسی قدریں ناپید ہونے لگتی ہیں۔ سماج سے امن و سکون اور عافیت و اطمینان رخصت ہو جاتا ہے اور پورا سماج جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔

قرآن نے بھی بنی اسرائیل کی عبرتناک تاریخ پیش کر کے بار بار مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی ان کی شرمناک تاریخ کے مختلف گوشے پیش کر کے بار بار تنبیہ فرمائی ہے تاکہ مسلمان چوکنے رہیں اور ان رخنوں پر نگاہ رکھیں جہاں سے برائیاں خاموشی سے سرایت کر کے پوری سوسائٹی کو تہ و بالا کر دیتی ہیں۔

بنی اسرائیل میں بھی ذلت و مسکنت اور شرمناک تباہی یکا یک نہیں آئی اور یکبارگی وہ عظمت و عزت کی بلندیوں سے ذلت اور برائی کی پستیوں میں نہیں دھنس گئے بلکہ ان کا حال بھی یہی ہوا کہ ابتداءً ان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام قائم تھا۔ ان کے افراد اپنے مشن کا شعور رکھتے تھے، ان کے اچھے افراد برائیوں کے خلاف سینہ سپر رہتے تھے۔ شر پسندوں کو للکارتے اور ہمت و جرات سے ان کو برائیوں سے روکتے تھے، ان کا ہاتھ پکڑتے اور بزور ان کو باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

لیکن دھیرے دھیرے ان کے پاکبازوں اور خیر پسندوں میں ڈھیل پیدا ہوئی، برائیوں کو برداشت کرنے، برے لوگوں سے سمجھوتا کرنے اور ان کے ہم نوالہ اور ہم پیالہ بننے کی بیماری پیدا ہوئی۔ مقابلے کی قوت کمزور پڑنے لگی۔ مفاہمت اور مصالحت کی روش اختیار کرنے میں عافیت محسوس ہونے لگی۔ کل تک یہ لوگ جن برے لوگوں کو برائیوں میں مبتلا دیکھ کر للکارتے اور بزور روکتے تھے، انہی کے ساتھ آخر کار سمجھوتے کرنے لگے۔ ان کو برائیوں

میں لت پت دیکھ کر روکنے کے بجائے ان کی ہم نشینی اور قربت میں عافیت محسوس کرنے لگے۔ شر پسندوں کی جرات بڑھنے لگی اور خیر پسندوں کے حوصلے پست ہونے لگے۔ دھیرے دھیرے یہ خیر پسند بھی انہی شر پسندوں اور مجرموں کے ہم نوالہ اور ہم پیالہ بن گئے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہوئی تو ان پر اللہ کا غضب ٹوٹ پڑا۔ اللہ نے ان پر اپنا عذاب مسلط کر دیا' ان میں اخوت و تعلق ختم ہو گیا۔ ان کے قلوب باہم پھٹ گئے۔ ان میں اختلاف انتشار اور افتراق کی فضا قائم ہو گئی۔ وہ گروہوں اور فرقوں میں بٹ گئے اور آپس ہی میں ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگے۔ ان پر ذلت' پستی' مسکنت اور زبوں حالی مسلط کر دی گئی اور یہ انسانیت کے لئے نمونہ عبرت بن گئے۔ ان کی شرمناک پستی کی یہ داستان تاریخ انسانیت کا عبرتناک باب ہے۔

سنن ابوداؤد میں رسول کریم ﷺ کے مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک روایت مروی ہے جو بنی اسرائیل کی اس عبرتناک تاریخ پر روشنی ڈالتی ہے اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی سوسائٹی انسانیت کی بلندیوں سے کس طرح شرمناک پستی کے پاتال میں دھنستی چلی گئی۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر بنی اسرائیل کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا:

سب سے پہلے بنی اسرائیل میں جس برائی نے جنم لیا وہ یہ تھی کہ ان میں ایک بھلا شخص جب کسی شخص کو کوئی برا کام کرتے دیکھتا تو کہتا کہ اے اللہ کے بندے! اس کام سے باز آ جا۔ یہ تو کیا کر رہا ہے؟ یہ ہرگز جائز نہیں' مگر جب دوسرے دن اس کی ملاقات ایسے ہی برے شخص سے ہوتی اور وہ اس کو برائی میں ملوث پاتا تو وہ اس کو منع نہ کرتا تاکہ وہ اس کی ہم نشینی کر سکے اس کے ساتھ کھا پی سکے اور مصالحت کی شکل رہے۔ جب ان میں یہ صورتحال پیدا ہوئی تو اللہ نے ان کو آپس میں ٹکرا کر تباہ و برباد کر دیا"۔ اور اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن پاک کی سورۃ المائدہ کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ○ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ○ تَرٰي كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ○ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ○

(سورہ المائدہ:۵:۷۸-۸۱)

"بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے

لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو برائیوں کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ بڑا ہی برا طرزِ عمل تھا جو انہوں نے اختیار کیا۔ آج تم ان میں بکثرت ایسے لوگ دیکھتے ہو جو اہل ایمان کے مقابلے میں کفار کی حمایت و رفاقت کرتے ہیں۔ یقیناً بہت برا انجام ہے جس کی تیاری ان کے نفسوں نے ان کے لئے کی ہے۔ اللہ ان پر غضب ناک ہو گیا ہے' وہ دائمی عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں۔ اگر یہ لوگ فی الواقع اللہ اور رسول ﷺ اور اس چیز کے ماننے والے ہوتے جو پیغمبر پر نازل ہوئی تھی تو ہرگز اہل ایمان کے مقابلے میں کافروں کو اپنا رفیق نہ بناتے مگر ان میں سے تو بہت سے لوگ اللہ کی اطاعت سے نکل چکے ہیں''۔

یہ حدیث ایک آئینہ ہے جس میں امت مسلمہ اپنا چہرہ صاف دیکھ سکتی ہے اور اپنی عبرتناک پستی کا اصل سبب معلوم کر سکتی ہے اور فیصلہ کن انداز میں اس حقیقت کو پا سکتی ہے کہ امر بالمعروف نہی عن المنکر کے فریضے سے غفلت کسی ملت کو پستی کی کن حدوں تک پہنچا دیتی ہے۔

ایک عادت بد اُمت میں یہ بھی رواج پا رہی ہے کہ وہ اپنا ماتم کرنے میں بھی بڑی مشاق ہو گئی ہے اور اپنی زبوں حالی کی داستان سرائی میں زورِ زبان اور زورِ قلم مقابلے کی حد تک دکھانے لگی ہے۔

خدارا! ماتم نہ کیجئے بلکہ اٹھئے اور تعمیر ملت کی فکر میں سرگرم ہو جایئے۔ نہی عن المنکر کی جرات پیدا کیجئے اور اپنا منصبی فریضہ جس پر اللہ نے خیر امتہ کو فائز کیا ہے یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کیجئے۔



# کل کی فکر

جو شخص ''آج'' موجود ہے اگر وہ زندہ رہا تو ''کل'' اس پر ضرور طلوع ہوگا۔ یہ زندگی اس ''آج اور کل'' کی آمدوشد ہی سے عبارت ہے۔ ہر ''آج'' کے لئے ''کل'' ناگزیر ہے' جب تک یہ زمین و آسمان قائم ہیں' دنیا کا ہر انسان اس حقیقت سے واقف بھی ہے اور اس کو تسلیم بھی کرتا ہے۔ بالعموم وہ اپنے کل کی فکر بھی کرتا ہے اور یہ کل کی فکر مطلوب اور پسندیدہ بھی ہے۔ مگر قرآن وسنت اور اسلامی لٹریچر میں یہ دو لفظ ''آج'' اور ''کل'' کی اصطلاح کے طور پر ایک بہت ہی فکر انگیز مفہوم میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ آج سے مراد ہوتی ہے' موجود زندگی اور کل سے مراد ہوتی ہے آخرت۔ اور یہ ایک یقینی حقیقت ہے کہ جس کو یہ ''آج'' نصیب ہوا ہے اس کو یہ ''کل'' بھی ضرور نصیب ہوگا۔ اس زندگی کی مہلت جتنی بھی ہو' یہ آج ہے اور یہ مہلت ختم ہوتے ہی جو ساعت شروع ہونے والی ہے' وہ کل ہے۔ مگر اس کل کو نمودار ہونے کے لئے سورج کے طلوع سے کوئی غرض نہیں ہے۔ یہ کسی وقت بھی شروع ہو سکتا ہے۔ سورج کے طلوع سے شروع ہونے والے کل کا وقت معلوم و متعین ہے لیکن موجود زندگی کا جو کل ہے اس کے آغاز کا وقت کسی کو نہیں معلوم۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت و مصلحت کے تحت اسے مخفی رکھا ہے۔ آج کی یہ مہلت کسی شخص کے لئے کتنی ہے؟ اس کی خبر اللہ علام الغیوب کو ہے' یہ مہلت چند دن کی بھی ہو سکتی ہے' چند مہینوں کی بھی اور چند رسالوں کی بھی اور یہ بھی ممکن ہے کہ چند لمحوں کی ہو بلکہ یہ بھی عین ممکن ہے کہ اگلے ہی لمحے کسی کا کل شروع ہو جائے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ ایک شخص سویا اور پھر اسے اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ باتیں کرتے کرتے ہارٹ فیل ہو گیا' اچھا خاصا کام کر رہا ہے اور نبض بند ہوگئی۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے اس ''کل'' کے آغاز کو مخفی رکھ کر انسان کو زبردست آزمائش میں رکھا ہے۔

اس دنیا کا سب سے بڑا نادان' سب سے بڑا نامراد' سب سے بڑا محروم وہ ہے جو اس کل کی فکر سے غافل ہے۔ کل کی فکر سے غفلت اس حقیقت کی علامت ہے کہ انسان کا ایمان مردہ ہو چکا ہے یا کم از کم اس پر سکرات کا عالم طاری ہے۔ جسے اپنا ایمان عزیز ہے وہ اللہ کی پکڑ سے ڈرے اور کل کی فکر میں لگ جائے۔ یہ ''آج'' جس میں وہ پھنسا ہوا ہے اور جس کے لئے شب و روز فکر کر رہا ہے' عارضی اور فانی ہے اور وہ ''کل''...... جس سے غفلت برت

رہا ہے وہ دائمی اور لازوال ہے۔ اس سے بڑی نادانی اور محرومی کیا ہوگی کہ آدمی عارضی اور فانی کے لئے تو اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں کھپاتا رہے اور اس کل سے غافل رہے جو ابدی اور لازوال ہے۔ اس کل کے بعد کوئی کل نہیں ہے۔ یہ کل جب ایک بار آج بن جائے گا تو ہمیشہ آج ہی آج رہے گا۔ اس آج کا پھر کوئی کل ہرگز نہ آئے گا۔ اس آج کو پھر فنا نہ ہوگی یہ دائمی اور ابدی آج ہوگا۔

اس شخص کی ناکامی اور خسران کا اندازہ کیجئے جس نے اس کل کے لئے کوئی فکر نہ کی ہو۔ زندگی ختم ہوتے ہی جب کل شروع ہو تو اسے معلوم ہو کہ وہ بالکل ہی خالی ہاتھ ہے۔ یہاں اس کے لئے نہ کوئی سایہ ہے' نہ سر چھپانے کی جگہ' نہ کوئی پرسان حال ہے اور نہ زندگی گزارنے کا کوئی سامان۔ وہ حسرت سے دونوں ہاتھ مل رہا ہو اور فریاد کر رہا ہو کہ کاش میں نے یہاں کے لئے بھی کچھ بھیجا ہوتا۔ میں نے تو اپنی تمام تر توانائیاں' صلاحیتیں' محنتیں اور کوششیں دنیا کی زندگی بنانے کے لئے کھپا دیں اور اس دائمی حیات کے لئے کچھ بھی فکر نہ کی' کچھ بھی نہ جمع کیا۔ کیسی عبرتناک نادانی ہے کہ آدمی فانی اور حقیر کے لئے تو اپنا سب کچھ کھپا دے اور آخرت کی لازوال اور بیش بہا زندگی کو تباہ و برباد کرے۔

دانائی اور بصیرت یہ ہے کہ آج کی زندگی میں آدمی ہر کام اور ہر مرحلے پر' ہر مقام اور ہر موڑ پر صبح و شام برابر اپنا احتساب کرتا رہے اور کسی وقت بھی اس جائزے سے غافل نہ رہے کہ وہ کل کے لئے آگے کیا بھیج رہا ہے۔ یہ کل یقینی ہے' اتنا یقینی جتنا یہ موجود آج یقینی ہے۔ آخرت کی زندگی ایک حقیقت ہے جیسی کہ آج کی موجود زندگی ایک حقیقت ہے۔ کامیاب اور دانشمند وہی ہے جو اس یقینی کل کے لئے فکرمند ہے' جو ہر لمحہ اس فکر کے ساتھ گزار رہا ہے کہ اس نے کل کے لئے کیا کمایا' کل کے لئے کیا جمع کر رہا ہے اور آگے کیا بھیج رہا ہے۔ دانائی یہ ہے کہ آدمی برابر یہ جائزہ لیتا رہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے' جو کچھ کہہ رہا ہے' جو کچھ سوچ رہا ہے' جو کچھ دے رہا ہے' جو کچھ لے رہا ہے' صبح و شام جو تگ و دو کر رہا ہے۔ یہ سب آخرت کی زندگی کے لئے مفید ہے یا نقصان دہ؟ وہ کون سی بات اور کون سا عمل ہے جو آخرت کے لئے زادِ راہ ہے اور وہاں کام آئے گا اور وہ کون سا عمل اور کون سی بات ہے جو آخرت کے لئے نقصان دہ اور آخرت کو تباہ کرنے والی ہے؟ یہ ساری چیزیں نہایت تفصیل کے ساتھ قرآن و حدیث اور اسلامی لٹریچر میں موجود ہیں' لیکن ان تفصیلات کو جاننے کی بے چینی اور تلاش و معلومات کی تڑپ اس شخص کو تو ہوگی جس کو کل کی فکر ہو اور جو اپنے شب و روز اس فکر کے ساتھ گزار رہا ہو کہ وہ کل کے لئے کیا کما رہا ہے۔ آخرت کی فکر سے بے پرواہ انسان کو تفصیلات جاننے کی کیا ضرورت؟

اس زندگی کو بہرحال ایک دن ختم ہونا ہے۔ ایک دن یہ کھلی آنکھیں ضرور بند ہوں گی اور بند ہوتے ہی کل کی زندگی نظروں کے سامنے ہوگی۔ یہ حقیقت اتنی ہی یقینی ہے جتنا خود ہمارا وجود ہے۔ ہر شخص اپنے بارے میں خوب

جانتا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے' کیا سوچ رہا ہے' کیا منصوبے بنا رہا ہے' تگ و دو کا ہدف کیا ہے اور کن تمناؤں اور آرزوؤں کے ساتھ زندگی گزار رہا ہے۔ وہ سنجیدگی سے سوچے اگر اس کی زندگی آخرت کی فکر سے غفلت میں گزر رہی ہے تو اولین فرصت میں اپنے ایمان کی خبر لے' ایمان سب سے بڑی دولت ہے اور آخرت سے غفلت کے معنے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہیں کہ آپ اپنی عاقبت تاریک کر رہے ہیں۔

زندگی کی بہتر تعمیر اور اسلام کی مطلوب پاکیزہ زندگی گزارنے کی آرزو میں اگر آپ واقعی صادق اور سنجیدہ ہیں اور دونوں جہانوں کی فلاح و کامرانی فی الواقع آپ کا مطلوب و مقصود ہے تو یاد رکھئے کہ سیرت و کردار کی تعمیر اور دونوں جہاں کی فلاح و کامرانی کا بنیادی نکتہ یہی ہے کہ آپ اپنے صبح و شام اور مصروف زندگی کا لحہ لحہ اس فکر کے ساتھ گزاریں کہ کل کے لئے آپ کیا کما رہے ہیں اور آنے والے یقینی کل کے لئے آپ کیا آگے بھیج رہے ہیں۔

یہ فکر اگر آپ پر غالب ہے تو لازماً آپ یہ جاننے کے لئے بے چینی کے ساتھ کوشش کریں گے کہ آپ کی زندگی کی تعمیر کے لئے کیا مفید ہے اور کیا مضر' آپ کیا کریں اور کن کاموں سے رک جائیں' آخرت کو تابناک بنانے کے لئے کیا کریں اور کیا نہ کریں' کن چیزوں میں اپنا وقت لگائیں اور کن چیزوں سے بچیں وہ کون سی چیزیں ہیں جن سے آپ کی آخرت بن سکتی ہے اور وہ کون سی چیزیں ہیں جو آپ کی آخرت کو تباہ و برباد کرنے والی ہیں اور پھر فیصلہ کن انداز میں فکر آخرت کا تعمیری رویہ اختیار کریں اور دو باتوں کو کسی لمحے بھی ذہن سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ ایک یہ کہ خدا ترسی کی زندگی گزاریں جو کچھ کریں اللہ کی شدید محبت اور خوف کے تحت کریں دوسرے ہر وقت اس یقین کو تازہ رکھیں کہ آپ کے ہر قول و عمل' ادنیٰ سے ادنیٰ حرکت بلکہ دل کے وسوسوں اور جذبات و خیالات سے بھی اللہ تعالیٰ پوری طرح باخبر ہے۔ آپ کی کوئی چیز اس سے مخفی نہیں' سب کچھ اس پر عیاں ہے۔ ایک ایسی علیم و خبیر ہستی کے سامنے کل اپنی زندگی کا حساب دینے کے لئے آپ کھڑے ہوں گے اور آپ کا کیا کرایا سب سامنے ہوگا۔ خواہ آپ نے آسمانوں کی فضاؤں میں کچھ کیا ہو یا سمندر کی تہوں میں' سب کچھ وہاں اپنے پورے منظر کے ساتھ موجود ہوگا۔ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا تھا:



يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ۝

''اے میرے پیارے بیٹے! کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر بھی ہو اور وہ کسی چٹان (کے سینے) میں ہو۔ یا آسمانوں (کی فضاؤں) میں ہو یا زمین (کی تہوں) میں ہو' اللہ اس کو نکال لائے گا وہ بہت باریک بین اور باخبر ہے''۔ (سورۂ لقمان: ۱۶)

یہ کل یقینی ہے، اس کا آنا ایک واقعی حقیقت ہے۔ اس کی یاد اور فکر کسی وقت ذہن سے اوجھل نہ ہونے دیجئے اور اس فکر کے ساتھ زندگی کا لمحہ لمحہ گزاریئے کہ اس کل کے لئے آپ کیا کر رہے ہیں اور کیا بھیج رہے ہیں اور اپنے رب کی اس ہدایت کو ہر دم وردِ زبان رکھئے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ (سورہ الحشر ۵۹/۱۸)

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس کل کے لئے کیا سامان کیا ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو اللہ یقیناً تمہارے ان اعمال سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو''۔



# بچوں کے لئے نیک صحبت کے مواقع فراہم کیجئے

کون نہیں چاہتا کہ اس کے بچے نیک بنیں اور صالح مسلمان بن کر رہیں۔ سارے والدین کی تمنا بھی یہی ہوتی ہے اور اس کے لئے وہ اپنی وسعت کے مطابق وسائل بھی فراہم کرتے ہیں اور اپنی سمجھ اور بصیرت کے مطابق مناسب اور مؤثر کوشش بھی کرتے ہیں اور وہ ساری تدبیریں اختیار کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں جو ان کے بس میں ہوتی ہیں اور حتی الامکان وہ نگرانی بھی کرتے ہیں کہ ان کے بچے ان تدبیروں سے کس حد تک فائدہ اٹھا رہے ہیں اور خدانخواستہ کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی ہے' اس لیے کہ بچے اگر بگڑ جائیں اور بگاڑ کی طرف ان کا رخ ہو جائے تو یہ دنیا بھی عذاب بن جاتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ ہر ایک کو محفوظ رکھے اور پھر آخرت کی باز پرس اور اللہ کی ناراضی تو اس سے بھی بڑھ کر اور لرزا دینے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا واضح حکم ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم ۶۶:۶)

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

صاحب ایمان والدین یوں بھی اپنی اولاد کے لئے فکر مند ہوتے ہیں اور ان کی تربیت و اصلاح کے لئے ہر طرح کی قربانی دیتے ہیں اور اللہ کا یہ حکم اور تنبیہ پا کر تو وہ اور زیادہ حساس اور چوکنے ہو جاتے ہیں۔ بچوں کو ذرا بھٹکتا دیکھتے ہیں تو پریشان ہو جاتے ہیں اور صحت مند روش پر چلتا دیکھتے ہیں تو باغ باغ ہو جاتے ہیں اور دلی اطمینان محسوس کرتے ہیں۔

بچوں کی اصلاح' تربیت اور بہترین اٹھان کے لئے بہت سے اسباب اور محرکات ہوتے ہیں۔ اس وقت بچوں کی اچھی تربیت کے ذرائع اور وسائل کی تحقیق و تعین اور ان پر مفصل گفتگو پیش نظر نہیں ہے۔ یہ ایک طویل موضوع ہے اور تربیت کے ذرائع پر مفصل گفتگو کے لئے ایک مضمون نہیں' ایک کتاب کی ضخامت درکار ہے۔ اس وقت میں بچوں کی تربیت میں صرف ایک قوی اور مؤثر ذریعے کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اگر ممکنہ ذرائع کے ساتھ اس ذریعے پر خصوصی توجہ رہے تو ان شاء اللہ توقع ہے کہ اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔ یہ ذریعہ جس کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ ذہن و فکر کی اصلاح اور انقلاب کے لئے انتہائی مؤثر اور نہایت ہی مجرب

دراصل بچوں میں اخذ کرنے، نقل اتارنے اور واقعات سے متاثر ہونے کی بے پناہ صلاحیت ہوتی ہے۔ اگر ان کے سامنے اچھے واقعات مسلسل آتے رہیں اور کچھ چیزیں دہرائی جاتی رہیں یا کوئی نئی چیز سامنے آئے تو وہ ان کی نقل اتارنے میں بہت دلچسپی لیتے ہیں اور کوئی چیز بار بار آتی رہے تو وہ اس کو اپنانے لگتے ہیں اور دھیرے دھیرے وہ ان کی عادت بن جاتی ہے۔ اسی طرح اگر برے واقعات اور بری باتیں برابر ان کے سامنے آتی رہیں تو وہ ان کی نقل اتارتے ہیں اور اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح بری عادتیں پڑنا شروع ہو جاتی ہیں۔ قدرت نے اپنی حکمت کے تحت بچوں کو ماحول سے متاثر ہونے اور اخذ و نقل کرنے کی بے پناہ قوت وصلاحیت فرمائی ہے۔ بچوں کی تربیت کرنے اور کسی کام کی عادت ڈلوانے اور اصلاح کرنے میں اس نکتے کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہئے اور بچوں کے لئے اچھا ماحول، اچھی گفتگو، اچھی حرکات اور اچھے حالات و واقعات مہیا کرنے کی فکر رکھنا چاہئے اور یہ اہتمام کرنا چاہئے کہ بچوں کے سامنے بری عادتیں، بری گفتگو اور گندے واقعات وحرکات نہ آنے پائیں۔ بچے کے معصوم ذہن اور دماغ کی صاف تختی پر وہی کچھ ثبت ہو جائے گا۔ جو اس کے سامنے آئے گا اور بار بار آئے گا اور وہ خواہ مخواہ اس کی نقل کرے گا اور وہی اس کی عادت بنتی چلی جائے گی۔

آپ اپنے گھر کے چھوٹے اور ننھے منے بچوں کا جائزہ لیں، یہ آپ کی چھوٹی بچی روحی دوپٹہ اوڑھ کر نماز پڑھ رہی ہے۔ یہ دوسری بچی خدیجہ نہ قرآن کو جانتی ہے نہ نماز کو مگر قرآن ہاتھ میں لیے ہوئے ہونٹ ہلا رہی ہے۔ یہ بچہ وسیم ٹوپی اوڑھ کر نماز پڑھ رہا ہے اور بچوں کے درمیان درس قرآن کی مجلس جمائے ہوئے ہے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ اس نے اپنے گھر کے بڑوں کو مسلسل یہی کرتے دیکھا ہے اور اگر خدانخواستہ آپ کے یہاں قوالیوں کی مجلسیں جمتی ہیں، سگریٹوں کا دور چلتا ہے، گانے اور بجانے کا اہتمام رہتا ہے تو بچہ خواہ مخواہ انہی چیزوں کی نقل کرے گا اور انہی چیزوں میں اس کی دلچسپی ہوگی اور وہ قوال وشاعر بننے کی کوشش کرے گا۔ اگر آپ ڈاکٹر ہیں اور بچوں کے سامنے مریضوں کو دیکھتے ہیں ان کو دوائیں دیتے ہیں اور مشوروں سے نوازتے ہیں تو لامحالہ بچے یہی کھیل کھیلیں گے۔ کوئی ڈاکٹر بنے گا کوئی مریض بنے گا۔ آلہ لگا کر دیکھنے، انجکشن لگانے اور لال پیلی دوائیں دینے کا کھیل ہوگا۔ غرض جو چیزیں بھی بچوں کے سامنے بار بار آئیں گی اور جس قسم کی واقعات بھی دہرائے جائیں گے، بچے لامحالہ انہی کی نقل کریں گے اور انہی میں دلچسپی کا اظہار کریں گے۔ دراصل نقل اتار اتار کر ہی بچے سیکھتے ہیں اور یہ نقل اتارنا سیکھنے کا بڑا ذریعہ ہے۔ بچے جس چیز کی بار بار نقل اتارتے ہیں وہ ان کے دل میں پیوست ہو جاتی ہے۔ اب آپ کا کام ہے کہ آپ بچوں کے سامنے اچھے واقعات دہرائیں۔ اچھی چیزوں کی نقل اتارنے کے مواقع فراہم کریں۔ ان شاء اللہ بچے اچھی ہی چیزیں سیکھیں گے۔

ایک دیہات کا سچا واقعہ ہے۔ دیہات سے ذرا باہر کھیتوں اور میدانوں کے قریب ایک مسجد تھی۔ اس مسجد

کے امام صاحب قدرے خوش الحان تھے۔ قریب کے میدانوں میں کچھ بچے جو اہیر تھے۔ (اہیر ایک پس ماندہ ذات ہے یہ لوگ جانور پالتے ہیں اور دودھ فروخت کرتے ہیں)۔ یہ اہیر بچے وہیں اپنے جانور چراتے تھے۔ ایک دن دوپہر کے وقت مسجد کے نیچے سے سورہ فاتحہ پڑھنے کی آواز آرہی تھی۔ امام صاحب حیران ہوئے کہ دوپہر کے وقت کون یہاں قرآن پڑھ رہا ہے۔ باہر نکل کر دیکھا تو مسجد کی دیوار سے ٹیک لگائے ایک اہیر کا لڑکا سورہ فاتحہ کی تلاوت کررہا ہے اور امام صاحب کی نقل کررہا ہے۔ امام صاحب نے اس کو بلایا اور پوچھا کہ تمہیں یہ کیسے یاد ہوگئی۔ اس نے بتایا کہ شام کی نماز میں جب آپ پڑھتے ہیں' مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں سنتا ہوں اور مجھے یاد ہوگیا اور پھر اس نے کچھ اور بھی سنایا۔ امام صاحب بہت خوش ہوئے اور اس بچے کو کچھ اور بھی بتانا شروع کیا۔ اس نے اسلامی معلومات میں دلچسپی لی اور اللہ کا کرنا کہ وہ بچہ مسلمان ہوگیا۔ پھر اس کا داخلہ کسی عربی مدرسے میں کرادیا گیا۔ وہاں سے فارغ ہوکر وہ مدینہ یونیورسٹی میں پہنچا اور وہاں سے فراغت کے بعد وہ وہیں سعودی عرب میں رہ گیا اور وہیں کا ہورہا۔ نقل کی بدولت اس کو یہ سعادت نصیب ہوئی اور اس کی دنیا بدل گئی۔

روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ایک مشہور صحابی ابومخذورہ کی نوعمری کا واقعہ ہے۔ یہ نوعمر ابومخذورہ اذان کی نقل کرتے پکڑے گئے تھے اور اسی نقل نے ان کی کایا پلٹ دی اور یہ رسول اللہ ﷺ کے مشہور صحابیوں میں سے ایک ہوئے۔

واقعہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک سے واپس آرہے تھے۔ حضور ﷺ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ آپ رات کے اندھیرے میں شہر میں داخل نہ ہوتے تھے۔ مدینہ سے چند ہی میل کے فاصلے پر تھے کہ سورج غروب ہو گیا۔ آپ ﷺ نے وہیں پڑاؤ ڈال دیا اور لشکر اسلام نے خیمے تان لیے اور رات کو قیام کا انتظام کرنے لگے۔ موذن نے نماز کے لئے بآواز بلند اذان دی تو آس پاس کے دیہات کے بچے جمع ہوگئے اور موذن کی نقل کرنے لگے اور ایک شور ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان بچوں کو پکڑ لاؤ۔ صحابہ رضی اللہ عنہم پکڑنے کے لئے دوڑے۔ سارے بچے بھاگ گئے لیکن ابومخذورہ قدرے عمر میں بڑے تھے تو انہیں شرم محسوس ہوئی۔ یہ بھاگے نہیں بلکہ وہیں کھڑے رہے۔ لوگ ان کو حضور ﷺ کے پاس لے آئے۔

حضور ﷺ نے ابومخذورہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا: تم کیا کہہ رہے تھے۔ انہوں نے بڑی جرات اور بے باکی سے جواب دیا: اذان کی نقل کررہا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اچھا پھر سناؤ کیا کہہ رہے تھے۔ ابومخذورہ نے دہرایا۔ اللہ اکبر اللہ اکبر۔ مگر ذرا شرماتے ہوئے آہستہ آہستہ دہرایا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ابومخذورہ زور سے کہو' ابومخذورہ نے موذن کی طرح بآواز بلند پکار کر کہا: اللہ اکبر اللہ اکبر۔

حضور ﷺ نے فرمایا: اور آگے کہو تو ابومخذورہ نے قدرے دبی زبان میں کہا: اشہدان لا الہ الا اللہ۔ یہ چونکہ

توحید کا اعلان تھا' اور مشرکین اور اہل اسلام میں توحید و شرک کا ہی اختلاف تھا اس لیے ابو مخدورہ نے جھجکتے ہوئے آہستہ سے اس فقرے کو ادا کیا مگر حضور ﷺ نے کہا کہ اسی طرح زور سے کہو اور ابو مخدورہ نے دوبارہ زور سے یہی کلمہ دہرایا۔ مشرکین عرب اگر چہ توحید کے قائل نہ تھے لیکن اللہ کے قائل ضرور تھے اور کسی درجے میں توحید کے بھی حامی تھے۔ اس لیے کہ وہ زمین و آسمان اور عرش و کرسی کا خالق و مالک اللہ ہی کو مانتے تھے اور اللہ کو لاشریک بھی کہتے تھے..... وہ جملے دہراتے تھے لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اور قرآن پاک میں مشرکین مکہ کے بارے میں ہے:

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ○ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○

اگر تم ان سے پوچھو گے کہ ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا مالک و آقا کون ہے؟ تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔ (المومنون:۸۶)

اس لیے ابو مخدورہ نے اشہد ان لا الہ الا اللہ بھی بلند آواز میں کہہ دیا۔ مگر آگے جو جملہ تھا' اس کے پڑھنے کی ابو مخدورہ کو جرات نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے کہ اس میں حضرت محمد ﷺ کی رسالت و نبوت کا اعلان تھا اور یہی تو مشرکین عرب اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان اصل جھگڑا تھا۔ حضور ﷺ نے کئی بار ابو مخدورہ سے کہا کہ آگے پڑھو۔ مگر ان کو تامل تھا اور کہتے ہوئے جھجک رہے تھے' مگر اللہ کے رسول ﷺ کے بار بار کہنے سے ابو مخدورہ نے دبی زبان میں کہہ دیا:

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ

حضور ﷺ نے فرمایا: ابو مخدورہ زور سے کہو موذن کی طرح اور آخر کار ابو مخدورہ نے جب دوسری بار یہ جملہ پکارا تو ان کی پکار کسی عجمی بچے کی پکار تو نہ تھی' وہ تو عرب کا نوجوان تھا' جانتا تھا کہ وہ کس چیز کا اعلان و اقرار کر رہا ہے اور یہ جملہ کہتے ہوئے وہ کس چیز کی گواہی دے رہا ہے۔ اسی لیے جب اس فقرے کے دہرانے کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے ابو مخدورہ سے کہا: ابو مخدورہ اب تم جا سکتے ہو' تو ابو مخدورہ نے کہا: حضور ﷺ اب میں کہاں جا سکتا ہوں۔ اب تو میں آپ کا ہو گیا۔ میں نے آپ کی غلامی قبول کر لی۔ اب جانے کا کیا سوال؟

یہ مسئلہ تو فقہا کے درمیان کا ہے اور اس سے یہاں اس وقت کوئی بحث نہیں' شافعی فقہا کہتے ہیں کہ ترجیع یعنی ہر جملے کو دوبارہ دہرانا صرف اذان میں ہے اور حنفی فقہا کہتے ہیں کہ یہ تو رسول ﷺ نے تعلیم دی ہے اس لیے اقامت میں بھی ترجیع ہے مگر یہاں تو اس واقعہ کے بیان کا مقصد صرف یہ ہے کہ اذان کے الفاظ ابو مخدورہ نے بچوں کے ساتھ مل کر دہرائے تھے اور اذان کی نقل کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے تو یہ نقل اتنی مبارک ثابت ہوئی کہ اس نقل نے ابو مخدورہ کی کایا پلٹ دی اور وہ مسلمان ہو کر حضور ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں شامل ہو گئے اور رہتی دنیا

تک کے لئے قابل عزت واحترام بن گئے اور آج ہم ایک محترم صحابی کی حیثیت سے ان کے تذکرے کی سعادت حاصل کررہے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ماحول' صحبت اور واقعات کا بچوں کے ذہن پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اگر والدین یہ اہتمام کریں کہ بچوں کے سامنے اچھے واقعات آئیں' اچھی باتیں دہرائی جائیں' اچھا ماحول اور اچھے حالات مہیا رہیں تو ان کے بچے لازماً اچھی باتوں کی نقل کریں گے۔ اچھی باتیں دہرائیں گے اور یہ اچھی باتیں ہی ان کی عادت بنتی جائیں گی اور اس کی بدولت اللہ نے چاہا تو وہ ضرور صالح اور نیک بن کر اٹھیں گے۔ آپ یہ کوشش کریں کہ ان کے لئے نیک ماحول' نیک صحبت اور نیک باتیں سیکھنے کے مواقع فراہم کریں۔ ان شاء اللہ یقین ہے کہ آپ کی اولاد آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن کر اٹھے گی۔



# اخلاص نیت

عَنْ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَبِيْ حَفْصٍ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ لِدُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوِ امْرَاَةٍ يَّنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ (متفق علیہ)

''امیر المومنین، ابوحفص، عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ان کا بیان ہے کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرما رہے تھے:

اعمال کا سارا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کے لئے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی ہے، پس جس نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لئے ہے اور جس شخص نے دنیا کی خاطر یا کسی عورت سے شادی کرنے کی خاطر ہجرت کی ہے تو اس کی ہجرت اسی مقصد کے لئے ہے جس کی خاطر اس نے ہجرت کی ہے''۔

## راوی کا تعارف

اس حدیث کے راوی امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ کا نام عمر بن الخطاب ہے، آپ رضی اللہ عنہ کی کنیت ابو حفص ہے۔ حفص شیر کے بچے کو کہتے ہیں۔ آپ اپنی جرات بہادری اور شدت وقوت میں واقعی شیر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ رضی اللہ عنہ کو فاروق کے لقب سے نوازا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کی زندگی کا سب سے نمایاں وصف یہی تھا کہ آپ حق و باطل کو الگ الگ کر دینے والے تھے۔ حق و باطل میں کسی آمیزش کو آپ ہرگز برداشت کرنے والے نہ تھے، باطل کے لئے آپ ہمہ وقت ننگی تلوار تھے۔ اسلام لانے سے پہلے آپ اسلام کے حق میں بھی بڑے سخت اور شدید تھے، ایک بار اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے حق میں یہ دعا فرمائی:

اَللّٰهُمَّ اَعِزَّ الْاِسْلَامَ بِاَحَبِّ الرَّجُلَيْنِ اِلَيْكَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَوْ عَمْرِو بْنِ هِشَامٍ

(طبرانی، انس رضی اللہ عنہ)

''اے اللہ تو اسلام کو اس شخص کے ذریعے عزت وقوت دے جو عمر بن الخطاب اور عمرو بن ہشام

(ابوجہل) دونوں میں سے تیرے نزدیک زیادہ محبوب اور عزیز ہو"۔

اور اللہ نے عمر بن الخطاب کو اسلام سے مشرف فرمایا اور آپ ہی وہ پہلے جانباز ہیں جنہوں نے کھلم کھلا اپنے اسلام کا اعلان و اظہار کیا اور اللہ نے ان کے ذریعے نبی صادق و امین کی دعوت کو قوت و طاقت عطا فرمائی۔

## حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام

قریش کے سرداروں میں مشورہ ہوا کہ مکے میں جس شخص نے ہنگامہ برپا کر رکھا ہے (توبہ توبہ) اس کو قتل کرنا ہی اب ناگزیر ہے۔ اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کا اب یہی علاج ہے' مگر کون اس کی ہمت کرے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا میں یہ کام انجام دوں گا اور وہ گھر سے ننگی تلوار لے کر نکلے کہ آج اس شخص کو (توبہ توبہ) قتل کر کے ہی دم لوں گا اور روانہ ہو گئے۔ راستے میں حسنِ اتفاق سے نعیم بن عبداللہ ملے۔ عمر رضی اللہ عنہ کو ہتھیاروں سے مسلح اور ہاتھ میں ننگی تلوار دیکھ کر نعیم بن عبداللہ نے پوچھا: "خیر تو ہے؟ کہاں کا ارادہ ہے؟" بولے بتاؤ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہاں ہیں؟ ان کے تیور دیکھ کر نعیم سمجھ گئے کہ ضرور کوئی بات ہے۔ فرمایا: عمر! پہلے اپنے گھر والوں کی خبر تو لو' تمہاری بہن فاطمہ اور تمہارے بہنوئی سعید ابن زید دونوں مسلمان ہو گئے ہیں۔

یہ سنتے ہی عمر رضی اللہ عنہ غصے سے بے تاب ہو گئے۔ اسی وقت سیدھے بہن کے گھر پہنچے۔ دروازے پر پہنچے تو کان میں کلام اللہ کے پڑھنے کی آواز سنائی دی۔ غصے سے بری حالت ہو گئی۔ گھر والوں نے جلدی جلدی قرآن کے اجزاء چھپا دیئے۔ اب عمر رضی اللہ عنہ نے بہن کو مارنا شروع کیا۔ مارتے مارتے لہولہان کر دیا۔ تھک جاتے تو بیٹھ جاتے اور پھر دم لے کر مارنے لگتے۔ ایک نازک اندام خاتون اور ایک کڑیل جوان کی مار' جسم سے تازہ تازہ سرخ خون بہنے لگا۔ عمر رضی اللہ عنہ مارتے جاتے اور کہتے۔ اب بھی نام لو گی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا' چھوڑ دو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو' بہن روتے ہوئے کہتیں' بھیا' اب اس دل سے ایمان نہیں نکل سکتا۔ جسم کے ٹکڑے تو ہو سکتے ہیں لیکن دل سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ بہن کی یہ استقامت اور جسم سے سرخ خون دیکھ کر عمر رضی اللہ عنہ کا دل پسیج گیا' آنکھیں کھل گئیں اور بڑی عاجزی سے کہنے لگے۔ بہن دکھاؤ تم کیا پڑھ رہی تھیں۔ بہن نے پاک وصاف ہونے کے لئے کہا اور چند آیتیں پڑھنے کو دیں' پڑھتے گئے اور دل کی سیاہی دھلتی گئی۔ بے قرار ہو کر اٹھے اور سیدھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام کے فدا کاروں میں شامل ہو گئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا یہ واقعہ مکے کی تاریخ میں عام واقعات میں سے ایک واقعہ نہیں ہے۔ مکے میں اس واقعہ نے اسلامی تحریک کو ایک نیا موڑ دیا۔ ابن سعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبوت کے چھٹے سال ذوالحجہ میں مشرف با اسلام ہوئے۔ بزار اور حاکم نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تو مشرکین نے کہا' مسلمانوں نے آج ہم سے بدلہ لے لیا

اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ حَسْبُكَ ٱللَّهُ وَمَنِ ٱتَّبَعَكَ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ ۝

''اے نبی ﷺ! تمہارے لیے اور تمہارے پیرو اہل ایمان کے لئے تو بس اللہ کافی ہے''۔

ایک دن حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے پوچھا عمر! آپ کو فاروق کا لقب کیسے ملا۔ فرمایا:

''ابن عباس! ہوا یہ کہ میرے اسلام لانے سے تین دن پہلے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اسلام لا چکے تھے۔ اس کے بعد اللہ نے میرا سینہ اسلام کے لئے کھول دیا اور میرے سامنے یہ آیت آئی۔ ''اَللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی '' اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور سارے اچھے نام اسی کے لئے ہیں اور پھر تو یہ ہوا کہ روئے زمین پر رسول اللہ ﷺ سے زیادہ محبوب میرے لئے کوئی نہ تھا۔ میں اسی وقت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ کوہ صفا کے دامن میں دارارقم کے اندر مقیم تھے۔ اب میں ایمان کے لئے بے تاب تھا' وہاں پہنچ کر میں نے دروازہ اس قوت سے کھٹکھٹایا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھی گھبرا گئے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی وہیں تھے۔ انہوں نے لوگوں سے پوچھا کون ہیں۔ لوگوں نے بتایا عمر بن الخطاب ہیں۔ نبی ﷺ میری طرف بڑھے اور میرا دامن پکڑ کر گھسیٹا اور اس زور سے جھٹکا دیا کہ میں گرتے گرتے بچا اور فرمایا: عمر! کب تک کفر کی دلدل میں پھنسے رہو گے؟ یہ سننا تھا کہ بے اختیار میری زبان پر کلمۂ شہادت جاری ہو گیا۔ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں نے خوشی اور جوش میں اس زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ دارارقم اللہ اکبر کی صدا سے گونج اٹھا۔

اور میں نے اسی وقت رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم حق پر ہیں تو یہ حق کو چھپانا کیسا۔ آج تو کھلم کھلا مسجد حرام میں نماز پڑھی جائے گی۔ پھر ہم نے دو صفیں بنائیں' ایک صف میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ تھے اور ایک صف میں عمر بن الخطاب اور دونوں صفوں کے درمیان ہم رسول اللہ ﷺ کو لے کر مسجد حرام کی طرف نکلے۔

قریش نے یہ منظر دیکھا تو ان کے دل بیٹھ گئے۔ ان کے دونوں جانباز اس وقت رسول اللہ ﷺ کے جاں نثاروں میں تھے۔ انہیں بڑا صدمہ ہوا۔ شاید اس سے پہلے کبھی انہیں ایسا صدمہ نہ پہنچا ہو گا۔ اس دن جوش و خروش سے میری کیفیت عجیب تھی۔ میرے سینے سے ایسی آواز اٹھ رہی تھی جیسے چکی چل رہی ہو۔ اسی دن اللہ کے رسول ﷺ نے مجھے ''فاروق'' کے لقب سے نوازا اور اللہ نے میرے ذریعے حق و باطل میں فرق کر دیا۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ پہلے خلیفہ ہیں جن کو امیر المومنین کے لقب سے پکارا گیا۔ آپ اپنے علم' دینی بصیرت' دینی فہم'

دینی غیرت‘ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت اور جاں فروشی میں بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں۔ آپ کی شخصیت بڑی باعظمت تھی اور آپ کے رعب و دبدبہ سے ہر شخص لرزتا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی عظمت‘ علم‘ دین اور تقویٰ کی شہادت خود رسول اللہ ﷺ نے دی اور فرمایا: ”اگر میرے بعد نبوت کا دروازہ بند نہ ہوتا تو عمر نبی ہوتے“ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”یَا خَیْرُ النَّاسِ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ“ ”یعنی اے وہ انسان جو رسول اللہ ﷺ کے بعد سارے انسانوں سے بہتر ہے“۔ تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حیرت سے کہا ”عمر! آپ یہ الفاظ کہہ رہے ہیں جبکہ میں نے نبی ﷺ سے آپ کے بارے میں سنا ہے‘ یہ سورج عمر سے بہتر کسی انسان پر طلوع نہیں ہوا ہے“۔

ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کے گھر میں جانے کی اجازت چاہی‘ اس وقت قریش کی کچھ عورتیں نبی ﷺ سے گفتگو کر رہی تھیں اور اونچی آواز میں اپنے مطالبات پیش کر رہی تھیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اندر آنے کی اجازت ملی تو عورتوں نے جلدی جلدی اپنے اوپر اپنی چادریں ڈال لیں اور خاموش ہو گئیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ نبی ﷺ مسکرا رہے ہیں‘ کہا: ”یارسول اللہ ﷺ! خدا آپ ﷺ کو ہمیشہ مسکراتا رکھے‘ کیا بات ہے؟“ فرمایا: مجھے ان خواتین کی حالت پر تعجب ہے۔ بڑی بے خوفی کے ساتھ مجھ سے باتیں کر رہی تھیں مگر جونہی تمہاری آواز سنی سب نے جلدی جلدی اپنے اوپر چادریں ڈال لیں۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان عورتوں کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے ”اے نفس کی دشمنو! مجھ سے ڈر رہی ہو اور رسول اللہ ﷺ سے نہیں ڈرتیں۔ وہ بولیں: جی ہاں! یہ اس لئے کہ آپ بڑے تندمزاج اور سخت گیر ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ”ادھر سنو عمر! اس خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ اگر کسی شاہراہ پر شیطان تمہیں چلتا دیکھ لے تو پھر وہ اس شاہراہ پر چلنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ وہ ضرور اس کو چھوڑ کر دوسری راہ پر ہو لے“۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”عمر کے قلب اور زبان پر اللہ نے حق جاری فرما دیا ہے“۔ (ترمذی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے جب بھی کسی مسئلہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان اختلاف ہوا تو قرآن پاک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے موافق ہوا۔

حضرت قدامہ بن مظعون اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ شخص جب تک تمہارے درمیان ہے تب تک فتنوں کا دروازہ بند رہے گا“۔ (بزار)

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار حضور ﷺ کی خدمت میں جبریل امین نازل ہوئے اور فرمایا: یارسول

اللہ ﷺ عمر رضی اللہ عنہ سے سلام کہیے اور انہیں یہ اطلاع دیجئے کہ ان کا غصہ غلبہ ہے اور ان کی خوشنودی حکمت ہے"۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہادری' شجاعت اور غیر معمولی رعب داب اور مکہ میں ان کے دبدبے کا اندازہ ان کی ہجرت کے واقعے سے ہوتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے علانیہ ہجرت کی ہو' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب ہجرت کا عزم کیا تو کندھے پر کمان لٹکائی' ترکش میں تیر رکھے' ہاتھ میں تلوار اٹھائی اور اسی شان کے ساتھ خانہ کعبہ میں تشریف لائے۔ کعبہ میں قریش کے بڑے بڑے سردار بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے اسی شان کے ساتھ سات بار خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ مقام ابراہیم کے پاس دو رکعت نفل نماز ادا کی اور قریش کے سردار اپنے اپنے لوگوں کے ساتھ الگ الگ حلقوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ایک ایک سردار کے حلقے کے پاس پہنچے اور چیلنج دیتے ہوئے کہا: ''تمہارا برا ہو' میں ہجرت کر کے مدینے جا رہا ہوں' جو شخص اپنے بیٹے کو یتیم' اپنی بیوی کو بیوہ اور اپنی ماں کو بیٹے کے لئے رونے والی دیکھنا چاہے وہ مدینے کے راستے میں جنگل کے اس طرف آ کر میرا راستہ روک لے'' مگر کسی میں یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ آپ کا راستہ آ کر روکتا''۔

(ابن عساکر)

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا' اسلام کا غلبہ تھا' آپ کی ہجرت نصرت تھی اور آپ کی خلافت رحمت تھی۔ ہم میں یہ ہمت نہ تھی کہ کعبۃ اللہ میں نماز ادا کر سکیں لیکن جب عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایمان لائے تو آپ رضی اللہ عنہ نے مشرکین سے ایسا مقابلہ کیا کہ انہوں نے ہمارا پیچھا چھوڑ دیا اور ہم علانیہ کعبۃ اللہ میں نماز ادا کرنے لگے''۔ (ابن سعد' طبرانی)

حضرت صہیب روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب اسلام لائے تب اسلام ظاہر و غالب ہوا۔ اسلام کی طرف علانیہ لوگوں کو دعوت دی جانے لگی اور ہم کعبۃ اللہ کے گرد بیٹھنے' کعبۃ اللہ کا طواف کرنے اور مشرکین کو جواب دینے اور ان سے بدلہ لینے کے قابل ہو گئے۔

نبی ﷺ نے فرمایا: معراج کی رات میں نے ایک محل دیکھا جس کے صحن میں ایک کنیز تھی۔ میں نے پوچھا یہ کس کا محل ہے؟ فرشتوں نے بتایا یہ عمر بن الخطاب کا ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں اندر جاؤں اور محل کو دیکھوں' مگر عمر! مجھے تمہاری غیرت کا خیال آیا اور میں رک گیا۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان کیا میری غیرت آپ کے لئے بھی ہے؟

آپ کے علم اور بصیرت اور دینی فہم کے بارے میں عبداللہ ابن مسعود کہتے ہیں ''اللہ کی قسم! اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا علم و فہم ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور روئے زمین کے سارے زندہ انسانوں کا علم دوسرے پلڑے

میں رکھا جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہی پلڑا جھک جائے گا جس میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا علم وفہم ہوگا''۔ ان کے گہرے علم وفہم' ان کی ذہانت وفطانت' ان کی خدا رسی' زہد وقناعت' ان کی شفقت ورافت' نظم وضبط' مصالح مسلمین کی حفاظت اور خیر خواہی پر تمام ہی صحابہ متفق تھے۔

آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام غزوات میں شریک رہے اور نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے افضل ہیں اور ان دس صحابیوں میں سے ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی۔ آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ سو انتالیس حدیثیں روایت کی ہیں۔ دس سال چھ مہینے اور پانچ دن آپ نے خلافت کی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیا اور آخرکار ۶۳ سال کی عمر میں ''ابولؤلؤ'' کے خنجر سے زخمی ہو کر شہید ہوئے اور دنیا کی زندگی چھوڑ کر ہمیشہ کی زندگی پائی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن کیے گئے۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَعَنَّا اَجْمَعِيْنَ۔

## حدیث کی غیر معمولی جامعیت اور درجہ

عالم اسلام میں حدیث کی دو کتابیں بہت مقبول اور مشہور ہیں اور محدثین کے نزدیک کلام اللہ کے بعد انہی کا مقام ومرتبہ ہے۔ ایک امام المحدثین حضرت ابوعبداللہ محمد ابن اسمٰعیل البخاری کی کتاب صحیح البخاری اور دوسری امام المحدثین حضرت ابوالحسین مسلم ابن الحجاج النیشاپوری کی کتاب صحیح المسلم اور جس حدیث کو یہ دونوں ائمہ حدیث اپنی اپنی کتابوں میں نقل کریں وہ حدیث محدثین کی اصطلاح میں ''متفق علیہ'' کہلاتی ہے اور ایسی حدیث اونچے درجے کی حدیثوں میں مانی جاتی ہے۔ زیر غور حدیث متفق علیہ بھی ہے اور ان دونوں کتابوں کے علاوہ صحاح ستہ کی باقی چاروں کتابوں میں بھی ہے۔ یعنی ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث آدھا اسلام ہے' اس لئے کہ اسلام کا آدھا ظاہر ہے جس کو عمل کہا جاتا ہے اور آدھا باطن ہے جس کو نیت کہا جاتا ہے اور یہ حدیث باطن سے یعنی نیت سے بحث کرتی ہے اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ احادیث نبوی کے مجموعے میں کوئی اور ایسا فرمان نہیں ہے جو اس قدر جامع' زندگی کے ہر مسئلہ پر حاوی اور ہر موقع اور محل کے لئے ضروری اور مفید ہو۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ' ابن مہدی رحمۃ اللہ علیہ' ابن المدینی رحمۃ اللہ علیہ اور دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ فرماتے ہیں: ''یہ حدیث ایک تہائی علم ہے'' اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو ایک تہائی علم کہنے کی توجیہ یہ بیان کی ہے کہ انسانی اعمال کا صدور تین چیزوں سے ہوتا ہے: دل ... جسم ... کا عمل ہے اور

سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ قابل ترجیح ہے۔ اس لئے کہ نیت خود ایک مستقل عبادت ہے۔ اس کے برخلاف زبان اور دوسرے اعضاء کے عمل کی قبولیت کا دارومدار نیت پر ہے۔ ایک روایت میں ہے ''مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے''۔ (نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِّنْ عَمَلِهِ) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس حدیث سے فقہ کے ستر باب کھلتے ہیں۔ غرض محدثین کرام نے حدیث کی عظمتِ شان، اہمیت اور مقام و مرتبے پر مختلف پہلوؤں سے گفتگو کی ہے اور اس کے معارف و حکم پر اظہار خیال کرتے ہوئے نہایت اہم نکتوں کی وضاحت کی ہے۔

حدیث کی اہمیت اور مقام اس پہلو سے بھی ہے کہ اس حدیث کے راوی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت قریب تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کو ہر وقت کی صحبت و قربت حاصل تھی۔ روایت کی اہمیت اور عظمت کو سمجھنے کے لئے یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ چونکہ حدیث بیان کرنے اور حدیث قبول کرنے کے سلسلہ میں نہایت سخت اور محتاط تھے اسی لئے آپ کی مرویات بہت کم ہیں۔ ساتھ ہی یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ صحاح ستہ کے محدثین کرام نے بھی اور بعض دوسرے محدثین نے بھی یہ حدیث حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہی سے روایت کی ہے۔ فن حدیث میں حدیث کی درجہ بندی اور اصطلاحات کے لحاظ سے یہ حدیث مشہور صحیح ہے۔ مشہور کا مطلب یہ ہے کہ صحابہ کے بعد کسی دور میں بھی اس کے راوی تین سے کم نہ ہوں اور صحیح کا مطلب یہ ہے کہ اس میں چار باتیں پائی جاتی ہوں یہ کہ اس کی سند متصل ہو، درمیان کے کسی دور میں اس کا کوئی راوی ساقط نہ ہو، یہ کہ اس کے سارے راوی ثقہ عادل ہوں اور ان کا حافظہ درست اور قابل اعتبار ہو، یہ کہ اس میں کوئی شذوذ نہ ہو، یعنی کوئی ثقہ راوی دوسرے راوی کی مخالفت نہ کرتا ہو اور یہ کہ اس میں کوئی ایسی علت نہ ہو جس کا اثر سند پر پڑتا ہو۔

اپنے مفہوم و مدعا اور فن کے لحاظ سے بھی یہ حدیث مدار اسلام اور معارف و مسائل کا سرچشمہ ہے۔ چند لفظوں میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ عظیم قائدہ کلیہ بیان کیا ہے جو زندگی کے تمام افکار و اعمال پر نہ صرف حاوی ہے بلکہ ان کو صحیح رخ دینے کی ضمانت ہے۔ اعمال کو خدا کی نظر میں قابل قبول بنانے اور نیک کو بد اور صحیح کو غلط سے ممتاز کرنے کا تمام تر دارومدار اسی قاعدۂ کلیہ پر ہے۔

## محدثین کا طرز عمل

حدیث کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر ممتاز علماء حدیث نے تواتر کے ساتھ اس حدیث کو نقل کیا ہے اور بالعموم اپنے حدیث کے مجموعوں کا آغاز اس حدیث سے کیا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی صحیح بخاری کے آغاز میں یہ حدیث نقل کی ہے اور صاحب مشکوٰۃ نے اس حدیث کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ نہ صرف اس حدیث سے مشکوٰۃ

کا آغاز کیا ہے بلکہ اس حدیث کے لئے کوئی باب یا عنوان بھی نہیں رکھا ہے۔ باب، فصل یا عنوان کی قید سے آزاد صرف حدیث نقل کر دی ہے اور یہ بلیغ اشارہ ہے اس حقیقت کی طرف کہ یہ حدیث اپنی غیر معمولی اہمیت، جامعیت اور پوری زندگی کے اعمال پر حاوی ہونے اور اعمال صالح بنانے کی وجہ سے اس لائق ہے کہ اس کو کسی باب یا عنوان کے تحت محدود کرنا مناسب نہیں۔ صاحب مشکوٰۃ کے علاوہ بھی بہت سے محدثین نے اپنی کتابوں کی ابتدا اسی حدیث سے کی ہے اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تینوں کتابوں ریاض الصالحین، الاذکار اور الاربعین کا آغاز اسی حدیث سے کیا ہے بعض محدثین نے حدیث کی اہمیت واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر سو کتابیں بھی حدیث کی مرتب کرنی ہوں تو سب کی ابتدا اس حدیث سے کی جا سکتی ہے اور بعض علماء نے کہا کہ اس حدیث سے اپنی کتاب کا آغاز کرنا مستحب ہے۔



# تذکیر و تفہیم

## حدیث کا پس منظر

طبرانی نے اپنی کتاب المعجم الکبیر میں قوی سند کے ساتھ عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ''ہم لوگوں میں ایک شخص تھا' جس نے ایک عورت کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ عورت نے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ یہ کام اسی وقت ہو سکتا ہے جب تم مدینے ہجرت کر کے آ جاؤ۔ اس شخص نے اس مقصد کے لئے مدینے کو ہجرت کی اور اس عورت سے اس کی شادی ہو گئی...... یہ وہ وقت تھا جب مسلمان ہجرت کر کے مدینے آ رہے تھے اور ہجرت ان حالات میں ایک عظیم عمل تھا۔ اپنے گھر بار' عزیز و اقارب' مال و جائیداد ہر چیز کو محض اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کی خاطر چھوڑ کر کسی اجنبی شہر میں آ بسنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ یہ عمل وہی کر سکتا تھا جس کو واقعی اللہ اس کا رسول اور دین' اپنے وطن' اپنے عزیز و اقربا اور اپنے مال و جائیداد سے زیادہ عزیز ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت ہجرت کا عمل دراصل اس بات کا ثبوت تھا کہ اس شخص کو واقعی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں۔ ہجرت اس حقیقت کی یقینی علامت تھی کہ یہ شخص اپنے ایمان و عمل میں واقعی مخلص ہے اور اسی لئے اس سوسائٹی میں مہاجر کا بڑا اونچا مقام تھا۔ مہاجر کو لوگ بڑے عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے اور بڑا اکرام کرتے تھے۔ انہی حالات میں اسی سوسائٹی میں ایک ایسا شخص بھی تھا جو اپنا وطن چھوڑ کر مدینے تو آیا تھا لیکن اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر نہیں بلکہ ایک عورت سے شادی رچانے کی خاطر آیا تھا۔ اس لئے مدینے میں لوگ اس کو مہاجر نہیں بلکہ مہاجر ام قیس کے نام سے پکارتے تھے۔ دنیا میں بھی یہ شخص مہاجر ام قیس کہلایا اور آخرت میں بھی یہ اپنی نیت کے مطابق ہی اجر پائے گا' یہ شخص اس اعزاز و اکرام اور اجر و انعام کا مستحق ہرگز نہیں ہو سکتا' جو ان مخلص بندوں کے لئے ہے جنہوں نے محض اللہ اور رسول کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ کر ہجرت کی اور ایک اجنبی شہر میں آ بسے۔

*مدینے میں یہ حالات اور یہ چرچے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر رونق افروز ہوئے اور آپ نے ایک نہایت ہی جامع اصولی حقیقت امت کو بتائی۔ آپ نے فرمایا: سارے اعمال خیر کا دارومدار نیت پر ہے اور پھر اس حقیقت کو ذہن نشین کرانے کے لئے ہجرت کے عظیم عمل اور مہاجر ام قیس کے واقعے کو بطور مثال پیش فرمایا۔*

## فرمان رسول ﷺ کا ماخذ

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۤؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ

''اللہ کو نہ ان کے گوشت پہنچتے ہیں، نہ خون، بلکہ اس کو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے''۔

یہ آیت دراصل قربانی کے بیان کے سلسلے کی ہے اہل عرب جانوروں کو اللہ کی راہ میں قربان کرکے، اس کا گوشت بیت اللہ کے سامنے لاکر رکھتے اور اس کا خون بیت اللہ کی دیواروں پر لتھیڑتے۔ اس سلسلے میں قرآن نے یہ حقیقت ذہن نشین کرائی کہ عمل کی صحت وقبولیت کا دارومدار ظاہر پر نہیں بلکہ ارادے اور نیت پر ہے۔ دل کے تقویٰ کا جائزہ لو، اللہ کو گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ وہ اس جذبے کو قبول کرتا ہے جس جذبے نے تم سے یہ عمل کرایا ہے۔

یہی بات ہابیل اور قابیل کے واقعے میں بھی قرآن نے ذہن نشین کرائی ہے جب قابیل کی قربانی قبول نہ ہوئی اور اس نے طیش میں آکر ہابیل کو قتل کردینے کی دھمکی دی اور ہابیل نے اسے یہی حقیقت سمجھائی کہ عمل کی قبولیت کا تمام تر دارومدار نیت اور قلب کی کیفیت پر ہے۔ قلب میں اللہ کی محبت اور خوف کا نام تقویٰ ہے۔ اگر یہ تقویٰ عمل کا محرک ہے تو ضرور عمل قبول ہوگا۔ لیکن عمل کی ظاہری شکل خواہ کتنی ہی اچھی اور خالص عبادت وقربانی ہی کیوں نہ ہو، اس کی بنیاد اور اس کا اصل محرک اگر تقویٰ نہیں ہے تو دربار الٰہی میں اس کا کوئی مقام نہیں۔ اس کی قبولیت کا کوئی سوال نہیں۔ قرآن پاک کی یہی اصولی تعلیم فرمان رسول ﷺ کا اصل ماخذ ہے۔

## نیت کا تعلق سارے اعمال سے ہے نہ کہ ہجرت سے

یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ ہجرت اور مہاجر ام قیس کا واقعہ حضور ﷺ نے بطور مثال بیان فرمایا ہے۔ جس طرح کہ قرآن نے قربانی کے ذیل میں اصولی حقیقت ذہن نشین کرائی ہے ورنہ نیت کا تعلق زندگی کے تمام اعمال کی صحت وقبولیت سے ہے۔ نیت کا انقلابی تاثر اور فیصلہ کن حیثیت صرف ہجرت تک محدود نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے پہلے ایک جامع اصول اور قاعدہ کلیہ بیان فرمایا ''تمام اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اور ہر ایک کے لئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی ہے''۔ اس اصول اور قاعدہ کلیہ کے بعد پھر بطور مثال ہجرت کا عظیم عمل اور مہاجر ام قیس کا واقعہ بیان فرمایا اور بتایا کہ دونوں اعمال میں زمین وآسمان کا جو فرق ہے وہ نیت کی وجہ سے ہے۔

## ہجرت یا ترک وطن

عہد حاضر میں ہر طرف جو کشاکش برپا ہے اور آئے دن انقلابات کی خبریں آتی رہتی ہیں اور لوگ ادھر سے ادھر مختلف وجوہ سے منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ''ہجرت'' کی دینی اصطلاح بڑی حد تک اپنے حقیقی مفہوم سے محروم ہوگئی ہے اور ہر اس شخص کے سفر کو ہجرت کہہ دیا جاتا ہے جو اپنے وطن سے دوسرے وطن چلا گیا

ہے۔ خواہ وہ مجبوراً گیا ہو یا اپنی کسی دنیوی ضرورت سے گیا ہو۔ دراصل ہجرت اور ترک وطن میں جوہری فرق ہے۔ ہجرت یہ ہے کہ ایک شخص اس مجبوری سے اپنا وطن' اپنا گھر بار اور اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی دوسری بستی میں منتقل ہوتا ہے کہ اپنے وطن میں اس کا دین وایمان محفوظ نہیں ہے۔ لوگ اسے اپنے دین وایمان کے مطابق عمل کرنے نہیں دیتے۔ اس مجبوری میں وہ اپنا دین وایمان بچانے کے لئے کسی ایسے ملک میں منتقل ہوتا ہے جہاں اس کا دین وایمان محفوظ رہے اور وہ اپنے دین وایمان کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزار سکے جیسا کہ مسلمانوں نے ابتدائی دور میں مکے سے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی یا کسی دارالکفر سے مسلمان دارالاسلام کی طرف ہجرت کریں یا کسی ایسے ملک کی طرف ہجرت کریں جہاں وہ آزادی کے ساتھ اللہ کی بندگی کرسکیں اور جہاں اپنے دین کے تقاضوں کے مطابق نظامِ زندگی قائم کر کے اس ملک کو دارالاسلام بنا سکیں جیسا کہ مسلمانوں نے مکے سے مدینے کو ہجرت کی اور وہاں پہنچ کر دینی نظام قائم کر کے پوری زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھالا۔

ہجرت یہ نہیں ہے کہ آدمی مختلف دنیوی اغراض سے ایک ملک چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا بسے۔ معاشی خوشحالی کے لئے' کاروبار بڑھانے کے لئے' جان و مال بچانے کے لئے۔ آج کل لوگ اپنا ملک چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں پہنچتے ہیں' اس لئے بھی کہ انقلاب زمانہ سے اپنے وطن میں لوگ ان کے درپے آزار ہیں' نہ ان کی جان محفوظ ہے' نہ ان کی عزت وآبرو اور وہ اپنی جان اور عزت وآبرو بچانے کے لئے دوسرے ملکوں میں پناہ لیتے ہیں' نہ اپنے وطن میں انہیں اللہ اور رسول ﷺ اور اس کے دین سے سروکار تھا' نہ سفر کے دوران انہیں اللہ کا دین یاد آیا اور نہ دوسرے ملک میں پہنچ کر اپنی دنیا بنانے کے سوا ان کے پیش نظر کوئی اور مقصد ہے۔ وہ اپنے سفر کے واقعے کو ہجرت کی دینی تاریخ سے جوڑتے ہیں اور خود کو مہاجر کہتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ مہاجر نہیں' تارکین وطن ہیں' ہجرت کی مقدس اصطلاح کے تقدس کو ختم کرنے والے ہیں۔ کیا نسبت ہے ان کے سفر کو مہاجرین مدینہ کی ہجرت اور بے مثال قربانیوں سے' اسی طرح جو لوگ خوشحالی کی زندگی کی فکر میں' اونچی اونچی ملازمتوں کی تلاش میں عیش وسکون کی زندگی گزارنے کی خاطر یا ایسی ہی دوسری دنیوی اغراض کے لئے دوسرے ملکوں میں منتقل ہوئے۔ ان کے ترک وطن کو بھی ہجرت کہنا صحیح نہیں ہے۔ اللہ کے دین سے بے نیاز زندگی گزارنے والے اس کی عبادت و بندگی سے آزاد اور بے پروا لوگ جو محض اپنی دنیا بنانے اور دنیوی اغراض کے تحفظ کی خاطر ترک وطن کرتے ہیں ان کے لئے مہاجر کا لفظ استعمال کرنا صحیح نہیں' نہ ان کو یہ حق ہے کہ وہ اس لفظ کو استعمال کر کے دین کی ایک باعظمت اور مقدس اصطلاح کو بے وقعت بنائیں۔

## ایک عام شبہ کا ازالہ

اس گفتگو کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ معاشی خوشحالی کے لئے جدوجہد' اونچی ملازمتوں کے حصول کی کوشش اور

اس کے لئے سفر' اپنے کاروبار پھیلانے اور بڑھانے کے لئے جدوجہد اور سفر یا کسی عورت سے شادی کرنے یا کسی اور دنیوی غرض کے لئے سفر کرنا کوئی جرم یا کوئی ناپسندیدہ اور معیوب عمل ہے۔ان کاموں کے لئے جدوجہد کرنا بھی جائز' ان کے لئے سفر اور ترک وطن بھی مباح ہے بلکہ بعض حالات میں یہ پسندیدہ اور مندوب بھی ہوسکتا ہے اور اگر سفر خالص دنیوی غرض سے کر لینے کے بعد نیت میں اخلاص وللّٰہیت پیدا کر لی جائے تو انسان اجر وثواب کا مستحق بھی بن سکتا ہے لیکن ان مقاصد کی خاطر ترک وطن کا مقام اللہ کی نظر میں وہ ہرگز نہیں ہوسکتا جو ہجرت کا ہے اور نہ ان مقاصد سے ترک وطن کرنا ہجرت کہلا سکتا ہے۔ہجرت کی اصل روح یہ ہے کہ آدمی اللہ کے دین پر آزادی کے ساتھ عمل کرنے کی خالص نیت کے ساتھ اپنا وطن چھوڑے اور اس کی تڑپ یہ ہو کہ وہ اللہ کی فرماں برداری کی زندگی گزار سکے اور اس کا مخلص اور وفادار بندہ بن سکے۔حضور ﷺ نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا۔

''اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ''

''مہاجر دراصل وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے روکا ہے''۔

اب جو شخص ترک وطن کرتے ہوئے یہ سوچتا بھی نہیں ہے کہ اللہ نے کیا کچھ حرام کیا ہے اور مسلمانوں کو کن کن چیزوں سے روکا ہے۔کیا حلال ہے اور کیا حرام' مسلسل بے عملی اور بدعملی کی زندگی گزار رہا ہے نہ عام زندگی میں دین کا کچھ پاس ولحاظ ہے اور نہ سفر کے دوران دین کے امر ونواہی کی طرف کوئی دھیان ہے۔دنیوی خوشحالی' عیش وعشرت اور معیار زندگی کو بلند کرنا اس کا مقصد ہے اور اسی کی خاطر اس نے اپنے وطن کو خیر باد کہا ہے یا وطن سے جان ومال بچا کر بھاگا ہے تو ظاہر ہے ایسے سفر کو ہجرت نہیں کہا جاسکتا اور نہ ایسے شخص کو مہاجر کہہ سکتے ہیں۔صحابہ کا عمل اس سلسلہ میں ہمارے لئے بہترین مثال ہے کہ ایک شخص اسی شہر میں آیا ہے جہاں مہاجرین ہجرت کر کے پہنچ رہے تھے لیکن چونکہ وہ ایک عورت سے شادی رچانے کی خاطر مدینے پہنچا تھا اس لئے صحابۂ کرام نے امتیاز کی خاطر اس کو مہاجر نہیں کہا بلکہ مہاجر ام قیس کے نام سے یاد کیا۔

## الاعمال سے مراد اعمال خیر

''اعمال کا دارومدار نیت ہی پر ہے'' حضور ﷺ کے اس ارشاد میں اعمال سے مراد سارے اچھے برے اعمال نہیں ہیں بلکہ صرف اعمال خیر مراد ہیں۔عربی زبان میں کسی عام اسم پر جب الف لام داخل کر دیتے ہیں تو وہ اسم خاص ہو جاتا ہے اور اس کے مفہوم میں تحدید' تعین اور تخصیص پیدا ہو جاتی ہے۔حضور ﷺ کے ارشاد کا متعین اور قطعی مفہوم یہ ہے کہ اعمال خیر کا دارومدار نیت پر ہے۔اعمال خیر سے مراد وہ سارے اعمال ہیں جن کو شریعت اسلامی نے خیر کہا ہے اور جن کو انسانی فطرت اور انسانی عقل بھی خیر سمجھتی ہے۔خواہ وہ فرائض وواجبات ہوں یا مندوبات یا مباحات۔بلاشبہ نیت میں انقلابی قوت اور غیر معمولی تاثیر ہے۔لیکن نیت کی یہ غیر معمولی تاثیر اعمال

صالحہ تک ہی محدود ہے۔ اعمال بد میں نیت غیر موثر ہے۔ تمام اعمال بد جن کو شریعت اسلامی نے بد قرار دیا ہے اور جن کو انسانی عقل وفطرت بھی بد سمجھتی ہے وہ کسی بھی نیت سے کئے جائیں بہر حال اعمال بد ہیں۔ مثلاً یتیم کا مال کھانا' بیوہ پر ظلم کرنا' کسی بے گناہ کو قتل کرنا' کسی کا حق مارنا' کسی کی زمین دبانا یا مال غصب کرنا' کسی خاتون کی آبرو ریزی کرنا وغیرہ۔ یہ سارے اعمال بد ہیں۔ شریعت کی نظر میں بھی اور عام انسانیت کی نظر میں بھی۔ ان اعمال بد کا ارتکاب کرنے والا کچھ بھی نیت کرے' اعمال بد میں نیت کی تاثیر کارگر نہیں ہوتی ...... یہ اعمال بد ہیں۔ اعمال بد ہی رہیں گے۔ اچھی نیت کے اظہار سے یہ اعمال بد اعمال خیر نہیں بن سکتے۔

حضور ﷺ کے ارشاد کا قطعی مطلب یہ ہے کہ وہ سارے اعمال جن کو شریعت نے نیک اعمال قرار دیا ہے اور انسانی فطرت بھی جن اعمال کو نیک قرار دیتی ہے اور عام انسانیت کے نزدیک جو اعمال معروفات میں شمار ہوتے ہیں' ان کا دارومدار نیت پر ہے۔ نیت کے مطابق ہی اللہ کی نظر میں ان کی قدر و قیمت ہوگی۔ ان کے پسند یا ناپسند ہونے' ان کے صحیح یا غلط ہونے' ان کے قابل قبول یا قابل رد ہونے اور ان کے قابل اجر وثواب یا قابل زجر و عذاب ہونے کا تمام تر دارومدار نیت پر ہوگا۔ عمل کرنے والے کی نیت میں اگر اخلاص وللّٰہیت ہے تو وہ نیک عمل اللہ کے یہاں مقبول اور موجب اجر وثواب ہوگا اور اگر نیت میں کوئی کھوٹ' خرابی اور محض دنیا طلبی اور نمود ونمائش ہے تو جو عمل بظاہر نیک ہے اور شریعت کی نظر میں اعمال صالحہ ہی کی فہرست میں ہے۔ وہ نیت کی کھوٹ اور دنیا طلبی کی وجہ سے آخرت کے بازار میں کھوٹا سکہ ثابت ہوگا اور وہاں اس کی کوئی قیمت نہ لگے گی۔ باعث اجر وثواب تو کیا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ موجب غضب وعذاب بن جائے۔

## اِنَّمَا لِکُلِّ امْرِیٍٔ مَانَوٰی

"ہر شخص کے لئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی"۔

حدیث کا یہ فقرہ جوامع الکلم میں سے ہے۔ اس میں معانی اور ہدایات کی ایک دنیا آباد ہے۔ اس جامع ترین فقرے سے نیت کی غیر معمولی اہمیت اور فیصلہ کن حیثیت سے متعلق کتنی ہی اصولی ہدایات ملتی ہیں۔ اس سے یہ اصولی اشارہ بھی ملتا ہے کہ انسانی اعمال وافعال کی حیثیت اور ان میں باہم فرقِ مراتب کا تعین نیت ہی سے ہوتا ہے اور کوئی عمل عادت ہے یا عبادت' اس کا فیصلہ بھی نیت ہی کرتی ہے۔ یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ حسن نیت بجائے خود نیکی ہے اور یہ اصولی روشنی بھی ملتی ہے کہ کسی عمل خیر کا اخروی اجر ایمان کے بغیر ممکن نہیں' ان اصولی اشارات کو ہم کسی قدر تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

## نیت ہی سے عمل کی حیثیت و مرتبے کا تعین

کسی عمل کی دینی حیثیت اور مرتبے کا تعین نیت سے ہوتا ہے۔ ایک شخص چار رکعت نماز ادا کر رہا ہے۔ اتنی

بات تو ظاہر ہے مگر یہ چار رکعت نماز فرض ہیں یا نفل عصر کی چار رکعت ہیں یا ظہر کی' قضا نماز ہے یا نذر و منت کی۔ ان ساری باتوں کا فیصلہ اور عبادت کی نوعیت و حیثیت کا تعین کرنے والی چیز نمازی کی نیت ہے۔ پھر یہ نماز اللہ کی مقبول ہے یا مردود' قابل اجر و ثواب ہے یا قابل زجر و عذاب۔ ریا کاری کی نماز ہے یا خوشنودی ربّ کی' اس کا فیصلہ بھی نیت ہی کی بنیاد پر ہوگا۔

اسی طرح ایک شخص نہ دن بھر کھاتا ہے نہ پیتا ہے' نہ خواہشات نفس پوری کرتا ہے' اس شخص کا یہ ترک عمل عادت ہے یا عبادت' یہ شخص روزے سے ہے یا فاقے سے' یہ ثواب کا مستحق ہے یا محروم ہے۔ اس کا فیصلہ بھی اس شخص کی نیت کی بنیاد ہی پر ہوگا۔ اگر اس نے اللہ کی عبادت کی نیت اور ارادے سے کھانا پینا وغیرہ چھوڑا ہے تو وہ روزے دار ہے اور اگر اس نے عادت یا ضرورت سے ایسا کیا ہے تو وہ روزے دار نہیں ہے اور روزے کے اجر و ثواب کا وہ مستحق نہیں بلکہ اس کے لئے صرف اس مقصود کے حصول کی توقع کی جا سکے گی جس کے لئے وہ بھوکا پیاسا اور خواہشاتِ نفس سے مجتنب رہا ہے۔



اعمال و افعال کی حیثیت اور اثرات میں اصل فیصلہ کن چیز نیت ہے۔ نیت ہی کی بنیاد پر ایک شخص ثواب اور جنت کا مستحق بنتا ہے اور نیت ہی کی بنیاد پر عذاب اور جہنم کا' حضور ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا۔

''جب دو مسلمان تلواریں سونت کر ایک دوسرے کے مقابل آ جائیں (اور ایک دوسرے پر وار کرنے لگیں) تو اس لڑائی میں قتل کرنے والا اور قتل ہونے والا دونوں جہنم میں جائیں گے۔ جب حدیث کے راوی حضرت نفیع بن حارث ثقفی نے حضور ﷺ سے پوچھا قاتل کی بات تو واضح ہے (کہ اس نے ایک کلمہ گو کو قتل کیا ہے) لیکن مقتول کیوں جہنمی ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: اس لئے کہ وہ مقابل کو قتل کرنے کے درپے تھا۔ (اور اسی ارادے سے قاتل پر وار کر رہا تھا۔ یہ اتفاق ہے کہ اس کا وار خالی گیا اور وہ خود قتل ہو گیا)''۔

اس حدیث سے اتنی بات تو صراحت سے معلوم ہوتی ہے کہ قاتل بھی جہنمی ہے اور مقتول بھی۔ قاتل کا معاملہ تو صاف ہے کہ اس نے ایک کلمہ گو کو قتل کیا ہے اور وہ خلود فی النار کی سزا پائے گا لیکن مقتول کے بارے میں سوال ابھرتا ہے اور اس کا جواب بھی حضور ﷺ نے دیا کہ چونکہ وہ بھی ایک کلمہ گو کو قتل کرنے کے ارادے سے ہی تلوار سونت کر مقابل پر وار کرنے کے لئے میدان میں اترا تھا۔ اسی لئے وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکنے کے باوجود اپنے ارادے اور نیت کی وجہ سے جہنمی ہے۔ رہا یہ سوال کہ دونوں کی ایک سزا ہوگی یا فرق ہوگا تو اس کا جواب یہ ہے کہ قاتل تو خلود فی النار کی سزا کا مستحق ہوگا۔ البتہ مقتول کی سزا خلود فی النار نہ ہوگی۔

## حسن نیت بجائے خود نیکی ہے

''ہر شخص کے لئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی'' اس کلمہ جامعہ سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ حسن نیت

بجائے خود نیکی ہے۔ نیت دراصل اس قصد و ارادے کو کہتے ہیں جس سے کوئی عمل وجود میں آتا ہے اور یہ قصد و ارادہ ہی عمل کی اصل غرض و غایت اور مقصود ہوتا ہے۔ فرمان رسول ﷺ کے الفاظ یہ ہیں ''جس شخص نے جو نیت کی اس کے لئے وہی ہے یعنی ہر شخص کو اس کی نیت کا پھل اور مقصود حاصل ہوگا۔ اس سے یہ سمجھنے کی پوری گنجائش ہے کہ عمل کے بغیر حسنِ نیت کا پھل ملے گا اس لئے کہ نیت دراصل قلب کا ایک عمل ہے اور عملِ خیر پر اللہ نے اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا ہے اس لئے محض اچھی نیت پر بھی انسان اجر و ثواب کا مستحق ہے۔ چاہے وہ اعضاء و جوارح سے اپنی نیت کے مطابق عمل نہ کر سکے۔ نیک نیتی قلب کا ایک عمل خیر ہے اور وہ بجائے خود ایک نیکی ہے۔ ایک شخص عملاً کسی کے ساتھ کوئی بھلائی اور سلوک کے موقف میں نہیں ہے لیکن دل میں نصح و خیر خواہی کے جذبات رکھتا ہے اور دل سے دوسروں کا بھلا چاہتا ہے تو وہ اپنی نیک نیتی کا اجر و ثواب ضرور پائے گا۔ دراصل حسن نیت خود ایک مستقل عبادت ہے۔

ایک شخص حج، جہاد، خدمتِ خلق اور بندگانِ خدا پر خرچ کرنے، کمزوروں، محتاجوں اور ناداروں کے ساتھ سلوک کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور اس شوق، تڑپ اور جذبے سے اس کا سینہ سرشار ہے لیکن اسے مواقع میسر نہیں ہیں، وسائل مفقود ہیں۔ حالات ساتھ نہیں دے رہے ہیں اور وہ عملی طور پر کچھ کرنے کی سعادت سے محروم ہے تو ایسے شخص کو بھی اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے نیک نیتی کے اجر و ثواب سے ضرور نوازے گا۔ نیک نیتی خود ایک مستقل نیک عمل ہے اور حسنِ نیت کا ثواب اسی وقت لکھ دیا جاتا ہے۔

غزوۂ تبوک اسلامی غزوات میں نہایت ہی اہم غزوہ تھا۔ اس میں شرکت غیر معمولی سعادت اور اخلاص کی ایک کسوٹی تھی۔ جو لوگ اس میں شرکت نہ کر سکے ان کو ملامت کی گئی۔ ان کے ایمان کو غیر معتبر قرار دیا گیا اور ان کو مجرم قرار دے کر رسول ﷺ کو ان سے بے تعلق رہنے کی ہدایت دی گئی لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس غزوہ میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ اپنے گھروں پر ہی رہے لیکن قرآن نے صاف صاف کہا کہ ان پر نہ کوئی اعتراض کیا جا سکتا اور نہ قابل ملامت ہیں بلکہ ان کے آرزوئے جہاد اور اللہ کی راہ میں نکلنے کی تڑپ کو قرآن نے نہایت رقت آمیز انداز میں بیان کر کے ان کے اخلاص و ایمان کو پیش کیا اور اس قدر موثر اسلوب میں ان کے کردار کی تصویر پیش کی کہ بے اختیار آنسو نکل پڑتے ہیں اور ان کے تذکرے سے دل ایمان کی گرمی پاتا محسوس ہوتا ہے۔

وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ۝ (التوبۃ ۹۲)

''اور نہ ان لوگوں پر کوئی اعتراض اور ملامت کا موقع ہے جنہوں نے خود آ کر آپ ﷺ سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لئے سواریاں مہیا نہیں کر سکتا تو وہ مجبوراً واپس ہو گئے اور حال یہ تھا کہ ان

کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے انہیں اس بات کا بڑا رنج تھا کہ وہ اپنے خرچ پر شریک جہاد ہونے کی مقدرت نہیں رکھتے''۔

اس آیت سے اوپر تین قسم کے لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ضعیف و کمزور' مریض اور وہ لوگ جو جہاد کے لئے مالی تعاون کی طاقت بھی نہیں رکھتے مگر ان کے قلوب میں اللہ اور رسول ﷺ کے لئے نصح و خیر خواہی کے جذبات تھے اور وہ خدمت دین کے لئے بے تاب تھے۔ یہ شریک جہاد نہ ہو سکتے تھے مگر ان کے بارے میں کہا گیا کہ نہ ان پر کوئی اعتراض کیا جا سکتا ہے' نہ ان کو ملامت کی جا سکتی ہے اس لئے کہ یہ اپنی مجبوریوں کے باعث میدانِ جہاد تک پہنچنے اور جنگ میں حصہ لینے کی عملاً سعادت تو نہ پا سکے لیکن ان کے قلوب وہیں لگے ہوئے تھے' یہ اللہ اور رسول ﷺ کی نصح و وفاداری کے جذبات سے سرشار تھے۔قلب کے ان پاکیزہ جذبات اور دین کے لئے نیک آرزوؤں کی بدولت قرآن نے ان کو محسنین کہا اور فرمایا: ''مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ '' ان وفادار اور مخلص بندوں پر نہ کوئی الزام رکھا جا سکتا ہے' نہ ان کو ملامت کی جا سکتی ہے''۔ درانحالیکہ میدانِ جہاد میں پہنچ کر ان کو اپنی وفاداری اور سرفروشی ثابت کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا۔ان کو ان کی نیک آرزوؤں' پاکیزہ تمناؤں اور نیک ارادوں نے اس مقام رفیع تک پہنچایا کہ قرآن نے ان کو محسنین میں شامل فرمایا جبکہ قدرت اور وسائل رکھنے کے باوجود جو لوگ پیچھے رہ گئے اور غزوہ تبوک میں شریک نہ ہوئے۔ان کے بارے میں قرآن نے نہایت سخت لہجہ اختیار کیا۔ ان کو گھر میں بیٹھنے والیوں سے تشبیہ دی' ان کو ہدایت سے محروم بتایا اور فرمایا ان کے قلوب پر اللہ نے مہر لگا دی' ان کی سمجھ میں کچھ نہ آئے گا۔ یہ سوجھ بوجھ اور علم سے بے بہرہ ہیں۔

رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ○ (التوبۃ ۸۷)

''ان لوگوں نے گھر بیٹھنے والیوں میں شامل ہونا پسند کیا اور ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا گیا اس لئے ان کی سمجھ میں اب کچھ نہیں آتا''۔

اس کے برخلاف جن لوگوں کے ایمان واخلاص کا قرآن نے اعتراف کیا گو وہ بھی میدان جہاد میں نہیں گئے لیکن ان کے ارادے ان کے جذبات اور ان کی دعائیں مجاہدین کے ساتھ تھیں' اس لئے وہ اپنی نیتوں سے گویا مجاہدین کے ساتھ تھے اور انہیں میں شامل تھے۔

غزوۂ تبوک سے واپس ہوتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا اور ان مجاہدین کے سامنے جو ابھی ابھی میدان جہاد میں تلوار کے جوہر دکھا کر لوٹے تھے ایک عجیب وغریب تقریر فرمائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

اِنَّ بِالْمَدِيْنَةِ اَقْوَامًا مَا سِرْتُمْ مَسِيْرًا وَّلَا قَطَعْتُمْ وَادِيًا اِلَّا كَانُوْا مَعَكُمْ

''مدینہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ تم نے جو کوچ بھی کیا اور جو وادی بھی طے کی وہ برابر تمہارے ساتھ

ساتھ رہے"۔

غزوۂ تبوک کے مجاہدین نے حیرت سے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ! کیا مدینے میں رہتے ہوئے؟ فرمایا: ہاں! مدینے میں رہتے ہوئے' انہیں مجبوری نے روک لیا تھا' ورنہ وہ رکنے والے نہ تھے"۔

بلاشبہ میدان جہاد میں انہوں نے ہاتھ پیروں سے کوئی خدمت انجام نہ دی اور نہ ان کو کفار سے لڑنے اور تلوار چلانے کا موقع ملا لیکن وہ دل سے برابر اس خدمت میں لگے رہے اور اپنے جذبات اور تمناؤں اور اپنی دعاؤں سے وہ برابر جہاد میں مصروف رہے۔

## ایمان کے بغیر عمل خیر کے اجر کا مسئلہ

"ہر ایک کے لئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی"۔ حدیث کے اس فقرے سے صاف طور پر ایک اصولی اشارہ بھی ملتا ہے اور یہ اشارہ عقل وفطرت کے عین مطابق ہے کہ جو شخص آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اس کے نیک اعمال کا کوئی اجر اس کو آخرت میں نہیں مل سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ جو شخص آخرت پر ایمان ہی نہیں رکھتا وہ عمل خیر کرتے وقت اجر آخرت کے بارے میں بھی کوئی یقین نہیں رکھتا۔ پس ایسے شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی۔ یہ رسول ﷺ کے اس ارشاد سے اشارہ ملتا ہے اور یہی عقل وفطرت کا تقاضا ہے اور حضور ﷺ کے اس ارشاد کی بنیاد قرآن کی یہ اصولی ہدایت اور صراحت ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ۝ (الکہف ۱۰۵)

"یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے ربّ کی آیات ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کے یقین سے محروم رہے اس لئے ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے۔ قیامت کے روز ہمیں' نہیں کوئی وزن نہ دیں گے"۔

دنیا میں بعض ایسے لوگ بھی کچھ اعمال خیر کرتے نظر آتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ یہ نہیں مانتے کہ اچھے برے اعمال کا بدلہ انسان آخرت کی زندگی میں پائے گا۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے اعمال خیر کا کوئی صلہ آخرت میں پائیں گے یا نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ آخرت میں ان کے اعمال کا کوئی وزن نہ ہوگا۔ قرآن کی یہ آیت بھی یہی صراحت کرتی ہے۔ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے اور حضور ﷺ کا ارشاد بھی یہی ہوتا ہے کہ ان کو وہی ملنا چاہیے جس کی انہوں نے نیت کی ہے۔ ان کا تصور خیر دنیا تک محدود ہے۔ دنیا ہی کے پیش نظر انہوں نے عمل خیر کیا ہے اس لئے یہ اسی کے مستحق ہیں جو انہوں نے نیت کی ہے۔ رہا یہ سوال کہ ان کے عملِ خیر کا کوئی بدلہ دنیا میں بھی ملے گا یا نہیں تو اللہ علیم وحکیم ہے وہ علم وحکمت کے تحت دنیا میں جو صلہ چاہے گا ان کو

دے گا۔

## اچھی اور بری نیت کا عظیم فرق

انسان کا دل خیر وشر کے جذبات وخیالات کی مستقل رزمگاہ ہے۔ وہ بُرے کاموں کی نیت بھی کرتا ہے اور اچھے کاموں کی نیت اور ارادہ بھی۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ کسی نیک کام کا عزم کرتا ہے لیکن کسی وجہ سے نہیں کر پاتا اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ کسی گناہ کا ارادہ کرتا ہے لیکن اس پر عمل نہیں کر پاتا۔ سوال یہ ہے کہ آدمی اچھا یا بُرا ارادہ کرتا ہے اور صرف نیت وارادہ کر کے رہ جاتا ہے اور اس نیکی یا بدی پر عمل نہیں کر پاتا تو اس صورتحال میں اللہ کا معاملہ اس بندے کے ساتھ کیا ہوگا؟ یہ بات تو اوپر معلوم ہوگئی کہ حُسنِ نیت چونکہ قلب کا ایک عمل ہے' اس لئے وہ بجائے خود نیکی ہے۔ رہ جاتا ہے بری نیت اور برے ارادے کا معاملہ تو قرآن میں ارشاد ہے:

وَ اِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡهُ یُحَاسِبۡکُمۡ بِهِ اللّٰهُ ؕ

''اور تم اپنے دل کی باتیں خواہ ظاہر کرو یا چھپاؤ بہرحال تم سے ان کا حساب لے لے گا''۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے قلب میں جو خیالات اور وساوس بھی آتے ہیں' ان کا اللہ کے یہاں محاسبہ ہوگا۔ اسی لیے جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابۂ کرام گھبرا گئے کہ ہم سے ان خیالات ووساوس پر بھی مواخذہ ہوگا جو ہمارے دل میں آتے ہیں؟ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ آیتیں نازل ہوئیں جو اس کے بعد ہیں اور جس میں وضاحت ہے۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا

''اللہ تعالیٰ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا''۔

ظاہر ہے کہ خیالات ووساوس کی لہروں پر انسان کا قابو نہیں ہے۔ انسان کا دل ان کی گزرگاہ ہے اور ان کی آمد وشد پر انسان کا اختیار نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص کسی نیکی یا بدی کا پختہ ارادہ اور عزم کرلے لیکن اپنی پختہ نیت کے مطابق عمل نہ کرے تو اس صورتحال میں ربِّ کریم کا معاملہ کیا ہوگا؟ اس کی وضاحت میں اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حوالے سے ایک ایمان افروز ہدایت نقل فرمائی ہے:

''حضرت عبداللہ ابن عباس ابن عبدالمطلب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ' اللہ بزرگ وبرتر کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں کہ ''بلاشبہ اللہ بزرگ وبرتر نے تمام نیکیاں اور برائیاں لکھ دی ہیں۔ پھر ان کو اپنی کتابوں اور نبیوں کے ذریعے بھی بیان کردیا ہے۔ اب جو شخص کوئی نیک کام کرنے کا ارادہ کرتا ہے مگر کسی وجہ سے عمل نہیں کر پاتا تو بھی اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک کامل نیکی اس کے نامۂ عمل میں لکھ دیتے ہیں اور اگر وہ اس پر پورا عمل بھی کرلیتا ہے تو اس کے نامۂ عمل میں دس نیکیوں سے لے کر سات

سونیکیوں تک بلکہ چند در چند یعنی بے شمار نیکیاں لکھ دیتے ہیں''۔

اس کے بالمقابل اگر کوئی شخص کسی برے کام کی نیت و ارادہ کرتا ہے (لیکن ارادہ کر کے رہ جاتا ہے) عملاً اس برائی کو نہیں کرتا تو (نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ بری نیت اور برے ارادہ پر اس کی پکڑ نہیں کرتا بلکہ) برا عمل نہ کرنے کے صلے میں اس کے حق میں ایک نیکی لکھ دیتا ہے اور اگر وہ اپنی بری نیت کے مطابق برا عمل کو گزرتا ہے تو اس کے نامۂ عمل میں اللہ تعالیٰ صرف ایک برائی لکھتا ہے۔ (متفق علیہ)

## حدیث کا اصل منشاء

حدیث کا اصل منشاء اور تمام تر دارومدار اس پر ہے کہ آدمی اپنی نیت کا بے لاگ جائزہ لے۔ ہر طرح کی کھوٹ سے نیت کو پاک رکھے اور جو کچھ کرے خالص اللہ کی رضا کے لئے کرے۔ عبادت و اطاعت ہو یا ایمان و اسلام' اللہ کے یہاں ان کی قبولیت کی بنیادی شرط یہ ہے کہ یہ سب کچھ خالص اللہ کے لئے ہو۔ دنیا طلبی' شہرت دکھاوا اور دنیا کا کوئی مفاد ہرگز پیش نظر نہ ہو' اس لئے کہ اللہ کی نظر میں کوئی بھی عمل اسی وقت درست اور قابل قبول ہوتا ہے جب وہ خالصتاً اس کی رضا کے لئے کیا جائے۔

بلاشبہ اعمالِ صالحہ کے کچھ مادی اور دنیوی فوائد بھی ہوتے ہیں اور وہ بھی بندہ مومن کو ملتے ہیں لیکن ان دنیوی اور ضمنی فوائد کو نہ مومن اپنا مقصود بنائے اور نہ ان کو اپنی نیت میں شامل کر کے اپنے اخلاص نیت کو برباد کرے۔ مثلاً کوئی شخص روزہ رکھے اور اللہ ہی کا حکم سمجھ کر اس کی رضا کے لئے رکھے مگر رضائے الٰہی کی نیت کے ساتھ ساتھ اس کی نیت یہ بھی ہو کہ اس سے صحت بنے گی یا ایک وقت کا کھانا بچے گا' اسی طرح ایک شخص اللہ کی اہم عبادت سمجھ کر حج کے لئے جاتا ہے مگر ساتھ میں یہ بھی نیت ہے کہ مختلف مقامات کی سیاحت ہوگی اور سیر و تفریح کا لطف آئے گا تو اس آمیزش سے وہ اخلاص باقی نہیں رہتا' جو مطلوب ہے۔ اللہ کے یہاں صرف اسی عمل کی قیمت لگتی ہے جو ہر طرح کی آمیزش سے پاک' خالص نیت کے ساتھ صرف اسی کی رضا کے لئے کیا گیا ہو' کوئی دوسری غرض ہرگز پیش نظر نہ ہو' اخلاص اللہ کی زبردست نعمت اور جوہر ایمان ہے' شیطان ہمہ وقت اس کو برباد کرنے کی تاک میں لگا رہتا ہے۔ اسی لئے مومن کو اس معاملہ میں نہایت حساس اور چوکنا رہنا چاہیے۔ اپنے اخلاص کی حفاظت جو لوگ کرتے رہتے ہیں اور کسی وقت اس مہم سے غافل نہیں ہوتے۔ ان پر شیطان کا داؤں نہیں چلتا۔ شیطان نے قسم کھا کر اللہ سے کہا کہ میں تیرے سارے بندوں کو بہکا لے جاؤں گا۔ مگر ان لوگوں کے بارے میں اپنی مجبوری کا اعتراف کرتا ہوں جن کو تو نے اپنے لئے خاص کر لیا ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مجھ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو میں نے عرض کیا:

اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کچھ نصیحت فرمائیے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَخْلِصْ دِيْنَكَ يَكْفِكَ الْعَمَلُ الْقَلِيْلُ

''اپنے دین واطاعت میں اخلاص پیدا کرو۔ تھوڑا عمل بھی تمہارے لئے کافی ہوگا''۔ (ترغیب وترہیب)

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور اس نے سوال کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ایک شخص جہاد کرتا ہے مگر وہ ثواب اور شہرت دونوں چیزوں کا خواہشمند ہے۔ بتایئے اس کے لئے کیا ہے؟ ارشاد فرمایا: ''لاشيء له'' اس کے لئے کچھ نہیں ہے''۔ سائل نے تین بار یہی سوال دہرایا اور تینوں بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی جواب دیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک اللہ صرف وہ عمل قبول کرتا ہے جو خالص اسی کے لئے ہو اور جس سے صرف اسی کی رضا مطلوب ہو۔

حضرت ابوفراس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا ''ایمان کیا ہے؟'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اخلاص''

اخلاص ایک قلبی کیفیت کا نام ہے' جس کو پیدا کرنے اور جس کی حفاظت کرنے کے لئے آدمی کو ہر وقت مستعد اور چوکنا رہنا چاہیے اور کسی وقت بھی اس کی طرف سے بے فکری اور لاپروائی نہ کرنا چاہیے۔ ہر عمل کا اجر و صلہ اللہ کی طرف سے اخلاص کی کیفیت کے مطابق ہی عطا کیا جائے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا آدمی نماز ختم کر کے فارغ ہوتا ہے اور حال یہ ہوتا ہے کہ کسی کے لئے نماز کا دسواں حصہ لکھا جاتا ہے اور کسی کے لئے نواں حصہ کسی کے لئے آٹھواں حصہ لکھا جاتا ہے اور کسی کے لئے ساتواں حصہ کسی کے لئے چھٹا حصہ لکھا جاتا ہے اور کسی کے لئے پانچواں حصہ' کسی کے لئے چوتھائی حصہ لکھا جاتا ہے اور کسی کے لئے تہائی حصہ اور کوئی ایسا ہوتا ہے کہ اس کے لئے آدھا حصہ لکھا جاتا ہے''۔ (ترغیب)



اخلاص چونکہ ایمان' اسلام' اعمال صالحہ اور فضائل اخلاق وغیرہ کی صحت اور قبولیت کی بنیاد ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہر شخص ہر وقت اپنی نیت کا جائزہ لے اور نیت کو ہر کھوٹ سے پاک اور خالص رکھنے سے کسی وقت بھی غفلت اور لاپروائی نہ برتے۔ جس نے نیت کی طرف سے لاپروائی برتی وہ ہلاک ہو گیا۔ اس لئے کہ نفس امارہ خواہشات اور رذائل پر اکسانے اور آمادہ کرنے سے کسی وقت غافل نہیں بیٹھتا۔ وہ ہمہ وقت اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ جاہ و مال' شہرت و عزت' اقتدار و منصب اور وقعت و عظمت کی خواہش اور ریا اور نام و نمود انسان کی کمزوری ہے اور کسی بھی کمزور مورچے سے شیطان اور نفس کسی بھی وقت حملہ آور ہو سکتا ہے۔ خاص طور پر نمود و نمائش اور ریا تو رذائل میں سے وہ بدترین اخلاقی بیماری ہے جو بڑی مشکل سے پیچھا چھوڑتی ہے اور حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو شرک اصغر فرمایا ہے۔

حضور ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

''تم پر میں سب سے زیادہ جس چیز کا خوف کرتا ہوں وہ شرک اصغر ہے''۔

صحابہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا حضور ﷺ شرک اصغر کیا ہے؟ فرمایا: ''ریا اور دکھاوا'' (مشکوۃ)

ریا کاری بظاہر بہت معمولی کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ آدمی اس کو زیادہ اہمیت بھی نہیں دیتا اور پھر یہ اس قدر خاموشی سے حملہ آور ہوتی ہے کہ بعض اوقات آدمی اس کے تباہ کن حملے کا احساس بھی نہیں کر پاتا۔ اس لئے بڑی آسانی سے آدمی اس کا شکار ہو جاتا ہے اور اس خود فریبی میں مبتلا رہتا ہے کہ اس کا عمل مخلصانہ ہے۔ مثلاً ایک شخص اللہ کی عبادت کرنے کی نیت ہی سے نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ کوئی دنیا طلبی یا دنیوی غرض پیش نظر نہیں ہوتی لیکن کچھ لوگ اسے دیکھ رہے ہوتے ہیں ان میں سے کوئی آدمی اتفاق سے اس کی تعریف میں کوئی جملہ کہہ دیتا ہے۔ بس ادھر نفس اپنی سازش کا آغاز کر دیتا ہے۔ نمازی کچھ بہت زیادہ غور و فکر سے فیصلہ کئے بغیر سجدہ اور قیام طویل کرنے لگتا ہے اور اس طرح نہ صرف اپنا عمل ضائع کر دیتا ہے بلکہ اللہ کی نظر اس پر غضبناک ہو جاتی ہے۔ دراصل ریا کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ بندے مجھ سے خوش ہو جائیں یا بندوں کی نظر میں میرا مقام بلند ہو جائے۔ ریا کاری دراصل اللہ کی غیرت کو چیلنج ہے اسی لئے ایک حدیث قدسی میں اللہ نے اس سے بیزاری کا اظہار نہایت سخت لفظوں میں فرمایا ہے۔ ایک حدیث قدسی میں رسول پاک ﷺ اللہ عزوجل کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جس بندے نے کوئی عمل خیر کیا اور اس عمل میں اس نے میرے ساتھ کسی غیر کو بھی شریک کیا میں اس سے بری ہوں وہ عمل اسی کے لئے جس کیلئے اس نے وہ عمل کیا ہے''۔

ایک دن امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ مسجد نبوی ﷺ میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے مزار مقدس پر بیٹھے ہیں اور زار و قطار رو رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا ''کیوں رو رہے ہیں؟'' فرمایا: ایک چیز مجھے رلا رہی ہے جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ تھوڑا سا ریا بھی شرک ہے اور جس شخص نے اللہ کے کسی دوست سے دشمنی کی وہ اللہ سے جنگ کے لئے میدان میں آ گیا۔ بے شک اللہ کو نیک متقی بندے جو بندوں کی نظر سے چھپے رہتے ہیں پسند ہیں جو اگر کہیں موجود نہ ہوں تو ان کی تلاش نہ ہو اور اگر موجود ہوں تو ناقابل التفات جان کر ان کی کسی تقریب میں شامل نہ کیا جائے...... ان کے قلوب چراغِ ہدایت ہیں یہ ہر مصیبت کی تاریکی سے پار ہو جاتے ہیں۔ (مشکوۃ)

بندوں سے چھپے رہنے والے بندے وہ ہیں جو اپنے اعمال چھپا کر کرتے ہیں اور بندوں پر اپنے کسی طور طریق اور شان و صورت سے اپنی یہ حیثیت ہرگز ظاہر نہیں ہونے دیتے کہ اللہ تعالیٰ سے ان کا کیا معاملہ ہے اور اس

کی نظر میں یہ کس مرتبے کے لوگ ہیں۔ وہ ریا اور نمود سے بہت دور ہوتے ہیں۔ وہ ربّ کی رضا کی خاطر جو کچھ کرتے ہیں، بندوں کی نظر سے بچا کر کرتے ہیں۔ بندے ان کے رتبوں سے ناواقف ہوتے ہیں، اس لئے معاشرے میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، وہ اپنے جوہرِ اخلاص کی قدر و قیمت سمجھتے ہیں اور اس کو محفوظ و مامون رکھنے پر ہی ان کی نظر لگی رہتی ہے اسی لئے یہ اللہ کے محبوب اور پسندیدہ ہوتے ہیں۔

## ریا، دنیا و آخرت کی رسوائی

آدمی دنیا میں نیک نام بننے، لوگوں کی نظر میں اپنی قدر و قیمت بڑھانے اور نامور بننے کے لئے ریا اور نمود سے کام لیتا ہے لیکن ریاکارانہ طرزِ عمل سے اس کو یہ مقصود حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے برخلاف اس کی ریاکاری اور دکھاوے کی شہرت ہوتی ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں رسوا اور ذلیل کر دیتا ہے۔

حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کوئی عمل اس لئے کرے گا کہ اس کی شہرت ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی غرض کو خوب شہرت دے گا اور جو کوئی دکھاوے کے لئے کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے اس مقصود کو خوب دکھاوے گا۔ اور پھر ایسے بدنصیبوں کا انجام حشر کے میدان میں بھی ایسا ہی ہوگا''۔ (بخاری، مسلم)

حضرت ابو ہند داری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ ''جو آدمی دکھاوے اور شہرت کے مقام پر کھڑا ہوگا۔ حشر کے روز اللہ تعالیٰ اس کو نمایاں اور مشہور کرے گا کہ یہ شہرت اور دکھاوے کے لئے عمل کرتا تھا۔ (احمد)

## حزن و غم کا خندق

اخلاص و للّٰہیت کے جوہر سے محروم، ریاکار عابدوں اور دیندار بننے والوں کو اللہ تعالیٰ غم اور حزن کے ایسے خندق میں دھکیل دے گا جو اپنے عذاب کی شدت میں اس قدر بھیانک ہوگا کہ خود جہنم بھی اس سے دن میں چار سو مرتبہ پناہ مانگتی ہے۔ اللہ کی پناہ!

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم لوگ حزن و غم کے خندق سے پناہ مانگتے رہا کرو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ غم کا خندق کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ جہنم میں ایک وادی یا نہایت گہرا کھڈ ہے (جو اس قدر بھیانک ہے) کہ خود جہنم دن میں چار سو بار اس سے پناہ مانگتا ہے۔ عرض کیا گیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس میں کون لوگ ڈالے جائیں گے۔ فرمایا: وہ بڑے عبادت گزار اور بہت زیادہ قرآن پڑھنے پڑھانے والے جو لوگوں کو دکھانے کے لئے عمل کیا کرتے تھے۔ (جامع ترمذی)

## فکر ونظر کی کوتاہی اور کجی

ہر شخص کی یہ فطری اور جائز خواہش ہوتی ہے کہ دنیا میں اسے عزت ملے' رسوائی اور ذلت سے محفوظ رہے۔ لوگوں میں اس کا اعتماد اور اعتبار ہو' اس کی بات کو لوگ وزن دیں اور لوگ اپنی مجلسوں اور محفلوں میں اسے اچھے لفظوں سے یاد کریں اور انسانی سماج میں وہ نیک نام تصور کیا جائے لیکن یہ نیک نامی اور عزت وعظمت اللہ کی طرف سے ملتی ہے' عزت وذلت اس کے قبضے میں ہے۔ اس سے بے نیاز ہو کر بندوں سے عزت وعظمت چاہنے والے اللہ کی نظر میں رسوا ہو جاتے ہیں اور جو لوگ اللہ کی نظر میں حقیر وذلیل ہوتے ہیں ان کے لئے اللہ ایسے حالات بناتا ہے کہ وہ بندوں کی نظر میں ذلیل ورسوا ہو جائیں۔

دنیا میں عزت وعظمت' نیک نامی اور خوش اعتمادی چاہنے کا طریقہ بھی صرف یہی ہے کہ آدمی سب کچھ اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے ہی کرے اور یہ یقین رکھے کہ سب کچھ اس کے قبضے میں ہے۔ اللہ کی نظر میں اگر اس کو عزت مل گئی اور اس نے اگر اپنا پسندیدہ اور محبوب بنالیا تو پھر یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ دنیا میں اس کی نیک نامی اور عزت وعظمت کے لئے ماحول کو سازگار نہ بنائے۔ کچھ حاسد' بدخواہ اور کمینہ خصلت لوگ اس کی نیک نامی اور عظمت کو بدنامی اور رسوائی میں بدلنے کی مذموم کوششیں کر سکتے ہیں' اس لئے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو اپنا نامۂ عمل تیار کرنے کا موقع دے رکھا ہے لیکن آخر کار وہ بندے عزت وعظمت ہی پائیں گے جو اللہ کی خوشنودی کے حصول میں اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ لگے ہوئے ہیں' بدخواہوں کی کوششیں بری طرح ناکام ہوں گی اور وہ خود رسوا ہوں گے اور اللہ کے مخلص بندے عظمت ونیک نامی پائیں گے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا: ''حضور بتایئے! اس بارے میں کیا رائے ہے کہ ایک شخص نیک کام کرتا ہے اور لوگ اس کے نیک کام کی وجہ سے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ تو بندۂ مومن کی فوری نقد بشارت ہے''۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ کی رضا اور آخرت کے اجر وانعام کی طلب میں جو بندہ اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ نیک اعمال میں لگا ہوا ہے اس کو دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ محروم ورسوا نہ کرے گا۔ بندہ اپنے اخلاص وللّٰہیت کو بے داغ رکھنے کے لئے مسلسل کوشاں رہے اور اللہ سے امید رکھے کہ وہ اس کے صلے میں دنیا میں بھی اس کو عزت اور محبت سے نوازے گا۔

## اخلاص وللّٰہیت کا مفہوم

اخلاص کے معنی ہیں خالص کرنا' بے آمیز رکھنا' اپنے اصل مطلوب اور مقصود میں دوسری اغراض کو شامل نہ کرنا' مثلاً ایک شخص وطن کی سربلندی چاہتا ہے تو اس کا اخلاص یہ ہوگا کہ اس کی ساری تگ ودو کا محور صرف یہی غرض ہو'

اس کا منتہائے مقصود صرف وطن ہو' ذاتی مفادات' اپنی شہرت' مادی منافع کا حصول ہرگز اس کے پیش نظر نہ ہو' یہ اخلاص جب ہر غرض سے پاک' ہر مفاد سے پاک اور ہر آمیزش سے پاک ہو اور پھر صرف اللہ کی رضا کے لئے ہو اور ایک شخص ہر طرف سے منہ موڑ کر' ہر چیز سے بے نیاز ہو کر اپنے اخلاص کا مرکز و محور اور حقیقی نصب العین اللہ کی رضا کو بنا لیتا ہے۔ سب کچھ صرف اللہ کی رضا ہی کے لئے کرتا ہے تو اس کے اخلاص میں للّٰہیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مخلص تو آدمی کسی چیز کے لئے بھی ہو سکتا ہے مگر جب ہم اخلاص کے ساتھ للّٰہیت کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ تمام تر اخلاص اللہ کی رضا کے لئے ہے۔ صرف اس کی رضا مطلوب و مقصود ہے اور ساری تگ و دو کا محور اسی کی ذات اقدس ہے۔

چونکہ اخلاص و للّٰہیت پر ہی ایمان' اسلام' اخلاق' اعمال اور دینداری کی صحت و قبولیت کا تمام تر دارومدار ہے۔ یہی تمام اعمال صالحہ کی جان ہے' اس کے بغیر نہ اسلام ہے نہ کوئی عمل عملِ صالح ہے' نہ کوئی عملِ خیر اللہ کی نظر میں عملِ خیر ہے' نہ اس کی قبولیت کا کوئی امکان ہے۔ جس طرح کسی جسم میں روح اور جان نہ ہو تو مٹی کا ڈھیر ہے' اسی طرح کوئی عمل اپنی ظاہری شکل میں کتنا ہی بہتر ہو' اخلاص و للّٰہیت کے بغیر وہ بے سود ہے۔ اخلاص و للّٰہیت اسلام و اعمال کی جان ہے اور یہ بندۂ مومن کی سب سے قیمتی متاع ہے۔ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: ''ایمان کیا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایمان اخلاص ہے''۔

اس قیمتی جوہر کی حفاظت اور اس کو اپنے ہر کاوش و عمل کی جان بنانے کی فکر و کوشش ہی مومن کی زندگی کا محور و مرکز ہوتا ہے اور زندگی کے مختلف محاذوں پر جہاں نیت کے ڈانوا ڈول ہونے کا اندیشہ رہتا ہے اور جن مورچوں سے شیطان اور نفس امارہ انسان کی نیت و اخلاص پر حملہ آور ہوتا ہے۔ بندۂ مومن مستعد اور چوکنا رہتا ہے اور کسی وقت بھی غافل و لاپروا نہیں ہوتا' اس لئے کہ لمحے بھر کی غفلت سے زندگی بھر کی کمائی غارت ہو سکتی ہے۔





# ہماری مقبول مطبوعات

| | |
|---|---|
| فضائل قرآن | مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ |
| کتاب الصوم | // |
| کتاب الذکر و دعا | // |
| کتاب الجنائز | // |
| شعور حیات | مولانا محمد یوسف اصلاحی |
| شمع حرم | // |
| گلدستۂ حدیث | // |
| تیس پروانےؓ | طالب ہاشمی |
| چالیس جاں نثارؓ | // |
| ہمارے رسول پاک ﷺ | // |
| تذکار صحابیات | // |
| سو شیدائیؓ | // |
| ستر ستارےؓ | // |
| پچاس صحابہؓ | // |
| سیرت فاطمہؓ | // |

البدر پبلی کیشنز اردو بازار لاہور